بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الۡمُرۡسَلِیۡنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ اَجۡمَعِیۡنَ

اخلاق

عقائد اور عبادات کے بعد تعلیماتِ نبویؐ کی کتاب کا تیسرا باب اخلاق ہے۔ اخلاق سے مقصود باہم بندوں کے حقوق و فرائض کے وہ تعلقات ہیں جن کو ادا کرنا ہر انسان کے لئے مناسب بلکہ ضروری ہے۔ انسان جب اس دنیا میں آتا ہے تو اس کی ہر شے سے تھوڑا بہت اُس کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی تعلق کے فرض کو بحسن و خوبی انجام دینا اخلاق ہے۔ اُس کے اپنے ماں باپ، اہل و عیال، عزیز اور رشتہ دار، دوست و احباب سب سے تعلقات ہیں بلکہ ہر اُس انسان کے ساتھ اس کا تعلق ہے جس سے وہ محلّہ، وطن، قومیّت، جنسیت یا اور کسی نوع کا علاقہ رکھتا ہے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر حیوانات تک سے اس کے تعلقات ہیں اور اُن تعلقات کے سبب سے اس پر کچھ فرائض عائد ہیں۔

دُنیا کی ساری خوشی، خوشحالی اور امن و امان اسی اخلاق کی دولت سے ہے۔ اسی دولت کی کمی کو حکومت و جماعت اپنے طاقت و قوت کے قانون سے پورا کرتی ہے۔ اگر انسانی جماعتیں اپنے اخلاقی فرائض کو پوری طرح از خود انجام دیں تو حکومتوں کے جبری قوانین کی کوئی ضرورت ہی نہ ہو۔ اس لئے بہترین مذہب وہ ہے جس کا اخلاقی دباؤ اپنے ماننے والوں پر اتنا ہو کہ وہ ان کے قدم کو سیدھے

راستہ سے بھٹکنے نہ دے۔ دُنیا کے سارے مذہبوں نے کم و بیش اسی کی کوشش کی ہے اور دُنیا کے
آخری مذہب اسلام نے بھی یہی کیا ہے۔ آئندہ ابواب میں اسلام کی انہی کوششوں کا جائزہ لینا
ہے اور محمّد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اِس باب میں جو کُچھ کہا ہے اور کیا ہے اُس کو تفصیل
سے بتانا ہے۔

اِسلام اور اخلاقِ حسنہ

اس میں شک نہیں کہ دُنیا کے سارے مذہبوں کی بُنیاد اخلاق ہی پر ہے چنانچہ اس عرصۂ ہستی میں جس قدر پیغمبر اور مصلح آئے سب کی یہی تعلیم رہی کہ سچ بولنا اچھا اور جھوٹ بولنا بُرا ہے۔ انصاف بھلائی اور ظلم برائی ہے۔ خیرات نیکی اور چوری بدی ہے لیکن مذہب کے دُوسرے ابواب کی طرح اِس باب میں بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تکمیلی حیثیت رکھتی ہے۔ خُود آپؐ نے ارشاد فرمایا:

بعثت لاتمم حسن الاخلاق۔ (موطا مالك: حسن اخلاق)

میں حُسنِ اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں۔

یہ امام مالکؒ کی مؤطا کی روایت ہے۔ مسندِ احمد، بیہقی اور ابنِ سعدؒ وغیرہ میں اس سے بھی زیادہ صاف اور واضح الفاظ میں آپؐ نے فرمایا:

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق۔[1]

میں تو اسی لئے بھیجا گیا کہ اخلاقِ حسنہ کی تکمیل کروں۔

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کے ساتھ ہی اس فرض کو انجام دینا شروع کر دیا۔ ابھی آپ مکہ ہی میں تھے کہ ابوذرؓ نے اپنے بھائی کو اس نئے پیغمبرؐ کے حالات اور تعلیمات کی تحقیق

---

[1] کنز العمال جلد ۲ صفحہ ۵ حیدرآباد و زرقانی شرح موطا جلد ۴ صفحہ ۹۲ ۔ مطبعہ کستلیہ مصر ۱۲۸۰ھ۔

کے لئے مکہ بھیجا۔ اس نے واپس آکر آپؐ کی نسبت اپنے بھائی کو جن الفاظ میں اطلاع دی وہ یہ تھے:

رأیته یأمر بمکارم الاخلاق[1]۔ میں نے اس کو دیکھا کہ وہ لوگوں کو اخلاقِ حسنہ کی تعلیم دیتا ہے۔

حبشہ کی ہجرت کے زمانہ میں نجاشی نے جب مسلمانوں کو بلوا کر اسلام کی نسبت تحقیقات کی اس وقت حضرت جعفر طیارؓ نے جو تقریر کی اس کے چند فقرے یہ ہیں:

"اے بادشاہ! ہم لوگ ایک جاہل قوم تھے، بتوں کو پوجتے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے، ہمسایوں کو ستاتے تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا، زبردست زیردستوں کو کھا جاتے تھے۔ اس اثنا میں ایک شخص ہم میں پیدا ہوا...... اس نے ہم کو سکھایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں، سچ بولیں، خونریزی سے باز آئیں، یتیموں کا مال نہ کھائیں، ہمسایوں کو آرام دیں، عفیف عورتوں پر بدنامی کا داغ نہ لگائیں[2]۔"

اسی طرح قیصرِ روم کے دربار میں ابوسفیان نے جو ابھی تک کافر تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلاحی دعوت کا جو مختصر خاکہ کھینچا اس میں یہ تسلیم کیا کہ وہ خُدا کی توحید اور عبادت کے ساتھ لوگوں کو یہ سکھاتے ہیں کہ "وہ پاکدامنی اختیار کریں، سچ بولیں اور قرابت کا حق ادا کریں[3]۔"

قرآن مجید نے جا بجا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں یہ کہا ہے:

وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ (الجمعة: ۲) یہ پیغمبر ان اَن پڑھ جاہلوں کو پاک و صاف کرتا اور ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔

---

[1] صحیح مسلم مناقب ابی ذرؓ۔ جلد ۲ صفحہ ۳۴۹ مصر۔ [2] ابن حنبل جلد ۱ صفحہ ۲۰۲ و مستدرک حاکم حیدرآباد، ج ۲ صفحہ ۳۱۰ و ابن ہشام ذکر واقعۂ ہجرت۔ [3] صحیح بخاری کتاب الوحی و کتاب الجہاد۔

اس آیت میں دو لفظ فیصلہ کے قابل ہیں۔ ایک پاک و صاف کرنا جس کو قرآنِ پاک نے تزکیہ کہا ہے اور دوسرا حکمت۔

ا۔ تزکیہ کے لفظی معنی پاک و صاف کرنا، نکھارنا، میل کچیل دور کرنا ہیں۔ قرآنِ پاک نے اس لفظ کو اس معنی میں استعمال کیا ہے کہ نفسِ انسانی کو ہر قسم کی نجاستوں اور آلودگیوں سے نکھار کر صاف ستھرا کیا جائے یعنی اس آئینہ کے زنگ کو دور کر کے اس میں صیقل اور جِلا پیدا کر دی جائے۔ سورۂ شمس میں ہے:

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝ (الشمس: ۷-۱۰)	قسم ہے نفس کی اور جیسا اس کو ٹھیک کیا۔ پھر اس میں اس کی بدی اور نیکی الہام کر دی۔ بے شبہ جس نے اس نفس کو صاف ستھرا بنایا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اس کو مٹی میں ملایا وہ ناکام رہا۔

دوسری جگہ ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝ (الاعلیٰ: ۱۴-۱۵)	بے شبہ وہ جیتا جس نے اپنے کو پاک و صاف کیا اور اپنے رب کا نام لیا اور نماز پڑھی۔

ایک جگہ اسلام کی دعوت کے نتیجہ کو تزکیہ اور تزکی کے لفظ سے ادا کیا ہے۔

عَبَسَ وَتَوَلّٰٓى ۝ اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى ۝ وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰٓى ۝ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ۝ (عبس: ۱-۴)	پیغمبر نے تیوری چڑھائی اور منہ موڑا کہ اس کے پاس وہ اندھا آیا۔ اور تجھے کیا خبر ہے شاید کہ وہ سنور جاتا۔ یا وہ سوچتا تو تیرا سمجھانا اس کے کام آتا۔

اِن آیتوں سے اندازہ ہوگا کہ قرآن پاک میں اس "تزکیہ" کا مفہوم کیا ہے جس کو اس پیغمبرِ اسلام علیہ السلام

کی خاص خصوصیت قرار دی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ وہ نفوسِ انسانی کو جلا دیں، ان کو برائیوں اور نجاستوں کی آلودگیوں سے پاک کریں اور اُن کے اخلاق و اعمال کو درست اور صاف ستھرا بنائیں۔ چنانچہ جو واقعات اوپر بیان کئے گئے اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ دوست اور دشمن دونوں آپؐ کی اس خصوصیت کے قائل تھے۔

۲۔ حکمت : اس کے بعد دُوسرا لفظ حکمت کا ہے گو اس لفظ کی پوری تشریح اس سے پہلے چوتھے حصّہ میں کی جا چکی ہے مگر اس موقع کے لحاظ سے یہ کہنا کہ حکمت کا لفظ قرآنِ پاک میں جہاں اُس علم و عرفان کے معنی میں ہے جو نورِ الٰہی کی صورت میں نبی کے سینہ میں ودیعت رکھا جاتا ہے اور جس کے آثار و مظاہر رسُول کی زبان سے کبھی مصالح و اسرار اور کبھی سنن و احکام کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں وہیں اس کا دوسرا اطلاق اس علم و عرفان کے ان عملی آثار و نتائج پر بھی ہوتا ہے جن میں بڑا حصّہ اخلاقی تعلیمات کا ہے۔ قرآن میں دو موقعوں پر یہ بتایا گیا ہے کہ اس دوسرے معنی کی حکمت میں کون کون باتیں داخل ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں توحید، والدین کی اطاعت و تعظیم، قرابتداروں اور محتاجوں کی امداد کی نصیحت اور فضول خرچی، بخل، اولاد کُشی، بدکاری، کسی بے گناہ کے جان لینے اور یتیموں کے ستانے کی ممانعت کے بعد ایفائے عہد کرنے، ٹھیک ناپنے اور تولنے اور زمین پر اکڑ کر نہ چلنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہے :

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ (بنی اسرائیل : ۳۹)	یہ حکمت کی اُن باتوں میں ہے جن کو تیرے رب نے تجھ پر وحی کیا۔

سورۂ لقمان میں ہے :

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ؕ (لقمٰن : ۱۲)	اور ہم نے لقمان کو حکمت کی باتیں سکھائیں کہ خدا کا شکر ادا کر۔

اس کے بعد حکمت کی ان باتوں کی مزید تشریح کی گئی ہے کہ کسی کو خدا کا شریک نہ بنا، والدین کے ساتھ مہربانی سے پیش آ، نماز پڑھا کر، لوگوں کو بھلی بات کرنے کو کہہ، اور بُری بات سے باز رکھ، مصیبتوں میں استواری اور مضبوطی دکھا، مغرور نہ بن، زمین پر اکڑ کر نہ چل، نیچی آواز میں باتیں کر۔" ان آیتوں سے معلوم ہُوا کہ قرآن کی اصطلاح میں ان فطری امورِ خیر کو بھی، جن کا خیر ہونا فطرۃً تمام قوموں اور مذہبوں میں مسلّم ہے اور جن کو دوسرے معنی میں اخلاق کہہ سکتے ہیں "حکمت" کہا گیا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوگا کہ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی شریعت میں اخلاق کا مرتبہ اور پایہ یہ ہے کہ ان کو "حکمت" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے اور قرآن پاک کے اس اظہارِ حقیقت سے کہ وحیِ محمدیؐ کتاب اور حکمت دونوں پر برابر مشتمل ہے یہ راز ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں عبادات اور دوسرے احکام کو جو اہمیّت حاصل ہے اس سے کم اخلاق کی اہمیت اس کی نگاہ میں نہیں۔ خود قرآن پاک نے اس کی تصریح کی ہے۔ فرمایا:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا	اے ایمان والو! رکوع کرو، سجدہ
وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ	کرو، اپنے ربّ کو پوجو اور نیکی کرو
لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ (الحج: ۷۷)	تاکہ تم فلاح پاؤ۔

گویا ایمان کی رُوح کے بعد دعوتِ محمدیؐ کے جسم کے دو بازو ہیں۔ ایک عبادت اور دوسرا اخلاق۔ ایک خالق کا حق، دوسرا مخلوق کا اور انہی کے مجموعہ کا نام اسلام ہے۔

حقوقِ عباد کی اہمیّت ایک اور نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ تعلیم محمدیؐ نے اخلاق کی اہمیت کو عبادات سے بھی زیادہ بڑھا دیا ہے۔ اخلاق حقوقِ عباد یعنی باہم انسانوں کے معاملات اور تعلقات کا نام ہے اور عبادات حقوق اللہ یعنی خدا کے فرائض ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جو ارحم الرّاحمین ہے اور جس کی رحمت کا دروازہ کسی نیک و بد پر بند نہیں ہے، شرک اور کفر کے سوا ہر گناہ کو اپنے ارادہ اور مشیت کے مطابق معافی کے قابل قرار دیا ہے۔ مگر حقوقِ عباد یعنی باہم انسانوں کے اخلاقی فرائض کی

کوتاہی اور تقصیر کی معافی خدا نے اپنے ہاتھ میں نہیں بلکہ ان بندوں کے ہاتھوں میں رکھی ہے جن کے حق میں وہ ظلم اور تعدی ہوئی ہو اور ظاہر ہے کہ ان سے اس رحم و کرم کی توقع نہیں ہو سکتی جو اس ارحم الراحمین کی بے نیاز ذات سے ہے۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جس بھائی نے دوسرے بھائی پر کوئی ظلم کیا ہو تو اس (ظالم بھائی) کو چاہیے کہ اسی دنیا میں وہ اس (مظلوم بھائی) سے اس کو معاف کرا لے ورنہ وہاں تاوان ادا کرنے کے لئے کسی کے پاس کوئی درہم یا دینار نہ ہوگا صرف اعمال ہوں گے، ظالم کی نیکیاں مظلوم کو مل جائیں گی اور نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کی بدیاں ظالم کے نامۂ اعمال میں لکھ دی جائیں گی۔"[1] ایک اور حدیث میں ہے کہ "قیامت میں نامۂ اعمال کی تین فردیں ہوں گی ایک وہ جس کی کوئی پروا خدا نہ کرے گا، دوسری وہ جس میں سے خدا ایک حرف کو بھی نہ چھوڑے گا اور تیسری وہ جس میں سے کچھ نہ معاف فرمائے گا۔ جس فرد کے گناہ معاف نہ ہوں گے وہ شرک ہے اور جس فرد کی کوئی پروا اس کو نہ ہوگی تو وہ ظلم ہے جو انسان نے خود اپنے اوپر کیا ہے اور جس کا معاملہ خود اس بندہ اور اس کے خدا کے درمیان ہے جیسے اس نے روزہ نہ رکھا ہو یا نماز نہ پڑھی ہو تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہے گا اس کے اس فرد کے گناہ کو معاف کر دے گا اور بخش دے گا لیکن وہ فرد جس کا ایک حرف بھی چھوٹ نہیں سکتا وہ ظلم ہے جو ایک بندہ نے دوسرے بندہ پر کیا ہے۔"[2] اس سے معلوم ہوا کہ معاملات انسانی میں جو تجاوز اور ظلم ہو گا اس کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔[3] چنانچہ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے حج کی فرضیت اس وقت تک بندہ پر عائد نہیں کی ہے جب تک وہ اپنے اہل و عیال کے نفقہ کا پورا سامان نہ کر لے اور زکوٰۃ بندہ کے اسی مال میں فرض کی ہے جو اس کے اور اس کے اہل و عیال کے مصارف سے زیادہ ہو یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنا حق اس وقت تک بندہ پر واجب نہیں کیا جب تک وہ بندوں کے حقوق سے عہدہ برآ نہ ہو لیا۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب القصاص یوم القیامۃ صفحہ ۹۶۶۔ [2] مسند احمد و حاکم عن عائشہؓ۔ [3] یہ اصولِ فقہ کا مسئلہ ہے، دیکھو ہدایہ کتاب الحج و تحریر للعلامہ عبد الحی مرحوم۔

اسلام کے ارکانِ پنجگانہ اور اخلاق بعض ان حدیثوں کی بنا پر جن میں اسلام کی عمارت کو ایمان کے بعد نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے چار ستونوں پر قائم بتایا گیا ہے بظاہر یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ اسلام کی اس عمارت میں اخلاقِ حسنہ کو کوئی جگہ ہی نہیں دی گئی ہے اور بے سمجھ واعظوں کی غلط بیانی سے اس غلط فہمی میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔ حالانکہ جیسا کہ عبادات کے شروع میں ہم یہ بتا چکے ہیں کہ دوسرے اہم مقاصد کے علاوہ ان عبادات سے ایک مقصد انسان کے اخلاقِ حسنہ کی تربیت اور تکمیل ہے قرآنِ پاک میں یہ نکتہ ہر جگہ نمایاں طریقہ سے واضح کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ نماز کا ایک فائدہ اس نے یہ بتایا ہے کہ وہ بُری باتوں سے باز رکھتی ہے۔ روزہ کی نسبت بتایا ہے کہ وہ تقویٰ کی تعلیم دیتا ہے۔ زکوٰۃ سر تاپا انسانی ہمدردی اور غمخواری کا سبق ہے اور حج بھی مختلف طریقوں سے ہماری اخلاقی اصلاح و ترقی کا ذریعہ اور اپنی اور دوسروں کی امداد کا وسیلہ ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے ان چاروں ارکان کے نام الگ الگ جو کچھ ہوں مگر ان کے بنیادی مقاصد میں اخلاقی تعلیم کا راز مضمر ہے۔ اگر ان عبادات سے یہ روحانی اور اخلاقی ثمرہ ظاہر نہ ہو تو سمجھ لینا چاہیئے کہ وُہ احکامِ الٰہی کی محض لفظی تعمیل اور عبادت کے جوہر و معنی سے یکسر خالی اور معرا ہیں۔ وہ درخت ہیں جن میں پھل نہیں، وہ پھول ہیں جن میں خوشبو نہیں، وہ قالب ہیں جن میں روح نہیں۔ قرآنِ پاک اور تعلیم نبویؐ کے جو اشارات اس باب میں ہیں حضراتِ صوفیہ نے اپنی تالیفات میں ان کی پوری تشریح کر دی ہے۔

امام غزالیؒ احیاء العلوم میں لکھتے ہیں:

" خدا فرماتا ہے کہ نماز کو میری یاد کے لئے کھڑی کرو اور فرمایا کہ بھولنے والوں میں نہ ہو اور فرمایا کہ نشہ کی حالت میں اس وقت تک نماز نہ پڑھو جب تک تم یہ نہ سمجھو کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ کتنے نمازی ہیں جنھوں نے گو شراب نہیں پی مگر جب وہ نماز پڑھتے ہیں تو نہیں جانتے

کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ جو شخص دو رکعت بھی نماز ایسی ادا کرے جن میں کسی دنیاوی چیز کا دھیان نہ آوے تو خدا اس کے گناہ کو معاف کردے گا۔ پھر فرمایا کہ "نماز عاجزی، فروتنی، زاری، دردمندی اور شرمندگی کا نام ہے" اور یہ کہ ہاتھ باندھ کر کہو کہ "اے میرے اللہ!" جس نے یہ بات نہیں پیدا کی اس کی نماز ناقص ہے اور اگلی کتابوں میں ہے کہ "اللہ تعالےٰ فرماتا ہے کہ میں ہر ایک کی نماز قبول نہیں کرتا۔ میں اس کی نماز قبول کرتا ہوں جو میری بڑائی کے سامنے سرنگوں ہے، میرے بندوں پر اپنی بڑائی نہیں جتاتا اور جو بھوکے محتاج کو میرے لئے کھانا کھلاتا ہے"۔[1] اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "نماز اسی لئے فرض کی گئی اور اسی لئے حج کے ارکان بنائے گئے تاکہ خدا کی یاد کی جائے" تو اگر دل میں یہ کیفیت پیدا نہ ہو جو مقصود ہے تو اس یادِ الٰہی کی قدر و قیمت کیا ہے؟ حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "جس کی نماز اس کو برائی اور بدی سے نہ روکے تو ایسی نماز اس کو خدا سے اور دور کردیتی ہے"۔[2] اس اخیر حدیث کو ابنِ جریرؒ، ابن ابی حاتم اور دوسرے اہلِ تفسیر محدثوں نے اپنی کتابوں میں لسند ذکر کیا ہے اور حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر (سورۃ عنکبوت) میں ان تمام روایتوں کو یکجا کردیا ہے۔ اس حدیث کی دوسری روایت میں الفاظ یہ ہیں کہ "جس کو اس کی نماز برائی اور بدی سے باز نہ رکھے اس کی نماز ہی نہیں"۔ اسی قسم کے الفاظ روزوں کے متعلق آپؐ نے فرمائے۔ ارشاد ہوا کہ "روزہ رکھ کر بھی جو شخص جھوٹ اور فریب کرنا نہ چھوڑے تو خدا کو اس کی ضرورت نہیں کہ انسان اپنا کھانا پینا چھوڑ دے"۔[3] ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ عبادات کا ایک اہم مقصد اخلاق کا تزکیہ بھی ہے۔

---

[1] احیاء العلوم جلد اول باب فضیلۃ الخشوع ۔ [2] تفسیر ابن کثیر سورۂ عنکبوت آیت ۴۵ ۔ [3] صحیح بخاری و جامع ترمذی و ابوداؤد و ابن ماجہ کتاب الصوم۔

اخلاقِ حسنہ اور ایمان اس سے بھی زیادہ مقدم یہ بات ہے کہ ایمان جو کہ مذہب کا اصل الاصول ہے لیکن اس بنا پر کہ وہ دل کے اندر کی بات ہے جس کو کوئی دوسرا جانتا نہیں اور زبان سے ظاہری اقرار ہر شخص کر سکتا ہے اس لئے اس ایمان کی پہچان اس کے نتائج و آثار یعنی اخلاق حسنہ کو قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۂ مومنون میں عبادات کے ساتھ ساتھ اخلاق کو بھی اہل ایمان کی ان ضروری صفات میں گنایا گیا ہے جن پر ان کی کامیابی کا مدار ہے فرمایا :

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ الَّذِيْنَ هُمْ	بے شبہ وہ ایمان والے کامیاب
فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ	ہوئے جو اپنی نماز میں خضوع و خشوع کرتے
هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ	ہیں اور جو نکمی بات پر دھیان نہیں کرتے
هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ	اور جو زکوٰۃ دیا کرتے ہیں اور جو اپنی
هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ○	شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔
وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُوْنَ ○	اور جو اپنی امانتوں اور اپنے وعدوں کا
وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ○	لحاظ رکھتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی
(المؤمنون : ۱-۵ و ۸-۹)	پابندی کرتے ہیں۔

ان آیتوں میں اہل ایمان کی کامیابی جن اوصاف کا نتیجہ بتائی گئی ہے ان میں وقار و تمکنت (لغویات سے اعراض) فیاضی (زکوٰۃ) پاکدامنی اور ایفائے عہد کو خاص رتبہ دیا گیا ہے۔

اخلاقِ حسنہ اور تقویٰ اسلام کی اصطلاح میں انسان کی اس قلبی کیفیت کا نام جو ہر قسم کی نیکیوں کی محرک ہے تقویٰ ہے۔ وحی محمدیؐ نے تصریح کر دی ہے کہ تقویٰ والے لوگ وہی ہیں جن کے یہ اوصاف ہیں :

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ	نیکی یہی نہیں ہے کہ تم نماز میں اپنا منہ پورب
الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ	یا پچھم کی طرف کرو بلکہ اصل نیکی اس
مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ	کی ہے جو خدا پر قیامت پر، فرشتوں
الْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى	پر، کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لایا
الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى	اور مال کی خواہش کے باوجود (یا خدا
وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَ	کی محبت کے سبب سے) اپنا مال رشتہ داروں
السَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ	کو، یتیموں کو، غریبوں کو، مسافر کو، مانگنے
الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ	والوں کو، اور غلاموں کے آزاد کرنے میں دیا
بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ	اور نماز ادا کرتا رہا اور زکوٰۃ
فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ	دیتا رہا اور جو وعدہ کر کے اپنے
الْبَاْسِ ۭ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ	وعدہ کو پورا کرتے ہیں اور جو مصیبت تکلیف
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ○	اور لڑائی میں ثابت قدم رہتے ہیں یہی وہ ہیں
(البقرۃ : ۱۷۷)	جو راستباز ہیں اور یہی تقویٰ والے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوا کہ راست بازی اور تقویٰ کا پہلا نتیجہ جس طرح ایمان ہے اسی طرح ان کا دوسرا لازمی نتیجہ اخلاق کے بہترین اوصاف فیاضی، ایفائے عہد اور صبر و ثبات وغیرہ بھی ہیں۔

اخلاقِ حسنہ اور خدا کا نیک بندہ ہونے کا شرف

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک تعلیم میں خدا کے نیک اور مقبول بندے وہی قرار دیئے گئے جن کے اخلاق بھی اچھے ہوں اور وہی تابیں خدا کے نزدیک اُن کے مقبول ہونے کی نشانی ہیں۔

چنانچہ سورۂ فرقان میں ارشاد ہوا:

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى
الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ
الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ○ وَالَّذِيْنَ
يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ○
وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ
عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا
كَانَ غَرَامًا ○ۖ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا
وَّمُقَامًا ○ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا
لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ
ذٰلِكَ قَوَامًا ○ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ
مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ
النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ
لَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ
اَثَامًا ○ۙ

....

....

وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا
مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ○ وَالَّذِيْنَ
اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا

اور رحم والے خُدا کے بندے وُہ ہیں جو
زمین پر دبے پاؤں چلتے ہیں اور جب
ناسمجھ لوگ اُن سے بات کریں تو وہ سلام
کہیں۔ اور جو اپنے پروردگار کی عبادت
کی خاطر قیام اور سجدہ میں رات
گزارتے ہیں۔ اور جو کہتے ہیں کہ اے
ہمارے پروردگار ہم سے جہنم کا عذاب
دور کر کہ اس کا عذاب بڑا تاوان ہے۔
اور جہنم بُرا ٹھکانا اور مقام ہے۔ اور جو
خرچ جب کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی
کریں اور نہ تنگی کریں بلکہ ان دونوں کے بیچ
سے وُہ سیدھے گذریں اور خدا کے ساتھ
کسی اور خدا کو نہیں پکارتے اور جو کسی
جان کا ناحق خون نہیں کرتے جس کو
خُدا نے منع کیا ہے اور نہ بدکاری کرتے
ہیں کہ جو ایسا کرے گا وہ گناہ سے پیوستہ ہوگا۔
اور جو جھوٹے کام میں شامل نہیں ہوتے اور جب کبھی
لغوبات پر گذر رہے ہوں تو سنجیدگی اور وقار سے
گزر جاتے ہیں اور جب خدا کی نشانیاں

عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ۝ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ۝

(الفرقان: ۶۳-۶۸-۷۲-۷۴)

ان کو سنائی جائیں تو وہ اندھے اور بہرے نہ ہو پڑیں اور یہ دعا مانگتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو ہمارے بیوی بچوں سے آنکھ کی ٹھنڈک بخش اور ہم کو پرہیزگاروں کا پیشوا بنا۔

دیکھو کہ ایک ایمان کی حقیقت میں عفو و درگذر و میانہ روی اور قتل و خونریزی اور بدکاری نہ کرنا اور مکر و زور میں شریک نہ ہونا وغیرہ اخلاق کے کتنے مظاہر پوشیدہ ہیں۔

اہل ایمان کے اخلاقی اوصاف

وہ لوگ جو خدا کے پیارے اور مقبول بندے ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی ان کے اخلاقی اوصاف یہ بیان ہوئے ہیں :

وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۠ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۠ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ۝ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ مَا

اور وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں اور جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور جو غصہ کی حالت میں معاف کرتے ہیں اور اپنے پروردگار کی پکار کا جواب دیتے ہیں۔ نماز ادا کرتے ہیں اور ان کے کام باہم مشورہ سے ہوتے ہیں اور ہم نے اُن کو جو دیا ہے اس میں سے کچھ خُدا کی راہ میں دیتے ہیں۔ اور جب ان پر چڑھائی ہو تو وہ بدلہ لیتے ہیں۔ اور بُرائی کا بدلہ ویسی ہی بُرائی ہے

عَلَيۡهِمۡ مِّنۡ سَبِيۡلٍ ؕ اِنَّمَا السَّبِيۡلُ عَلَى الَّذِيۡنَ يَظۡلِمُوۡنَ النَّاسَ وَ يَبۡغُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ بِغَيۡرِ الۡحَقِّ ؕ اُولٰٓـئِكَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ○ وَلَمَنۡ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰ لِكَ لَمِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ ○

(الشوریٰ : ۳۶-۴۳)

تو جو کوئی معاف کر دے اور نیکی کرے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمّہ ہے۔ وہ ظلم کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا اور اگر کوئی مظلوم ہو کر بدلہ لے لے تو اس پر کوئی ملامت نہیں۔ ملامت تو اُن پر ہے جو لوگوں پر از خود ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق فساد مچاتے ہیں ان کے لئے بڑا دردناک عذاب ہے۔ اور بے شبہ جو (مظلوم ہونے پر بھی) ظالم کو معاف کر دے اور سہہ لے تو یہ ہمّت کے کام ہیں۔

اُعِدَّتۡ لِلۡمُتَّقِيۡنَ ○ الَّذِيۡنَ يُنۡفِقُوۡنَ فِى السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالۡكٰظِمِيۡنَ الۡغَيۡظَ وَالۡعَافِيۡنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَ اللّٰهُ يُحِبُّ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ○

(آلِ عمران : ۱۳۳-۱۳۴)

جنّت ان پرہیزگاروں کے لئے تیّار کی گئی ہے جو خوشی اور تکلیف دونوں حالتوں میں خُدا کی راہ میں کچھ خرچ کرتے ہیں اور جو غصّہ کو دباتے ہیں اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں اور خدا اچھّے کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

اُولٰٓـئِكَ يُؤۡتَوۡنَ اَجۡرَهُمۡ مَّرَّتَيۡنِ بِمَا صَبَرُوۡا وَيَدۡرَءُوۡنَ بِالۡحَسَنَةِ

یہ وہ ہیں جن کو دُہرا ثواب ملے گا اس لئے کہ انہوں نے صبر کیا اور وہ بُرائی کو

السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ○ وَاِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ اَعْرَضُوْا عَنْهُ وَقَالُوْا لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ○ (القصص: ۵۴-۵۵)

بھلائی سے دُور کرتے ہیں اور جو ہم نے دیا ہے اس سے کچھ خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور جب کوئی بیہودہ بات سنتے ہیں تو اس سے کنارہ کر لیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے لئے ہمارا عمل اور تمھارے لئے تمھارا عمل ہے۔ تم سلامت رہو ہم ناسمجھوں کو نہیں چاہتے۔

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا○ (الدّھر: ۸)

اور کھانے کی خود ضرورت ہوتے ہوئے مسکین، یتیم اور قیدی کو کھلا دیتے ہیں۔

ان آیتوں کی اور اسی قسم کی دوسری آیتوں کی جو تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے فرمائی وہ احادیث میں محفوظ ہے۔ ہم ان حدیثوں کو مختلف عنوانوں کے نیچے یہاں لکھتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلیمی نصاب میں اخلاق کے سبق کی کیا اہمیت اور کیا رتبہ ہے۔

اخلاقِ حسنہ کا درجہ اسلام میں اسلام میں اخلاق کو جو اہمیّت حاصل ہے وُہ اس سے ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں جو دُعا مانگتے تھے اس کا ایک فقرہ یہ بھی ہوتا تھا:

واھدنی لاحسن الاخلاق لا یھدی لاحسنھا الا انت و اصرف عنی سیئاتھا لایصرف عنی سیئاتھا الا انت۔

اور اے میرے خدا تو مجھ کو بہتر سے بہتر اخلاق کی رہنمائی کر تیرے سوا کوئی بہتر سے بہتر اخلاق کی راہ نہیں دکھا سکتا اور بُرے اخلاق کو مجھ سے پھیر دے اور ان کو

نہیں پھیر سکتا لیکن تو۔ (مسلم: باب الدعاء فی الصلوٰۃ)

ان الفاظ کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوگا کہ ایک پیغمبر اپنے تقرب اور استجابت کے بہترین موقع پر بارگاہِ الٰہی سے جو چیز مانگتا ہے وہ حسنِ اخلاق ہے۔

ایمان سے بڑھ کر اسلام میں کوئی چیز نہیں، لیکن اس کی تکمیل بھی اخلاق ہی سے ممکن ہے فرمایا:

اَکمل المؤمنین ایماناً احسنهم خلقاً۔	مسلمانوں میں کامل ایمان اس کا ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہے۔

یہ حدیث ترمذی، ابنِ حنبل، ابوداؤد، حاکم اور ابنِ حبان میں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں ایمان کے کمال کا معیار جس چیز کو ٹھہرایا گیا ہے وہ حُسنِ اخلاق ہے کہ یہی وہ پھل ہے جس سے ایمان کے درخت کی پہچان ہوتی ہے۔

اسلام میں نماز اور روزہ کی جو اہمیت ہے وہ ظاہر ہے لیکن اخلاقِ حسنہ کو بھی ان کی قائم مقامی کا شرف کبھی کبھی حاصل ہو جاتا ہے۔ ارشاد ہُوا:

انّ الرّجل لیدرک عن خلقه درجة قائم اللّیل و صائم النّهار۔	انسان حُسنِ اخلاق سے وہ درجہ پا سکتا ہے جو دن بھر روزہ رکھنے اور رات بھر عبادت کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔

یہ حدیث چند ہم معنی لفظوں کے الٹ پھیر سے ابوداؤد، ابنِ حنبل، حاکم، ابنِ حبان اور طبرانی میں ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نفل نمازوں میں رات بھر کی شب بیداری اور نفل روزوں میں دن بھر کی بھوک پیاس سے جو درجہ حاصل ہوسکتا ہے وہی درجہ حسنِ خُلق سے بھی حاصل ہوسکتا ہے حُسنِ اخلاق کی یہ حیثیت اس کو یک گونہ عبادات کی کثرت سے بڑھا دیتی ہے۔

اسلام میں اخلاق ہی وہ معیار ہے جس سے باہم انسانوں میں درجہ اور رتبہ کا فرق نمایاں ہوتا ہے فرمایا:

خیارکم احسنکم اخلاقاً۔ (بخاری: کتاب الادب)

تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔

ایک اور حدیث میں ہے:

ما من شیٔ یوضع فی المیزان اثقل من حسن الخلق فانّ صاحب حسن الخلق لیبلغ بہ درجة صاحب الصوم والصلوٰة۔

(قیامت کی) ترازو میں حُسنِ خلق سے زیادہ بھاری کوئی چیز نہ ہوگی کہ حُسنِ اخلاق والا اپنے حُسنِ خُلق سے ہمیشہ کے روزہ دار اور نمازی کا درجہ حاصل کر سکتا ہے۔

یہ حدیث ترمذی میں انہی الفاظ کے ساتھ ہے لیکن حدیث کی دوسری کتابوں (حاکم، ابنِ حبان، ابنِ حنبل، ابوداؤد) میں مختصر اً صرف پہلا ٹکڑا ہے یعنی یہ کہ "حُسنِ اخلاق سے زیادہ بھاری کوئی چیز ترازو میں نہیں"۔ اس حدیثِ نبویؐ نے پوری طرح واضح کر دیا کہ اسلام کی میزان میں حُسنِ اخلاق سے زیادہ گراں کوئی چیز نہیں۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ بندہ کو خدا کی طرف سے جو کچھ ملا ہے اس میں حُسنِ اخلاق کا عطیہ سب سے بڑھ کر ہے۔

خیر ما اعطی الناس خلق حسن۔

لوگوں کو قدرتِ الٰہی کی طرف سے جو چیزیں عطا ہوئیں ان میں سب سے بہتر اچھے اخلاق ہیں۔

مختلف الفاظ کے ساتھ یہ حدیث حاکم، نسائی، ابنِ ماجہ، ابنِ حنبل، طبرانی اور ابنِ شیبہ میں ہے۔ اس بشارت نے اخلاقِ حسنہ کی نعمت کو تمام انسانی نعمتوں سے بالاتر بنا دیا۔ ایک اور حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

احب عباد اللہ الی اللہ احسنہم اخلاقاً۔ (طبرانی)

اللہ کے بندوں میں اللہ کا سب سے پیارا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حُسنِ خُلق خُدا کی محبّت کا ذریعہ ہے اور درحقیقت رسولؐ کی محبت کا بھی یہی ذریعہ ہے۔ فرمایا:

ان احبّکم الیّ واقربکم منّی	تم میں میرا سب سے پیارا اور قیامت کے
فی الاٰخرۃ مجالس محاسنکم	دن نشست میں مجھ سے سب سے نزدیک وہ
اخلاقًا وانّ ابغضکم الیّ و	ہیں جو تم میں خوش خلق ہیں اور مجھے ناپسند اور
ابعدکم منّی فی الاٰخرۃ مساویکم	قیامت میں مجھ سے دور وہ ہوں گے جو
اخلاقًا [1]	تم میں بد اخلاق ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں دو صحابی بیویاں تھیں۔ ایک رات بھر نماز پڑھتیں، دن کو روزہ رکھتیں اور صدقہ دیتیں مگر اپنی زبان درازی سے پڑوسیوں کا دم ناک میں کئے رکھتی تھیں۔ دوسری بیوی صرف فرض نماز پڑھتیں اور غریبوں کو چند کپڑے بانٹ دیتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان دونوں کی نسبت پوچھا گیا تو آپؐ نے پہلی کی نسبت فرمایا کہ "اس میں کوئی نیکی نہیں وہ اپنی بدخلقی کی سزا بھگتے گی"۔ اور دوسری کی نسبت فرمایا کہ "وہ جنتی ہو گی" [2]۔ ان دونوں بیویوں کی سیرتوں کے جو مختلف نتیجے پیغمبرِ اسلام علیہ السّلام کی زبانِ فیض ترجمان سے ظاہر ہوئے ہیں وُہ اسلام میں اخلاق کی حیثیت کو پوری طرح نمایاں کر دیتے ہیں۔

حضرت برار بن عازبؓ کہتے ہیں کہ ایک بدوی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ مجھے وہ کام سکھایئے جو مجھے جنّت کو لے جائے۔ فرمایا "انسان کو غلامی سے آزاد کر، انسان کی گردن کو قرض کے بندھن سے چھڑا اور ظالم رشتہ دار کا ہاتھ پکڑ۔ اگر تو یہ نہ کر سکے تو بھوکے کو کھلا اور پیاسے کو پلا نیکی بتا اور بُرائی سے روک۔ اگر یہ بھی نہ کر سکے تو بھلائی کے سوا اپنی زبان روک"۔ غور کیجئے کہ یہ حدیث

---

[1] یہ تمام حدیثیں کنز العمال جلد ثانی کتاب الاخلاق باب اوّل سے ماخوذ ہیں۔ [2] ادب المفرد امام بخاری باب من لا یوذی جارہ۔

اخلاقی عظمت کو کہاں تک بڑھا رہی ہے۔[1]

ایمان کے اوصاف و لوازم ان کے علاوہ کثرت سے ایسی حدیثیں ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ فلاں فلاں اوصاف و اخلاق ایمان کے لوازم اور خصوصیات ہیں جسقدر ان لوازم اور خصوصیات میں زیادتی اور کمی ہوگی گویا اسی قدر اس ایمان کے منشا میں زیادتی و کمی ہوگی یعنی ہمارے یہ ظاہری اخلاق ہماری اندرونی ایمانی کیفیت کا معیار اور پیمانہ ہیں۔ ہمارے دل کے اندر کا ایمان ہمارے گھر کا چراغِ زیرِ دامن ہے جسکی چمک دمک اور روشنی کا اندازہ اسکی باہر نکلنے والی شعاعوں سے کیا جائے گا۔ آپؐ نے فرمایا:

۱۔ ایمان کی ستّر سے کچھ اوپر شاخیں ہیں جن میں سے ایک حیا ہے۔

۲۔ ایمان کی بہت سی شاخیں ہیں جن میں سب سے بڑھ کر توحید کا اقرار ہے اور سب سے کم درجہ یہ ہے کہ تم راستہ سے کسی تکلیف کی چیز کو ہٹا دو تاکہ تمہارے دوسرے بھائی کو تکلیف نہ ہو۔

۳۔ جس میں تین باتیں ہوں اُس نے ایمان کا مزہ پایا جس کو خدا اور اس کا رسولؐ سب سے پیارا ہو، جو دوسرے کو صرف خدا کے لئے پیار کرے اور جس کو ایمان کے بعد پھر کفر میں مبتلا ہو جانے سے اتنا ہی دُکھ ہو جتنا آگ میں پڑنے سے۔

۴۔ جس میں یہ تین باتیں ہوں اس نے ایمان کا مزہ پایا۔ حق بات کے سامنے جھگڑنے سے باز رہنا، مزاحمت کے باوجود جھوٹ نہ بولنا اور یقین کرنا کہ جو کچھ پیش آیا وُہ ہٹ نہیں سکتا تھا۔

۵۔ تین باتیں ایمان کا جُز ہیں۔ مفلسی میں بھی خُدا کی راہ میں دینا، دُنیا میں امن اور سلامتی پھیلانا اور خود اپنے نفس کے مقابلہ میں بھی انصاف کرنا۔

۶۔ تم میں سے کوئی اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتا ہے جب تک اپنے بھائی کے لئے بھی وہی پسند نہ کرے جو اپنے لئے کرتا ہے۔

---

[1] مشکل الآثار امام طحاوی جلد نمبر ۲ صفحہ ۲، حیدرآباد دکن۔

۷. مسلمان وُہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مُسلمان سلامت رہیں اور مومن وُہ ہے جس پر لوگ اتنا بھروسہ کریں کہ اپنی جان و مال اس کی امانت میں دے دیں۔

۸. ایک شخص آکر پوچھتا ہے کہ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کون سا اسلام سب سے بہتر ہے"؟ فرمایا "(بھوکوں کو) کھانا کھلانا اور جانے انجانے ہر ایک کو سلامتی کی دعا دینا" (سلام کرنا)۔

۹. ایک شخص پوچھتا ہے کہ "اے خُدا کے رسولؐ! اسلام کیا ہے"؟ فرمایا "اچھی بات بولنا اور کھانا کھلانا"۔

پھر پوچھا ایمان کیا ہے؟ فرمایا "صبر کرنا اور اخلاقی جوانمردی دکھانا" (سماحت)۔

۱۰. مومن وُہ ہے جو دوسروں سے اُلفت کرتا ہے اور جو نہ دوسروں سے الفت کرتا اور نہ کوئی اس سے الفت کرتا ہے اس میں کوئی بھلائی نہیں۔

۱۱. مومن نہ تو کسی پر طعن کرتا ہے نہ کسی کو بد دعا دیتا ہے اور نہ گالی دیتا ہے اور نہ بد زبان ہوتا ہے۔

۱۲. ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے نہ اس پر وہ ظلم کرے اور نہ اس کو گالی دے۔ جو اپنے کسی بھائی کی مدد میں ہوگا خُدا اس کی مدد میں ہوگا۔ جو کسی مُسلمان کی کسی مصیبت کو دور کرے گا تو خدا اس کی مصیبت دور فرمائے گا۔

۱۳. مومن وُہ ہے جس کو لوگ امین سمجھیں۔ مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے لوگ سلامت رہیں۔ مہاجر وُہ ہے جس نے بدی کو چھوڑ دیا ہے۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کوئی اس وقت تک جنّت میں نہیں جا سکتا جب تک اس کا پڑوسی اس کے غصے سے محفوظ نہ رہا ہو۔

۱۴. جو صاحبِ ایمان ہے اس کو چاہیئے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے۔

۱۵. بے ایمان (منافق) کی پہچان تین ہیں۔ بولے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو خلاف کرے، اس کو امانت سپرد کی جائے تو خیانت کرے۔

ل[1] یہ تمام حدیثیں معتبر و مستند کتب حدیث کی کتاب الایمان میں موجود ہیں ہم نے ان کو مجمع الفوائد اور کنز العمال جلد ۱ کتاب الایمان سے لیا ہے۔ کنز العمال میں ہر قسم کی حدیثیں ہیں، مگر ہم نے ان کے انتخاب میں مشہور و معتبر حدیثوں کو ترجیح دی ہے۔

ان مذکورہ بالا حدیثوں میں سے ایک ایک حدیث پر غور کرنا چاہیئے کہ اسلام اور ایمان کا خلاقی تخیل کتنا اونچا اور کتنا بلند ہے۔

اخلاقِ حسنہ صفاتِ الٰہی کا پرتو ہیں لیکن اسلام نے اخلاقِ حسنہ کا اس سے بھی ایک اور بلند تخیل پیش کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اخلاقِ حسنہ درحقیقت صفاتِ الٰہی کا سایہ اور ظل ہیں اور اسی کی صفاتِ کاملہ کے ادنیٰ ترین مظاہر ہیں[1]

حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حسن الخلق خلق اللہ الاعظم (طبرانی) یعنی خوش خلقی اللہ تعالیٰ کا خلق عظیم ہے۔ ہم انہی اخلاق کو اچھا کہتے ہیں جو صفات ربانی کا عکس ہیں اور انہی کو برا کہتے ہیں جو خدا کی صفات کے منافی ہیں۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ خدا کی بعض خاص صفتیں ایسی بھی ہیں جو اسی کے ساتھ مخصوص ہیں اور جن کا تصور بھی دوسرے میں نہیں کیا جاسکتا جیسے اس کا واحد ہونا، خالق ہونا۔ نیز بعض ایسی پرجلال صفتیں بھی ہیں جو صرف خدا ہی کو زیبا ہیں جیسے اس کی کبریائی اور بڑائی وغیرہ۔ اس قسم کی صفات کا بندہ میں کمال یہ ہے کہ اُن کی متقابل کی صفتیں اس میں پیدا ہوں خدا کی کبریائی کے مقابلہ میں بندہ میں خاکساری اور تواضع ہو اور خدا کی بلندی کے مقابلہ میں بندہ میں پستی اور فروتنی ہو۔ الغرض اسلام نے انسان کی روحانی تکمیل کا ذریعہ اخلاق کو اسی لئے قرار دیا ہے کہ وہ صفاتِ الٰہی کے انوار کے کسب و فیض کا سبب ہے۔ ہم جس حد تک اس کسب و فیض میں ترقی کریں گے ہماری روحانی ترقی کا سلسلہ جاری رہے گا اور یہی ہماری زندگی کی روحانی سیر کی آخری منزل ہے۔ اخلاق کا اس سے بلند تر تخیل ممکن نہیں۔

---

[1] ہم نے اسمائے الٰہی کی بحث میں اس اجمال کی پوری تفصیل بیان کر دی ہے دیکھو سیرۃ جلد چہارم طبع اول صفحات ۳۸۴ — ۴۰۵۔

اخلاقی معلّموں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا امتیاز

دنیا میں اخلاق کے بڑے بڑے معلّم پیدا ہوئے جن کے مکتب میں آکر بڑی بڑی قوموں نے ادب کا زانو تہہ کیا اور آداب و اخلاق کے وہ سبق ان سے حاصل کئے جو سینکڑوں اور ہزاروں برس گزر جانے کے بعد بھی اب تک ان کو یاد ہیں اور سچ یہ ہے کہ آج جہاں کہیں بھی حسنِ اخلاق کا کوئی نمونہ ہے وہ انہی کے صحیفۂ تعلیم کا ایک ورق ہے مگر ایک تنقیدی نظریہ بتادے گی کہ ان اخلاقی استادوں میں باہمی نسبت کیا ہے۔ ان کے تعلیمی نصاب کی ترتیب کن کن اصولوں پر مبنی ہے اور ان میں درس گاہِ عالم کے سب سے آخری معلّم علیہ الصّلوٰۃ والتّسلیم کو کیا امتیاز حاصل ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے پہلے نوعِ انسانی کے اخلاقی معلّمین کی دو جماعتیں ہیں۔ ایک وہ جس نے اپنی تعلیم کی بنیاد کسی اُخروی مذہب پر رکھی جیسے عام انبیاء علیہم السّلام اور بعض مذہبوں کے بانی۔ دوسری وہ ہے جس نے اپنے فلسفہ و حکمت اور عقل و دانائی کی بنیاد پر اپنی عمارت کھڑی کی۔ ہم اُن میں سے اوّل کو انبیاء اور مصلحینِ دین اور دوسری کو حکماء کے نام سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ ان دونوں جماعتوں نے اپنے درس و تعلیم کے اصول اور طریقے الگ الگ اختیار کئے۔ پیغمبروں اور مذہب کے بانیوں نے اپنی تعلیمات کا ماخذ "حکمِ خداوندی" کو قرار دیا۔ اس حکم و فرمانِ الٰہی کے سوا ان کی تعلیم کی کوئی اور بنیاد نہیں۔ نہ ان کی تعلیمات میں علت و معلول کا سلسلہ ہے نہ اخلاق کے دقیق نکتوں کی گرہ کشائی ہے اور نہ ان احکام

و تعلیمات کی اخلاقی مصلحتوں اور عقلی حکمتوں کی تصریح ہے۔ دوسرے فریق کی تعلیمات میں علّت و معلول کی تحقیق، نفسیاتی خواص کی بحث، اخلاق کی غرض و غائت کی تعیین، قوائے عملی کی تحدید یہ سب کچھ ہے مگر بحث و نظر سے آگے عمل کا درجہ صفرِ محض ہے۔ اگر ہے تو بے کیف اور بے لذت مگر ؎

یارِ ما ایں دارد و آں نیز ہم

دنیا کے آخری معلّم کی تعلیم میں حکمِ خداوندی اور عقلی دقیقہ رسی، فرمانِ الٰہی اور اخلاقی نکتہ دری، امرِ ربّانی اور حکمِ فطرت، کتاب اور حکمت دونوں کی آمیزش ہے۔

انبیاءؑ اور حکماء میں جو اصلی فرق و امتیاز ہے وہ یہ ہے کہ انبیاء کی اخلاقی تعلیمات کے ساتھ ساتھ ان کی معصوم زندگی، اُن کے مقدس کارنامے اور اُن کے پاک اثرات ہوتے ہیں، جن کا فیض ان کے ہر بُنِ مو سے خیر و برکت کی سلسبیل بن کر نکلتا ہے اور پیاسوں کو سیراب کرتا ہے لیکن بلند سے بلند حکیم اور اخلاق کا دانائے رموز فلسفی جس کی اخلاقی سخن طرازی اور نکتہ پروری سے دنیا محوِ حیرت ہے اور جس نے انسان کے ایک ایک اندرونی جذبہ، باطنی قوّت اور اخلاقی فطرت کا سُراغ لگایا ہے عمل کے لحاظ سے دیکھو تو اس کی زندگی ایک معمولی بازاری سے ایک اِنچ بُلند نہ ہوگی وہ گو دوسروں کو روشنی دکھا سکتا ہے مگر خُود تاریکی سے باہر نہیں آتا۔ وہ دوسروں کی رہنمائی کا مدعی بنتا ہے مگر خود عمل کی ہر راہ میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ وہ رحم و محبت کے طلسمات کے ایک ایک راز سے واقف ہے مگر غریبوں پر رحم کھانا اور دشمنوں سے محبت کرنا وہ نہیں جانتا وُہ سچائی اور راست بازی کی حقیقت پر بہترین خطبہ دے سکتا ہے مگر وہ خود سچّا اور راستباز نہیں ہوتا۔

اس واقعہ کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ چونکہ وہ محض زبان یا دماغ ہوتا ہے دل اور ہاتھ نہیں اس لئے اُس کے مُنہ کی آواز کسی دل کی لوح پر کوئی نقش نہیں بناتی بلکہ ہوا کے تموّج میں مل کر بے نشان ہو جاتی ہے اور انبیاءؑ علیہم السّلام چونکہ جو کچھ کہتے ہیں وہ کرتے بھی ہیں۔ جو اُن کی تعلیم ہے وہی اُن کا عمل ہے۔ جو ان کے

مُنہ پر ہے وہی دل میں ہے اس لئے ان کی تعلیم اور صحبت کا فیضان خوشبو بن کر اٹھتا اور ہمنشینوں کو مُعطّر بنا دیتا ہے یہی وہ فرق ہے جو انبیاؑ اور حکما یعنی موسےٰ، عیسےٰ محمّدرسول اللہ علیہم السّلام اور سقراط، افلاطون اور ارسطو میں نمایاں ہے۔ سقراط اور افلاطون کے مکالمات اور ارسطو کے اخلاقیات کو پڑھ کر ایک شخص بھی صاحبِ اخلاق نہ بن سکا مگر یہاں قوموں کی قومیں ہیں جو موسیٰؑ عیسےٰ اور محمّدرسول اللہ علیہم السّلام کی تعلیم و تلقین سے اخلاق کے بڑے بڑے مدارج اور مراتب پر پہنچیں اور آج زمین کے کرہ پر جہاں کہیں بھی حُسنِ اخلاق کی کوئی کرن ہے وہ نبوّت ہی کے کسی مطلعِ انوار سے چھن کر نکل رہی ہے۔

مگر اس وصف میں سارے انبیاء علیہم السّلام یکساں نہیں ہیں بلکہ ان کے مختلف مدارج ہیں۔ ان کی عملی حیثیت کے کامل ہونے کے ساتھ ضرورت یہ ہے کہ ان کے اس درجۂ کمال کی ایک ایک ادا عمل کی صورت میں نمایاں ہو تاکہ ہر ذوق اور ہر رنگ کے رفیق اور اہلِ صحبت اپنی اپنی استعداد کے مطابق ان کی عملی مثالوں سے متاثر ہوں اور پھر وہ روایتوں کے اوراق میں محفوظ رہیں تاکہ بعد کے آنے والے بھی اُس نشانِ قدم پر چل کر مقصود کی منزل تک پہنچ سکیں الغرض ایک کامل و مکمّل اور آخری معلّم کے لیئے حسبِ ذیل معیاروں پر پورا اترنا نہایت ضروری ہے:

(۱) اس کی زندگی کا کوئی پہلو پردہ میں نہ ہو۔

(۲) اس کی ہر زبانی تعلیم کے مطابق اس کی عملی مثال بھی سامنے موجود ہو۔

(۳) اس کی اخلاقی زندگی میں یہ جامعیت ہو کہ وہ انسانوں کے ہر کارآمد گروہ کے لیے اپنے اندر اتباع اور پیروی کا سامان رکھتی ہو۔

بے پردہ زندگی تنقید کے ان معیاروں پر اگر ہم سارے انبیاء اور مذہبوں کے بانیوں کی زندگیوں کو جانچیں تو معلوم ہو گا کہ ان میں سے کسی کی زندگی بھی پیغمبرِ اسلام کی حیاتِ پاک کے برابر جامع کمالات نہیں۔ دُنیا کا کوئی پیغمبر یا بانئ مذہب ایسا نہیں ہے جس کی اخلاقی زندگی کا ہر پہلو ہمارے سامنے

اس طرح بے نقاب ہو کر گویا وہ خود ہمارے سامنے موجود ہے۔ تورات کے پیغمبروں میں سے کون سا پیغمبر ہے جس کے اخلاقی کمالات ہمارے علم میں ہیں اُن غیر اخلاقی قصوں کا ذکر فضول ہے جن کو تورات کے راویوں نے ان معصوم بزرگوں کے حالات میں شامل کر دیا ہے اور قرآن نے ہر جگہ اُن کو ان بیہودہ الزامات سے پاک اور بری قرار دیا ہے۔ حضرت نوح سے لے کر حضرت موسےٰ علیہا السلام تک تورات کے ایک ایک پیغمبر پر نگاہ ڈال جاؤ۔ ان کی معصوم زندگی کے حالات کی کتنی سطریں تمہارے سامنے ہیں اور کیا ان کی اخلاقی شکل وصورت کی پُوری شبیہ دنیا کے سامنے کبھی موجود رہی؟

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تینتیس برس کی زندگی میں سے صرف تین برس کا حال ہم کو معلوم ہے اور ان تین برسوں کے حالات میں سے بھی معجزات و خوارق کے سوا کوئی اور حال بہت کم معلوم ہے۔ ایسی صورت میں کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُن کی اخلاقی زندگی کا کوئی پہلو پردہ میں نہیں؟

ان انبیا علیہم السلام کے علاوہ ہندوستان، ایران اور چین کے بانیانِ مذاہب کی اخلاقی زندگیوں کا جائزہ لینا چاہو تو معلوم ہوگا کہ اس کے لیے دُنیا میں کوئی سامان ہی موجود نہیں کیونکہ ان کی اخلاقی زندگی کے ہر پہلو پر ناواقفیت کا پردہ پڑا ہوا ہے صرف اسلام ہی کے ایک معلّم کی زندگی ایسی ہے جس کا حرف حرف دُنیا میں محفوظ اور سب کو معلوم ہے اور بقول باسورتھ اسمتھ کے کہ "یہاں (سیرتِ محمدیؐ) پورے دن کی روشنی ہے، جس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہر پہلو روزِ روشن کی طرح نمایاں[1] ہے"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خود یہ حکم تھا کہ میرے ہر قول اور عمل کو ایک سے دوسرے تک پہنچاؤ محرمانِ راز کو اجازت تھی کہ جو مجھے خلوت میں کرتے دیکھو اس کو جلوت میں برملا بیان کرو جو حجرہ میں کہتے سنو اس کو چھتوں پر چڑھ کر پکارو: الا فلیبلغ الشاھد الغائب[2]۔

قول کے ساتھ عمل اب دوسری حیثیت سے غور کیجیے۔ ان مقدس ہستیوں کی تعلیم کی اچھائی اخلاقی

---

[1] باسورتھ اسمتھ کی کتاب سیرت محمد ص ۰۸ [2] خطبہ حجۃ الوداع۔

احکام کی خوبی اور مواعظ و نصائح کی عمدگی میں کوئی شبہ نہیں لیکن کیا دنیا کو خود ان بزرگوں کے عملی اخلاق کا بھی تجربہ اور علم ہے؟ کوہِ زیتون کے پُرتاثیر واعظ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کی معصومانہ باتیں، سچائی اور راست بازی کی نصیحتیں اور لفظی صنائع و بدائع اور دلکش تمثیلوں سے بھری ہوئی تقریریں دنیا نے سنیں اور اُن کی فصاحت اور شیرینی کا مزہ اب تک اس کے کام و دہن میں ہے مگر کیا اس کی آنکھوں نے اس معصوم واعظ کی عملی مثالیں بھی دیکھیں؟ کیا اس سلبی پہلو کے سوا اس کے اخلاق کا کوئی ایجابی پہلو بھی ہمارے سامنے ہے؟ وہ جس نے کہا کہ سب کچھ تمہارے پاس ہے، جب تک اس کو خدا کی راہ میں نہ لٹا دو آسمان کی بادشاہت میں داخل نہ ہوگے۔" کیا اس نے اپنا بھی سب کچھ خدا کی راہ میں لٹایا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "شریروں کا مقابلہ نہ کرو۔" کیا اُس نے خود بھی شریروں کا مقابلہ نہیں کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "دشمنوں کو بھی پیار کرو۔" کیا اس نے بھی کبھی اپنے دشمن کو پیار کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "تو اپنے پڑوسی کو اپنے سارے جان و مال سے پیار کر۔" کیا خود بھی اس کا ایسا ہی عمل تھا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "اگر تمہارے داہنے گال پر کوئی تھپیڑ مارے تو بایاں گال بھی اس کے سامنے کر دو۔" کیا اس نے خود بھی ایسا کیا؟ وہ جس نے یہ کہا کہ "تم سے اگر کوئی تمہارا کرتہ مانگے تو اپنی قبا بھی اس کے حوالہ کر دو۔" کیا ایسی فیاضی اس سے خود بھی ظہور میں آئی؟ ہم یہ نہیں کہتے کہ حضرت مسیح علیہ السلام میں یہ صفات موجود نہ تھیں بلکہ کہنا یہ ہے کہ انجیل نے اُن کی اس حیثیت کو محفوظ نہیں رکھا ہے۔

مگر اسلام کے اخلاقی معلّم کی شان اس حیثیت سے بھی بلند ہے کہ اُس نے جو کچھ کہا سب سے پہلے خود اس کو کر کے دکھایا اس کا جو قول تھا وہی اس کا عمل تھا۔ اس نے یہودیوں کو طعنہ دیا کہ:

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ[2]۔

(کیا اوروں کو نیکی کی بات بتاتے ہو اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو) اور مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ:

---

[1] انجیل۔ [2] البقرۃ: ۴۴۔

لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝[1]

(تم کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں۔ بڑی بیزاری ہے اللہ کے یہاں کہ کہو وہ جو نہ کرو۔)

ایک شخص نے اُم المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیا تھے؟ فرمایا "کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا کَانَ خُلُقُہُ الْقُرْآنَ[2] جو قرآن میں الفاظ کی صورت میں ہے وہی حاملِ قرآن کی سیرت میں بصورتِ عمل تھا۔ اگر غریبوں اور مسکینوں کی امداد و اعانت کا حکم دیا تو پہلے خود اس فرض کو ادا کیا۔ خود بھوکے رہے اور دوسروں کو کھلایا۔ اگر آپ نے اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کرنے کی نصیحت کی تو پہلے خود اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کیا۔ کھانے میں زہر دینے والوں سے درگزر کیا۔ اپنی ذات کے لئے کسی سے انتقام نہیں لیا۔ جنہوں نے آپؐ پر تیر برسائے اور تلواریں چلائیں مسلح ہو کر بھی کبھی اُن پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ کپڑوں کی شدید ضرورت کے وقت میں بھی جس نے آپ سے کپڑا مانگا خود اپنی چادر اتار کر اس کے حوالہ کر دی۔ سیرت کی دوسری جلد میں یہ واقعات پوری شرح و تفصیل کے ساتھ ہم بیان کر چکے ہیں۔ الغرض یہی وجہ ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگ انسانوں کو اپنے ہادیوں اور رہنماؤں کی صرف تعلیمات اور اقوال سناتے ہیں اور ان کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں اور مسلمان اپنے پیغمبرؐ کے نہ صرف اقوال و نصائح کو بلکہ اس کے عملی نمونوں اور کارناموں کو بھی پیش کرتے اور ان کی پیروی کی دعوت دیتے ہیں۔ دنیا کے کسی پیغمبر اور بانیٔ دین کے صحیفہ نے خود اپنے پیغمبر یا بانی کی اخلاقیت کو تحدی اور اعلان کے ساتھ اُس کے ہمعصروں کے سامنے پیش نہیں کیا لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیفہ نے سب سے آگے بڑھ کر بلا خوف و خطر اپنے داعی اور مبلغ کی زندگی کی اخلاقیت کو خود اس کے معاصرین کے سامنے نقد و تبصرہ کے لئے پیش کیا۔ فرمایا:

---

[1] الصف : ۲-۳۔ [2] ابو داؤد باب صلوٰۃ اللیل۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ○ (یونس : ۱۶)

(اے منکرو!) میں تو تمہارے درمیان اس سے پہلے ایک زمانہ بسر کر چکا ہوں کیا تم نہیں سمجھتے ۔

پھر آپ کو خطاب کر کے خود آپ سے فرمایا گیا :

إِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ ○ (ن : ۴)

(اے محمدؐ!) بیشک تو اخلاق کے بڑے درجہ پر ہے ۔

کامل و مکمل | اخلاقی معلّم کے کمال کی ایک اور شرط یہ ہے کہ اس کی تعلیم میں یہ تاثیر ہو کہ وہ دوسرں کو بھی اپنے فیض سے بہرہ مند کر سکے یعنی وہ خود کامل ہو اور دوسرے ناقصوں کو بھی کامل بناتا ہو، وہ خود پاک ہو اور دوسرے ناپاکوں کو بھی دھو کر پاک وصاف کر دیتا ہو ۔ اخلاق کے سارے معلّموں کی فہرست پر ایک نظر ڈال جاؤ کہ یہ تکمیل کی شان سب سے زیادہ کس میں تھی ؟ کیا اس میں جس کو قدم قدم پر بنی اسرائیل کی سنگدلی اور کجروی کا گلہ کرنا پڑا ہے ؟ کیا اس میں جس کے پورے پورے گیارہ شاگرد بھی امتحان کے وقت پورے نہ اُتر سکے ؟ یا اس میں تھی جس کی نسبت اس کے صحیفۂ وحی نے بار بار اعلان کیا :

يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهٖ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ (الجمعۃ : ۲)

وہ اُن کو خدا کی باتیں سناتا اور اُن کو پاک وصاف بناتا اور اُن کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے ۔

اس تحدّی اور اعلان میں یہ بات خاص لحاظ کے قابل ہے کہ اس میں اسلام کے معلّم کی نسبت صرف یہی دعویٰ نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو کتاب وحکمت کی باتیں سکھاتا اور خدا کے احکام سناتا ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ ان کو اپنے فیض واثر سے پاک وصاف ومصفّا بنا بھی دیتا ہے ۔ وہ ناقصوں کو کامل، گنہگاروں کو نیک، اندھوں کو بینا اور تاریک دلوں کو روشن دل بنا دیتا ہے ۔ چنانچہ جس وقت اس نے اپنی حیات کا کارنامہ ختم کیا کم از کم ایک لاکھ انسان اس کی تعلیم سے عملاً بہرہ مند ہو چکے تھے اور وہ عرب جو اخلاق کے پست ترین نقطہ پر تھا تیئس برس کے بعد وہ اخلاق کے اس اوجِ کمال پر پہنچا جس کی بلندی تک

کوئی ستارہ آج تک نہ پہنچ سکا۔

اخلاقی تعلیم کا تنوّع اگر کسی معلّم میں تکمیل کی یہ تاثیر بھی ہو پھر بھی یہ دیکھنا ہے کہ اس عالم کی تکمیل اور نظم و نسق کے لئے ایک ہی قوت کے انسانوں کی نہیں بلکہ سینکڑوں مختلف قوتوں کے انسانوں کی ضرورت ہے۔ اخلاق کے دوسرے معلّمین کی درس گاہوں پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہو گا کہ وہاں صرف ایک فن کے طالب العلم تعلیم پاتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی تربیت گاہ میں فوجی تعلیم کے سوا کوئی اور فن نمایاں نہیں، حضرت عیسےٰ علیہ السّلام کے مکتب میں عفو و درگذر کے سوا کوئی اور سبق نہیں، بودھ کے وہار اور خانقاہ میں در بدر بھیک مانگنے والے مرتاض فقیروں کے سوا کوئی اور موجود نہیں۔ لیکن محمد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم کی درس گاہِ اعظم میں آکر دیکھو تو معلوم ہو گا کہ یہ ایک عمومی جامعہ ہے جس میں انسانی ترقی کی ہر قوت نشو و نما پا رہی ہے۔ خود معلّم کی ذات ایک پوری یونیورسٹی ہے جس کے اندر علم و فن کا ہر شعبہ اپنی جگہ پر قائم ہے اور ہر جنس اور ہر مذاق کے طالب العلم آتے ہیں اور اپنے اپنے ذوق اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق کسبِ کمال کر رہے ہیں۔

آپ ؐ کی حیثیت ایک انسان، ایک باپ، ایک شوہر، ایک دوست، ایک خانہ دار، ایک کاروباری تاجر، ایک افسر، ایک حاکم، ایک قاضی، ایک سپہ سالار، ایک بادشاہ، ایک استاد ایک واعظ، ایک مرشد، ایک زاہد و عابد اور آخر ایک پیغمبر کی نظر آتی ہے۔ یہ تمام انسانی طبقے آپ ؐ کے سامنے آکر زانوئے ادب تہ کرتے ہیں اور اپنے اپنے پیشہ و فن کے مطابق آپ ؐ کی تعلیمات سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ مدینۃ النبی ؐ کی اس درس گاہِ اعظم کو غور سے دیکھو جس کی چھت کھجور کے پتوں سے اور ستون کھجور کے تنوں سے بنائے گئے تھے اور جس کا نام مسجدِ نبوی تھا۔ اس کے الگ الگ گوشوں میں ان انسانی جماعتوں کے الگ الگ درجے کھلے ہوئے ہیں۔ کہیں ابوبکر و عمر و عثمان و علی جیسے فرمانروا زیرِ تعلیم ہیں کہیں طلحہ و زبیر و معاویہ و سعد بن معاذ و سعد بن جبیر رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہم جیسے اربابِ رائے و تدبیر ہیں کہیں خالد، ابو عبیدہ،

سعد بن ابی وقاص اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم جیسے سپہ سالار ہیں کہیں وہ ہیں جو بعد میں صوبوں کے حکمران، عدالتوں کے قاضی اور قانون کے مقنن بنے کہیں ان زہّاد و عبّاد کا مجمع ہے جن کے دن روزوں میں اور راتیں نمازوں میں کٹتی تھیں، کہیں ابوذر رضؓ سلمانؓ و ابو دردا رضؓ جیسے وہ خرقہ پوش ہیں جو "مسیح اسلام" کہلاتے تھے، کہیں وہ صفہ والے طالب العلم تھے جو جنگل سے لکڑی لاکر بیچتے اور گزارہ کرتے اور دن رات علم کی طلب میں مصروف رہتے تھے، کہیں حضرت علیؓ، حضرت عائشہ رضؓ حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابن مسعود رضؓ، حضرت زید رضؓ بن ثابت جیسے فقیہ و محدّث تھے جن کا کام علم کی خدمت اور اشاعت تھا، ایک جگہ غلاموں کی بھیڑ ہے تو دوسری جگہ آقاؤں کی محفل ہے، کہیں غریبوں کی نشست ہے اور کہیں دولتمندوں کی مجلس ہے۔ مگر ان میں ظاہری عزت اور دنیاوی اعزاز کی کوئی تفریق نہیں پائی جاتی۔ سب مساوات کی ایک ہی سطح پر اور صداقت کی ایک ہی شمع کے گرد پروانہ وار جمع ہیں۔ سب پر توحید کا یکساں نشہ چھایا اور سینوں میں حق پرستی کا ایک ہی ولولہ موجیں لے رہا ہے اور سب اخلاق و اعمال کے ایک ہی آئینۂ قدس کا عکس بننے کی کوشش میں لگے ہیں۔[۱]

---

[۱] اس موقع پر مدراس والے میرے چھ خطبوں پر ایک نظر ڈال لینی چاہیے۔

اسلام کا فلسفۂ اخلاق

ان اصول کی تفصیل و تشریح کے لیے ہم کو تھوڑی دیر کے لیے فلسفۂ اخلاق کے کانٹوں میں الجھنا ہوگا۔ اخلاق کا وجود تو یقیناً اس وقت سے ہے جب سے انسان کی زندگی اور اس کے ذہنی و جسمانی اعمال کا وجود ہے۔ مگر ان اعمال کی حقیقت پر بحث، ان کے اسباب و علل کی تلاش، اُن کے اصول و قوانین کی تحقیق اور ان کی غرض و غایت کی تعیین یونانیوں کے عہد میں شروع ہوئی اور موجودہ عہد میں علم نفسیات کے زیرِ سایہ پرانے نظریوں پر نظرِ ثانی کی گئی۔ ان اسباب و علل، اصول و قوانین اور غرض و غایت کی تحقیق میں شروع سے آج تک فلسفیوں میں قدم قدم پر اختلافات رونما ہوئے۔ ہر سوال کے جواب میں متعدد نظریے بنتے اور بگڑتے رہے اور نئے نئے فرقے اور اسکول پیدا ہوتے رہے اور ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ نام پڑ چکا ہے۔ تاہم اگر ان سب کو سمیٹنا چاہیں تو اساسی اور کلی طور پر یہ تمام مذاہب انھی دو قدیم مسلکوں کی تشریح ہیں جنھیں یونانی اصطلاح میں "رواقیہ" اور "لذتیہ" کہا گیا ہے۔ موجودہ اصطلاح میں پہلے کو "ضمیریہ" اور دوسرے کو "افادیہ" کہہ لیجیے یا ایک اور تعبیر کے لحاظ سے یوں کہیے کہ پہلا فریق اخلاق کی بنا "جذبات" پر قرار دیتا ہے اور دوسرا "عقل" پر۔ پھر اس منشائے اختلاف کے تحت میں تعبیر کے اختلاف سے اور بہت سے فرقے پیدا ہو گئے۔ ارسطو اور اس کے متبعین نے اخلاق کا منتہیٰ نفس کی تکمیل کو قرار دیا ہے۔

اخلاقی قوانین کی حقیقت اور اصل ماخذ کی نسبت بھی بے انتہا اختلافات ہیں۔ علمائے اخلاق کے مختلف فرقوں نے بادشاہ کا قانون، خدا کا قانون، فطرت کا قانون، حاسۂ اخلاق کی آواز، ضمیر کا قانون، وجدانیّت اور پھر بالآخر عقل کا قانون کہہ کر الگ الگ اپنے نظریوں کی بنیاد ڈالی ہے۔ لیکن درحقیقت ان کی بھی دو ہی اصلی تقسیمیں ہیں یعنی یہ کہ یہ قوانینِ اخلاق کسی وحی و الہام سے ماخوذ ہیں یا کسی بیرونی ماخذ سے۔ جو لوگ وحی و الہام پر ایمان نہ لاسکے انہوں نے ان قوانین کا کوئی بیرونی ماخذ قرار دینا چاہا۔ پھر کسی نے اس بیرونی ماخذ کو خود انسان کے اندر تلاش کیا اور کسی نے اس سے باہر۔ جنہوں نے خود انسان کے اندر تلاش کیا انہوں نے باختلافِ مذاق انسان کی اصل فطرت کو، انسان میں ایک خاص حاسۂ اخلاق کو، انسان کے وجدان کو، انسان میں ضمیر کو اور آخری طور پر خود انسان کی عقل کو ان کا ماخذ قرار دیا۔ جنہوں نے انسان سے باہر ڈھونڈا انہوں نے قبیلہ کے سردار اور بادشاہ کے حکم اور سوسائٹی کے رسم و رواج کو ان کا ماخذ قرار دیا مگر سوال تو یہ ہے کہ قبیلہ کے سردار کا حکم یا بادشاہ کا حکم یا سوسائٹی کے رسم و رواج کی بنیاد خود کس اصول پر پڑی؟ اس لئے لامحالہ اس بیرونی ماخذ کو چھوڑ کر پھر کسی اندرونی ہی ماخذ کو اصل مبنیٰ قرار دینا ہوگا ورنہ اخلاقی اصول کو فطری ہونے کے بجائے مصنوعی اور ساختہ پرداختہ بتانا پڑے گا جو اخلاق کے امہاتِ مسائل میں کبھی قبول نہیں کیا جاسکتا۔

بہر حال دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جو اخلاق کا ماخذ خدا کے حکم کے سوا کسی اور شے کو تسلیم کرتا ہو۔ لیکن اسلام اس کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ خدا نے اپنے ان احکام کو وحی کے الفاظ میں بیان بھی کیا ہے اور اپنے بندوں کی فطرت میں ودیعت بھی رکھا ہے تاکہ فطرت اگر کسی سبب سے خاموش رہے تو احکام الٰہی کی آواز اس کو پکار کر ہشیار کردے۔ فلسفیانہ کاوشوں اور موشگافیوں کو چھوڑ کر عملی حیثیت سے غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ نظریے باہم کسی قدر متخالف ہونے کے باوجود بھی باہم اس قدر متضاد نہیں کہ وہ ایک جگہ جمع نہ ہوسکیں۔ ہوسکتا ہے کہ ہمارے اخلاق کا ماخذ خدا کا حکم ہونے کے ساتھ اس کے تائیدی ماخذ اور محرکات ضمیر،

فطرت، وجدان اور عقل سب ہوں۔ اسی طرح معیارِ اخلاق کے اختلافات میں بھی توافق ممکن ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسان بغیر کسی ذاتی غرض و غایت کو خیال میں لائے ہوئے محض اپنی فطرت کے اصرار یا ضمیر کی پکار سے مجبور ہو کر ایک کام کو انجام دے یا اپنا فرض سمجھ کر اس کو پورا کرے یا اس کے ساتھ کسی مصلحتِ عامہ کی افادی حیثیت بھی اس میں ملحوظ ہو اور وہ روحانی تکمیل کا بھی ذریعہ ہو۔ اسلام کے اخلاقی فلسفہ میں یہ سب جہتیں ایک کام میں مجتمع ہو سکتی ہیں۔

فرض کیجئے کہ ایک مظلوم کی امداد خدا کا حکم بھی ہے اور ہماری فطرت کے اندر بھی یہ ودیعت ہے۔ ہمارے ضمیر کا بھی یہی تقاضا ہے اور وجدان بھی اسی طرح اس کام کو اچھا کہتا ہے جس طرح وہ ایک خوبصورت چیز کو خوبصورت یقین کرنے پر مجبور ہے۔ ساتھ ہی اس کے اندر عام فائدے اور مصلحتیں بھی ہیں اور ہم کو اس سے مسرت بھی ہوتی ہے اور عقل بھی یہی کہتی ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ بہت سے ایسے مواقع بھی ہو سکتے ہیں جہاں خدا، ضمیر، فطرت، جذبات اور وجدان کا ایک حکم ہو اور ہماری خود پسند اور مصلحت شناس عقل دوسری طرف جا رہی ہو۔ اسی لئے اخلاق کے باب میں وہ عقل جو ہمارے قوی کے مجموعی احکام کے خلاف جانا چاہتی ہے اصلاح کے لائق ہے۔

الغرض خدا کے حکم ہونے کے ساتھ اسلام ان کو انسان کے اندر کی آواز بھی کہتا ہے اس اندر کی آواز کو خواہ فطرت کہیے، وجدان کہیے، حاسۂ اخلاقی کہیے، ضمیر کہیے، اس فلسفیانہ تحقیق سے اس کو بحث نہیں اور باوجود اس کے وہ ان کو عقل اور مصلحت اور فوائد پر بھی مبنی سمجھتا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک بات بدیہی طور سے ثابت ہے کہ انسان میں زیادہ تر اخلاقی اصول ایسے ہیں جن کی اچھائی یا برائی پر کہ آب و ہوا، خصوصیاتِ اقلیم، زبان، مذہب، رسم و رواج، طرزِ حکومت وغیرہ صدہا اختلافات کے باوجود دنیا کی ساری قومیں بلا دلیل متفق اور متحد ہیں! اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ یہ اخلاقی حس ہمارے اندر اسی طرح فطرۃً ودیعت ہے جس طرح دوسرے قویٰ اور حواس ودیعت ہیں اب یہ کاوش کہ جس طرح

مرئیات، مسموعات اور ملموسات وغیرہ کے لئے ہمارے اندر باصرہ، سامعہ اور لامسہ کے نام سے الگ الگ حاسے ہیں اسی طرح اخلاقی تمیز کے لئے ہمارے اندر کوئی خاص اخلاقی حاسہ ہے جس سے ہم اخلاق کی اچھائی اور بُرائی کا احساس اور تمیز کرتے ہیں یا کوئی اخلاقی وجدان ہمارے اندر ہے جس کے ذریعے سے ہم اس طرح اس کا احساس کرتے ہیں جس طرح ہم دوسرے وجدانیات جیسے حسن و قبح، خوب صورتی اور بدصورتی کا یا یہ کہ ہمارے اندر کوئی روحانی آواز ہے جو ہم کو ہر وقت ہمارے فرائض یاد دلاتی ہے اور بتاتی ہے کہ یہ اچھا ہے یا بُرا عملی حیثیت سے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

تعلیم محمدیؐ نے گو اخلاق کے ان اصول و مبانی کی طرف کہیں تفصیل اور کہیں اجمالی اشارات کئے ہیں مگر اس نے اس نکتہ کو فراموش نہیں کیا ہے کہ اخلاق کی خوبی ان کے علم و فلسفہ میں نہیں بلکہ اُن کے عمل میں ہے اس لئے "علم بلا عمل" کی کوئی قدر و قیمت اس کی نگاہ میں نہیں لیکن اسی کے ساتھ "عمل بلا علم" کو بھی اس نے پسندیدہ نہیں سمجھا ہے اسی بنا پر اس نے ان اصولوں کی طرف اشارے تو کئے ہیں مگر اخلاق کے باب میں اُن کی عالمانہ تحقیق و تلاش کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے۔

اسلام نے اخلاق کا کمال یہ قرار دیا ہے کہ وہ یہ سمجھ کر ادا کئے جائیں کہ یہ خدا کے احکام ہیں۔ وہ خدا کے دوسرے فطری احکام کی طرح ہمارے اندر ودیعت ہیں انہی احکامِ الٰہی کے مطابق ہمارا ضمیر، وجدان، اخلاقی حاسہ اور عقل میں سے جس ایک کو یا سب کو اصل کہئے ہونا چاہیے۔ ان میں باہم جس حد تک باہمی مطابقت و موافقت زیادہ ہوگی اسی قدر انسان کا روحانی کمال بلند ہوگا اور جس حد تک ان میں کمی ہوگی اسی حد تک اس کے کمال میں نقص ہوگا۔

ایک مسافر کی امداد یا ایک بیمار کی تیمارداری یہ سمجھ کر کی جائے کہ یہ خدا کا حکم ہے۔ پھر کرنے والے کے ضمیر کی آواز بھی یہی ہونی چاہیے، اس کا وجدان بھی یہی ہو، اس کو وہ اپنا فرض بھی جانے اس کے کرنے میں وہ اپنے اندر روحانی مسرت بھی محسوس کرے اور اسی کی پیروی میں نوعِ انسان کی کثیر جماعت

کا فائدہ بھی سمجھے۔ الغرض جس حد تک اس کے ان تمام قویٰ میں اس بارہ میں باہم موافقت اور یکسانی ہوگی اتنا ہی اس کا روحانی کمال بلند ہوگا۔ اور جس قدر اس توافق میں کمی ہوگی کہ خدا کا حکم سمجھ کر بھی اس کے اندر کے ضمیر اور وجدان کی یہ آواز نہ ہو یا وہ اس کو اپنا انسانی فرض نہ سمجھے یا اس سے اس کو روحانی مسرت اور انبساط پیدا نہ ہو اسی قدر اس کے روحانی و ایمانی کمال میں نقص پیدا ہے۔ کتنا ہی نیک کام ہم خدا کا حکم سمجھ کر انجام دیں لیکن اگر ہمارا اندرونی احساس اور ضمیر اس کو نیک نہیں سمجھتا اور ہماری عقل اس کے خلاف ہم کو راہ سجھاتی ہے تو اس کے یہ صاف معنی ہیں کہ ابھی تک اس کے خدا کے حکم ہونے پر ہمارا یقین پختہ نہیں ہوا ہے، جس کے دوسرے معنی ایمان اور روحانی تکمیل کا نقص ہے۔ اسی طرح اگر کسی نیک سے نیک کام کو کوئی انسان صرف اپنے ضمیر کی آواز یا صرف فرض یا وجدان یا حصولِ مسرت یا افادۂ عام کی غرض سے انجام دے مگر خدا کے حکم کی حیثیت اس میں ملحوظ نہ رکھے، تو وہ کام بھی اسلام کی نظر میں ثواب اور تزکیۂ روح کا ذریعہ نہیں۔

بے غرضی چونکہ اسلام میں اخلاق بھی دوسری مذہبی چیزوں کی طرح عبادت ہے اس لئے اس کی غرض و غایت بھی ہر قسم کی دنیاوی، نفسانی اور ذاتی اغراض سے پاک ہونی چاہیئے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو ان کاموں میں کوئی نیکی اور ثواب نہیں اور نہ ان کی حیثیت عبادت کی باقی رہے گی۔ مذہبی کاموں کو چھوڑ کر دنیاوی کاموں پر بھی نظر ڈالیئے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے کام میں جس قدر اخلاص کا حصہ شامل ہوتا ہے اسی قدر وہ قابلِ قدر ہوتا ہے۔ ہم کسی مہمان کی کتنی ہی خاطر کریں اور اُس کے سامنے کتنے ہی الوانِ نعمت چُن دیں لیکن اگر اس کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس خاطر داری کی تہ میں ذاتی نفع یا ریاکاری یا نمائش یا خوشامد کرنے والے کی کوئی ذاتی غرض ہے تو ہماری یہ تمام خاطر تواضع اور تعظیم و تکریم اس کی نگاہ میں بے قیمت ہو جاتی ہے لیکن ہم اگر کسی کے سامنے اخلاص اور بے غرضی کے ساتھ نان و نمک ہی رکھ دیں تو اس کی وقعت اور قدر و قیمت کی کوئی انتہا نہ رہے گی۔ تو جب دنیاوی کاموں میں اخلاص اور عدمِ اخلاص کے یہ اثرات ہیں

تو روحانی عالم میں ان کے نتائج کہاں تک ہوں گے۔

نیت اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیمات میں نیت یعنی قلبی ارادہ اور انسان کی اندرونی غرض و غایت کو ہر اچھے اور بُرے کام کی بُنیاد قرار دیا ہے۔ بلکہ حقیقت میں روحانی حیثیت سے کوئی کام اپنے نتیجہ کے لحاظ سے اتنا اچھا یا بُرا نہیں ہوتا جتنا قلب کی کیفیت اور اس کی اندرونی نیت کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ ایک دو مثالوں سے یہ حقیقت زیادہ واضح ہو جائے گی۔ ایک شخص نے نہایت اصرار سے کسی کو رات کی تاریکی میں اپنے گھر اس لئے بلایا کہ اس کو یقین تھا کہ راہ کے ڈاکو اس کو مار ڈالیں گے یا سخت تکلیف پہنچائینگے۔ اتفاق یہ کہ وہ اندھیرے میں بہک کر دوسرے راستہ پر جا پڑا اور وہاں اس کو اشرفیوں کی تھیلی راستہ میں پڑی ملی تو گو اس سفر کا نتیجہ کتنا ہی اچھا ہو مگر اس بلانے والے کی نیت کی بُرائی میں اب بھی کوئی شک نہیں اور نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے رات کو اندھیرے میں بلوا کر اس پر احسان کیا۔ لیکن ایک اور شخص نے اس کو رات کے اندھیرے میں درحقیقت اس کے ساتھ احسان کرنے ہی کی نیت سے بلوایا لیکن اتفاق سے وہ راستہ میں کسی گڑھے یا کنوئیں میں گر کر مر گیا، تو وہ بلانے والا بدی کے گناہ کا مرتکب نہ ہوگا کہ گو جانے والے کے سفر کا نتیجہ خراب نکلا۔ مگر پہلے شخص کی طرح اس دوسرے شخص کی نیت بُری نہ تھی۔

ایک دوسری مثال فرض کیجئے میری جیب میں روپوں کا ایک بٹوا تھا اتفاق سے وہ راستہ میں گر گیا۔ جب میں راستہ سے واپس پلٹا تو ایک بٹوا پڑا دیکھا اور دل میں یہ خیال کر کے کہ یہ کسی دوسرے کا ہے چپکے سے اٹھا لیا تو اگرچہ واقعہ کے لحاظ سے میں کسی برائی کا مرتکب نہیں ہوا مگر اپنے ارادہ اور نیت کے لحاظ سے بُرائی کر چکا۔ لیکن فرض کیجئے کہ کسی دوسرے موقع پر اسی قسم کا بٹوا مجھ کو سڑک پر پڑا ملا اور میں نے اس کو اپنا سمجھ کر اٹھا لیا تو گو واقعہ کتنا ہی مختلف ہو پھر بھی میرا دامن گناہ کی برائی سے پاک ہے۔ راستہ میں کوئی چل رہا ہو اور ایک عورت سامنے سے نظر آئے اس نے اس کو بیگانہ اور غیر سمجھ کر کسی بُری نیت

سے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر درحقیقت وہ اس کی بیوی تھی یا اس نے کسی غیر عورت کی طرف یہ یہ سمجھ کر ہاتھ بڑھایا کہ وہ اس کی بیوی ہے حالانکہ یہ واقعہ نہ تھا تو پہلی صورت میں اس کا دل گنہگار ہو چکا اور دوسری صورت میں اس کی بیگناہی بالکل ظاہر ہے۔ نماز سے بڑھ کر کوئی نیک کام کیا ہو سکتا ہے لیکن اگر وہ بھی فخر، نمائش، ریا اور دکھاوے کی خاطر سے کیا جائے تو وہ ثواب کے بجائے الٹا عذاب کا باعث ہوگا۔ اسی طرح آپ اگر کسی معذور کی امداد اس لئے کریں کہ لوگ آپ کی تعریف کریں گے تو اسلام کی نگاہ میں یہ نیکی کا کام شمار نہ ہوگا۔

سورہ آل عمران میں ہے:

وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ (آل عمران: ۱۴۵)	اور جو دنیا کا بدلہ چاہے گا اس کو وہ دیں گے اور جو آخرت کا بدلہ چاہے گا اس کو وہ دیں گے۔

ایک اور آیت میں اس کی تصریح کر دی گئی ہے کہ جس کام کا مقصد صرف نمائش اور دکھاوا ہو اس کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں۔ فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ (البقرۃ: ۲۶۴)	اے ایمان والو! تم اپنی خیراتوں کو احسان دھر کر اور ستا کر برباد نہ کرو جس طرح وہ اپنے مال کو برباد کرتا ہے جو لوگوں کے دکھاوے کے لئے خرچ کرتا ہے اور خدا اور قیامت پر یقین نہیں رکھتا۔

اسی قسم کی اور بہت سی آیتیں ہیں جن کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مختصر لیکن جامع و مانع الفاظ فرمائے ہیں:

اِنّما الاعمال بالنّیّات۔ — انسان کے اعمال اس کی نیت پر موقوف ہیں۔

اور اس کی مزید تصریح کے لئے یہ الفاظ ارشاد فرمائے:

و لکلّ امریٔ مانوی فمن	ہر شخص کے لئے وہی ہے جس کی وہ
کانت ھجرتہ الی اللہ ورسولہ	نیت کرے تو جس کی ہجرت خدا ورسول
فھجرتہ الی اللہ ورسولہٖ و	کی طرف ہے اور جس کی ہجرت کی غرض
من کانت ھجرتہ الی دنیا	دنیا کمانا ہو یا کسی عورت کو پانا ہو کہ اس
یصیبھا او امرأۃ یتزوجھا	سے نکاح کرے تو اس کی ہجرت اسی کی طرف
فھجرتہ الی ما ھاجر الیہ۔[1]	ہے جس کی غرض سے اس نے ہجرت کی۔

الغرض عمل کا نیک و بد ہونا تمام تر نیت اور ارادہ پر موقوف ہے اور اسی لئے اخلاق کی بحث میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ حسن نیت نہ ہو تو اخلاق کا بڑے سے بڑا کام بھی حسنِ خلق کے دائرہ سے خارج، دنیاوی تعریف وستائش کے حدود سے باہر اور روحانی خیر وبرکت اور ثواب سے محروم رہ جاتا ہے۔

جدید فلسفۂ اخلاق کی تائید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیم کا یہ وہ اصول ہے جس کی حرف بحرف تائید جدید فلسفۂ اخلاق سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ جان، ایس میکنزی اپنی تصنیف "مینول آف اتھکس" کی پہلی کتاب کے چھٹے باب میں لکھتا ہے:

"جس چیز پر حکم لگایا جاتا ہے وہ صاف ہے یعنی فعل ارادی، جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس سے اخلاقیات میں شروع سے آخر تک بحث ہوتی ہے۔ اس کا کام

---

[1] صحیح بخاری جلد اول، باب ماجاء ان الاعمال بالنیۃ۔ [2] علم اخلاق، کتاب اول باب ششم، مترجمہ پروفیسر عبد الباری ندوی شائع کردہ جامعہ عثمانیہ ۱۳۴۱ھ۔

تمام تر ارادہ کی صحیح جہت ہی کا بتلانا ہے۔ جو اخلاقی احکام ہم لگاتے ہیں اُن کا تعلق بھی ارادہ ہی سے ہوتا ہے جس فعل میں ارادہ شامل نہیں اس کی اخلاقی حیثیت نہیں....

اس مسئلہ کی ایک دو مثالیں دے کر کینٹ کی رائے نقل کی ہے۔

"اسی لئے کینٹ نے اپنی اخلاقیات کی کتاب کو جس مشہور و معروف دعویٰ کے ساتھ شروع کیا ہے اس کی ہم کو تصدیق کرنی پڑتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "بجز اچھے ارادہ کے دنیا بھر میں بلکہ دنیا کے باہر بھی کوئی ایسی شے نہیں ہے جس کو علی الاطلاق بلا کسی قید و شرط کے اچھا کہا جا سکے۔"[1]

اخلاق کے لئے ایمان کی شرط

جب یہ ظاہر ہو چکا کہ اخلاق کی تمام تر بنا ارادہ و نیت یعنی قلب کے عمل پر ہے تو قلب کی اندرونی کیفیت اور حالت کی درستی کے لئے یہ اعتقاد ضروری ہے کہ کوئی ہستی ہے جو ہمارے دل کے ہر گوشہ کو ہر طرف سے جھانک رہی ہے، ہم مجمع میں ہوں یا تنہائی میں اندھیرے میں ہوں یا روشنی میں تاہم کوئی ہے جس کی آنکھیں اس کے دل کی تہ کو ہزار پردوں میں بھی دیکھ رہی ہیں۔ دنیا کی تمام قوتیں صرف جسم پر حکمران ہیں مگر ایک قدرت والا ہے جو دل پر حکمران ہے۔ پھر یہ اعتقاد بھی ضروری ہے کہ ہم کو اس ہستی کے آگے اپنے تمام کاموں کا جواب دہ ہونا ہے اور ایک دن آئے گا جب ہم کو اپنے اعمال کی جزا یا سزا ملے گی۔ جب تک یہ دو خیال دل و دماغ میں جاگزیں نہ ہوں گے اچھے اعمال کا اچھے ارادے سے وجود قطعی محال ہے۔ اسی لئے وحیِ محمدیؐ نے خدا اور قیامت پر ایمان لانا ہر نیک کام کی بنیاد قرار دی ہے کہ بے اس کے ہر کام محض ریا اور نمائش بن جاتا ہے۔ فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا	اے ایمان والو! اپنی خیراتوں کو جتا کر
صَدَقَاتِكُم بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ	یا ستا کر برباد نہ کرو، جس طرح وہ برباد کرتا

---

[1] علم اخلاق کتاب اول باب ششم مترجمہ پروفیسر عبد الباری ندوی شائع کردہ جامعہ عثمانیہ ۱۳۰۱ء

كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ (البقرة: ۲۶۴)

ہے جو اپنے مال کو لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرتا ہے اور خدا اور آخری دن پر یقین نہیں رکھتا۔

یہی ایمانِ صحیح جس سے حسنِ نیت پیدا ہوتا ہے آبِ حیات کا وہ سرچشمہ ہے جو نہ ہو تو ہمارے اعمال سراب سے زیادہ بے حقیقت ہیں:

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍۭ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا

(النور: ۳۹)

اور جو خدا اور قیامت کو نہیں مانتے ان کے کام ایسے ہیں جیسے میدان میں ریت کہ پیاسا اس کو پانی سمجھے۔ جب وہاں وہ جائے تو اس کو کچھ نہیں پائے۔

یہی وہ مشعل ہے جو ہماری تیرہ و تار زندگی کی روشنی ہے، یہ نہ ہو تو ہم کو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آئے اور اپنے کسی کام کی کوئی غایت معلوم نہ ہو:

اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ؕ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ۝

(النور: ۴۰)

یا (خدا اور قیامت کے نہ ماننے والوں کے کاموں کی مثال ایسی ہے کہ اندھیرے میں گہرے دریا میں اس کو لہر ڈھانکے ہے اس لہر پر دوسری لہر ہے اس پر گھٹا چھائی ہے، تاریکیاں ہیں ایک پر ایک جب اپنا ہاتھ نکالے تو سوجھتا نہیں اور جس کو اللہ نے روشنی نہیں دی اس کو کہیں روشنی نہیں۔

جب تک کسی واقفِ اسرار، عالم الغیب، دانائے راز اور دل کی ہر جنبش اور ہر حرکت سے

باخبر ہستی کا اور اس کے سامنے عمل کے مواخذہ، بازپرس اور جواب دہی کا یقین نہ ہوگا دل میں اخلاص اور نفس میں دنیاوی اغراض سے پاکی پیدا نہیں ہوسکتی اور نہ بے غرضانہ بلند پایہ اخلاق کا وجود ہوسکتا ہے

غرض وغایت اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعتِ کاملہ میں نفسِ عمل مطلوب نہیں بلکہ وہ عمل مطلوب ہے جس کی غرض وغایت صحیح ہو۔ عمل قالب ہے تو صحیح غرض وغایت اسکی روح ہے۔ روح نہیں تو بے جان قالب کس کام آسکتا ہے۔ حکمائے اخلاق کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ انسان کا کوئی فعل غرض وغایت سے خالی نہیں ہوتا لیکن یہ غرض وغایت ہے کیا؟ اس پر آج تک وہ متفق نہیں ہوسکے۔ سقراط، افلاطون اور ارسطو کے زمانہ سے لے کر آج تک بیسیوں نظریے قائم ہو چکے ہیں لیکن حقیقت کا راز اب تک آشکارا نہیں۔

اسلام کو اس سے بحث نہیں کہ اخلاق کی غرض وغایت کیا ہوتی ہے بلکہ اس سے بحث ہے کہ اخلاق کی غرض وغایت کیا ہونی چاہئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے کام کی ادنیٰ اور اعلیٰ، پست اور بلند متعدد غرضیں اور غایتیں ہوسکتی ہیں۔ ہم راہ میں ایک بوڑھے کی گردن سے بوجھ اتار کر خود اٹھا لیتے ہیں اور اس کو اس کے گھر تک بآرام پہنچا دیتے ہیں۔ ہمارے اس کام کی غرض یہ ہوسکتی ہے کہ گھر پہنچ کر بڈھا خوش ہوکر ہم کو مزدوری اور انعام دے گا۔ یہ بھی مقصد ہوسکتا ہے کہ لوگ ہم کو دیکھ کر ہماری تعریف کریں گے اور کسی پبلک منصب اور عہدہ کے انتخاب میں وہ ہم کو اپنی رائے دیں گے۔ یہ بھی مطلب ہوسکتا ہے کہ راستہ چلتے لوگ ہم کو اس حالت میں دیکھ کر ہمیں بڑا نیک اور دیندار سمجھیں گے۔ یہ بھی غرض ہوسکتی ہے کہ آج اگر جوانی میں اس بوڑھے کی مدد کریں گے تو کل ہمارے بڑھاپے میں کل کے نوجوان ہماری مدد کریں گے۔ بعض نیک لوگوں کو ایسے کاموں کے کرنے سے طبعاً خوشی ہوتی ہے وہ اپنی اس خوشی کے لئے اس قسم کے کاموں کو کرتے ہیں۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایک بوڑھے کو اس حال میں دیکھ کر ترس کھاتے ہیں اور اس سے متاثر ہوکر یہ کام کرتے ہیں۔ غرض ایک ہی قسم کے کام کی یہ تمام مختلف اغراض مختلف

اشخاص کے کاموں کی غایت اور محرّک ہو سکتے ہیں لیکن اس فہرست پر دوبارہ غور کی نظر ڈالیئے تو معلوم ہو گا کہ یہ تمام اغراض بتدریج پستی سے بلندی کی طرف جا رہے ہیں اور جس حد تک جو غرض فاعل کی ذاتی و نفسانی غرض و غایت سے پاک ہے اسی قدر وُہ بلند اور قابل قدر ہے۔ کسی مالی یا جسمانی معاوضہ کی خاطر کوئی نیک کام کرنا سب سے پست مقصد ہے۔ اس کے بعد عزّت و شہرت کی طلب اور نیک نامی کے حصوُل کے لئے کرنا بھی گو پست مقصد ہے مگر پہلے سے بُلند ہے پھر روحانی خوشی اور ضمیر کی فطری خواہش کی تسلّی کرنا پہلے سے اعلیٰ مقصد ہے۔ مگر پھر بھی ذاتی منفعت اور اس دُنیا کا لگاؤ باقی ہے۔ یہ بالکل فطری بات ہے کہ کوئی انسان کسی کے ساتھ کتنا ہی عمدہ برتاؤ کرے مگر جب اُس کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کی تہ میں اس کی فلاں ذاتی غرض تھی تو اس کام کی قدر و قیمت اس کی نگاہوں سے گر جاتی ہے اور یہ سارا جادو بے اثر ہو جاتا ہے۔

اس سے آگے بڑھ کر مذہبی لوگ اپنے کاموں کی غرض و غایت جنت کی طلب قرار دے سکتے ہیں لیکن درحقیقت اس میں بھی گو اس دنیا کی نہیں، لیکن اُس دنیا کی ذاتی غرض و غایت شامل ہے اس لیے یہ اعلیٰ ترین مقصد ہونے کے باوجود بھی ہنوز پست ہے۔ اس لیے یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تعلیم محمدیؐ میں بہشت کو ایک مومن کے نیک کام کا لازمی نتیجہ بتایا ضرور گیا ہے، مگر اس کو نیک کام کی غرض و غایت قرار نہیں دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ ایک بادہ خوار مسلمان شاعر بھی اس نکتہ سے بے خبر نہیں ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

ضمیر کی آواز یعنی انسان کی نفسیاتی کیفیت کا وہ زندہ احساس جس کے ذریعہ سے وُہ برائی اور بھلائی میں تمیز کرتا ہے اور جس کے سبب سے اس کے دل کے اندر سے خود نیکی کی دعوت کی آواز اٹھتی ہے۔ غریب ولاچار آدمی کو دیکھ کر ہر شخص پر فطرۃً رحم کا جذ

طاری ہوتا ہے۔ قاتل اور ظالم سے طبعاً ہر شخص کو نفرت ہوتی ہے۔ یہ قلب کی فطری حقیقت ہر انسان کے ضمیر میں ہے۔ ہر اچھے یا بُرے کام کے کرتے وقت اس کے دل کے پردہ سے تحسین یا نفرین کی آواز آتی ہے لیکن بُری صحبت، بُری تربیت یا کسی خاص شدید جذبہ کے اثر سے یہ آواز اور اس کا اثر دب بھی جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہر گناہ کے پہلے پہل کرنے میں انسان خوف کھاتا ہے، اس کے ہاتھ پاؤں لرزتے ہیں، وہ اپنی گنہگاری کے تخیل سے شدید ذہنی اذیت محسوس کرتا ہے، وہ کبھی کبھی ندامت کے دریائے احساس میں غرق ہو جاتا ہے، اس کے ذکر سے اس کی خجالت کی پیشانی عرق عرق ہو جاتی ہے لیکن جب وہ بار بار اپنے ضمیر کی اس آواز کو دباتا رہتا ہے تو وہ دب کر رہ جاتی ہے اور اس کی پشیمانی اور ندامت کے احساس کا شیشہ اس ٹھوکر سے چور چور ہو جاتا ہے۔

یہ اثرات کس چیز کا نتیجہ ہیں؟ اسلام کے اصولِ اخلاق کی بنا پر اس کا جواب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان میں نیکی و بدی کے جو فطری الہامات ودیعت رکھے ہیں، یہ اُس کے نتائج ہیں قرآن کہتا ہے:

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ۝ (الشمس: ۸)

ہر نفس میں اس کی بدی اور نیکی الہام کر دی ہے۔

وہ جذبہ جس کا نام ضمیر ہے اور جو ہم کو ہمارے ہر برے کام کے وقت ہشیار کرتا ہے وحیِ محمدی کی اصطلاح میں اُس کا نام نفسِ لوّامہ (ملامت کرنے والا نفس) ہے اور یہ خود ہمارے دل کے اندر ہے۔ سورۂ قیامت میں ہے:

وَلَا أُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝ (القیامہ: ۲)

اور قسم کھاتا ہوں اس نفس کی جو انسان کو اس کی برائیوں پر ملامت کرتا ہے۔

آگے چل کر فرمایا:

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ۝ وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ۝ (القیامہ: ۱۴-۱۵)	بلکہ انسان اپنے نفس پر آپ سمجھ بوجھ ہے اگرچہ وہ اپنے اوپر طرح طرح کے بہانوں کے پردے ڈال لیتا ہے۔

نواس بن سمعان انصاریؓ ایک سال تک اس انتظار میں مدینہ میں ٹھہرے رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نیکی اور گناہ کی حقیقت سمجھیں۔ آخر ایک دن ان کو موقع مل گیا اور انہوں نے دریافت کیا۔ فرمایا" نیکی حُسنِ اخلاق کا نام ہے اور گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹک جائے اور تجھ کو پسند نہ ہو کہ تیرے اس کام کو لوگ جانیں"۔ اسی طرح وابصہ بن معبدؓ نام ایک صاحب خدمتِ نبویؐ میں نیکی اور گناہ کی حقیقت دریافت کرنے کی غرض سے آئے۔ چاروں طرف جاں نثاروں کا ہجوم تھا اور وہ شوق و ذوق میں سب کو ہٹاتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔ لوگ ان کو روک رہے تھے مگر وہ آگے بڑھتے ہی گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو فرمایا" وابصہ قریب آجاؤ"۔ جب وہ قریب جاکر بیٹھے تو فرمایا" اے وابصہ میں بتاؤں کہ تم کیوں آئے ہو یا تم بتاؤ گے"۔ عرض کی" حضور ہی ارشاد فرمائیں"۔ فرمایا "وابصہ! تم مجھ سے نیکی اور گناہ کی حقیقت دریافت کرنے آئے ہو"۔ عرض کی" سچ ہے یا رسول اللہؐ"۔ فرمایا:

یا وابصة استفت قلبك واستفت نفسك البرّ ما اطمأنّ اليه القلب واطمأنّت اليه النّفس والاثم ما حاك فى القلب و تردّد فى النفس و ان افتاك	اے وابصہ! اپنے دل سے پوچھا کر اپنے نفس سے فتویٰ لیا کر۔ نیکی وہ ہے جس سے دل اور نفس میں طمانیت پیدا ہو اور گناہ وہ ہے جو دل میں کھٹکے اور نفس کو ادھیڑبن میں ڈالے

الناسؔ۔ اگرچہ لوگ تجھے اس کا کرنا جائز ہی کیوں نہ بتائیں

یہی وہ حاسۂ اخلاقی ہے جس کا نام لوگوں نے ضمیر کی آواز رکھا ہے۔

پہلے پہل جب انسان اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف کوئی بات کرتا ہے تو اس کے دِل کی صاف وسادہ لوح پر داغ کا ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے اگرچہ ہوش میں آکر جب وہ توبہ و استغفار کرتا ہے اور پشیمان و نادم ہوتا ہے تو وہ داغ مٹ جاتا ہے۔ لیکن پھر اگر وہی گناہ بار بار اسی طرح کرتا رہے تو وہ داغ بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ وُہ پورے دل کو سیاہ کر کے ضمیر کے ہر قسم کے احساس سے اس کو محروم کر دیتا ہے، اسی مفہوم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں ادا فرمایا:

ان العبد اذا اخطأ خطیئۃ نکتت فی قلبہ نکتۃٌ سوداء فاذا ھو نزع واستغفر و تاب صقل قلبہ وان عاد زید فیھا حتّٰی یعلو قلبہ[2]۔

بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اُس کے دل میں داغ کا ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے تو اگر اس نے پھر اپنے کو علیحدہ کر لیا اور خدا سے مغفرت مانگی اور توبہ کی تو اس کا دل صاف ہو جاتا ہے اور اگر اس نے پھر وہی گناہ کیا تو وہ داغ بڑھایا جاتا ہے، یہانتک کہ وہ پورے دل پر چھا جاتا ہے۔

اس کے بعد فرمایا یہی وہ دل کا زنگ ہے جس کا ذکر اس آیت میں ہے:

---

[1] مسند ابن حنبل جلد ۴ ص ۲۲۸، مصر۔ [2] جامع ترمذی تفسیر آیت مذکور۔

كَلَّا بَلْ سكتة رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ (التطفیف : ۱۴)

کبھی نہیں بلکہ اُن کے (برے) کاموں کی وجہ سے ان کے دلوں پہ زنگ چھا گیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تمثیل میں فرمایا کہ منزلِ مقصود کی جانب ایک سیدھا راستہ جاتا ہے۔ راستہ کے ادھر ادھر دونوں طرف دو دیواریں کھچی ہیں اور ان دونوں میں کچھ دروازے کھلے ہیں لیکن ان پر پردے پڑے ہیں۔ راستہ کے سرے پر ایک آواز دینے والا آواز دے رہا ہے کہ راستہ پر سیدھے چلے چلو اور ادھر اُدھر مڑو نہیں۔ جب کوئی راہ گیر خدا کا بندہ چاہتا ہے کہ ان دائیں بائیں کے دروازوں میں سے کسی ایک دروازے کا پردہ اٹھائے تو اوپر سے ایک منادی پکار کر کہتا ہے "خبردار پردہ نہ اٹھانا، اٹھاؤ گے تو اندر چلے جاؤ گے۔" پھر فرمایا یہ راستہ اسلام ہے، اور یہ دروازے اللہ تعالیٰ کی ممنوعات ہیں اور یہ پردے اس کی حدود ہیں اور راستہ کے سرے پر پکارنے والا قرآن ہے، اور اوپر کا منادی جو پکارتا ہے

ھو واعظ اللہ فی قلب کل مؤمن[1]

وہ خدا کا وہ واعظ ہے جو ہر مومن کے قلب میں ہے۔

کیا کسی بڑے سے بڑے ضمیری نے بھی اخلاقِ ضمیر کی اس سے بہتر تشریح کی ہے۔

مسرّت وانبساط

یہ بات کہ نیکی کے کاموں سے کرنے والے کو جو خوشی اور برائی کی باتوں سے اس کو جو رنج ہوتا ہے اس کو نیکی کے حصول کی ترغیب دیتے اور برائیوں سے بچنے پر آمادہ کرتے ہیں، گو تمام تر صحیح نہیں ہے تاہم اتنا درست ہے کہ نیکی کے کاموں سے حقیقۃً

---

[1] مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ بحوالہٗ احمد وبیہقی فی شعب الایمان و رزین و ترمذی مختصراً۔

کرنے والے کے دل کو انشراح اور خوشی ہوتی ہے اور بُرائی سے اس کو انقباض اور غم ہوتا ہے۔ لیکن یہ نیکی اور بدی کے محرّک نہیں اور نہ اُن کو ہمارے کاموں کی غرض و غایت ہونی چاہیئے کہ یہ بھی مادّی خود غرضی ہے بلکہ درحقیقت یہ نیکی اور بدی کے فطری اور طبعی نتائج ہیں۔ ایک غریب لاچار کی امداد سے بے شبہ ہم کو خوشی ہوتی ہے لیکن یہ خوشی ہماری مخلصانہ کوشش کا طبعی اور لازمی نتیجہ ہے لیکن وہ اس کی محرّک، علت اور غرض و غایت نہیں۔ اسلام کے نزدیک ایک مسلمان کے کاموں کی غرض و غایت تو صرف ایک ہی ہوتی ہے، اور وہ ہے خدا اور اس کی رضامندی کا حصول۔

اس تشریح کے بعد معلوم ہوگا کہ سرورِ کائنات علیہ الصلوات کی تعلیم نے حکمائے اخلاق کی اس جماعت کے نظریہ میں جو اخلاق کی بنیاد اسی خوشی اور رنج یا روحانی لذت والم کے اصول پر قائم کرتی ہے، تھوڑی سی ترمیم کر دی ہے اور وہ یہ کہ خوشی حاصل کرنا اور قلبی غم سے بچنا نیکی کی غرض و غایت نہیں بلکہ اُس کا لازمی اور طبعی نتیجہ ہے۔ علمائے اخلاق میں بڑی جماعت کا آج کل یہی مسلک ہے کہ مسرّت نیکی کی غرض نہیں۔ اسی نکتہ کو اسلام کے صحیفۂ الٰہی نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ	لیکن اللہ نے ایمان کو تمہارا محبوب بنایا
وَزَيَّنَهٗ فِىْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ	اور اس کو تمہارے دلوں میں اچھا کر
الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ؕ	کے دکھایا۔ اور کفر اور گناہ اور نافرمانی
اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۝	سے گھن لگا دی۔ یہی لوگ نیک چلن ہیں۔

(الحجرات: ۷)

اسی آیت پاک کی تفصیل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے الفاظ میں اس طرح فرمائی:

اذا سرّتك حسنتك وساءتك	جب تمہاری نیکی تم کو خوشی بخشے اور

سیئتك فانت مؤمن[1]	تمہاری بدی تم کو غمگین کر دے تو تم مومن ہو۔
من سرّته حسنته وساءته سیّئته فهو مؤمن[2]	جس کو نیکی خوش اور برائی غمزدہ بنائے وہ مومن ہے۔
من عمل سیّئة فکرهها حین یعمل وعمل حسنة فسرّ فهو مؤمن[3]	جس نے جب کوئی برائی کی تو اس کو اس سے سخت نفرت آئی اور جب کوئی اچھا کام کیا تو اس کو مسرت ہوئی وُہ مومن ہے۔

غرض نیکی پر مسرّت وانبساط اور انشراحِ خاطر کی لذّت کو اسلام نے ایمان کی پہچان مقرر کیا ہے اور اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسلام کے اصولِ اخلاق میں سابق الذکر ترمیم کے ساتھ فرقۂ لذّتیہ کے لیے بھی قدم رکھنے کی گنجایش باقی رکھی ہے اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلّم کی پیغمبرانہ نظر سے یہ نکتہ بھی پوشیدہ نہیں رہا ہے بلکہ اس نظریہ میں جس حد تک غلطی تھی اس کی تصحیح فرما دی ہے۔

رضائے الٰہی

اسلام میں ہر قسم کے نیک کاموں کی غرض وغایت صرف ایک ہی قرار دی گئی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضامندی ہے۔ ایک سچے مسلمان کو صرف اسی کی خاطر کام کرنا چاہیے اور اس کے سوا کسی دوسری غرض کو اپنے کام کی بنیاد نہیں بنانا چاہیے یہیں آکر فلسفۂ اخلاق اور اسلامی اخلاق کے اصول کا فرق نمایاں ہوتا ہے۔ حکمائے اخلاق یہ

---

[1] مسند احمد بن حنبل عن ابی امامۃ الباہلی جلد ۵ صفحہ ۲۵۱ و ۲۵۲ و مستدرک حاکم کتاب الایمان جلد اول صفحہ ۱۴ حیدرآباد و مختصر شعب الایمان بیہقی ص ۵۲ مطبع سعادت مصر، و ابن حبان و ابوداؤد و عن عمر بن الخطاب۔ [2] طبرانی فی الکبیر عن ابی موسیٰ کنز العمال جلد اوّل صفحہ ۳۰۷۔ [3] مستدرک حاکم کتاب الایمان جلد اوّل صفحہ ۱۳ حیدرآباد۔

ڈھونڈتے ہیں کہ انسانی اخلاق کی غرض و غایت کیا ہوتی ہے اور معلّم حکمت علیہ السلام یہ تعلیم دیتے ہیں کہ انسان کو اپنے اخلاق کی غرض و غایت کیا قرار دینی چاہیے۔ انسان کے پاس دو ہی دولتیں ہیں، جان اور مال اور انہی دونوں کو خدا کی راہ میں خرچ کرنا ایثار اور حسنِ عمل ہے۔

پہلے ایک مومن کی جان کے متعلق فرمایا:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ	بعض ایسے ہیں جو اپنی جان کو خدا کی
ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ	خوشنودی چاہنے کے لیے بیچتے ہیں۔
رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝ (البقرۃ: ۲۰۷)	اور اللہ بندوں پر مہربان ہے۔

پھر مال کے متعلق فرمایا:

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ	اور اُن کی مثال جو اپنی دولت خدا کی
اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ	خوشنودی کے لیے خرچ کرتے ہیں۔
اللّٰهِ (البقرۃ: ۲۶۵)	
وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ	اور تم تو خرچ نہیں کرتے مگر اللہ کی ذات
اللّٰهِ ؕ (البقرۃ: ۲۷۲)	کو چاہ کر۔
وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ	اور جو یہ تمام کام خدا کی خوشنودی کے
مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ	لیے کرے گا تو ہم اس کو بڑا اجر
اَجْرًا عَظِيْمًا (النّسآء: ۱۱۴)	دیں گے۔
وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ	اور جنہوں نے خدا کے لیے صبر کیا اور
رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا	نماز کھڑی کی اور ہم نے جو اُن کو دیا ہے
مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّ	اس میں کچھ چھپے اور کھلے طریقہ سے

يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ — خرچ کیا اور بُرائی کو نیکی سے دور کرتے

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ۝ — ہیں انہی کے لیے ہے پچھلا گھر۔

(الرعد: ۲۲)

سب سے صاف اور واضح طور سے یہ حقیقت سورۂ لیل میں کھولی گئی ہے:

الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۝ — جو اپنا مال صفائی اور پاکی حاصل کرتے

وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ — ہوئے دیتا ہے۔ کسی کا اس پر احسان

تُجْزٰٓى ۝ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ — نہیں ہے جس کو ادا کرنے کے لیے دیتا

الْاَعْلٰى ۝ — ہو، بلکہ وہ خدا کی ذات کی طلب کے

(اللیل: ۱۸-۲۰) — کے لیے دیتا ہے۔

ان آیات کی تفسیر و توضیح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے متعدد احادیث میں فرمائی ہے۔ ایک صحابی پوچھتے ہیں "یا رسولَ اللہ! کوئی اس لیے لڑتا ہے کہ غنیمت کا کچھ مال ہاتھ آئے، کوئی اس لیے کہ وہ بہادر کہلائے، کوئی اس لیے کہ اُس کو شہرت حاصل ہو تو ان میں سے راہِ خدا میں لڑنا کس کو کہیں گے"۔ فرمایا "اس کو جو اس لیے لڑتا ہو کہ خدا کی بات بلند ہو"[۱]۔ ایک دفعہ ارشاد فرمایا "گھوڑا باندھنا کسی کے لیے اجر کا موجب کسی کے لیے پردہ پوش اور کسی کے لیے گناہ ہے۔ اجر کا موجب اس کے لیے ہے جو خدا کی راہ میں اس کو باندھتا ہے تو اُس کے چرنے اور پانی پینے کا بھی اس کو ثواب ملتا ہے۔ پردہ پوش اس کے لیے ہے جو ضرورةً اس لیے باندھتا ہے کہ خدا نے اس کو دولت دی ہے تو اس کو اپنی ضرورت کی چیز دوسروں سے مانگنی نہ پڑے تو وہ رحم و شفقت کے ساتھ اس سے کام لیتا ہے اور اس کا حق ادا کرتا ہے، اور گناہ اس کے لیے ہے جو فخر اور نمائش کے لیے باندھتا ہے"[۲]۔

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الجہاد جلد اول صفحہ ۹۴ [۲] صحیح بخاری کتاب الجہاد و کتاب المناقب آخر باب علامات النبوۃ فی الاسلام و کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ باب الاحکام التی تعرف بالدلائل و باب تفسیر اذا زلزلت و صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ۔

اس تعلیم کا سب سے مؤثر بیان وہ ہے جس کو ترمذی نے حضرت ابوہریرہؓ سے نقل کیا ہے اور جس کو دہراتے ہوئے حضرت ابوہریرہؓ تین دفعہ غش کھا کر گرے اور جس کو سن کر حضرت معاویہؓ زار زار روتے۔ حضرت ابوہریرہؓ نے قسم کھا کر بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ "قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ عدالت کے لیے اترے گا اور ہر امت اپنی جگہ گھٹنے ٹیکے ہو گی اس وقت سب سے پہلے ان کی پیشی کا حکم ہو گا جو قرآن کے عالم تھے اور جو جہاد میں مارے گئے تھے اور جو دولت والے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ عالم سے پوچھے گا "کیا میں نے تجھ کو وہ سب نہیں سکھایا جو اپنے پیغمبر پر اُتارا تھا تو تو نے اس پر کیا عمل کیا؟" وہ عرض کرے گا "بارِ الٰہا! میں شب و روز نماز میں قرآن پڑھتا تھا" خدا فرمائے گا "تو جھوٹا ہے"۔ فرشتے بھی کہیں گے "یہ جھوٹا ہے"۔ پھر خدا فرمائے گا "تو تو اس لیے یہ کرتا تھا تاکہ لوگ کہیں کہ تو بڑا عالم اور قرآن خواں ہے۔ تو دنیا میں تجھ کو یہ کہا جا چکا" (یعنی تو اپنا بدلہ پا چکا)۔ پھر دولت مند سے خدا فرمائے گا "کیا میں نے تجھ پر دنیا کو کشادہ نہیں کیا یہاں تک کہ تو کسی کا محتاج نہ رہا؟" عرض کرے گا "کیوں نہیں اے میرے ربّ!" خدا دریافت کرے گا "تو میں نے جو کچھ تجھ کو دیا اس میں تو نے کیا کیا؟" جواب دے گا "میں اہلِ استحقاق کا حق ادا کرتا تھا اور خیرات دیتا تھا"۔ ارشاد ہو گا "تو جھوٹا ہے" فرشتے بھی کہیں گے "یہ جھوٹا ہے"۔ پھر خدا فرمائے گا "تو تو اس لیے یہ کرتا تھا تاکہ لوگ کہیں کہ تو بڑا سخی ہے تو یہ تجھ کو دنیا میں کہا جا چکا" (تو اپنا بدلہ پا چکا)۔ اس کے بعد وہ لایا جائے گا جو جہاد میں مارا گیا تو خدا اس سے دریافت کرے گا "تو کس بات کے لیے مارا گیا؟" کہے گا "خدایا تو نے اپنی راہ میں جہاد کا حکم دیا تھا تو میں لڑا یہاں تک کہ مارا گیا"۔ خدا فرمائے گا "تو جھوٹا ہے"۔ فرشتے بھی کہیں گے "یہ جھوٹا ہے"۔ خدا کہے گا "تو تو اس لیے لڑا تھا کہ لوگ تجھ کو بہادر کہیں تو دنیا میں تجھ کو یہ کہا جا چکا"۔ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا "یہ وہ لوگ ہیں جو سب سے

پہلے جہنم میں ڈالے جائیں گے۔[1]

حضرت معاویہؓ اس حدیث کو سن کر بہت روئے پھر بولے "خدا اور اس کا رسولؐ سچا ہے" اور اس حدیث کی تائید میں قرآنِ پاک کی یہ آیت پڑھی:

مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُونَ ۝ أُولٰئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ إِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوا فِيهَا وَبَاطِلٌ مَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ (ھود: ۱۵-۱۶)	جو کوئی دنیا کی زندگی اور اس کی رونق چاہتا ہو تو ہم اس کا عمل اسی دنیا میں پورا کر دیں گے بے کم و کاست۔ ان لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں مگر دوزخ۔ اس دنیا میں انہوں نے جو بنایا وہ مٹ گیا اور جو کیا وہ برباد گیا۔

غرض اگر ہمارے اخلاق و اعمال کی غایت خود غرضی اور کسی نہ کسی طرح کی ذاتی منفعت ہے تو وہ ثواب کی روح سے خالی ہے اور اسلام کی اخلاقی تعلیم اس پستی سے بہت بلند ہے۔ بلکہ ایک مقام اس کا وہ بھی ہے جہاں اس کی منزل رضائے الٰہی کی طلب نہیں بلکہ خود ذاتِ الٰہی ہو جاتی ہے:

وَمَا تُنْفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۚ (البقرۃ: ۲۷۲)	اور تم تو خرچ نہیں کرتے مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر۔
وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ (الرعد: ۲۲)	اور جنہوں نے اپنے پروردگار کی طلب کے لیے صبر کیا۔

---

[1] جامع ترمذی ابواب الزہد، باب ما جاء فی الریاء والسمعۃ۔

وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰۤى ۙ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۚ (الیل: ۱۹-۲۰)	اور جو کسی کے احسان کا بدلہ اتارنے کے لیے نہیں بلکہ اپنے برتر پروردگار کی طلب کے لیے کرتا ہے۔

اخلاقی احکام کی تعمیل اور ادائے حقوق کی تاکید کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا:

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ ۖ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۚ (الروم: ۳۸)	تو رشتہ دار کا حق ادا کر اور غریب کا اور مسافر کا، ایسا کرنا ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو خدا کی ذات کو چاہتے ہیں اور وہی کامیاب ہیں۔

مذہب میں اخلاق کا بنیادی اصول

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اصولِ اخلاق کی جو تکمیل ہوئی اس کا پتہ نفسِ اخلاق کے بنیادی اصول سے چلتا ہے۔ توراۃ نے اپنی اخلاقی تعلیمات میں شاہی احکام کی شان رکھی ہے جن میں کسی اصول اور غرض وغایت اور علت ومصلحت کی کوئی تشریح نہیں کی جاتی۔ انجیل میں لفظی صناعیوں کے سوا ان اخلاقی احکام کی کوئی دوسری بنیاد ہی قائم نہیں کی گئی ہے تاہم عیسائی مذہب میں کچھ اصول ضرور موجود ہیں مگر ان کی بنیاد حد درجہ کمزور ہے۔ ان میں سے پہلا مسئلہ خود اصل خلقتِ انسانی کا ہے۔

سوال یہ ہے کہ انسان کی ہستی کا صحیفہ اپنی اصل خلقت میں سادہ ہے یا گناہوں سے داغدار ہے۔ عیسائیت کی تعلیم یہ ہے کہ انسان اصل میں گنہگار پیدا ہوتا ہے، گناہ اس کا مایۂ خمیر ہے کیونکہ اس کے باپ اور ماں حضرت آدمؑ اور حواؑ گناہ گار تھے اور یہ موروثی گناہ ہر انسان کی فطرت میں منتقل ہوتا چلا آیا ہے جس سے بچنا انسان کے لیے ممکن نہیں۔ اس مسئلہ میں مسیحی تعلیم کا غلو اس درجہ

بڑھا ہوا ہے کہ اس کے نزدیک ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے وہ جب تک بپتسمہ نہ پالے پاک نہیں ہوتا۔ اگر کسی عیسائی کا بچہ بھی اس سے پہلے مرجائے تو وہ گنہگار مرا اور آسمانی بادشاہی کی حدود میں وہ داخل نہ ہوگا بلکہ وہ جہنم میں جھونکا جائے گا کیوں کہ مسیح کے نام سے اس نے نجات نہیں پائی تھی۔

لیکن اسلام کا اصول اس سے بالکل جداگانہ ہے۔ اس کے نزدیک توحید اصل فطرت ہے فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا (خدا کی وہ فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا) پھر اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کے ازلی سوال کے جواب میں بَلٰی یعنی خدا کا اعتراف ہر انسان روزِ ازل کر چکا ہے۔ اس لیے اس دنیا میں آکر جس نے اپنے فطری اور ازلی اعتراف کے بعد اس کا انکار نہیں کیا اس کا وہ اقرار و اعتراف اس کی بے گناہی کے لیے کافی ہے اور اسی لیے اللہ تعالٰی نے اس کی لوحِ فطرت پر جو زرّیں حروف لکھے ہیں وُہ اپنے ہوش و تمیز کے بعد یا اُن کو ابھار کر چمکا دیتا ہے یا مٹا ڈالتا ہے۔ فرمایا:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ○ (التین: ۴)	ہم نے انسان کو اچھی سے اچھی ساخت پر پیدا کیا۔

یعنی ہم نے اس کی خلقت بہترین تقویم اور راستی پر بنائی ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا:

الَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ○ فِیْٓ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ○ (الانفطار: ۷-۸)	جس خدا نے تجھ کو بنایا پھر تجھ کو برابر کیا، پھر تجھ کو ٹھیک کیا۔ پھر جس صورت میں چاہا تجھ کو جوڑ دیا۔

یہ آیت سورۂ انفطار کی ہے۔ اس میں قیامت اور حشر و نشر یعنی انسان کی جزا و سزا کے مقررہ دن کا بیان ہے اس کے بعد یہ آیت ہے۔ جس لفظ کا ترجمہ ہم نے "ٹھیک کیا" کیا

ہے، اس کے لفظی معنی "معتدل کیا" کے ہیں، یعنی اس کو قویٰ کا ہر قسم کا اعتدال بخشا۔ نیشاپوری وغیرہ مفسّرین نے اس کے معنی یہ بتائے ہیں کہ اس میں کمالات کے حصول کی پوری استعداد عنایت کی۔ اس سے ثابت ہوا کہ اعتدال کے عموم میں اس کے جسمانی اور روحانی دونوں قویٰ کا اعتدال داخل ہے۔ دوسری آیتوں میں یہ مفہوم اور زیادہ واضح بیان کیا گیا ہے۔ سورۂ اعلیٰ میں ہے:

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۙ الَّذِيْ خَلَقَ فَسَوّٰى ۙ وَالَّذِيْ قَدَّرَ فَهَدٰى ۝ (الاعلیٰ: ۱-۳)	اپنے بلند و برتر پروردگار کی پاکی بیان کر جس نے پیدا کیا، پھر برابر کیا۔ اور جس نے ہر قسم کا اندازہ درست کیا پھر راہ دکھائی۔

راہ دکھانا یعنی ہدایت انسان کی فطرت میں اس نے اسی طرح ودیعت رکھا ہے جس طرح دوسرے بیسیوں قویٰ اس نے ودیعت رکھے ہیں۔ سورۂ دہر میں اس سے بھی زیادہ صاف ہے:

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ ۖ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۝ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝ (الدھر: ۲-۳)	ہم نے انسان کو ایک بوند کے لچھے سے پیدا کیا، پلٹتے رہے اس کو، پھر کر دیا اس کو سنتا دیکھتا۔ ہم نے اس کو راہ سوجھا دی تو وہ یا شکر گذار (نیکو کار) ہوتا ہے، یا ناشکر (بدکردار)۔

غرض اُس کو یہ رہنمائی اور ہدایت پہلے ہی دن دے دی گئی۔ اب عقل و تمیز آنے کے بعد خدا کا شکر گذار یا ناشکر، نیکوکار یا بدکردار، اچھا یا بُرا ہو جانا خود اس کا کام ہے۔ سورۂ شمس

میں اس سے بھی زیادہ واضح ہے :

وَنَفۡسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝ فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوٰىهَا ۝ قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰىهَا ۝

(الشمس : ۷-۱۰)

قسم ہے ہر نفس کی اور اس کو ٹھیک بنانے کی۔ پھر ہم نے اس کو الہام کردی (یا سوجھادی) اس کی نیکی اور بدی۔ تو کامیاب ہوا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک و صاف رکھا۔ اور ناکام ہوا وہ جس نے اس کو مٹی میں ملادیا (گندہ کردیا)۔

الغرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیم کی رو سے انسانی فطرت کو پیدائش کے ساتھ ہی گناہ گار اور عصیاں کار نہیں ٹھہرایا گیا ہے بلکہ اس کی اصلی فطرت میں ہدایت اور صحیح الہام ودیعت ہے۔ اسی لیے یہ کہا گیا :

فَاَقِمۡ وَجۡهَكَ لِلدِّيۡنِ حَنِيۡفًا ؕ فِطۡرَتَ اللّٰهِ الَّتِىۡ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيۡهَا ؕ لَا تَبۡدِيۡلَ لِخَـلۡقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيۡنُ الۡقَيِّمُ ۙ وَلٰـكِنَّ اَكۡثَرَ النَّاسِ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۝

(الروم : ۳۰)

سو تو باطل سے ہٹ کر اپنے آپ کو دین پر سیدھا قائم رکھ، وہی اللہ کی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا۔ خدا کے بنائے میں بدلنا نہیں۔ یہی سیدھا دین ہے لیکن بہت لوگ نہیں جانتے۔

یہ دینِ فطرت، اسلام اور اس کی تعلیمات ہیں جن کی بنیادی چیز توحید ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ "ہر بچہ دینِ فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ جس طرح ہر جانور کا بچہ اصل میں صحیح د

سالم پیدا ہوتا ہے وہ کن کٹا نہیں پیدا ہوتا[1]۔" اسی طرح انسان کا بچہ بھی اپنی صحیح فطرت اور صالح خلقت پر پیدا ہوتا ہے۔ وحیِ محمدیؐ نے اسی مسئلہ کو ایک اور ازلی مکالمہ کی صورت میں بیان کیا ہے۔ انسان کی موجودہ جسمانی پیدائش کے سلسلہ سے پہلے اللہ تعالیٰ نے انسانی ارواح سے دریافت فرمایا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ "کیا میں تمہارا پروردگار نہیں؟" انہوں نے اپنی زبانِ حال یا قال سے بالاتفاق جواب دیا بَلٰى "ہاں بیشک تو ہمارا پروردگار ہے"۔ یہی ازلی اور فطری اعترافِ انسان کا وہ عہد ہے جس کو قرآن نے بار بار یاد دلایا ہے اور کہا ہے کہ "دیکھو شیطان نے تمہارے باپ آدم کو بہکایا تھا، تو تم اس کے بہکانے میں نہ آؤ"۔

ان تعلیمات کا لازمی نتیجہ یہ عقیدہ ہے کہ انسان اپنی اصل فطرت میں معصوم اور بے داغ پیدا ہوتا ہے۔ وہ پیدا ہونے کے ساتھ اپنے باپ کے موروثی گناہ کا پشتارہ اپنی پیٹھ پر لاد کر نہیں لاتا۔ قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (الفاطر: ۱۸)	اور ایک کے گناہ کا بوجھ دوسرا نہیں اُٹھاتا۔
كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ۝ (الطور: ۲۱)	ہر نفس اپنے ہی عمل میں گروی ہے۔

اور اسی کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الا لا یجنی جانٍ علی ولدہٖ ولا مولودٌ علی والدہٖ[2]۔	ہاں باپ کے جرم کا بیٹا ذمہ دار نہیں اور نہ بیٹے کے جرم کا باپ۔

---

[1] صحیح بخاری و مسلم، کتاب الایمان۔ [2] سنن ابن ماجہ کتاب الحج، باب الخطبہ یوم النحر۔

اسی طرح اُن مذہبوں نے بھی جنہوں نے انسانوں کو آواگون اور تناسخ کے چکر میں پھنسا رکھا ہے انسانیت کی پیدائش کو ایک طرح سے گنہگار اور داغدار ہی ٹھہرایا ہے۔ انہوں نے انسانیت کی پیٹھ پر ایک بڑا بھاری بوجھ رکھ دیا ہے۔ اس کی ہر پیدائش کو دوسری پیدائش کا، ہر زندگی کو دوسری زندگی کا اور ہر جنم کو دوسرے جنم کا نتیجہ بتا کر اس کو اپنے پچھلے کرموں کے ہاتھوں میں مقید کر رکھا ہے یعنی اس سے پہلے کہ وہ پیدا ہو اس کے اعمال کا دفتر سیاہ ہو چکا ہوتا ہے۔

اب غور کیجیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی یہ تعلیم کہ انسان اصل فطرت میں بے گناہ اور بے داغ ہے غمگین دنیا کے لیے کتنی بڑی عظیم الشان خوشخبری ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیم اس سراسر ظلم اور بے انصافی کے عقیدہ سے پاک ہے کہ معصوم اور ناکردہ گناہ بچہ بھی گناہگار اور جہنم کا ایندھن ہے۔ آپ کی تعلیم یہ ہے کہ ہر بچّہ اپنے ہوش وحواس اور عقل وتمیز سے پہلے تک معصوم اور بے گناہ ہے۔ فرمایا کہ " خدا کا قلم بچّہ سے اس وقت کے لیے اٹھا دیا گیا جب تک وہ عقل وتمیز کو نہ پہنچے۔"[1]

باغِ ہستی کی یہ انسانی کلیاں جو بِن کھلے مرجھا گئیں اسلام کی نگاہ میں جنّت کے پھول ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ " جس مسلمان کے بچّے بچپن میں مر گئے وہ خدا کے دربار میں اپنے ماں باپ کے شفیع ہوں گے اور ان کو جنّت میں لے جائیں گے۔"[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے شیر خوار صاحبزادہ نے جب وفات پائی تو فرمایا " یہ جنّت میں جا کر جنّتی دایوں کا دودھ پیئے گا۔"[3] اس سے زیادہ یہ

---

[1] صحیح بخاری کتاب الطلاق، ترمذی فی من لایجب علیہ الحد۔

[2] صحیح مسلم باب فضل من یموت لہ ولد۔

[3] ابن ماجہ کتاب الجنائز۔

کہ مشرکین کے کم سن بچوں کی نسبت آپ سے دریافت کیا گیا کہ یہ بے گناہ کہاں رہیں گے فرمایا "خدا کو علم ہے، کہ یہ کیا ہوتے"[1]۔ لیکن دوسرے موقع پر اس کی تصریح فرمادی۔ ایک دفعہ رویاء میں حضرت ابراہیمؑ کو دیکھا کہ وہ جنّت میں بیٹھے ہیں اور ان کے چاروں طرف کمسن بچوں کا ہجوم تھا۔ فرمایا یہ وہ کمسن بچے تھے جو دینِ فطرت پر مرگئے۔ صحابہ نے پوچھا "یا رسولؐ اللہ! مشرکوں کے بچے"؟ فرمایا "اور مشرکوں کے بچے بھی"[2]۔ ان تصریحات کا نتیجہ یہ تھا کہ بعض صحابہ کمسنی میں مرجانے والے بچہ کو بہ تخصیص جنّتی کہہ اٹھتے تھے لیکن چونکہ غیب پر حکم لگانا صرف خدا کا کام ہے اس لیے تصریحاً کسی خاص بچہ کی نسبت ایسا کہہ دینا آپؐ نے مناسب نہیں سمجھا۔ ایک دفعہ ایک صحابی کا بچہ مرگیا تھا، امّ المومنین حضرت عائشہؓ نے اس سانحہ کو سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی "یا رسولؐ اللہ! اس کو مبارک ہو۔ یہ جنّت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا تھی۔ نہ گناہ کیا نہ گناہ کرنے کا زمانہ پایا"۔ فرمایا "اے عائشہ! اللہ تعالےٰ نے جنّت کے لیے کچھ لوگ پیدا کیے ہیں اور جہنم کے لیے کچھ لوگ"[3]۔ ایک طرف عیسائیت ہے جو بپتسمہ پانے سے پہلے مرجانے والے کمسن بچوں کو جہنم میں جھونکتی ہے دُوسری طرف اسلام ہے جو اُن کے لیے جنّت کا دروازہ کھولتا ہے اور اُن کے جنازہ کی نماز میں یہ دعا مانگنے کی تعلیم دیتا ہے "خداوندا! اس کو میرے لیے پیشگی کا ذخیرہ بنانا، اس کو میرا ایسا شافع بنانا جس کی شفاعت تیری بارگاہ میں مقبول ہو"۔ احادیث میں ایسے موقعوں پر جب کسی ایک نیک عمل سے سارے گناہوں کے معاف ہوجانے کا ذکر آتا ہے، اکثر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فقرہ استعمال کیا ہے کہ "وہ پھر ایسا معصوم ہوجاتا ہے کہ گویا اُس کی ماں نے اُس کو آج ہی جنا ہے"[4]۔

---

[1] صحیح مسلم کتاب القدر۔ [2] صحیح بخاری کتاب التعبیر، باب التعبیر الرویا بعد صلوٰۃ الصبح۔ [3] یہ حدیثیں صحیح مسلم کتاب القدر میں ہیں، نیز امام نووی کی شرح مسلم میں بھی یہ باب دیکھو اور باب فضل من یموت لہ ولد، جلد ۲ صفحہ ۳۲ و ۳۷ نولکشور۔ [4] صحیح مسلم باب الاوقات التی نہی عن الصلوٰۃ فیہا، و صحیح بخاری و مسلم و ترمذی کتاب الحج۔

خوف و رجا اسی مسئلہ کے قریب قریب ایک اور مسئلہ ہے۔ یونان کے فلسفیوں میں دو گروہ گزرے ہیں۔ ایک کو رونے والے فلسفی دوسرے کو ہنسنے والے فلسفی کہتے ہیں۔ پہلا گروہ وہ ہے جو ہر واقعہ سے نا اُمیدی اور مایوسی کا نتیجہ پیدا کرتا ہے اس کو دنیا تمام تر تاریک اور خارزار نظر آتی ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جس کو دنیا میں چہل پہل، عیش و آرام اور بہار و رونق کے سوا کچھ سوجھائی نہیں دیتا۔ پہلے گروہ کی تعلیم یہ ہے کہ خاموش رہو اور زندگی میں موت کی صورت بنالو کہ دنیا کی آخری منزل یہی ہے۔ دوسرے کا نظریہ یہ ہے کہ کھاؤ پیو اور خوش رہو اور کل کے غم کی فکر نہ کرو۔ اخلاقی لحاظ سے یہ دونوں رائیں ترمیم کے قابل ہیں۔ پہلے نظریہ پر اگر یقین ہو تو انسان کے تمام قوٰی سرد ہو کر رہ جاتے ہیں اور وہ دنیا میں کسی کام کے سرانجام دینے کا اہل نہیں باقی رہتا اور جو دوسرے عقیدہ پر ایمان رکھتا ہے وہ بادۂ غفلت میں مست و سرشار ہوتا ہے اور اس کو نیک و بد کی تمیز نہیں رہتی۔ اسلام کی تعلیم کی شاہراہ ان دونوں گلیوں کے بیچ سے نکلی ہے۔ وہ ایک طرف دنیا کی فنا اور زوال کا قصہ بار بار سناتا ہے کہ دل بادۂ غفلت میں سرشار نہ ہو اور دوسری طرف وہ اس کو خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہونے دیتا۔ وہ اخیر وقت تک خدا کے سہارے جینے کی تعلیم کرتا ہے۔ اُس کی شریعت میں خدا سے نا امیدی اور کفر ایک ہے۔ وہ ایک مسلمان کے دل کو مشکل سے مشکل اوقات میں بھی نا اُمید بنا کر بے سہارا نہیں ہونے دیتا۔ قرآن پاک میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرشتہ کی زبانی کہا گیا:

فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْقَانِطِيْنَ ۝ (الحجر:۵۵) ابراہیم! نا امیدوں میں سے نہ بن۔

پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کی زبانی تعلیم ملی:

وَلَا تَايْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ اور اللہ کے فیض سے نا اُمید مت ہو۔

لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ	اللہ کے فیض سے نا امید وہی ہیں جو
الْكٰفِرُوْنَ ○ (یوسف: ۸۷)	خدا کے منکر ہیں۔

اس اُمت کے گنہگاروں کو کس پیار سے خطاب ہوتا ہے:

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى	اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنی
اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ	جانوں پر آپ ظلم کیا، تم خدا کی رحمت
اللّٰهِ ؕ (الزمر: ۵۳)	سے نا امید مت بنو۔

اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں انسان کو ہمیشہ پر اُمید رہنے کی تاکید کی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ "میں اپنے بندہ کے گمان کے پاس رہتا ہوں[1]"، یعنی جیسا وہ میری نسبت گمان کرتا ہے وہی اس کے لیے ہو جاتا ہوں۔ اس بارہ میں اسلام کے عقیدہ کی صحیح آئینہ دار یہ آیتِ کریمہ ہے:

اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا	بھلا ایک وہ جو بندگی میں لگا ہے،
وَّقَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا	رات کی گھڑیوں میں سجدہ کرتا ہے اور
رَحْمَةَ رَبِّهٖ ؕ	کھڑا ہوتا ہے، آخرت سے ڈرتا ہے
(الزمر: ۹)	اور اپنے رب کی رحمت کا اُمیدوار ہے۔

یعنی اُس کے دل میں یہ دونوں کیفیتیں یکجا ہیں۔ گناہوں اور تقصیروں کے مواخذہ اور باز پرس کا ڈر بھی ہے اور خدا کی رحمت کی امید کا سہارا بھی ہے۔ خدا کے غضب سے ڈرنا اور اس کی رحمت کا امیدوار رہنا یہی اسلام کی تعلیم ہے۔ یہ ڈر اس کو غافل، بیباک اور گستاخ نہیں ہونے دیتا اور یہ اُمید اس کو مایوس، غمزدہ اور شکستہ خاطر نہیں ہونے دیتی اسی لیے ایک مسلمان کا دِل

---

[1] جامع ترمذی، کتاب الزہد باب فی حسن ظن باللہ تعالیٰ۔

ہمیشہ سوء انجام سے خائف لیکن توقعات سے لبریز رہتا ہے۔اسی کی طرف اشارہ کرکے قرآن اہلِ ایمان سے کہتا ہے :

وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ۚ (النساء: ۱۰۴) اور تم کو تو خدا سے وہ امید ہے جو کافروں کو نہیں۔

یہی وہ ذہنی فرق ہے جو مشکلات کے عالم میں ایک مومن اور ایک کافر کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔کافر اپنے ہر کام اور ہر عمل کی دنیاوی جزا کا خواہاں ہے اور جب وہ اُس کو نہیں پاتا تو دل شکستہ ہو جاتا ہے۔وہ کامیابی صرف مادی ہی کامیابی کو سمجھتا ہے اور جب وہ نہیں ملتی تو افسردہ ہو جاتا ہے۔ لیکن مومن اگر ظاہری اور دنیا کی مادی کامیابی سے ہم آغوش نہیں بھی ہوتا تب بھی اس کا دل شاداں اور فرحاں رہتا ہے کہ اس نے نیکی کا کام کیا اور ہر حال اس نیکی کا یہاں نہیں تو وہاں معاوضہ ضرور ملے گا۔اگر دنیا کی کامیابی نصیب نہ ہوئی تو نہ ہو خدا کی خوشنودی اور ثواب تو بہر حال ملے گا۔ اسی یقین کا نتیجہ ہے کہ اُس نے مسلمانوں کو ہر نیک کام میں جری اور بہادر بنا دیا ہے اور اُن کو بغیر کسی مادی غرض کے اخلاص کے ساتھ کام کرنا سکھا دیا ہے۔اسی کا اثر ہے کہ دنیا کی تمام غیر اسلامی قوموں میں ناکامی اور ناامیدی کی خودکشیوں کا عام طور سے رواج ہے۔ ہندوستان میں ہندو عورتوں کے جان دینے کے واقعات ہر روز اخبارات میں پڑھے جاتے ہیں۔یورپ اور امریکہ کے متمدن ملکوں میں ذرا ذرا سی ناامیدی پر خودکشی کر لینا ایک معمولی واقعہ بن گیا ہے۔جس وقت یہ سطریں لکھ لکھ رہا ہوں وارسا (پولینڈ) میں ناکام نوجوان لڑکیوں کو خودکشی پر آمادہ کرنے کی ایک مجلس کے قیام کی خبریں اخباروں میں چھپ رہی ہیں۔مگر کسی مسلمان میں اخیر سے اخیر لمحہ میں بھی ناامیدی کا یہ جذبہ پیدا نہیں ہوتا اور خدا کے فضل و کرم سے اُس کی آس نہیں ٹوٹتی۔امید

ہو کہ غریب، تندرست ہو کہ بیمار، اولاد والا ہو کہ بے اولاد کامیاب ہو یا ناکام، دولتمند ہو یا دیوالیہ، ہر حالت میں وہ پر اُمید رہتا ہے۔ مشکلات میں، بیماریوں میں، محتاجیوں میں، ناکامیوں میں، ہر وقت وہ ہمت کے ساتھ خدا کی رحمت کا امیدوار ہے اور یقین رکھتا ہے کہ نا اُمیدی اور کفر دونوں اس کے مذہب میں ایک ہیں اور اس کے عمل کا معاوضہ اگر یہاں نہیں تو وہاں ضرور ہے کہ اس کے خدا کا یہ وعدہ ہے کہ

اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ (آل عمران: ۱۹۵) میں تم میں سے کسی کام کرنے والے کے کام کو ضائع نہیں کرتا۔

اخلاق اور رہبانیّت

اخلاق درحقیقت انسانوں کے باہمی تعلّقات میں خوش نیّتی اور اچھائی برتنے کا نام ہے یا یوں کہیے کہ ایک دوسرے پر جو انسانی فرائض عائد ہیں ان کو ادا کرنے کو کہتے ہیں۔ اخلاق کی اس حقیقت ہی سے یہ واضح ہے کہ اخلاق کے وجود کے لیے باہم انسانوں میں تعلقات اور وابستگی کا وجود ضروری ہے جو رہبانیّت، تجرّد اور جوگی پن میں نہیں پائی جاتی ہے۔ اسی لیے گوشہ نشینی، عزلت گزینی، خلق سے کم آمیزی، جماعت سے علیحدگی، اہل وعیال، عزیز وقریب اور دوست واحباب کے تعلّقات سے آزادی، اخلاق کے استعمال کے موقع ہی کو کھو دیتی ہے یا کم کر دیتی ہے۔

اس مسئلہ پر بحث کی ضرورت اس لیے ہے کہ خلق سے قطعِ تعلّق اور گوشہ نشینی نے مذہب میں اکثر نیکی اور دین داری کی بہترین شکل کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ اسلام سے پہلے راہب اور جوگی اسی اصول پر اپنی زندگی بسر کرتے تھے اور وہ خود اور ان کے عقیدتمند بھی اس کو ان کی انتہائی نیکوکاری اور دینداری قرار دیتے تھے لیکن حقیقۃً ان مذہبی افراد

اور جماعتوں نے زیادہ تر اس پردہ اور حجاب کو اس لیے اختیار کیا کہ اس سے ایک طرف اپنے کو عام نظروں سے چھپا کر بادشاہوں کی طرح اپنے رعب و اثر کو نمایاں کرنے اور اپنے کو بالاتر ہستی تصوّر کرانے میں مدد ملے اور دوسری طرف اپنی زندگی کو زیرِ پردہ رکھ کر جھوٹا تقدس اور جھوٹی دینداری کا ڈھونگ کھڑا کرسکیں اور تیسری طرف اپنی اس عزلت نشینی کے جھوٹے عذر کی بنا پر کسی ملامت کا نشانہ بنے بغیر اہل و عیال، اعزہ و اقارب، دوست و احباب اور قوم و ملّت کے فرائض و حقوق بجا لانے کی تکلیف سے بچ جائیں۔ اسی لیے اسلام نے اپنے اصولِ اخلاق میں راہبانہ، جوگیانہ اور مجرّدانہ زندگی کی ہمّت افزائی نہیں کی ہے۔ نبوّت کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی پوری ۲۳ برس کی زندگی اسی مجمعِ انسانی میں رہ کر اور تمام تر انسانی جدوجہد میں شریک ہو کر گزاری ہے۔ یہی طرزِ عمل خلفائے راشدینؓ اور چند کے سوا تمام اکابر صحابہ کا تھا اور پورا قرآن پاک اسی انسانی جدوجہد اور انسانی مجمع کے ساتھ عملِ صالح کی تعلیم سے بھرا ہوا ہے۔ تجرّد، علیحدگی، خلوت نشینی ترکِ عمل اور ترکِ جماعت کے لیے ایک اشارہ بھی پورے قرآن میں موجود نہیں ہے۔

یہ بالکل ظاہر ہے کہ جماعتی حقوق اور فرائض جماعتوں کے اندر ہی رہ کر ادا ہو سکتے ہیں اُن سے ہٹ کر نہیں۔ وہ لوگ جو آبادی سے دور کسی جنگل یا ویرانہ میں گوشہ گیر اور عزلت نشین ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں کیا وہ جماعتی مشکلات کو حل کرتے ہیں؟ کیا وہ قوم کی اخلاقی نگرانی کا فرض انجام دیتے ہیں؟ کیا وہ غریبوں کا سہارا بنتے ہیں؟ کیا وہ یتیموں کے سرپرست ہیں؟ کیا وہ خلقِ الٰہی کی کوئی خدمت کرتے ہیں؟ کیا وہ لوگوں کو گمراہی اور ضلالت سے بچاتے ہیں؟ کیا وہ اپنے دست و بازو سے اپنی روزی کماتے ہیں؟ کیا وہ تبلیغ و دعوت، تعلیم و موعظت، امر بالمعروف نہی عن المنکر، اور جہاد جیسے فریضوں سے عہدہ برآ ہیں،

حالانکہ اخلاقی عبادتوں کے یہی بہترین مواقع ہیں۔ اسی لیے اسلام کی نظر میں نجات طلبی کا عموماً یہ مستحسن طریقہ نہیں۔ قرآنِ پاک میں ہے :

قُوٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (التحریم : ۶)

تم اپنے کو اور اہل وعیال کو بھی دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔

یعنی انسان کا فرض اپنے ہی کو آگ سے بچانا نہیں بلکہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی بچانا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صریح طور سے تمام مسلمانوں کو خطاب کرکے فرمایا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ "تم میں سے ہر ایک دوسرے کا ذمہ دار اور نگران ہے اور اس سے اُس کی ذمہ داری اور نگرانی میں آئے ہوئے لوگوں کی نسبت پوچھا جائے گا۔ امیر اپنی رعیّت کا چرواہا، مرد اپنے اہل وعیال کا رکھوالا اور بیوی اپنے شوہر کے گھر کی نگہبان ہے[1]" جماعتی مصیبتیں جب آتی ہیں تو کنارہ گیر اشخاص کو بھی نہیں چھوڑتیں۔ یہ آگ اندر اور باہر سب کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے اسی لیے وحیِ محمدیؐ نے اس نکتہ کو علی الاعلان ظاہر کر دیا اور کہا :

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ج (الانفال : ۲۵)

اور اس فساد سے بچو جو کہ صرف گنہگاروں ہی پر نہیں پڑے گا۔

بلکہ اس کی لپیٹ گنہگار و بے گناہ سب تک پہنچے گی کہ اگر جماعت اپنے تمرّد کی مجرم ہوئی ہے تو کنارہ گیر اپنے تبلیغ کے فرض سے غافل رہے۔ چنانچہ قرآنِ پاک میں اصحابِ سبت کے قصہ میں ان کنارہ گیر اور فرضِ تبلیغ سے بے پروا رہنے والے اشخاص کو بھی گنہگاروں ہی میں شامل کیا ہے۔

---

[1] صحیح بخاری جلد دوم کتاب النکاح باب المرأة راعیة فی بیت زوجها۔ ص ۷۸۳۔

دنیا درحقیقت جد وجہد اور دار وگیر کا ایک میدان ہے جس میں تمام انسان باہمی معاونت سے اپنا اپنا راستہ طے کر رہے ہیں۔ راستہ میں سب لوگوں کے ساتھ چلنے میں یقیناً بہت کچھ تکلیفیں ہیں۔ ہر ایک کو دوسرے کی تکلیف و آرام کا خیال ولحاظ کرنا پڑتا ہے اسی لیے وہ شخص جو ان جماعتی مشکلات سے گھبرا کر الگ ہوجاتا ہے اور صرف اپنا بوجھ اپنے کندھے پر رکھ کر چل کھڑا ہوتا ہے، دنیا کے معرکہ کا ایک نامرد سپاہی ہے۔ بیہقی نے شعب الایمان میں اور ترمذی نے جامع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت نقل کی ہے:

ان المسلم الذی یخالط الناس ویصبر علی اذاھم افضل من الذی لا یخالط الناس ولا یصبر علی اذاھم۔[1]	وہ مسلمان جو لوگوں میں مل جل کر رہتا ہے اور ان کی تکلیف دہی پر صبر کرتا ہے اس سے بہتر ہے جو لوگوں سے نہیں ملتا اور ان کی تکلیف دہی پر صبر نہیں کرتا۔

گوشہ گیری اور جماعت سے علیحدگی کی اجازت اسلام نے صرف ایک ہی موقع پر دی ہے کہ جماعت کا قوام اتنا بگڑ جائے کہ ان کا کوئی مرکزی نظام باقی نہ رہے اور فتنہ و فساد کے شعلے اتنے بھڑک چکے ہوں کہ ان کا بجھانا قابو سے باہر ہوجائے تو ایسے وقت میں وہ اشخاص جو اس فساد کے روکنے اور اس آگ کے بجھانے کی طاقت اپنے میں نہ پائیں وہ مجمع سے الگ ہوجائیں۔ فتنہ میں عزلت نشینی کی حدیثیں اسی موقع سے تعلق رکھتی ہیں ورنہ ہر قوی ہمت مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس حالت میں تبلیغ اور امر معروف کے فرض کو ادا کرکے جماعت کے بچانے میں پوری کوشش صرف کردے یہی وہ نمونہ ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] شعب الایمان بیہقی وجامع ترمذی، کتاب الزہد صفحہ ۴۱۲۔

نے دنیا میں پیش کیا اور تمام بڑے بڑے صحابہ نے اپنے اپنے دائرہ میں اسی کی پیروی کی۔

آپؐ نے فرمایا کہ "بدی کو اپنے ہاتھ سے روکنا اور مٹانا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اگر ہاتھ سے نہ مٹا سکے تو زبان سے مٹائے۔ اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو اس کو دل سے برا سمجھے اور یہ سب سے کمزور ایمان ہے"[1]۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

اسلام کے اس اصولِ اخلاق کو پیشِ نظر رکھنے سے اسلام کا ایک دوسرا اخلاقی اصول بھی خود بخود سامنے آجاتا ہے کہ تعلیم محمدیؐ میں جماعت کے افراد پر ان کی قوت کے بقدر جماعت کے دوسرے افراد کی نگرانی فرض ہے۔ اسی اخلاقی فرض کا شرعی نام "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" (یعنی اچھی باتوں کے لیے کہنا اور بری باتوں سے روکنا) ہے، قرآن پاک نے مسلمانوں کا یہ ممتاز وصف قرار دیا ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران: ۱۱۰)

تم سب سے بہتر امت ہو جو لوگوں کے لیے باہر لائی گئی۔ اچھی بات کا حکم دیتے ہو اور بری بات سے روکتے ہو۔

يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (التوبۃ: ۷۱)

وہ اچھی بات کا حکم دیتے ہیں اور بری بات سے باز رکھتے ہیں۔

پھر خاص طور سے حکم ہوا:

وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ

اچھی بات کا حکم دے اور بری بات

---

[1] صحیح مسلم کتاب الایمان۔

اَلْمُنْكَرِ (لقمان: ۱۷)	سے روک ۔

مسلمانوں کی تصویر یہ ہے کہ

وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ ۝ (البلد: ۱۷)	اور آپس میں ثابت قدم رہنے اور مہربانی کرنے کی ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں ۔
وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝ (العصر: ۳)	اور وہ آپس میں سچائی اور ثبات قدم کی ایک دوسرے کو نصیحت کرتے ہیں ۔

یہ وہ تعلیم ہے جو تمام دنیا کے مذاہب میں اسلام کی اخلاقی نگرانی کے اصول کو نمایاں کرتی ہے اور قوی دل اور قوی ہمت افراد کا یہ فرض قرار دیتی ہے کہ وہ جماعت اور سوسائٹی کے مزاج اور قوام کی نگہبانی اور اس کے بگاڑ کی دیکھ بھال کرتے رہیں ۔

توراۃ میں قابیل کا یہ فقرہ کہ "کیا میں اپنے بھائی کا رکھوالا ہوں؟"[1] عیسائی مذہب کے اخلاق کا ایک اہم اصول بن گیا ہے ۔ اسی اخلاقی اصول نے یورپ کے اس قانونی مسئلہ کی صورت اختیار کر لی ہے جس کا نام "شخصی آزادی کی بحالی" ہے ۔ لیکن اسلام کے قانون میں اس کے برخلاف واقعی ہر شخص اپنے بھائی کا رکھوالا بنایا گیا ہے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف طور پر فرمایا جیسا کہ ابھی گزرا کہ کلکم راعٍ وکلکم مسئول عن رعیتہ "تم میں ہر شخص نگہبان ہے اور تم میں ہر شخص سے اس کے زیرِ ذمہ داری لوگوں کی نسبت باز پرس ہوگی"۔ قرآن پاک میں صراحت کے ساتھ لوگوں کو نیکی کی ہدایت کرنے اور بدی سے بچنے اور باز رکھنے

---

[1] سفر تکوین ۔ ۴ ۔ ۹ ۔

کا فرض مسلمانوں پر واجب ٹھہرایا گیا ہے تاکہ سوسائٹی کی شرم اور جماعت کا خوف لوگوں کی نیک چلنی کا ضامن ہو سکے اور ساتھ ہی جماعت کا ہر فرد اپنے دوسرے بھائی کو ضلالت کی تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لانے کا ذمہ دار ٹھہرے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالےٰ نے بنی اسرائیل کا ایک قصہ بیان فرمایا ہے۔ بنی اسرائیل کے لیے سبت کے دن کسی قسم کا دنیاوی کام کرنا حرام تھا۔ بنی اسرائیل کی ایک آبادی سمندر کے کنارہ آباد تھی وہ حیلہ کر کے سبت کے دن مچھلی پکڑ لیتی تھی۔ اس موقع پر اس آبادی میں تین گروہ ہو گئے۔ ایک وہ جو اس گناہ کا علانیہ مرتکب ہوتا تھا، دوسرا وہ جو اس فعل سے ان کو باز رکھنے کی کوشش کرتا تھا اور اُس کو سمجھاتا تھا تیسرا وہ جو گو اس فعل میں شریک نہ تھا لیکن ان کو سمجھانے اور باز رکھنے کی کوشش بھی نہیں کرتا تھا بلکہ خود سمجھانے والوں سے کہتا تھا کہ ایسے ناشنوا لوگوں کو سمجھانے سے کیا فائدہ جن کو اللہ تعالےٰ اُن کے اس جرم کی پاداش میں ہلاک کرنے والا ہے۔ لیکن اُن پر جب عذاب الٰہی آیا تو صرف دوسرا گروہ بچ گیا جو اپنے تبلیغ کے فرض کو ادا کر رہا تھا بقیہ پہلا اور تیسرا گروہ برباد ہو گیا۔ پہلا تو اپنے گناہ کے بدولت اور تیسرا اپنے فرض تبلیغ کو ترک کرنے کے سبب سے۔ سورۂ اعراف کے بیسویں رکوع میں یہ پورا قصہ مذکور ہے۔ آخر میں ہے:

وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ	اور جب ان میں سے ایک فرقہ
قَوْمَا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ	بولا کہ تم کیوں ایسے لوگوں کو نصیحت
عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ قَالُوْا مَعْذِرَةً	کرتے ہو جن کو خدا برباد کرنے والا
اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝ فَلَمَّا	یا سزا دینے والا ہے۔ انہوں نے
نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖٓ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ	جواب دیا کہ ہم تمہارے ربّ کے

يَنۡهَوۡنَ عَنِ السُّوۡٓءِ وَ اَخَذۡنَا الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا بِعَذَابٍۢ بَئِيۡسٍۢ بِمَا كَانُوۡا يَفۡسُقُوۡنَ ۝

آگے اپنے سے الزام اتارنے کے لیے اُن کو نصیحت کرتے ہیں اور شاید کہ یہ نیک بن جائیں۔ تو جب وہ بھول گئے جو ان کو سمجھایا گیا تھا تو ہم نے ان کو جو منع کرتے تھے بچا لیا اور گنہگاروں کو ان کی بے حکمی کے سبب بڑے عذاب میں پکڑا۔

(الاعراف: ۱۶۴-۱۶۵)

یہ قصہ بتاتا ہے کہ اسلام کی نظر میں اپنے دوسرے بھائیوں کو گرنے سے بچانا اور گرتوں کو سنبھالنا اور سہارا دینا کتنا اہم ہے اور اس کے اخلاقی فرائض کا یہ کیسا ضروری حصہ ہے کہ اگر اس کو ادا نہ کیا جائے تو وہ بھی ایسا ہی گنہگار ہے جیسا وہ جو اس فعل کا مرتکب ہوا۔ البتہ بھائی کا فرض اُس کو سمجھا دینے اور بتا دینے کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ زبردستی منوا دینا اس کا فرض نہیں اور اُس کا کیا بلکہ خود رسُول کا بھی یہ فرض نہیں فرمایا:

مَا عَلَى الرَّسُوۡلِ اِلَّا الۡبَلٰغُ

رسُول کا کام فقط پیام پہنچا دینا ہے۔

(المائدة: ۹۹/ النور: ۵۴)

اگر یہ فرض ادا ہو گیا تو اس کے سر سے ذمہ داری اتر گئی اسی لیے سورۂ مائدہ میں فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا عَلَيۡكُمۡ اَنۡفُسَكُمۡ‌ۚ لَا يَضُرُّكُمۡ مَّنۡ ضَلَّ اِذَا اهۡتَدَيۡتُمۡ‌ؕ

اے ایمان والو! تم پر اپنی جان کی فکر لازم ہے۔ تم اگر سیدھے راستہ پر ہو تو جو کوئی بھٹکا وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑتا۔

(المائدة: ۱۰۵)

حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اس آیتِ پاک کو پڑھ کر لوگوں سے کہا کہ "لوگو! تم کو اس آیت کے ظاہری معنی دھوکے میں نہ ڈالیں کہ میں نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو کہتے سنا ہے کہ اگر ظالم کو ظلم کرتے لوگ دیکھیں اور پھر اس کے دونوں ہاتھ نہ پکڑ لیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ سب کے سب عذاب میں گرفتار ہو جائیں"۔ ایک دوسرے صحابی ابو ثعلبہؓ سے اس آیت کے معنی پوچھے گئے تو جواب دیا کہ میں نے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے اس کے معنی دریافت کیے تو فرمایا کہ "نہیں بلکہ نیکی کا باہم حکم کرو اور بدی سے ایک دوسرے کو روکو۔ لیکن جب دیکھو کہ حرص اور بخل کی اطاعت ہے اور خواہشِ نفسانی کی پیروی ہے اور دنیا کو دین پر ترجیح دی جا رہی ہے اور ہر ایک اپنی رائے پر آپ مغرور ہے تو اُس وقت عوام کو چھوڑ کر اپنی خبر لو کہ تمہارے بعد وہ زمانہ آنے والا ہے جس میں ثابت قدم رہنا شعلہ کو ہاتھ سے پکڑنا ہے"۔[1]

ان تعلیمات نے اخلاق کے اس غلط اصول کو کہ "کیا میں اپنے بھائی کا رکھوالا ہوں" منسوخ کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب تک اخلاقی تعلیمات کو جماعت اپنے ہاتھ میں نہیں رکھے گی ان کی حفاظت نہیں ہو سکتی۔ قوموں کے رسوم و آداب اور ایٹیکیٹس اسی اصول پر قائم ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ بظاہر اخلاقی امور ہر شخص کے پرائیویٹ اور نجی کی باتیں معلوم ہوتی ہیں جن کا نفع و نقصان کرنے والے کی ذات تک محدود ہے۔ مگر ذرا گہری نظر سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ ان کے اثرات اور نتائج پوری سوسائٹی کو متاثر کرتے ہیں۔ ان کا اثر ایک سے دوسرے تک اور دوسرے سے تیسرے تک پہنچتا ہے اور اسی طرح رفتہ رفتہ پوری سوسائٹی میں پھیل جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر ان کی روک تھام نہ کی جائے تو ان بُرائیوں کی بُرائی نہایت ہلکی ہو کر رہ جاتی ہے اور لوگ اس کو ایک معمولی بات سمجھنے لگتے ہیں اور آہستہ

---

[1] یہ دونوں حدیثیں ترمذی کتاب التفسیر (المائدہ) میں ہیں، صفحہ ۴۹۸، ۴۹۹۔

آہستہ یہ زہر اتنا پھیلتا ہے کہ ان بُرائیوں کا بُرا ہونا بھی مشکوک معلوم ہونے لگتا ہے۔ اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند روز میں پوری قوم کا اخلاقی مزاج فاسد ہوجاتا ہے اور وہ اپنی بلندی کے معیار سے نیچے گرجاتی ہے۔ ترمذی میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی مجلس میں فرمایا کہ "بنی اسرائیل میں اخلاقی تنزّل اسی طرح شروع ہوا کہ جب ان میں بُرائی پھیلنے لگی تو پہلے تو اُن کے علما نے منع کیا لیکن جب وہ نہ رُکے تو وہ اُن کے ساتھ بیٹھنے اٹھنے اور کھانے پینے لگے۔ صحبت کے اثر سے وہ بھی ایسے ہی ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ نے داؤدؑ اور عیسیٰؑ کی معرفت ان پر لعنت کی۔" اس کے بعد آپؐ سنبھل کر بیٹھ گئے اور فرمایا "نہیں جب تک تم ظالم کا ہاتھ نہ پکڑو، اور اس کو حق پر نہ جھکا دو۔"[1]

یہ ہے اس باب میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم!

اس کی چند شرائط

لیکن یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر جاہل و عامی کا فرض نہیں ہے کیونکہ اگر ایسا ہو تو وہ اس کے بہانہ سے فتنہ و فساد پیدا کردے گا۔ یہ حق سب سے اوّل اسی شخص کو حاصل ہے جو خود ان بُرائیوں سے بچا ہے۔ قرآن نے کہا:

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنسَوْنَ أَنفُسَكُمْ (البقرۃ۔ ۴۴) — کیا تم دوسروں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو۔

اسی طرح یہ ضروری ہے کہ نصیحت اور فہمایش خوش اسلوبی، نرمی اور مصلحت کے ساتھ کی جائے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا:

اُدْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ — تو اپنے رب کے راستہ کی طرف

---

[1] جامع ترمذی تفسیر مائدہ۔

وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ (النحل: ۱۲۵) دانائی سے اور اچھی نصیحت سے بُلا۔

حضرتِ موسیٰ اور ہارون علیہما السّلام کو فرعون کے پاس بھیجا گیا تو کہہ دیا گیا:

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا (طٰہٰ: ۴۴) تم دونوں اس سے نرمی سے باتیں کرنا۔

ایک اور جگہ تعلیم دی گئی:

وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَّهُمْ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ اور تو اُن کو نصیحت کر اور اُن سے
قَوْلًا بَلِيْغًا ۝ (النساء: ۶۳) کہہ اُن کے دل تک پہنچ جانیوالی بات۔

یہ تمام احتیاطیں اور تاکیدیں اس لیے ہیں کہ لوگوں میں ضد اور کد نہ ہونے پائے اور نیکی کے بجائے بُرائی کا اندیشہ نہ پیدا ہو جائے۔

امن و امان کا قائم رکھنا امام کے ہاتھ میں ہے اس لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ایسے فوجدارانہ اور زبردستی کے تحکمانہ انتظامات جن کے لیے تنفیذی قوّت درکار ہے صرف حکومت کا فرض ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ ایک برائی کے روکنے کے لیے دوسری قسم کی اور بیسیوں برائیوں کا ارتکاب ہو جائے۔

تجسّس اور غیبت کی ممانعت

یہ بات کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اصل مقصد سوسائٹی کی اصلاح اور جماعت کی اخلاقی حفاظت ہے اس سے واضح ہوتی ہے کہ اسلام نے دوسروں کے ذاتی معائب کی تحقیق و تفتیش کی، جس کا نام تجسّس اور ٹوہ لگانا ہے، ممانعت کی ہے۔ کسی مسلمان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے مسلمان کے گھر گھس کر اُس کی حالت و کیفیت کی جستجو کرے۔ یہاں تک کہ اسلام کے لٹریچر کا یہ عام محاورہ بن گیا ہے کہ

محتسب را درونِ خانہ چہ کار

اس کا سبب یہی ہے کہ اس طریقۂ اصلاح سے فتنہ و فساد کا دروازہ کھل جاتا اور کوئی شخص اپنے گھر میں بھی محفوظ نہ رہتا۔ لیکن اس کی ممانعت کا اصلی راز یہ ہے کہ جو شخص گھر میں چھپ کر کوئی برا کام کرتا ہے اس کا اثر صرف اس کی ذات تک محدود رہتا ہے جماعت تک اس کا اثر نہیں پہنچتا۔ اس لیے جماعت کو اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ اور اسی کے ساتھ ایک اور نکتہ یہ ہے کہ جو شخص کوئی مخفی گناہ کرتا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں شرم وحیا کا جوہر ابھی موجود ہے جو ممکن ہے کہ آگے چل کر اس کی ہدایت کا سبب بن جائے۔ لیکن اگر لوگ اس کو چھپ چھپ کر دیکھتے پھریں تو ڈر ہے کہ ضد اور ہٹ کی بادِ تند سے اُس کے دل کی یہ دھندلی روشنی بھی گل نہ ہو جائے۔ اسلام میں کسی گھر یا کمرہ میں بے اجازت داخلہ کی جو ممانعت ہے اس کی علت بھی یہی ہے جیسا کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ظاہر فرما دیا ہے کہ انما الاذن لاجل الرؤیة ۔ یعنی کسی کے گھر میں داخلہ کی اجازت مانگنا اسی لیے ہے کہ وہ اُس کو نہ دیکھے۔

اس سلسلہ میں ایک اور اصول یہ ہے کہ اس کی غیبت نہ کی جائے یعنی اس کی برائی اس کے پیچھے دوسروں سے نہ کی جائے کہ یہ اصلاح کی تدبیر نہیں بلکہ ممکن ہے کہ اس کو جب یہ معلوم ہو تو واعظ و ناصح کی طرف سے اس کو ملال ہو اور اس میں مخالفت کی ضد پیدا ہو جائے اور پھر اس کی اصلاح کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے۔ چنانچہ وحیِ محمدیؐ نے اسی لیے تجسّس اور غیبت ان دونوں چیزوں کی قطعی طور سے ممانعت کی۔ فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا	اے ایمان والو! بہت سارے
مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَّ	گمانوں سے بچتے رہو کہ بے شک
لَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم	بعض گمان گناہ ہیں اور نہ کسی کا اندر

بَعۡضًا ؕ اَیُحِبُّ اَحَدُکُمۡ اَنۡ یَّاۡکُلَ لَحۡمَ اَخِیۡهِ مَیۡتًا فَکَرِهۡتُمُوۡهُ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِیۡمٌ ○

کا بھید ٹٹولا کرو اور نہ پیٹھ پیچھے کسی کو بُرا کہو۔ بھلا تم میں سے کوئی یہ پسند کرسکتا ہے کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ سو تم کو گھن آئے۔ اللہ سے ڈرو بے شبہ اللہ معاف کرنے والا مہربان ہے۔ (الحجرات: ۱۲)

پیٹھ پیچھے کسی کی بُرائی کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی مردہ لاش کا گوشت اپنے دانتوں سے نوچنا کہ جس طرح مردہ اپنے اُس جسم کی حفاظت نہیں کرسکتا وہ بھی جس کو تم اس کی غیر حاضری میں بُرا کہہ رہے ہو اپنے الزام کی مدافعت نہیں کرسکتا۔ اس غیبت کی ایسے قابلِ نفرت کام سے تشبیہ جس سے ہر انسان کو فطرۃً گھن آجائے اس سے زیادہ بلیغ نہیں ہوسکتی۔ اس کی کراہت کی یہ شدت اسی لیے اختیار کی گئی ہے کہ اس طریقہ سے امر بالمعروف کا فائدہ حاصل نہیں ہوسکتا اور نہ اس شخص کی جس کی غیبت کی جائے اصلاح ہوسکتی ہے اور نیز اس سے غیبت کرنے والے شخص کی اخلاقی کمزوری بر ملا ظاہر ہوتی ہے جو ایک مسلمان کی شانِ ایمان کے شایان نہیں۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "اگر تم لوگوں کی کمزوریوں کی ٹوہ لگاتے پھرو گے تو اُن کو برباد کردوگے"[1]

غور کیجیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیمات میں اخلاق کے کتنے لطیف نکتے پنہاں ہیں۔

توسط اور اعتدال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے یہودیت اور

---

[1] سنن ابی داؤد کتاب الادب، باب النہی عن التجسس۔

نصرانیت کا دور گذر چکا تھا اور دنیا ایک ایسے مذہب کا انتظار کر رہی تھی جو ان دونوں کا جامع ہو۔ اسلام دنیا کی اسی ضرورت کے پورا کرنے کے لیے آیا اور سلسلۂ نبوت کی ان دونوں بکھری ہوئی کڑیوں کو باہم ملا دیا۔

عدل و انصاف ایک ایسی چیز ہے جس نے دنیا کے نظام کو قائم رکھا ہے اور احسان و رفق و ملاطفت کی آمیزش نے اس کو اور بھی خوشنما بنا دیا ہے۔ لیکن اسلام سے پہلے مذہبی سیاست کے یہ دونوں جز بالکل الگ الگ تھے جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اب تک دنیا کا نظام غیر مکمل تھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت مجسم عدل ہے اس میں احسان و درگذر کی اخلاقی کشش بہت کم رکھی گئی ہے[۱]۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام مجسم رحمت کا پیام بن کر آئے۔ اُن کی شریعت میں عدل و انصاف کے قائم کرنے کی روح بہت کم پائی جاتی ہے[۲]۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت نے دنیا کے لیے عدل و انصاف کے جو اصول قائم کر دیے تھے اس کے مقابل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی اخلاقی تعلیم کا اعلان ان لفظوں میں فرمایا:

"تم نے یہ سنا ہوگا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت[۳]۔ لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ بُرائی کا بُرائی کے ساتھ مقابلہ نہ کرو بلکہ جو شخص تمہارے داہنے گال پر طمانچہ مارے اس کے سامنے دوسرا گال بھی حاضر کر دو۔ جو شخص لڑنے جھگڑنے میں تمہارے کپڑے پکڑ لے اس کو چادر بھی دیدو۔ جو شخص تم کو ایک میل تک بیگاری پکڑ لے جائے اس کے ساتھ دو میل تک چلے جاؤ۔ جو تم سے مانگے اس کو دو۔ جو تم سے قرض لینا چاہے اس کو واپس نہ کرو۔

---

[۱] یہود کی سنگدلی کے سبب سے۔ [۲] یہود کی قانونی لفظ پرستی کی اصلاح کے لیے۔ [۳] یہ موسوی شریعت کی طرف اشارہ ہے۔

تم نے یہ کہتے ہوئے سُنا ہوگا کہ اپنے عزیزوں سے محبت اور اپنے دشمنوں سے بغض رکھو لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو۔" (متی باب ۵)

حضرت عیسٰی علیہ السلام سے پہلے دنیا سے جو کچھ کہا یا سنا گیا تھا وہ حضرت موسٰی علیہ السلام کا قانون تھا جو بالکل عدل و انصاف پر مبنی تھا۔ لیکن اب جو کچھ دنیا حضرت عیسٰی علیہ السلام کی زبان مُبارک سے سُن رہی تھی وہ سراسر اخلاق، رحمت اور احسان تھا۔ لیکن اسلام نے عدل و احسان دونوں میں امتزاج پیدا کر کے دنیا کے نظامِ حکومت کو کامل تر کر دیا:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (النحل: ۹۰)

بے شبہ خدا عدل اور احسان (دونوں) کا حکم دیتا ہے۔

یہ ایک اصولی تعلیم تھی جس نے شریعتِ موسوی و عیسوی کی دو الگ الگ خصوصیتوں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔

عدل اور احسان

"عدل" اور "احسان" کے صحیح مفہوم کے سمجھنے کے لیے تھوڑی تفصیل کی ضرورت ہے۔ قانون کی بنیاد درحقیقت "عدل" پر ہے۔ "عدل" کے معنی "برابر" کے ہیں۔ جو شخص کسی کے ساتھ بُرائی کرے اُس کے ساتھ اتنی ہی بُرائی کی جائے، یہ عدل ہے اور اُس کو چھوڑ دینا اور معاف کر دینا اور درگذر کرنا یہ احسان ہے۔ اسلام میں ان دونوں کے الگ الگ مراتب ہیں۔ اس نے قانونِ عدل کو جماعت اور سلطنت کے ہاتھ میں دیا ہے یہ کسی ایک شخص کا کام نہیں ہے۔ اور احسان ہر شخص کے ہاتھ میں ہے اور یہ محض شخصی معاملہ ہے۔ قانونِ عدل ہی پر جماعت اور حکومت کا نظام قائم ہے۔ اگر اس کو مٹا دیا جائے تو جماعت اور حکومت کا شیرازہ بکھر جائے اور کسی کی جان و مال و آبرو سلامت نہ رہے۔ اس لیے قانون کو سرے

سے مٹانا، جیسا کہ پال نے عیسائیت کو اس رنگ میں پیش کر کے ہمیشہ کے لیے توراۃ کے قانونِ عدل کا خاتمہ کر دیا، کبھی دنیا کے لیے قابلِ عمل نہیں رہا۔ خود عیسائی سلطنتوں کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے کہ کسی قانونِ عدل کے بغیر صرف اخلاق کے بھروسہ پر زمین کے ایک چپہ پر بھی امن و امان قائم نہیں رہ سکا اور نہ برائیوں کی روک تھام ہو سکی۔

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ ایک شخص جب جماعت کے کسی فرد کا کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ گناہ درحقیقت اس شخص کا نہیں ہوتا بلکہ پوری جماعت کے نظام کا ہوتا ہے۔ اب اگر پہلی ہی دفعہ اس کی باز پُرس نہ کی جائے تو بہت ممکن ہے کہ وہ جرأت پا کر اسی گناہ کا ارتکاب جماعت کے کسی دوسرے فرد کے ساتھ کرے اس لیے کسی مظلوم کو اپنے ظالم کے معاف کر دینے کا پورا پورا حق نہیں ہے کیونکہ وہ اس طرح ایک فرد کے ساتھ نیکی کر کے جماعت کے ہزاروں لاکھوں افراد کے ساتھ گویا بُرائی کا ارتکاب کر رہا ہے۔ اس لیے اخلاق کو قانونِ عدل کی جگہ دینے میں بہت کچھ غور و فکر اور احتیاط کی ضرورت ہے جو شریعتِ محمدیؐ میں پوری طرح برتی گئی ہے کیوں کہ وہ دنیا کی دائمی شریعت بننے والی تھی۔

پھر سب لوگ دنیا میں ایک طبیعت اور فطرت کے پیدا نہیں ہوئے۔ بعض نیک نرم مزاج صابر اور متحمل پیدا ہوئے ہیں جن کے لیے معاف کر دینا، درگذر کرنا اور بدلہ نہ لینا آسان ہے۔ اور بعض غصہ ور، سخت مزاج اور تند خو پیدا ہوتے ہیں جو بدلہ اور بدلہ سے زیادہ لیے بغیر چین نہیں لے سکتے۔ ان کے لیے اتنی ہی اصلاح بہت ہے کہ بدلہ سے زیادہ کرنے سے ان کو روک دیا جائے اور "برائی برائی کے بقدر" کے اصول پر عمل کرنے کے لیے ان کو رضا مند کر لیا جائے۔ اس لیے ایک عالمگیر شریعت کے لیے، جو تمام دنیا کی اصلاح کے لیے آئی ہو، عدل اور احسان دونوں اصولوں کی جامعیت کی ضرورت تھی۔

قانون اور اخلاق

اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ دنیا میں امن وامان اور عدل وانصاف کے قیام اور فتنہ وفساد اور برائیوں کے انسداد کے لیے دو چیزیں ہیں، قانون اور اخلاق، اور گو ان دونوں کا منشا ایک ہی ہے مگر ان کے منزلِ مقصود تک پہنچنے کے راستے مختلف ہیں اور تنہا ان میں سے ہر ایک میں کچھ نہ کچھ کمی ہے جس کی تلافی دوسرے سے ہوتی ہے۔ قانون برائیوں کو تو روک دیتا ہے مگر دل میں اُس بُرائی کی طرف سے کراہت کا کوئی روحانی کیف پیدا نہیں کرتا جو انسانیت کی جان ہے۔ اور اخلاق پر عمل کرنے کے لیے ہر شخص کو بزور مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے اس کے ذریعہ عدل وانصاف کا قیام اور برائیوں کا استیصال کلیۃً نہیں ہو سکتا۔ توراۃ محض قانون ہے اور انجیل محض اخلاق اسی لیے یہ دونوں الگ الگ امن وامان اور عدل وانصاف کے قیام اور فتنہ وفساد اور بدیوں اور برائیوں کے انسداد کے لیے پوری طرح کافی نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم ایک ایسی کامل شریعت لے کر آئے جو عدل واحسان اور قانون واخلاق دونوں کو جامع ہے۔

اس جامعیت کا اصول شریعتِ محمدیؐ میں دو حیثیتوں سے پایا جاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ اُس نے نہ تو یہودیت کی طرح اخلاق کو بھی قانون کی شکل دے دی اور نہ عیسائیت کی طرح قانون کو مذہب کے ہر حصہ سے خارج کر کے قانون کو بھی اخلاق بنا دیا۔ بلکہ اس نے قانون اور اخلاق دونوں کے درمیان حدِ فاصل قائم کر کے ہر ایک کی حد مقرر کر دی اور اپنی شریعت کی کتاب میں قانون کو قانون کی جگہ اور اخلاق کو اخلاق کی جگہ رکھ کر انسانیت کو تکمیل تک پہنچا دیا۔

اسلام نے ان بُرائیوں کے انسداد کو جن کا اثر براہِ راست دوسروں تک پہنچتا ہے، قانون

کے تحت میں رکھا مثلاً قتل، سرقہ، رہزنی، تہمت لگانا۔ چنانچہ ان جرائم کے لیے قرآن نے سزا مقرر کی ہے جو حکومتِ اسلام کی طرف سے دی جاسکتی ہے اور جو باتیں ایک انسان کی ذاتی تکمیلِ نفس کے متعلق تھیں ان کو اخلاق کے دائرہ میں رکھا مثلاً جھوٹ نہ بولنا، رحم کھانا، غریبوں کی امداد وغیرہ۔ اس طرح شریعتِ محمدیؐ اس حیثیت سے قانون اور اخلاق دونوں کا مجموعہ ہے۔

اسلام ایک اور حیثیت سے بھی قانون اور اخلاق کا مجموعہ ہے۔ قانوناً اس نے ہر مظلوم اور صاحبِ حق کو یہ اختیار بخشا ہے کہ وہ چاہے تو توراۃ کے حکم کے مطابق اس کا بدلہ لے لیکن اس سے بلند تر بات یہ رکھی ہے کہ وہ انجیل کے مطابق اس ظالم کو معاف کردے بلکہ بُرائی کے بجائے اس کے ساتھ بھلائی اور نیکی کرے۔ اس مجموعی تعلیم نے حکومت کے قانونِ انتظام و عدل اور شخص کی اخلاقی روحانیت کی تکمیل دونوں کو اپنی اپنی جگہ قائم رکھا ہے اور اس لیے وہ نسلِ انسانی کی حفاظت، ترقی اور نشوونما کی پوری طرح متکفّل ہے۔ وہ عدل و انصاف کے بزور قائم کرنے کی بھی صلاحیت رکھتی ہے اور ذاتی اخلاق کے ذریعہ سے لوگوں کی روحانی تکمیل میں بھی کسی طرح حارج نہیں۔ وہ نہ یہودیوں کی شریعت کی طرح صرف مردہ جسم ہے اور نہ عیسائیوں کی تعلیم کی طرح غیر محسوس روح ہے بلکہ وہ جسم و جان کا مجموعہ اور زندہ اور محسوس پیکر ہے۔

عفو اور انتقام

موسوٰی، عیسوٰی اور محمدیؐ اخلاقی تعلیمات میں باہم جو باریک فرق ہے وہ اسی قانون اور اخلاق کی علیحدگی اور ترکیب کا نتیجہ ہے۔ اسلامی قوانین کو پیشِ نظر رکھ کر مخالفین نے اکثر کہا ہے کہ پیغمبرِ اسلام کی تعلیم میں اخلاقی روح نہیں لیکن اگر وہ قانونِ محمدیؐ کے ساتھ ساتھ اخلاقِ محمدی کو بھی سامنے رکھتے تو اُن کو یہ شبہ پیش نہ آتا۔ معلوم ہو

چکا کہ توراۃ کا اصول عادلانہ انتقام پر مبنی ہے۔ اُس کا حکم ہے :

"اور جو انسان کو مار ڈالے گا سو مار ڈالا جائے گا، ...... اور اگر کوئی اپنے ہمسایہ کو چوٹ لگائے سو جیسا کرے گا ویسا پائے گا۔ توڑنے کے بدلے توڑنا، آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت" (احبار ۲۴ - ۱۷ خروج ۲۱ - ۱۲ گنتی ۳۵ - ۳۱ استثنا ۱۹ - ۱۱ - ۱۲)۔

انجیل کی تعلیم سراسر عفو ہے۔ اس کا حکیمانہ وعظ یہ ہے :

"تم سُن چکے کہ کہا گیا آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت پر میں تمہیں کہتا ہوں کہ ظالم کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو تیرے داہنے گال پر تھپڑ مارے دوسرا گال بھی اس کی طرف پھیر دے" (متی ۵ - ۳۸)۔

لیکن اس سراپا روحانی اخلاقیت پر ایک دن بھی دنیا کا نظام قائم رہ سکتا ہے؟ اور کبھی کوئی عیسائی قوم اور عیسائی ملک اس رحیمانہ وعظ پر عمل کر سکا؟ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تعلیم پیش کی وہ عفو اور عادلانہ انتقام یعنی اخلاق اور قانون دونوں کا مجموعہ ہے۔ عدل قانون ہے اور احسان اخلاق ہے اسلام کے تمام احکام میں یہ دونوں اصول جاری ہیں۔ اوپر جس مسئلہ کے متعلق توراۃ اور انجیل کے احکام نقل کیے گئے ہیں اس کی نسبت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ یہ تعلیم ہم کو ملی ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى ۖ الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنثَىٰ بِالْأُنثَىٰ ۚ (البقرۃ : ۱۷۸)	اے ایمان والو! تم پر مقتولوں میں برابری کے بدلے کا حکم ہوا۔ آقا کے بدلے آقا، غلام کے بدلے غلام، عورت کے بدلے عورت۔

یہ تو معاوضہ کا عادلانہ قانون تھا۔ اس کے بعد ہی اخلاق کا حکم ہے :

فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ	تو اگر اُس کے بھائی کی طرف سے کچھ
فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ	معاف کر دیا گیا تو دستور کے مطابق
بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ	اُس کی پیروی کرنا اور نیکی کے ساتھ
رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى	اس کو ادا کرنا ہے۔ یہ تمہارے رب
بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○	کی طرف سے آسانی اور مہربانی ہوئی
	تو جو کوئی (مقتول کے رشتہ داروں میں
	سے) اس (معافی یا خون بہا لینے) کے
	بعد پھر زیادتی کرے تو اس کے لیے
(البقرۃ : ۱۷۸)	دُکھ کی سزا ہے۔

ان آیتوں کی بلاغت پر غور کیجیے کہ قاتل اور مقتول کے رشتہ داروں کے درمیان کھلی دشمنی کے باوجود اُن کے جذبۂ رحم کی تحریک کی غرض سے قاتل کو مقتول کے رشتہ داروں کا بھائی کہہ کر بتایا گیا۔ ساتھ ہی چونکہ توراۃ کے حکم میں خونبہا لے کر معافی کی دفعہ نہ تھی اس لیے اس عفو کو آسانی اور رحمت سے تعبیر کیا گیا اور قاتل کو نیکی اور احسان کی یاد دلائی گئی اور مقتول کے رشتہ داروں کو معاف کر دینے یا خونبہا لینے کے بعد انتقام لینے پر عذابِ الٰہی کا ڈر سنایا گیا۔ دیکھو کہ اسلام کا حکم توراۃ اور انجیل، قانون اور اخلاق، انتقام اور عفو دونوں کو کس خوبی سے یکجا کرتا ہے :

قرآن نے اسی جامعیت کو دوسری جگہ ظاہر کیا ہے :

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ	اور ہم نے بنی اسرائیل پر توراۃ میں

بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنْفَ بِالْأَنْفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهِ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝ وَقَفَّيْنَا عَلَىٰ آثَارِهِمْ بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَآتَيْنَاهُ الْإِنْجِيلَ فِيهِ هُدًى وَّنُورٌ وَّمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَاةِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ۝

(المائدۃ: ۴۵-۴۶)

یہ حکم لکھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، دانت کے بدلے دانت اور زخموں میں برابر کا بدلہ۔ تو جس نے بخش دیا تو وہ اس کے لیے کفّارہ ہے اور جس نے خدا کے اتارے ہوئے حکم کے مطابق فیصلہ نہیں کیا تو وہی ظالم ہیں۔ اور ہم نے بنی اسرائیل کے ان پیغمبروں کے بعد مریم کے بیٹے عیسٰی کو بھیجا، جو اپنے آگے کی کتاب توراۃ کی تصدیق کرتا تھا اور اس کو انجیل دی جس میں رہنمائی اور روشنی ہے اور جو اپنے آگے کی کتاب توراۃ کی تصدیق کرتی ہے اور جو پرہیزگاروں کے لیے ہدایت اور وعظ و نصیحت ہے۔

یہ فوجداری کے سب سے سخت گناہ کے متعلق قانونی و اخلاقی احکام تھے۔ مالی معاملات کے متعلق بھی اسلام اسی جامعیت کے نکتہ کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔ فرمایا:

وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ

(البقرۃ: ۲۷۹)

اور اگر تم سود سے باز آگئے تو تمہارا وہی حق ہے جو اصل سرمایہ تم نے دیا تھا۔

یہ تو قانون تھا۔ اب اخلاق دیکھئے :

وَاِنْ كَانَ ذُوْعُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ (البقرۃ: ۲۸۰)	اور اگر قرضدار تنگدست ہو تو اس کو اُس وقت تک مہلت ہے جب تک اس کو کشایش ہو اور بالکل معاف کر دینا تمہارے لیے زیادہ اچھا ہے اگر تم کو سمجھ ہو۔

جزئیات کو چھوڑ کر اصولی طور سے بھی اس جامعیت کو قائم رکھا ہے۔ فرمایا :

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ؕ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ ○ (النحل: ۱۲۶)	اور اگر سزا دو تو اتنی ہی جتنی تکلیف تم کو دی گئی ہو اور اگر صبر کر لو تو یہ صبر کرنے والوں کے لیے بہت بہتر ہے۔

اسی مفہوم کو ایک اور آیت میں اس طرح ادا کیا گیا :

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ○ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ○ (الشوریٰ: ۳۹-۴۰)	اور وہ لوگ کہ جب ان پر چڑھائی ہو تب وہ بدلہ لیتے ہیں اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔ تو اگر معاف کر دیا اور نیکی کی تو اس کا ثواب دینا خدا پر ہے۔ وہ ظالموں کو پیار نہیں کرتا۔

آیت کے پہلے ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان از خود کسی پر ظلم کرنے میں پہل اور سبقت نہ کریں لیکن اگر کوئی اُن پر ظلم کرے تو وہ اس ظلم کا قانونًا اتنا ہی بدلہ لے سکتے ہیں جتنا ان پر کیا گیا۔ کیونکہ قانون یہی ہے کہ بُرائی کا بدلہ اتنی ہی بُرائی ہے جیسا کہ توراۃ میں بیان ہوا ہے۔ لیکن اگر کوئی

مسلمان اخلاقاً اس ظلم کو معاف کر دے اور نہ صرف معاف ہی بلکہ اس برائی کی جگہ کچھ نیکی اور بھلائی بھی کرے (وَاَصْلَحَ) تو اس کو خدا کی طرف سے ثواب ملے گا۔ اور بلاغت یہ ہے کہ اس صابر مظلوم کی تسکین کی خاطر فرمایا کہ اس کو ثواب اور اجر دینا خدا پر ہے۔

الغرض عفو اور انتقام میں سے کسی ایک ہی کو اختیار کرنا دنیا کے جسمانی یا روحانی نظام کا نقص ہے اگر انتقام اور سزا کا اصول نہ ہو تو جماعت کا نظام قائم نہیں رہ سکتا اور نہ ملک میں امن وامان رہ سکتا ہے۔ اور نہ افراد کے بڑے حصّہ کو بُرائیوں سے باز رہنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر عفو کا اصول نہ ہو تو رُوح کی بلندی اور اخلاق کی پاکیزگی کوئی چیز نہ رہے حالانکہ وہی ایک سچّے مذہب کا مطلوب ہے۔ اس لیے ان میں سے کسی ایک کو لینا اور دوسرے کو چھوڑ دینا نظام ہستی کو آدھا رکھنا اور آدھا مٹا دینا ہے۔

اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم ایک ایسی تعلیم کو لے کر آئے جس کی نظر انسانی ہستی کے پورے نظام پر ہے۔ اس نے یہ کیا کہ سزا اور انتقام کو تو جماعت اور حکومت کے ہاتھ میں دے دیا اور اس حکم کے ساتھ دیا کہ اس کے اجراء میں کوئی رحم نہ کیا جائے اور نہ اس میں بڑے چھوٹے، امیر وغریب اور اپنے اور غیر میں کوئی فرق کیا جائے تاکہ جماعت اور ملک کا نظام قائم رہے۔ دوسری طرف عفو کو شخصیت کے مدارجِ کمال کا ذریعہ بتایا تاکہ اشخاص کی روحانی پاکی اور اخلاقی بلندی برابر ترقی کرتی جائے۔

جماعتی انتظامات کے قیام کے لیے سختی کا یہ عالم ہے کہ ایک خاص سزا کے اجراء کے وقت حکم ہوتا ہے:

وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ	اور تم کو اللہ کے حکم چلانے میں ان دونوں گنہگاروں پر ترس نہ آئے اگر تم کو خدا

وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (النور: ۲) پر اور قیامت پر ایمان ہے۔

یعنی اس گناہ کی جو سزا خدا کے ہاں ہے اور جو قیامت میں ہوگی وہ اس سے کہیں زیادہ سخت ہوگی، اس لیے اس گناہ کی سزا دنیا ہی میں دے دینا درحقیقت اپنے گنہگار بھائی پر احسان کرنا ہے۔ اس لیے اس سزا کے دینے میں نرمی نہ کی جائے۔

کسی سزا کے جاری کرنے میں اُونچے نیچے اور امیر و غریب کے فرق نہ کرنے کا یہ حال ہے کہ ایک دفعہ جب ایک شریف مسلمان عورت سرقہ کے جرم میں گرفتار ہوئی اور قریش نے چاہا کہ اس کو سزا نہ دی جائے اور اس کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں سفارشیں پہنچائی گئیں تو فرمایا "اے لوگو! تم سے پہلی قومیں اسی لیے ہلاک ہوئیں کہ جب کوئی بڑا آدمی چوری کرتا تھا تو اُس کو چھوڑ دیتے تھے اور اگر کوئی معمولی آدمی اسی کام کو کرتا تو اس کو سزا دیتے۔ خدا کی قسم اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو میں اس کے بھی ہاتھ کاٹتا"[1]

دوسری طرف عفو کا حال یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی سے اپنا ذاتی انتقام نہیں لیا الا یہ کہ اس نے خدا کے کسی حکم کو توڑا ہے[2] تو اُس کو (قانوناً) سزا ملی ہو" یہ عمل تھا۔ تعلیم کی کیفیت یہ ہے کہ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ "میں نے آپ کی خدمت میں قصاص کا کوئی مقدمہ پیش ہوتے نہیں دیکھا لیکن یہ کہ اُس میں آپ نے معاف اور درگذر کرنے کا مشورہ دیا[3]" یعنی قصاص کے بجائے بالکل معافی یا دیت (زرِ تاوان یا خونبہا) لے کر معاف کر دینے کو فرمایا۔ معمولی چھوٹے جرائم کی نسبت صحابہ سے فرمایا "آپس میں گناہوں کو معاف کر دیا کرو لیکن مجھ تک جب وہ واقعہ پہنچے گا تو سزا ضروری ہو جائے گی[4]"

---

[1] صحیح بخاری جلد دوم کتاب الحدود ص ۱۰۰۳۔ [2] بخاری کتاب الحدود۔ [3] ابوداؤد و نسائی، کتاب الدیات۔ [4] ابوداؤد کتاب الحدود۔

یعنی جب مرافعہ اور استغاثہ حکومت کے سامنے پیش ہوجائے گا تو پھر سزا ہونا واجب ہے تاکہ حکومت کا رعب دلوں پر قائم رہے۔ چنانچہ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ایک صاحب ایک چادر اوڑھے سو رہے تھے۔ ایک شخص نے چپکے سے چادر اتار لی وہ پکڑا گیا اور عدالتِ نبوی میں پیش کیا گیا۔ آپؐ نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا جن صاحب کی چادر تھی انہوں نے آکر عرض کی کہ "یا رسول اللہ! کیا تیس درہم کی ایک چادر کے لیے ایک انسان کا ہاتھ کاٹا جائے گا؟ میں یہ چادر اس کے ہاتھ ادھار فروخت کر دیتا ہوں۔" فرمایا کہ "میرے پاس لانے سے پہلے کیوں نہیں یہ کر لیا؟"[1]

یہ تو اُس عفو کا حال ہے جس کو ایک حد تک قانونی جرائم کی صورت حاصل ہے۔ اور اِس لحاظ سے قانونِ محمدیؐ موجودہ سلطنتوں کے قوانین سے زیادہ نرم، زیادہ منصفانہ اور عقل کے زیادہ مطابق ہے۔ لیکن عفو کی عام اخلاقی تعلیم کا دائرہ اسلام میں اس سے بھی زیادہ وسیع ہے۔

عفو و درگذر کی تعلیم

اخلاق کی سب سے بھاری اور دشوار تعلیم جو اکثر نفوس پر نہایت شاق گذرتی ہے وہ عفو، درگذر، ضبطِ نفس، تحمل اور برداشت کی ہے۔ لیکن اسلام نے اس سنگلاخ زمین کو بھی نہایت آسانی سے طے کیا ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ اسلام میں شرک اور بت پرستی سے کتنی شدید نفرت ظاہر کی گئی ہے اور خدا تعالےٰ کی توحید اور عظمت و جلالت کا کتنا اعلیٰ اور ناقابلِ تبدیل تصور اُس نے پیش کیا ہے جو خاص اسلام کا امتیازی حصہ ہے۔ تاہم مسلمانوں کو یہ تاکید کی جاتی ہے کہ "تم مشرکوں کے بتوں کو برا بھلا نہ کہو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ چڑ میں تمہارے خدا کو برا کہہ بیٹھیں:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ   اور جن کو یہ مشرک اللہ کے سوا پکارتے

---

[1] ابو داؤد کتاب الحدود۔

دُونِ اللّٰہِ فَیَسُبُّوا اللّٰہَ عَدْوًا بِغَیْرِ عِلْمٍ (الانعام: ۱۰۸)

ہیں ان کو برا نہ کہو کہ وہ اللہ کو بے ادبی سے نادانستہ برا کہہ بیٹھیں۔

یہ برداشت کی کتنی انتہائی تعلیم ہے۔ پیغمبر کو خطاب ہوا کہ کفار اور مشرکین کے ظلم وستم اور گالی گلوج پر صبر کرو اور ان کو معاف کرو اور اسی کی پیروی کا حکم عام مسلمانوں کو ہو رہا ہے:

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ○ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○ (الاعراف: ۱۹۹-۲۰۰)

معاف کرنے کی خو پکڑ اور نیک کام کو کہہ اور جاہلوں سے کنارہ کر۔ اور اگر تجھ کو شیطان کی کوئی چھیڑ ابھار دے (یعنی غصہ آجائے) تو خدا کی پناہ پکڑ وہ وہ ہے سنتا جانتا۔

سکون کی حالت میں عفو و درگذر آسان ہے مگر ضرورت ہے کہ انسان غصہ میں بھی بے قابو نہ ہونے پائے۔ صحابہ کی تعریف میں فرمایا:

وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ○ (الشوریٰ: ۳۷)

اور غصہ آئے جب بھی وہ معاف کر دیتے ہیں۔

نیکو کاروں کی تعریف میں ایک اور جگہ یہ فرمایا گیا کہ اپنے غصہ کو دبانا اور معاف کرنا خدا کا پیارا بننے کا ذریعہ ہے:

وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ○ (آل عمران: ۱۳۴)

اور جو غصہ کو دبانے والے اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں۔ اور اللہ اچھے کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

انتقام کی قدرت ہونے اور استطاعت رکھنے کے باوجود دشمن کو معاف کر دینا بہت بڑی بلند ہمّتی کا کام ہے۔ فرمایا :

وَلَمَنۡ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ ۝ (الشوریٰ: ۴۳)	اور البتہ جس نے برداشت کیا اور معاف کیا تو وہ بے شک ہمت کے کام ہیں۔

اس برداشت اور عفو کو وحیِ محمدیؐ نے اپنے الفاظ میں عزم کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جو خاص انبیاء اور پیغمبروں کی توصیف میں آیا ہے۔ فرمایا :

فَاصۡبِرۡ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الۡعَزۡمِ مِنَ الرُّسُلِ (الاحقاف: ۳۵)	اور برداشت کر جس طرح ہمت اور عزم والے پیغمبروں نے برداشت کیا۔

نیکی کے پھیلانے اور بدی کے روکنے میں ایک مسلمان کو ہر قسم کی تکلیف برداشت کرنی چاہیے کہ یہ بڑی ہمت کا کام ہے۔ فرمایا :

وَاۡمُرۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَانۡهَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ	اچھی بات بتا اور بری بات سے روک
وَاصۡبِرۡ عَلٰى مَاۤ اَصَابَكَ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ	اور جو تجھ پر پڑے اس کو سہار لے
مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ ۝ (لقمان: ۱۷)	کہ یہ ہمّت کے کام ہیں۔

کفار اور مشرکین کی بدگوئیوں کو اور ان کی لائی ہوئی مصیبتوں کو برداشت کر لینا بھی بہادری ہے۔ فرمایا :

وَاِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَتَتَّقُوۡا فَاِنَّ ذٰلِكَ	اور اگر صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو
مِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ ۝	تو یہ بڑی ہمّت کے کام ہیں۔

(آلِ عمران: ۱۸۶)

اوپر کی تمام آیتوں میں صبر، برداشت، تحمل اور عفو و درگذر کو بڑی ہمّت اور اخلاقی

بہادری کا کام بلکہ خدا کی محبوبی کا سبب بتایا گیا ہے اور مسلمان کو اس پر عمل کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر دیکھئے کہ حسبِ ذیل آیت میں ایمان والوں کو دشمنوں کو بھی معاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے :

قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ	(اے پیغمبر!) ایمان والوں سے کہہ کہ
لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ	اُن کو جو ایام اللہ کی اُمید نہیں رکھتے
(الجاثیۃ: ۱۴)	معاف کریں۔

ایام اللہ (خدا کی گرفت اور شہنشاہی کے دن) کی جو اُمید نہیں رکھتے، ظاہر ہے کہ یہ وہی ہیں جو کافر و مشرک ہیں۔ اب دیکھیے کہ کافر و مشرک کے خلاف اسلام کو جو شدید بیزاری ہے اس کے باوجود مسلمانوں کو یہ تاکید کی جاتی ہے کہ وہ ان کو معاف کریں اور ان کی خطاؤں سے درگذر کریں۔ کیا اس سے زیادہ اسلام سے کسی نرمی کا مطالبہ جائز ہے؟ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی ترغیب کی خاطر اس عفو و درگذر اور معافی کو اپنا خاص وصف بتا کر اُن کو اپنی پیروی کی تلقین فرماتا ہے:

اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ	اگر کسی نیکی کے کام کو کھلے طور سے کرو
تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ	یا چھپا کر کرو یا کسی بُرائی کو معاف کرو
عَفُوًّا قَدِيْرًا ○	(تو یہ مسلمان کی شان ہے) کیونکہ خدا
(النساء: ۱۴۹)	معاف کرنے والا قدرت والا ہے۔

یعنی جب گنہگاروں اور بدکاروں کو معاف کرنا خدا کی صفت ہے تو بندوں میں بھی خدا کی اس صفت کا جلوہ پیدا ہونا چاہیے اور اس تعلیم میں قرآن پاک یہ بلاغت اختیار کرتا ہے کہ فرماتا ہے کہ تمہارا خداوند تعالیٰ تو ہر قسم کی قدرت علی الاطلاق رکھنے کے باوجود اپنے بندوں کو معاف کرتا ہے تو انسان جس کی قدرت محدود ہے اور جس کا اختیار مشروط ہے اور جس کی عاجزی

اور درماندگی ظاہر ہے اُس کو تو بہر حال معاف ہی کرنا چاہیے۔ اسی کے قریب قریب یہ آیتِ پاک بھی ہے:

وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ○ (النور: ۲۲)	اور چاہیے کہ معاف کریں اور درگذر کریں۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو معاف کرے۔ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

یعنی تم دُوسروں کو معاف کرو تو اللہ تم کو معاف کرے گا۔ اس میں عفو و درگذر کی کتنی عظیم الشان ترغیب ہے۔

بُرائی کی جگہ نیکی

عفو و درگذر کے بعد اس سے زیادہ اہم تعلیم یہ ہے کہ جو بُرائی کرے نہ صرف یہ کہ اس کو معاف کرو بلکہ اس کے ساتھ بھلائی کرو۔ اور جو عداوت رکھے اس کے ساتھ حُسنِ سلوک کرو۔ اس تعلیمِ ربّانی پر عمل کرنے والوں کا نام خدا نے صابر اور ذو حظٍ عظیم یعنی "بڑا خوش قسمت" رکھا ہے اور بتایا ہے کہ دشمن کو دوست بنا لینے کی یہ بہترین تدبیر ہے فرمایا:

لَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ ○ وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا ۚ وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ ○ (حٰمٓ السجدۃ: ۳۴-۳۵)	نیکی اور بدی برابر نہیں۔ تو برائی کا جواب بہتری سے دے پھر دیکھ کہ وہ جس کے اور تیرے درمیان دشمنی ہے وہ ایسا ہو جائے گا جیسا ناتے دار دوست اور یہ بات اُنہی کو حاصل ہوتی ہے جو برداشت (صبر) رکھتے ہیں اور جس کی بڑی قسمت ہے۔

اس عظیم الشان تعلیم کو اللہ تعالےٰ نے "بڑی خوش قسمتی" سے تعبیر کیا ہے۔ اس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ پھر دوسری جگہ فرمایا مشرکوں اور کافروں کے طعنوں کا برا نہ مانو کیونکہ دینی معاملہ میں بھی غصہ سے کوئی بیجا حرکت کر بیٹھنا شیطان کا کام ہے اگر ایسا موقع پیش آئے تو خدا سے دعا مانگنی چاہیے کہ وہ شیطان کے پھندے سے بچالے اور غصہ سے محفوظ رکھے:

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَةَ ؕ
نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَصِفُوْنَ ۝ وَقُلْ
رَّبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ
الشَّیٰطِیْنِ ۝ وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ
اَنْ یَّحْضُرُوْنِ ۝
(المؤمنون: ۹۶-۹۷)

مشرکوں کی بُرائی کا جواب بھلائی سے دے ہم جانتے ہیں جو وہ کہتے ہیں۔ اور کہہ کہ اے میرے پروردگار میں شیطانوں کی چھیڑ سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ اور اے رب اس سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ میرے پاس آئیں۔

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے نماز، خیرات، صبر اور عفو کا ذکر فرمایا ہے اور ان کاموں کے بدلہ میں جنّت کا وعدہ کیا ہے۔ مگر تمام مذکورہ بالا نیکیوں میں سے دوبارہ صرف صبر ہی کو خصوصیت کے ساتھ اس جنّت کے ملنے کا سبب قرار دیا ہے۔ فرمایا:

وَالَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ
اَنْ یُّوْصَلَ وَیَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَ
یَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ؕ۝ وَالَّذِیْنَ
صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَ
اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا
رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً وَّ

اور جو لوگ اس کو جوڑتے ہیں جس کے جوڑنے کا حکم ان کو اللہ نے دیا ہے (یعنی ایک دوسرے کا حق) اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور حساب کے بُرے انجام سے خوف کھاتے ہیں۔ اور جو اپنے پروردگار کی خوشی کے لیے صبر کرتے

يَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ۝ جَنَّاتُ عَدْنٍ (الرعد: ۲۱-۲۳)	ہیں اور نماز ادا کرتے ہیں اور ہم نے ان کو جو روزی دی اس میں سے چھپے اور کھلے خیرات کرتے ہیں اور برائی کے بدلہ بھلائی کرتے ہیں انہی کے لیے ہے پچھلا گھر۔ ہمیشہ رہنے کے باغ۔

اُن سے کہا جائے گا :

سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ۝ (الرّعد: ۲۴)	تم پر سلامتی ہو اس کے بدلے میں کہ تم نے صبر کیا سو خوب ملا پچھلا گھر۔

آپ نے دیکھا کہ جنّت کی اس بشارتِ غیبی میں نہ تو نماز کا ذکر ہے نہ خیرات کا اور نہ خوفِ خدا کا، صرف ایک صبر کی جزا کی خوشخبری ہے۔ علاوہ ازیں اس آیت سے یہ بھی معلوم ہو گا کہ بُرائی کے بدلے نیکی کرنا ایسی اہم چیز ہے کہ نماز اور زکوٰۃ جیسے فرائض کے پہلو بہ پہلو اس کا بھی ذکر کیا جائے۔ ایک اور آیت میں نومسلم یہودیوں کو اپنے برخلاف اپنے ہم قوموں سے جو دلآزار فقرے اور اعتراضات سننے پڑتے ہیں اور وہ اس پر صبر کرتے ہیں اس کی تعریف کی گئی ہے کہ اسلام کے اثر سے اب ان کا یہ حال ہو گیا ہے، کہ وہ بُرائی کی جگہ بھلائی کرتے ہیں:

أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ۝ وَإِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ وَقَالُوا لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ	وہ لوگ صبر کے سبب سے اپنا حق دہرا پائیں گے اور وہ بُرائی کا جواب بھلائی سے دیتے ہیں اور ہمارا دیا کچھ خیرات کرتے ہیں۔ اور جب کوئی نکمّی بات سنتے ہیں تو اس سے درگذر

سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجَاهِلِينَ ۝ (القصص: ۵۴-۵۵)

کر لیتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے لیے ہمارے کام ہیں اور تمہارے لیے تمہارے کام، سلامت رہو ہم کو بے سمجھوں سے مطلب نہیں۔

ان آیتوں کے ایک ایک ٹکڑے پر غور کیجیے۔ نہ صرف یہ کہ برائی کا بدلہ نیکی کے ساتھ دیتے ہیں اور درگذر کرتے ہیں بلکہ اُن کے حق میں سلامتی کی دعائے خیر بھی کرتے ہیں۔

صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "قرابت کا حق ادا کرنے والا وہ نہیں ہے جو احسان کے بدلہ میں احسان کرتا ہو بلکہ وہ ہے جو بدسلوکی پر سلوک کرتا ہو"[1]۔ ایک دفعہ ایک صحابی نے آکر عرض کی کہ "اے خدا کے پیغمبر! میرے کچھ رشتہ دار ہیں جن کے ساتھ میں تو سلوک کرتا ہوں مگر وہ بدسلوکی کرتے ہیں، میں نیکی کرتا ہوں اور وہ بدی کرتے ہیں، میں حلم اور بردباری سے پیش آتا ہوں اور وہ جہالت کرتے ہیں"۔ آپؐ نے فرمایا "اگر ایسا ہی ہے جیسا تم کہتے ہو تو تم ان کے منہ میں مٹی بھر رہے ہو"۔ یعنی نیکی کے لقمہ سے اُن کے منہ بند کر رہے ہو اور جب تک تم اس روش پر قائم رہو گے خدا کی مدد شامل رہے گی[2]۔ "حذیفہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" تم ہر ایک کے پیچھے نہ چلو۔ تم کہتے ہو کہ اگر لوگ میرے ساتھ بھلائی کریں گے تو ہم بھی کریں گے اور اگر وہ ظلم کریں گے تو ہم بھی کریں گے۔ یہ نہیں بلکہ اپنے کو پُرسکون اور مطمئن رکھو۔ لوگ تمہارے ساتھ بھلائی کریں تو بھلائی کرو اور اگر بُرائی کریں تو بھی ظلم نہ کرو[3]"۔

---

[1] صحیح بخاری بحوالہ مشکوٰۃ باب البر والصلۃ۔ [2] صحیح مسلم بحوالہ مشکوٰۃ باب البر والصلۃ۔ [3] جامع ترمذی کتاب البر والصلۃ صفحہ ۳۲۴ (غریبؔ)۔

وہ لوگ جو اسلام اور مسلمانوں کو اپنی فریب کاریوں، جھوٹے وعدوں، خیانت کارانہ معاہدوں، اور پر فریب صلحوں سے دھوکا دیا کرتے تھے ان کے متعلق بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کو یہی ہدایت ہوئی :

وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ○ (المآئدۃ: ۱۳)

اور ان میں سے چند کے سوا اوروں کی کسی نہ کسی خیانت سے تو ہمیشہ مطلع ہوتا رہتا ہے۔ تو تو ان کو معاف کر، اور ان کے قصور سے درگذر کر کہ اللہ نیکی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

غور کا مقام ہے کہ ایسی خیانت کار قوم کو بھی معاف کرنا اور اُن کے قصوروں سے درگذر کرنا اسلام میں وہ نیکی ہے جس کے سبب سے خدا ان نیکی کرنے والوں کو اپنے پیار اور محبت کی خوشخبری دیتا ہے۔

ان تمام تفصیلات سے واضح ہو گا کہ محمدّ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیم اس باب میں کس قدر اہم اور کامل ہے۔

اسلام کی اخلاقی تعلیم کا تکمیلی کارنامہ

تمدّن کے زمانہ میں نظامِ حکومت میں جو ترقیاں ہو جاتی ہیں اُن کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ تمدّن اصولِ قانون میں کوئی جدید اضافہ کر دیتا ہے بلکہ اُس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ تمدّنی نظامِ حکومت میں قانون کے نفاذ میں اُن وسیع اور ہمہ گیر دفعات کا لحاظ رکھا جاتا ہے جو اس کے اثر کو اس قدر عام کر دیتا ہے کہ دُنیا کا ایک ذرّہ بھی اُن کی حدود سے باہر نہیں جا سکتا لیکن وحشت کے زمانہ میں صرف سادہ قانون نافذ کر دیا جاتا ہے اور گرد و پیش اور اطراف و جوانب کے حالات پر نظر نہیں کی جاتی۔ ہر سلطنت نے چوری کو ایک جُرم قرار دیا ہے اور اس لحاظ سے ایک غیر متمدّن سلطنت بھی ایک اعلےٰ سے اعلےٰ مہذّب حکومت کی ہم پلّہ ہے لیکن اس جرم کے کلّی استیصال کے لئے اسی قدر کافی نہیں ہے بلکہ اس کا استیصال صرف اس وقت ہو سکتا ہے جب وہ تمام لوگ مجُرم قرار دیئے جائیں جو اس جُرم میں اعانت کرتے ہیں، موقعِ واردات کا سراغ دیتے ہیں، مالِ مسروقہ کو بیچتے یا خریدتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ بہرحال تمدّنی نظامِ حکومت کو ایک غیر متمدّن سلطنت پر جو ترجیح و امتیاز ہے وہ صرف اس بنا پر ہے کہ تمدّن نے اس کے اصول و آئین کو نہایت وسیع اور عام کر دیا ہے اور وحشیانہ نظامِ حکومت میں یہ وسعت اور ہمہ گیری نہیں پائی جاتی۔ تمدّن کے زمانہ میں انسانی ضروریات میں جو غیر محدود اضافہ ہو جاتا ہے اس کا راز بھی تمدّن کی اسی خصوصیت کے اندر مضمر ہے۔

تفصیل اور ہمہ گیری مذہب بھی ایک عظیم الشّان روحانی سلطنت ہے اور جس اصول کی بنا پر ایک دنیوی حکومت کو دوسری حکومت پر ترجیح دی جاسکتی ہے اسی کو مختلف مذاہب کے موازنہ ومقابلہ کا بھی معیار قرار دیا جاسکتا ہے۔ مثلاً اصولِ شریعت میں دنیا کے اکثر مذاہب میں اشتراک واتحاد پایا جاتا ہے اس لحاظ سے عقائد میں، اعمال میں، عبادات میں، معاملات میں، اخلاق میں جو چیزیں ناجائز اور مصلحتِ عامہ کے مخالف تھیں ان کی سرسری طور سے سب نے ممانعت کی اور جو چیزیں جائز اور مصالحِ عامہ کے موافق تھیں اُن کی ترغیب دی لیکن امر ونہی کے طریقے اور ان کی جزئیات کے احاطہ میں کمی وبیشی ہے اور اسی نے ان مذاہب کے احکام وشرائع میں باہم امتیاز پیدا کردیا ہے۔ اس بنا پر جس طرح اُس حکومت کے قانون کو سب سے بہتر کہا جاتا ہے جس سے برائیوں کا تمام تر سدِ باب ہوتا ہے اور جس کے اندر تمام جزئیات کا احاطہ کرلیا گیا ہو، اسی طرح بہترین اخلاقی تعلیم وہ ہے جس نے محاسن اور مفاسد کا سب سے زیادہ استقصاء کیا ہو اور عام انسانوں کے لئے کھول کر ان کو اچھی طرح بیان کردیا ہو اور اس کے ہر ہر گوشہ کو اس قدر روشن کردیا ہو کہ غلط فہمی کی گنجائش نہ رہے۔ اسلام کو دوسرے مذاہب پر جو ترجیح وامتیاز ہے اس کا ایک سبب اس کے احکام کی تفصیل، ہمہ گیری اور انضباط ہے یعنی اسلام نے اپنے اصول واحکام کی تفصیل اس وسعت اور جامعیت کے ساتھ کی ہے کہ برائیوں کا کلّی استیصال ہوگیا ہے اور نیکیوں کے مظاہر عام ہوگئے ہیں۔ اس کے بخلاف دوسرے مذاہب نے ان کلیات کے جزئیات کی نہایت نامکمل اور اجمالی تشریح کی ہے۔

مثلاً توحید تمام مذاہب کا امّ الاصول ہے لیکن کامل طور پر کسی مذہب نے اس کی حقیقت اور اس کے مظاہر کی تعیین نہیں کی۔ اس بنا پر ہر مذہب میں شرک کسی نہ کسی صورت میں شامل ہوگیا۔ صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے شرک کے تمام علل واسباب اور عواقب ونتائج کی تحدید کی اور ان کا کلّی استیصال کیا۔ شرک کا ایک متداول طریقہ بت پرستی تھا اس کے انسداد کا سادہ طریقہ یہ تھا کہ تمام قوم

کو توحید کی دعوت دی جاتی اور عرب کے تمام بُت توڑ دیئے جاتے لیکن اسلام نے صرف اس سادہ طریقہ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان تمام چیزوں کو ناجائز قرار دیا جو ان بتوں کی یاد کو تازہ کرسکتی تھیں۔ تصویر بجائے خود کوئی بُری چیز نہ تھی تاہم وہ بت پرستی کا ایک عام مظہر تھی اس لئے اسلام نے اس کو ناجائز قرار دیا۔ کسی کی مدح میں غلو و اغراق اگرچہ ایک قسم کی بد اخلاقی ہے تاہم اس سے اشخاص کے اثر اور ان کے نفوذ و طاقت میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اگر اس سے کوئی نیک کام لیا جائے تو وہ نہایت مفید چیز ہو سکتا ہے۔ اسلام اپنے عالمگیر اثر کی وسعت کے لئے اس سے کام لے سکتا تھا تاہم چونکہ اس سے شخص پرستی کی بنیاد قائم ہوتی تھی، جس نے امم قدیمہ میں شرک کی صورت اختیار کرلی تھی اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے برسرِ منبر سختی کے ساتھ اس کی ممانعت فرمائی۔

لا تطرونی کما اطرت النّصارٰی	میری شان میں مبالغہ نہ کرو جس
ابن مریم فانّما انا عبدہٗ	طرح نصاریٰ نے ابنِ مریم کی شان
فقولوا عبد اللہ و رسولہ۔	میں کیا۔ میں تو خدا کا بندہ ہوں تو کہو کہ
(بخاری، کتاب الانبیاء)	خدا کا بندہ اور رسول۔

یہ ایک کلّی حکم تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے ہر موقع پر اس کی پابندی کرائی۔ اسی طرح شرک کے ایک ایک ریشہ کو بتا بتا کر اس کی بیخ کنی کی۔ یہی حال عبادات کا بھی ہے اس کے ایک ایک رکن اور طریقہ کو اسلام نے پوری تفصیل سے واضح کر دیا اور یہی روش اس کی اخلاقی تعلیمات کی بھی ہے۔ اخلاق کی تمام جزئیات کا پوری طرح احاطہ کرکے اپنے پیروؤں کو ان سے ہر طرح آگاہ فرما دیا اور کوئی بات سوال و جواب کے لئے باقی نہیں رکھی یہی معنی اس تکمیل کے ہیں جس کے لئے آپ کی بعثت ہوئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے اخلاق کی تکمیل تین حیثیتوں سے فرمائی ہے:

۱۔ تمام اخلاقی تعلیمات کا احاطہ۔

۲۔ ہر بُرائی اور بھلائی کی ساری جزئیات کا احاطہ۔

۳۔ نرمی و گرمی، عاجزی و بلند ہمتی دونوں قسم کے اخلاق کی تفصیل اور ان کے مواقع کی تحدید۔

اخلاقی تعلیمات کا احاطہ یہودی وعیسائی اور دوسرے اخلاقی معلّین کی تعلیمات کی فہرست پر ایک استقصائی نظر ڈال لینا اس راز کو فاش کردے گا کہ انسان کے تمام اخلاقی احوال اور کیفیات کا احاطہ ان میں سے کسی نے نہیں کیا ہے۔ بلکہ صرف اپنے زمانہ اور اپنی قوم کے حالات کو سامنے رکھ کر اپنی اخلاقی اصلاحات کی فہرست بنالی گئی ہے۔ اور ان میں سے بھی صرف چند اصول کو سب سے زیادہ اہمیّت دے کر ان کو ہر جگہ اپنی تعلیم میں نمایاں کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے صحیفہ میں سب سے زیادہ اہمیّت احکام عشرہ کی ہے یعنی وہ دس احکام جو بنی اسرائیل کو کوہ سینا کے دامن میں سنائے گئے تھے۔ ان دس احکام میں سے پہلا حکم توحید، دوسرا تصویر اور مجسّمہ بنانے کی ممانعت، تیسرا خُدا کے نام کی جھوٹی قسم کھانے کی کراہت اور چوتھا سبت کے دن آرام کرنے کی ہدایت پر مشتمل ہے۔ باقی اخلاقی احکام صرف چھ ہیں جو حسبِ ذیل ہیں۔ (دیکھو خروج باب ۲۰)

توراۃ کے اخلاقی احکام ۱۔ تو اپنی ماں اور باپ کو عزت دے۔

۲۔ تو خون مت کر۔

۳۔ تو زنا مت کر۔

۴۔ تو چوری مت کر۔

۵۔ تو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی مت دے۔

۶۔ تو اپنے پڑوسی کی جورو اور اُس کے غلام اور اُس کی لونڈی اور اس کے بیل اور اس کے

گدھے اور اس کی کسی چیز پر جو تیرے پڑوسی کی ہے لالچ مت کر۔

یہ گویا انسان کے اخلاقی سبق کی ابجد ہے۔اس کے بعد خروج باب ۲۲ اور ۲۳ میں قانونی احکام کے ساتھ ساتھ دو تین باتیں اور آگئی ہیں یعنی مسافر، بیوہ اور یتیم کے ساتھ سلوک کا حکم اور جھوٹی گواہی کی ممانعت۔ پھر احبار باب ۱۹ میں انہی احکام کی حسب ذیل مزید تفصیل ہے:

۱. تم میں سے ہر شخص اپنی ماں اور باپ سے ڈرتا رہے۔

۲. تم چوری نہ کرو، نہ جھوٹا معاملہ کرو، ایک دوسرے سے جھوٹ نہ بولو۔

۳. تم میرا نام لے کر جھوٹی قسم نہ کھاؤ۔

۴. تو اپنے پڑوسی سے دغابازی نہ کر۔نہ اس سے کچھ چھین لے۔ مزدور کی مزدوری چاہیئے کہ ساری رات صبح تک تیرے پاس نہ رہ جائے۔

۵. تو بہرے کو مت کوس۔تو وہ چیز جس سے اندھے کو ٹھوکر لگے اندھے کے آگے مت رکھ۔

۶. تو حکومت میں بے انصافی نہ کر، غریب و امیر کو نہ دیکھ، بلکہ انصاف سے اپنے بھائی کی عدالت کر۔

۷. تو عیب جوؤں کے مانند اپنی قوم میں آیا جایا نہ کر اور اپنے بھائی کے خون پر کمر نہ باندھ۔

۸. تو اپنے بھائی سے بغض اپنے دل میں نہ رکھ۔

۹. تو اپنی قوم کے فرزندوں سے بدلہ مت لے اور نہ اُن کی طرف سے کینہ رکھ۔

۱۰. تو اس کے آگے جس کا سر سفید ہے اُٹھ کھڑا ہو اور بوڑھے مرد کو عزّت دے۔

۱۱. اگر کوئی مسافر تمہاری زمین پر تمہارے ساتھ سکونت کرے تم اس کو مت ستاؤ بلکہ مسافر

کو جو تمہارے ساتھ رہتا ہے ایسا جانو جیسے وہ جو تم میں پیدا ہوا ہے بلکہ تم اس کو ایسا پیار کرو جیسا آپ کو کرتے ہو۔

۱۲۔ تم حکومت کرنے میں، پیمائش کرنے میں، تولنے میں، ناپنے میں بے انصافی نہ کرو۔

انجیل کے اخلاقی احکام انجیل نے اخلاقی تعلیمات کا نہ صرف یہ کہ احاطہ نہیں کیا ہے بلکہ ان کی تفصیل بھی نہیں کی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا مقصد درحقیقت بنی اسرائیل کی رسم پرستی اور شریعت کی ظاہری پابندی کے خلاف معنیٰ اور روح کی طرف دعوت تھی۔ یہ حقیقت جس طرح احکام میں نظر آتی ہے اخلاق میں بھی جھلکتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اخلاقی تجدید و اصلاح یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توراۃ، حضرت داؤدؑ کی زبور، حضرت سلیمانؑ کے امثال اور دوسرے اسرائیلی صحیفوں میں جو خالص بلند اخلاقی تعلیمات منتشر تھیں اور جن کو بنی اسرائیل اپنے قانونی احکام کے سامنے بھلا بیٹھے تھے، ان کو یک جا اپنے مشہور وعظ میں ان کے سامنے پیش کیا۔ اس مشہور اخلاقی وعظ میں بہ ترتیب حسبِ ذیل باتیں بیان کی گئی ہیں،

دل کی غریبی، غمگینی، حلم و بُردباری، راست بازی، رحم دلی، پاک دلی، صلح جوئی، صبر، عفو و درگزر، پاک دامنی، قسم کھانے کی ممانعت، ظالم کا مقابلہ نہ کرنا، قرض معاف کرنا، دشمنوں کو پیار کرنا، ریا کی ممانعت، توکل، عیب نہ لگانا، جو کچھ تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ کریں ایسا تم بھی اُن کے ساتھ کرو۔

یہ اخلاقی تعلیمات بیشتر انہی لفظوں کے ساتھ جو انجیل میں ہیں، بنی اسرائیل کے مختلف صحیفوں میں مذکور ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا خاص طور سے ان اخلاقیات کو بنی اسرائیل کے سامنے پیش کرنے سے مقصود ان میں اخلاقی توازن کا قائم کرنا اور رسمی اخلاق اور لفظی شریعت کے اصل روح و معنی کو جلوہ گر کرنا تھا۔

اسلام میں اخلاقی احکام کا استقصا: محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کسی خاص قوم یا زمانہ تک محدود نہیں اس لئے آپ کو اخلاقی تعلیمات کا جو صحیفہ عنایت ہوا اس کو صرف ایک قوم یا زمانہ کی اخلاقی اصلاح تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ تمام قوموں اور زمانوں تک وسیع کیا گیا۔ اس لئے تمام قوموں اور زمانوں میں جو برائیاں پائی جاتیں یا پائی جانے والی تھیں ان سب کو استقصاء کر کے منع کیا گیا اور اسی طرح تمام انسانی اخلاقی محاسن کو بھی کھول کر بیان کیا گیا اور ان کے حصول کی تاکید کی گئی۔ گذشتہ صحیفوں میں جن برائیوں سے روکا گیا تھا یا جن نیکیوں کی تعلیم دی گئی تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی مبارک نے اُن کی تمام جزئیات کا استقصا کیا اور اُن کے گوشہ گوشہ کو کھول کر روشن کر دیا۔ ذیل میں ہم اُن اخلاقی تعلیمات کی ایک مجمل فہرست درج کرتے ہیں جن کی تعلیم یا ممانعت قرآن پاک نے کی ہے۔

قرآنی اخلاق کی فہرست سچ بولنا، جھوٹ کی برائی، علم بے عمل کی مذمت، عام عفو ودر گذر توکل، صبر، شکر، حق پر استقامت، خدا کی راہ میں جان دینا، سخاوت اور خیرات کا حکم، بُخل کی بُرائی، اسراف اور فضول خرچی کی ممانعت، میانہ روی کی تاکید، عزیزوں، قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور پڑوسیوں کے ساتھ نیکی، مسافروں، سائلوں اور غریبوں کی امداد، غلاموں اور قیدیوں کے ساتھ احسان، فخر وغرور کی بُرائی، امانت داری، وعدہ کا ایفا کرنا، عہد کا پورا کرنا، معاہدوں کا لحاظ رکھنا، صدقہ وخیرات، نیکی اور بھلائی کی بات کرنا، آپس میں لوگوں کے درمیان محبت پیدا کرنا، کسی کو بُرا بھلا نہ کہنا، کسی کو نہ چڑانا، نہ بُرے ناموں سے یاد کرنا، والدین کی خدمت اور اطاعت، ملاقاتوں میں باہم بھلائی اور سلامتی کی دُعا دینا، حق گوئی، انصاف پسندی، سچی گواہی دینا، گواہی کو نہ چھپانا، جھوٹی گواہی کا دل کی گنہگاری پر اثر، نرمی سے بات کرنا، زمین پر اکڑ کر نہ چلنا، صلح جوئی، اتحاد واتفاق، ایمانی برادری، انسانی برادری، اکل حلال، روزی خود حاصل کرنا، تجارت کرنا، گداگری کی ممانعت، لوگوں

کو اچھی بات کی تعلیم دینا اور بُری بات سے روکنا، اولاد کُشی، خودکُشی اور کسی دوسرے کی ناحق جان لینے کی ممانعت، یتیم کی کفالت، اس کے مال وجائیداد کی نیک نیتی کے ساتھ حفاظت، ناپ اور تول میں بے ایمانی نہ کرنا، ملک میں فساد برپا نہ کرنا، بے شرمی کی بات سے روکنا، زنا کی حرمت، آنکھیں نیچی رکھنا، کسی کے گھر میں بے اجازت داخل نہ ہونا، ستر اور حجاب، خیانت کی بُرائی، آنکھ، کان اور دل کی بازپُرس، نیکی کے کام کرنا، لغو سے اعراض، امانت، اور عہد کی رعایت، ایثار، تحمّل، دوسروں کو معاف کرنا، دُشمنوں سے درگذر، بدی کے بدلہ نیکی کرنا، غصہ کی بُرائی، مناظروں اور مخالفوں سے گفتگو میں آداب کا لحاظ، مشرکوں کے بتوں تک کو بُرا نہ کہنا، فیصلہ میں عدل وانصاف، دُشمنوں تک سے عدل وانصاف، صدقہ وخیرات کے بعد لوگوں پر احسان دھرنے کی بُرائی، الاہنے کی مذمت، فسق وفجور سے نفرت، چوری، ڈاکہ، رہزنی اور دوسرے کے مال کو بے ایمانی سے لے لینے کی ممانعت، دل کا تقویٰ اور پاکیزگی، پاکبازی جتانے کی بُرائی، رفتار میں وقار ومتانت، مجالس میں حُسنِ اخلاق، ضعیفوں کمزوروں اور عورتوں کے ساتھ نیکی، شوہر کی اطاعت، بیوی کا حق ادا کرنا، ناحق قسم کھانے کی بُرائی، چغل خوری، طعنہ زنی اور تہمت دھرنے کی ممانعت، جسم وجان اور کپڑوں کی پاکیزگی اور طہارت، شرمگاہوں کی ستر پوشی، سائل کو نہ جھڑکنا، یتیم کو نہ دبانا، خدا کی نعمت کو ظاہر کرنا، غیبت نہ کرنا، بدگمانی نہ کرنا، سب پر رحم کرنا، ریا اور نمائش کی ناپسندیدگی، قرض دینا، قرض معاف کرنا، سود اور رشوت کی ممانعت، ثباتِ قدم، استقلال اور شجاعت وبہادری کی خوبی، لڑائی کے گھمسان سے نامردی سے بھاگ کھڑے ہونے کی بُرائی، شراب پینے اور جُوا کھیلنے کی ممانعت، بھوکوں کو کھانا کھلانا، ظاہری اور باطنی ہر قسم کی بے شرمی کی باتوں سے پرہیز، بے غرض نیکی کرنا، مال ودولت سے محبت نہ ہونا، ظلم سے منع کرنا، لوگوں سے بے رُخی نہ کرنا، گناہ سے بچنا، ایک دوسرے کو حق پر قائم رکھنے کی فہمائش، معاملات میں سچائی اور دیانت داری۔

احادیث کے اخلاقیات کی فہرست یہ وہ تعلیمات ہیں جن کا ماخذ قرآنِ پاک ہے۔ ان کے علاوہ اسلام کی اخلاقیات کا بڑا ذخیرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے اُن اقوال میں ہے جو اُن کی تفسیر و تشریح میں احادیث میں مذکور ہیں۔ اُن کی کثرت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ کنز العمال میں جو ہر قسم کی حدیثوں کا سب سے بڑا مجموعہ ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی اخلاقی تعلیمات باریک ٹائپ کے بڑی تقطیع کے ۱۸۷ صفحوں میں ہیں جن میں سے ہر صفحہ میں ۳۷ سطریں ہیں اور تعداد کے اعتبار سے یہ تین ہزار نوسو چھ حدیثیں ہیں جو ڈھائی سو کے قریب مختلف اخلاقی ابواب و عنوانات میں منقسم ہیں۔ ان میں بعض مکرر باتیں بھی ہیں تاہم ان سے اندازہ ہوگا کہ انسان کی اخلاقی و نفسانی کیفیات و حالات کا کوئی ایسا جزنہ ہوگا جو داعئ اسلام علیہ السّلام کی تلقینات کی فہرست سے رہ گیا ہو اور جس پر دُنیا کے اس سب سے بڑے اور سب سے آخری اخلاقی معلّم کی نگاہ نہ پڑی ہو۔ ہم ذیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی اخلاقی تعلیمات کے صرف وہ عنوانات لکھتے ہیں جو صحیح بخاری، جامع ترمذی اور سنن ابی داؤد میں مذکور ہیں۔

صلۂ رحمی، ماں باپ کیساتھ سلوک، بچوں سے محبت، چھوٹوں کی محبت اور بڑوں کی عزت، اپنے بھائی کو اپنے ہی مانند چاہنا، ہمسایوں کے ساتھ سلوک، غلاموں کے ساتھ سلوک، غلاموں کا قصور معاف کرنا، اہل و عیال کی پرورش، یتیموں کی پرورش، بیوہ کی خبر گیری، حاجت مندوں کی امداد، اندھوں کی دست گیری، عام انسانوں کے ساتھ ہمدردی، قرض داروں پر احسان، فریادیوں کی فریاد رسی، خلق کو نفع رسانی، مسلمانوں کی خیر خواہی، جانوروں پر شفقت اور رحم، محسنوں کی شکر گزاری، ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق، بیمار کی خدمت و عیادت، رشک و حسد کی ممانعت، دوسروں کی مصیبت پر خوش ہونے کی ممانعت، شجاعت و بہادری، لڑائی کے میدان سے بھاگنے کی بُرائی، امیر و امام کی اطاعت، مداومتِ عمل، اپنے ہاتھ سے کام کرنا، شیریں کلامی، خوش خلقی، فیاضی، بدزبانی سے اجتناب، مہمان نوازی، شرم و حیا، حلم و وقار، غصّہ کو

ضبط کرنا، عفو و درگذر، صبر و تحمل، حسب و نسب پر فخاری کی مذمت، بدگمانی کی برائی، کسی کے گھر میں بلا اجازت داخل نہ ہونا، دوسروں کے گھر جا کر اِدھر اُدھر نہ دیکھنا، دوسرے بھائی کے لئے پیٹھ پیچھے دُعا کرنا، رفق و نرمی، قناعت اور استغنا، گداگری کی ممانعت، اپنے گناہوں کی پردہ پوشی، اپنے بھائیوں کے عیوب پر پردہ ڈالنا، چغلخوری کی ممانعت، تہمت لگانے کی برائی، غیبت کی ممانعت، بغض و کینہ کی ممانعت، دوسروں کی ٹوہ لگانے کی ممانعت، راز داری، تواضع و خاکساری، امانت داری، گالی کی ممانعت، منہ پہ مدح و ستائش کی ممانعت، لعنت کرنے کی ممانعت، بخل کی ممانعت، فضول گوئی کی ممانعت، فضول خرچی کی ممانعت، کبر و غرور کی مذمت، ہنسی مذاق کی برائی، نفس انسانی کا احترام، ظلم کی ممانعت، عدل و انصاف، تعصب کی ممانعت، سخت گیری کی ممانعت، غمخواری و غمگساری، توکل، لالچ کی برائی، رضا بالقضا، ماتم کی ممانعت، قمار بازی کی ممانعت، سچائی کی ہدایت اور جھوٹ کی ممانعت، جھوٹی گواہی کی ممانعت، جھگڑا فساد کرنے کی ممانعت، باہم مصالحت کرانا، ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے تین دن سے زیادہ ناراض نہ رہے، منافقت اور دورُخی چال کی مذمت، وعدہ خلافی کی ممانعت، خیانت اور فریب کی ممانعت، شرابخوری، زناکاری اور چوری کی ممانعت، طہارت و صفائی، دوست و احباب کی ملاقات، سلام و تحیّت، مصافحہ و معانقہ، دیگر آدابِ ملاقات، آدابِ مجلس، آدابِ طعام، آدابِ لباس، آدابِ نشست و برخاست، خانہ داری کے آداب، سونے جاگنے کے آداب، عورتوں کے متعلق خاص آداب و اخلاق و سلوک کے احکام۔ ان تفصیلات سے قیاس ہو سکے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اخلاقیات کا کتنا عظیم الشان ذخیرہ انسانوں کو عطا کیا گیا ہے۔

اخلاقی جزئیات کا استقصاء انسان بڑا بہانہ جو اور حیلہ طلب واقع ہوا ہے۔ اس کے لئے اخلاقیات کے صرف کلّی اصول کافی نہیں کہ وہ لفظوں کے ہیر پھیر کے سایہ میں پناہ لے اور صرف چند رسوم کی لفظی تقلید پر قناعت کر لے۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ ہر خوش اخلاقی یا بداخلاقی

کے ایک ایک جزئیہ کا استقصاء کیا جائے اور اس کے ایک ایک ریشہ کو کھول دیا جائے اور اس کی تہ کی اصلی گہرائیوں تک پہنچا جائے، اس کے وسائل اور ذرائع کا بھی پتہ لگایا جائے اور اُن کے متعلق صریح احکام دیئے جائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی اخلاقی تعلیمات نے اس نکتہ کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔ اس کی توضیح کے لئے امر و نہی دونوں کی ایک ایک دو دو مثالیں کافی ہوں گی۔

صدقہ و خیرات تمام مذہبوں میں ثواب کا سب سے بڑا کام سمجھا گیا ہے لیکن توراۃ نے اس کو صرف عشر اور زکوٰۃ تک محدود رکھا ہے ان کے علاوہ کسی اور قسم کی خیرات کا ذکر اس میں نہیں ملتا۔ انجیل نے سب کچھ غریبوں کو دے کر خود غریب بن جانے کو اچھا سمجھا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیم نے دونوں کو یک جا کر دیا ہے اور ہر ایک کے ایک ایک جزء کی تفصیل کر دی۔ توراۃ میں یہ مبہم تھا کہ کتنے ملّا یا سونے چاندی کے مالک پر عُشر یا زکوٰۃ فرض اور کن کن چیزوں میں فرض ہے شریعت محمدیؐ نے اس کے متعلق مقدار اور تعداد اور زمانہ کی پوری پوری تعیین کر دی۔ وہ اجناس مقرر کر دیئے جن میں عُشر یا زکوٰۃ واجب ہے، ان کی تحصیل کا طریقہ بتا دیا، اُن کے اخراجات اور مصارف کی نوعیتوں کی تشریح کر دی۔ اس نے یہ حکم نہیں دیا کہ تم سب کچھ راہِ خدا میں لٹا کر خود مفلس اور کنگال بن جاؤ بلکہ یہ کہا:

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ (البقرۃ: ۲۱۹)	لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں۔ کہہ دے کہ جو تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو۔

مگر اخلاقی حیثیت سے اس نے یہ تلقین ضرور کی کہ تم خود اپنی ضرورت روک کر اور اپنے اوپر تھوڑی تکلیف اٹھا کر دوسروں کی حاجت پوری کرو تو یہ تمہارے کمالِ خُلق کی دلیل ہے۔ انصار جنہوں نے خود تکلیفیں اٹھا کر مہاجرین کی مصیبتیں دُور کیں اُن کی تعریف میں خُدا نے فرمایا:

يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ؕ (الحشر: ۹)	وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ خود اُن کو حاجت ہو۔

صحابہ کی مدح میں فرمایا:

يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝ (الدھر: ۸)	خود کھانے کی خواہش کے باوجود مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلا دیتے ہیں۔

قرآنِ پاک سراپا انفاق فی سبیل اللہ یعنی خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی ہدایت سے بھرا ہوا ہے۔ اکثر لوگ وہ چیز خدا کی راہ میں دوسروں کو دیتے ہیں جو سڑی گلی، خراب اور نکمّی ہو، قرآن پاک نے اس سے روکا کہ یہ نفس کے تزکیہ اور صفائی کے بجائے جو اس خیرات کا مقصد ہے، نفس کی اور دناءت اور آلودگی ظاہر کرتا ہے، فرمایا:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۗ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝ (آل عمران: ۹۲)	تم ہرگز پوری نیکی کو نہ پاؤ گے جب تک اس میں سے تم نہ خرچ کرو جو تم کو محبوب ہے۔ اور جو بھی تم خرچ کرو، خدا کو اس کا علم ہے۔

پھر فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝ (البقرۃ: ۲۶۷)	اے ایمان والو! جو تم کماتے ہو اُس میں کی اچھی چیزیں اور جو ہم تمہارے لئے زمین سے نکالتے ہیں اس میں سے کچھ خدا کی راہ میں دو اور اُس میں سے خراب چیز دینے کا قصد بھی نہ کرو کہ تم کو کوئی ایسی چیز دے تو نہ لو مگر یہ کہ چشم پوشی کر لو اور یقین کرو کہ اللہ بے پروا اور خوبیوں والا ہے۔

اس آیتِ پاک کے خاتمہ کی بلاغت پر غور کرو کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نسبت فرمایا کہ "وہ بے پروا اور خوبیوں والا ہے" یعنی اس نے اپنے بندوں کو مال کے بہترین حصہ کے خیرات کرنے کی جو ہدایت فرمائی اس کا یہ سبب نہیں کہ نعوذ باللہ خود خدا کو اپنے بندوں کی اچھی چیزوں کی ضرورت ہے کہ وہ تو ہماری ہر اچھی سے اچھی چیز سے بے نیاز اور بے پروا ہے بلکہ یہ سبب ہے کہ وہ خوبیوں والا ہے اس لئے خوبی ہی والی چیز کو قبول کرتا ہے۔

سب سے پہلے تمہاری امداد کے محتاج خود وہ ہیں جن کی کفالت کا بار تم پر ہے، اہل وعیال دست نگر عزیز و قریب، پھر دوسرے محتاج و مسکین اور یتیم اور مسافر:

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ؕ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ○ (البقرۃ: ۲۱۵)	لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خیرات کریں؟ کہہ دے جو کچھ تم نیکی کا مال خرچ کرو وہ ماں باپ، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافر کے لئے۔ اور جو بھی تم نیکی کا کام کرو اللہ اُس سے واقف ہے۔

اگر کسی کے پاس کچھ نہ ہو تو خیرات کیا دے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا کہ "ہر مسلمان پر صدقہ دینا واجب ہے" لوگوں نے عرض کی کہ اگر اس کی قدرت نہ ہو تو فرمایا "مزدوری کرے اور جو ملے اس میں کچھ خود کھائے کچھ محتاجوں کو کھلائے" صحابہ نے عرض کی "اگر مزدوری کرنے کی بھی قوت نہ ہو؟" فرمایا "تو غم رسیدہ حاجت مند کی کوئی جسمانی خدمت کرے اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو نیکی کی تعلیم دے اور اگر یہ بھی نہ کر سکے تو بُرائی کرنے سے بچے۔ یہ بھی صدقہ ہے"[1] دوسرے موقع پر

---

[1] الادب المفرد امام بخاری باب ان کل معروف صدقہ ص ۴۶ مصر۔

فرمایا۔"اچھی بات کہنا اور بُری بات سے روکنا بھی صدقہ ہے، کسی بھولے بھٹکے مسافر کو راستہ بتانا بھی صدقہ ہے، کسی اندھے کی دست گیری بھی صدقہ ہے، راستہ سے پتھر، کانٹا اور ہڈی کو ہٹا دینا بھی صدقہ ہے اور اپنے ڈول کا پانی اپنے بھائی کے ڈول میں ڈال دینا بھی صدقہ ہے"[1] غور کیجئے کہ یہ صدقہ اور خیرات کا کتنا وسیع مفہوم ہے۔

کسی کے ساتھ کوئی نیکی کر کے اس کو یاد مت دلاؤ، نہ احسان اس پر جتاؤ، نہ اُس سے اس کے شکریہ کے طالب ہو، نہ نمائش مقصود ہو کہ اس سے خود نیکی برباد ہو جاتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دوسری ہی وحی میں یہ نکتہ بتایا گیا۔ فرمایا:

وَلَا تَمۡنُنۡ تَسۡتَكۡثِرُ ۝ (المدثر: ۶)	اور اپنا احسان نہ جتا کہ تو اور زیادہ چاہے۔

عام مسلمانوں کو تاکید کی گئی:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُبۡطِلُوۡا	اے ایمان والو! اپنی خیرات کو
صَدَقٰتِكُمۡ بِالۡمَنِّ وَالۡاَذٰى ۙ	احسان رکھ کر اور جتا کر برباد مت کرو
كَالَّذِىۡ يُنۡفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ	جس طرح وہ برباد کرتا ہے جو لوگوں کے
النَّاسِ وَلَا يُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ	دکھانے کیلئے خرچ کرتا ہے اور خدا اور
الۡاٰخِرِ ؕ (البقرة: ۲۶۴)	پچھلے دن پر یقین نہیں رکھتا۔

پھر فرمایا کہ ایسی خیرات سے تو معمولی ہی نیکی بہتر ہے:

قَوۡلٌ مَّعۡرُوۡفٌ وَّمَغۡفِرَةٌ خَيۡرٌ	اچھی بات کہنی اور معاف کرنا اُس خیرات سے بہتر ہے
مِّنۡ صَدَقَةٍ يَّتۡبَعُهَاۤ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ	جس کے پیچھے احسان جتا کر دینے والے کے دل کو
غَنِىٌّ حَلِيۡمٌ ۝ (البقرة: ۲۶۳)	صدمہ پہنچایا جائے۔ اور خدا بے نیاز اور بُردبار ہے۔

---

[1] جامع ترمذی ابواب البر والصلہ، باب صنائع المعروف۔

ریا اور نمائش سے بچنا ہو تو چھپا کر دو اور اگر لوگوں کی تشویق و ترغیب مقصد ہو تو دکھا کر بھی دے سکتے ہو:

اِنۡ تُبۡدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِیَ ۚ	اگر تم خیرات کھول کر دو تو بھی اچھا ہے
وَ اِنۡ تُخۡفُوۡهَا وَ تُؤۡتُوۡهَا الۡفُقَرَآءَ	اور اگر چھپا کر غریبوں کو دو تو وہ تمہارے
فَهُوَ خَیۡرٌ لَّكُمۡ ؕ وَ یُكَفِّرُ عَنۡكُمۡ	لئے سب سے بہتر ہے اور اللہ تمہاری
مِّنۡ سَیِّاٰتِكُمۡ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ	برائیوں کا کفارہ کر دے گا اور جو کچھ تم
خَبِیۡرٌ ۝ (البقرة: ۲۷۱)	کرتے ہو اللہ اُس سے خبردار ہے۔
اَلَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمۡ بِالَّیۡلِ	جو لوگ اپنا مال رات اور دن چھپے
وَ النَّهَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِیَةً فَلَهُمۡ	اور کھلے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں
اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ۚ وَ لَا خَوۡفٌ	تو ان کا ثواب ان کے رب کے
عَلَیۡهِمۡ وَ لَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ۝	پاس ہے۔ نہ ان کو خوف ہو گا
(البقرة: ۲۷۴)	اور نہ غم۔

صدقہ اور خیرات کھلے دل سے ہنسی خوشی ہونی چاہیئے جبر و کراہت سے نہ ہو، کہ یہ منافقت کی نشانی ہے:

وَ لَا یُنۡفِقُوۡنَ اِلَّا وَ هُمۡ كٰرِهُوۡنَ ۝	اور وہ خدا کی راہ میں نہیں خرچ کرتے
(التوبة: ۵۴)	لیکن کڑھ کر۔

صدقہ و خیرات پکّے دل سے اور صرف خدا کے لئے ہونی چاہیئے:

وَ مَثَلُ الَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَهُمُ	اور اُن کی مثال جو اپنا مال اللہ کی
ابۡتِغَآءَ مَرۡضَاتِ اللّٰهِ وَ تَثۡبِیۡتًا مِّنۡ	خوشنودی چاہ کر اور اپنا دل پکا کر کے

اَنْفُسِہِمْ کَمَثَلِ جَنَّۃٍ بِرَبْوَۃٍ (البقرۃ: ۲۶۵) | خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اُس باغ کے مانند ہے جو کسی ٹیلہ پر ہو۔

بلکہ اس سے زیادہ یہ ہے کہ اس سے مقصود خود خدا ہو:

وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْہِ اللّٰہِ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَیْرٍ یُّوَفَّ اِلَیْکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (البقرۃ: ۲۷۲) | اور تم تو خرچ نہیں کرتے مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر۔ اور جو خیرات کرو گے وہ تم کو پوری ملے گی تمہارا حق کچھ دبا نہ رہے گا۔

صدقہ و خیرات کی ان تمام تفصیلات سے اندازہ ہوگا کہ اسلام نے اس ایک تعلیم کے کتنے گوشوں کا احاطہ کیا ہے۔

مسکرات کی حرمت میں جزئیات کا احاطہ ان احکام میں وسعت اور ہمہ گیری اور بھی زیادہ نمایاں طور پر نظر آتی ہے مثلاً مسکرات کو تمام مذاہب نے صاف صاف حرام نہیں کیا ہے مگر اچھا کسی نے نہیں سمجھا ہے۔ اسلام پہلا مذہب ہے جس نے تذبذب اور شک اور ہاں اور نہیں کے تمام پہلوؤں کو دور کر کے اس بارے میں ایک قطعی اور آخری فیصلہ نافذ کر دیا۔ اسلام سے پہلے گو بعض نیک لوگوں نے شراب کا پینا چھوڑ دیا تھا لیکن یہ حرمت صرف اشخاص تک محدود تھی، ان کے ذریعے سے تمام دنیا کو اس کے نقصانات سے محفوظ نہیں رکھا جا سکتا اور خود اشخاص بھی اس کے اثر سے کلیتہً محفوظ نہیں رہ سکتے۔ مثلاً ایک شخص شراب نہیں پیتا لیکن اس کی تجارت کرتا ہے۔ ایک شخص ان دونوں چیزوں سے احتراز کرتا ہے لیکن ان برتنوں کو استعمال میں لاتا ہے جن میں شراب رکھی یا بنائی جاتی ہے۔ لیکن اسلام نے شراب کی حرمت کا اعلان اس جامعیت کے ساتھ کیا ہے کہ ان احکام کی مراعات کے ساتھ کوئی شخص شراب کا تصور بھی نہیں کر سکتا:

قَالَ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ و | آپؐ نے فرمایا خدا شراب پر، اس کے

سلّم لعن اللہ الخمر وشاربہا و ساقیہا وبائعہا ومبتاعہا و عاصرہا ومعتصرہا وحاملہا والمحمولۃ الیہ۔

(ابوداؤد: کتاب الاشربہ)

پینے والے پر، اس کے پلانے والے پر، اس کے بیچنے والے پر، اس کے خریدنے والے پر، اس کے نچوڑنے والے پر، اس کے اپنے لئے نچوڑنے والے پر، اس کے لے جانے والے پر اور اس شخص پر جس کے پاس وہ لے جائی جائے لعنت کرتا ہے۔

مہذب قانون کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ جس چیز سے لوگوں کو روکتا ہے سب سے پہلے اس کی منطقی حقیقت (ڈیفینیشن) بتائے۔ عرب میں شراب مختلف چیزوں سے بنتی تھی، اس کے مختلف نام تھے اور ان کا اثر بھی مختلف تھا۔ قرآن مجید میں حرمتِ شراب کے متعلق جو آیت نازل ہوئی ہے اس میں خمر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اس بنا پر خمر کی حقیقت کی تعیین نہایت ضروری تھی چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس کی تعیین فرمادی:

قال رسول اللہ صلّے اللہ علیہ و سلّم انّ من العنب خمرا و انّ من التّمر خمرا و انّ من العسل خمرا و انّ من البرّ خمرا و انّ من الشعیر خمرا۔

(ابوداؤد: کتاب الاشربہ)

آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا انگور سے بھی شراب بنتی ہے، کھجور سے بھی، شہد سے بھی، گیہوں سے بھی، اور جَو سے بھی۔

قال سمعت رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم یقول ان الخمر من

راوی کا بیان ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے سُنا ہے کہ شراب

العصیر والزبیب والتمر و	انگور، منقی، کھجور، گیہوں، جو، جوار
الحنطۃ والشعیر والذرۃ، وانّی	اور ہر چیز کے نچوڑنے سے بنتی ہے۔
انھاکم عن کل مسکر۔	اور میں تم کو ہر نشہ آور چیز سے
(ابوداؤد: کتاب الاشربہ)	منع کرتا ہوں۔

عرب کے مختلف حصّوں میں انہی چیزوں کی شراب بنتی تھی اس لئے یہ تعریف عرب کے تمام اصنافِ شراب کو حاوی تھی۔ لیکن اسلام ایک عالمگیر مذہب تھا اور یہ ممکن تھا کہ دُنیا کے اور حصّوں میں شراب کی دوسری قسمیں استعمال کی جائیں اور تحدید اُن کو شامل نہ ہو۔ اس لئے آپ نے شراب کی ایک کلّی تعریف کی جو تمام اقسامِ شراب پر حاوی تھی:

کلّ مسکر خمر و کل مسکر حرامٌ۔	ہر نشہ آور چیز شراب ہے
(ابوداؤد: کتاب الاشربۃ۔ وصحیح مسلم و احمد وترمذی ونسائی)	اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔
کلّ شراب اسکر فھو حرام۔	ہر پینے کی چیز جو نشہ لائے وہ
(ابوداؤد، احمد وبخاری ومسلم)	حرام ہے۔

لیکن حیلہ جُو لوگوں کے لئے اب بھی حیلہ جُوئی کا موقع باقی تھا حرمتِ شراب کی اصل وجہ جو اس تعریف سے مستنبط ہوتی ہے نشہ ہے لیکن یہ ممکن تھا کہ شراب کی اس قدر کم مقدار استعمال کی جائے کہ نشہ نہ آئے، اس لئے فرمایا:

ما اسکر کثیرۃ فقلیلہ حرام۔	جو چیز زیادہ مقدار میں نشہ لائے اس
(ابوداؤد: کتاب الاشربہ)	کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے۔

بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو نشہ نہیں لاتیں تاہم اعصاب میں ایک خدر کی کیفیت پیدا کر دیتی

ہیں جو نشہ کا ابتدائی مقدمہ ہوتی ہے۔ بھنگ وغیرہ اسی قسم کی چیزیں ہیں اور تمدّن کے زمانہ میں مہذب اور رحیلہ جُو لوگ اکثر اس قسم کے مفرحات کا استعمال کرتے ہیں۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے ان کی بھی ممانعت فرمائی۔

نھٰی رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ و سلّم عن کلّ مسکر و مفتر۔	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے ہر منشّی و مخدّر چیز سے منع فرمایا۔
(ابوداؤد: کتاب الاشربہ)	

لیکن اس تفصیل و جامعیت کے بعد بھی یہ ممکن تھا کہ لوگ اس قسم کی منشّی چیزیں استعمال کریں جن پر عرفاً خمر کا اطلاق نہ کیا جاتا ہو۔ عرب میں اس قسم کی ایک مصنوعی چیز تھی جس کو داذی کہتے تھے۔ چنانچہ آپ نے اس کو بھی خمریات میں داخل فرمایا:

یقول یشربنّ ناس من امّتی الخمر یسمّونھا بغیر اسمھا۔	آپ نے فرمایا کہ میری امّت میں کچھ لوگ نام بدل کر شراب کا استعمال کریں گے۔
(ابوداؤد: کتاب الاشربہ)	

ان کے علاوہ عرب میں جن برتنوں میں شراب رکھی جاتی تھی، شروع میں اُن کے استعمال کی بھی ممانعت فرمائی۔

نھٰی عن الدبّاء والحنتم والمزفّت والنقیر۔	آپ نے کدو، سبز و سیاہ رنگ کے مرتبان اور کھجور کی جڑ سے جس میں سوراخ کر کے شراب رکھی جاتی منع فرمایا۔
(ابوداؤد: کتاب الاشربہ)	

لیکن چونکہ یہ ایک قسم کی سخت گیری تھی اس لئے آپ نے آخر میں اس حکم کو منسوخ فرما دیا۔ اب صرف شراب کے استعمال کی دو صورتیں باقی رہ گئی تھیں ایک یہ کہ اس کی حقیقت بدل دی جائے، دوسرے یہ کہ سخت مجبوری کی حالت میں استعمال کی جائے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے ان دونوں صورتوں

میں بھی شراب کی ممانعت فرمائی چنانچہ چند یتیم بچوں نے وراثت میں شراب پائی تھی حرمتِ خمر کے بعد وہ بے کار چیز ہو گئی۔ حضرت ابو طلحہؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اس کا سرکہ کیوں نہ بنا لیا جائے لیکن آپؐ نے اجازت نہ دی[1]۔

ایک بار دیلم حمیری نے آپؐ کی خدمت میں عرض کی کہ ہم سرد ملک میں رہتے ہیں اور سخت کام کرتے ہیں اس لئے گیہوں کی شراب پیتے ہیں کہ محنت اور سردی برداشت کرنے کی طاقت قائم رہے۔ آپؐ نے فرمایا "کیا اس سے نشہ بھی ہوتا ہے"؟ انہوں نے کہا "ہاں"۔ آپؐ نے فرمایا "تو اس کو چھوڑ دو"۔ انہوں نے کہا "لیکن اور لوگ نہیں چھوڑیں گے"۔ ارشاد ہوا کہ "اگر نہ چھوڑیں تو ان سے جہاد کرو[2]"۔

سود کی حرمت میں جزئیات کا احاطہ اسلام سے پہلے توراۃ نے بھی بنی اسرائیل کو اپنے بھائیوں سے سود لینے کی ممانعت کی تھی۔ انجیل نے بھی "ناروا نفع" سے لوگوں کو روکا ہے تاہم یہ ممانعت بہت مجمل ہے لیکن اسلام نے جب اس کو حرام کیا تو ربا کی حقیقت، ربا کی اقسام، کن کن چیزوں میں کس کس قسم کا ربا ناجائز ہے، اس کی پوری تفصیل کی۔ اس کے مشابہ اور مبہم معاملات سے بھی باز رکھا۔ اس ظلم میں لوگ کسی طرح بھی شریک ہوں ان سب کو شریکِ جرم ٹھہرایا:

لعن رسول اللہ صلّی اللہ علیہ و سلّم اٰکل الرّبٰو وموکلہ وشاھدہ وکاتبہ (ابوداؤد، کتاب البیوع)	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے سود کھانے والے، سود کھلانے والے، اس پر گواہی دینے والے اور اس کے لکھنے والے پر لعنت بھیجی۔

رشوت کی حرمت میں استقصاء

لعن رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے رشوت

---

[1] ابوداؤد جلد ۲ ص ۸۰ کتاب الاشربہ۔ اس سرکہ کے جواز و عدم جواز میں فقہا کا اختلاف ہے۔

[2] ابوداؤد جلد ۲ ص ۸۰ کتاب الاشربہ۔

الراشی والمرتشی — دینے والے اور رشوت لینے والے دونوں پر لعنت بھیجی ہے۔ (ابوداؤد، باب فی کراھیۃ الرشوہ)

اسلام کی دوسری اخلاقی تعلیمات میں بھی اس قسم کی تفصیل، استقصار اور تمام جزئیات کا احاطہ پایا جاتا ہے کیونکہ جس چیز کا عام رواج پیدا ہو جاتا ہے اس کی نہایت کثرت سے مختلف صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور ہر شخص کسی نہ کسی صورت میں مبتلا ہو جاتا ہے اس لئے جب تک ان تمام صورتوں کو مٹا نہ دیا جائے اس چیز کا کلیتاً قلع وقمع نہیں ہو سکتا۔

نرم وگرم اخلاق مسیحی فلسفۂ اخلاق نے دُنیا میں ایک بڑی غلط فہمی یہ پیدا کر دی تھی کہ اس نے حُسنِ اخلاق کا انحصار اخلاق کی صرف منفعل اور سرد قسم میں کر دیا تھا یعنی تواضع، خاکساری، فروتنی، عاجزی، خواری، بُردباری، مسکینی، غریبی، غمگینی وغیرہ منفعل قوتوں کو اخلاق کا درجہ دیا تھا اور اس کے مقابل کی قوتوں کی سخت توہین کی تھی۔ حالانکہ دُنیا کے امن وسلامتی اور ترقی وخوشحالی کے لئے دونوں قسم کی مناسب قوتوں کے امتزاج کی ضرورت ہے۔ جس قدر ایک مقام پر تواضع وخاکساری کی ضرورت ہے اسی قدر دوسرے مقام پر خودداری اور عزتِ نفس کی حاجت ہے۔ جس طرح عفو ودرگذر بلند ہمتی کا کام ہے اسی طرح عدل اور مناسب قانونی انتقام بھی بسا ضروری ہے۔ محکومانہ اخلاق کی خوگیری کا وعظ قناعت پسندوں کے لئے ضروری سہی مگر حاکمانہ روح بھی قوم کے اندر موجود رہنی چاہیئے کہ دنیا کے عدل کی میزان قائم رہے۔

نٹشے کا اعتراض مسیحی اخلاق پر جرمن فلاسفر نٹشے نے مسیحی اخلاق پر جا وبے جا اعتراضات کے جو تیر برسائے اور ان مسیحی اخلاقی تعلیمات کو جس طرح انسانی چہرہ کا داغ ٹھہرایا ہے وہ اسی لئے ہے کہ وہ صرف کمزوری، عاجزی، خواری اور مسکینی کی تعلیم دیتے ہیں جن سے لوگوں میں عزم، بلند ہمتی، استقلال، ثباتِ قدم، عزتِ نفس اور خودداری کے جوہر پیدا نہیں ہو سکتے۔ وہ کہتا ہے،

مسیحیت نے ہمیشہ کمزور، پست اور بوسیدہ اشیاء کا ساتھ دیا ہے مسیحیت نے

طبائع انسانی کی تمام خود دارانہ قوّتوں کا استیصال کر دینا اپنا مسلک قرار دیا ہے مسیحیت نے زبردست دماغوں کا ستیاناس کر دیا ہے[1]۔

اسلامی اخلاق کا اعتدال لیکن اس کو معلوم نہ تھا کہ مسیح علیہ السلام کے ۵۷۰ برس بعد اُس نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا ہے جس نے مسیحی نظام اخلاق کی غلطیوں کی تصحیح کر دی اور انسانی اخلاق کا ایسا معتدل نظام پیدا کر دیا جو ہر شخص، ہر قوم اور ہر زمانہ کے مناسب ہے۔ اسی کا اثر یہ ہوا کہ ابھی اس کی تعلیم پر دس سال کی مدت بھی نہیں گزری تھی کہ محکوموں نے حاکموں کی، پست نے بلند کی، ادنیٰ نے اعلیٰ کی اور تنزل نے ترقی کی جگہ حاصل کر لی۔ مسیحی یورپ کو ان میں سے ایک چیز بھی اس وقت تک نہ مل سکی جب تک اصلاح و تجدید کے نام سے اسلامی اصول کو اس نے عاریتہً قبول نہیں کیا۔

نفوس کا اختلاف استعداد اخلاقی تعلیم کوئی ایک ایسی طب نہیں ہے جس کا ایک ہی نسخہ ہر بیمار کی اندرونی بیماریوں کا علاج ہو۔ تمام انسانوں کی اندرونی کیفیتیں، اخلاقی استعدادیں اور نفسانی قوتیں یکساں نہیں ہیں۔ انسانوں میں کمزور و پست ہمت بھی ہیں اور قوی و بلند حوصلہ بھی، خاکسار و متواضع بھی ہیں اور مغرور و خوددار بھی، بزدل بھی ہیں اور بہادر بھی، بُردبار بھی ہیں اور غضب ناک بھی، بخیل بھی ہیں اور فضول خرچ بھی، گداگر بھی ہیں اور فیاض بھی، ناامید بھی ہیں اور پُرامید بھی، ضعیف الارادہ بھی ہیں اور قوی دل بھی، ظالم و زبردست بھی ہیں اور ذلیل و خوار بھی۔ الغرض امراض کے اس قدر متفاوت اور مختلف درجات اور مراتب ہیں کہ سب کے لئے ایک دوا بھی کارآمد نہیں ہو سکتی بہترین اخلاقی معالج وہ ہے جس نے ہر شخص، ہر قوم اور ہر زمانہ کے مطابق اپنے نسخے ترتیب دیئے ہوں اور ہر قسم کے مریضوں کو صحیح و تندرست بنانے کی قدرت رکھتا ہو۔

ہر شخص کی حسب ضرورت اصلاح صحیح اخلاقی تعلیم و تربیت کا اصول یہ ہے کہ ہر شخص یا

---

[1] نطشے از ایم اے گے، مترجمہ مولوی سید مظفر الدین ندوی ایم اے، باب سوم۔

ہر قوم کی نفسانی کیفیت کو دیکھ کر جو عنصر کم ہو اس کو زیادہ اور جو زیادہ ہو اس کو کم کر کے قوّتوں میں مناسب اعتدال پیدا کرے۔ وہ کمزور کو بہادر اور بہادر کو عادل، پست ہمّت کو بلند ارادہ اور بلند ارادہ کو دوسروں کے حقوق کو غصب نہ کرنے والا بنائے، وہ ناامید کو پُر امید کرے اور امید سے بھرے ہوئے کو یہ سمجھائے کہ جو کچھ تم کو مل رہا ہے وہ خُدا سے مل رہا ہے۔ وہ قانع کو بلند ارادہ اور حریص کو دوسروں سے بے نیاز کر کے خُدا سے مانگنے والا کر دے۔ وہ ذلیل وخوار کو خود دار اور خود دار کو غیر مغرور بنا دے۔ وہ اچھی قوّتوں کو نشو ونما دے اور بُری قوتوں کا رُخ اچھے مقصدوں کی طرف پھیر کر ان کی بُرائی کو کم سے کم کر دے۔

قوّتِ غضب اور قوّتِ شہوت میں تعدیل قدیم فلسفۂ اخلاق کے واقف کار جانتے ہیں کہ انسان کے تمام اخلاق کی بنیاد اس کی دو قوّتوں پر ہے، قوّتِ غضب اور قوّتِ شہوت۔ غضب نام ہے اپنے نفس کے نامناسب امور کے پیش آنے پر ان کی مدافعت کی قوّت کا اور شہوت نام ہے نفس کے مناسب امور کے حصول اور طلب کی قوّت کا۔ ان دونوں قوّتوں کی افراط و تفریط اور اعتدال اور ان کے مختلف مراتب سے سینکڑوں اچھی بُری اخلاقی جزئیات پیدا ہوتی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ نام ہے۔ غضب کی قوّت اگر افراط و تفریط سے پاک ہو اور عقل کے قابو میں ہو تو اس کا نام شجاعت ہے اور وہ حالات و کیفیات کے لحاظ سے مختلف پیکروں میں جلوہ گر ہوتی ہے مثلاً خود داری، دلیری، آزادی حق گوئی، بلند ہمتی، بُردباری، استقلال، ثباتِ قدم، وقار، صبر و سکون، مطالبۂ حق، جدوجہد، سعی و محنت، جہاد۔ پھر جب یہی قوّت اعتدال سے ہٹ کر افراط کی طرف مائل ہوتی ہے، تو تہوّر بن جاتی ہے اور اس سے سلسلہ بہ سلسلہ غرور، نخوت، خود پرستی، تکبّر، ترفّع، دوسروں کی تحقیر، ظلم، قتلِ نفس وغیرہ کی بُرائیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور جب یہ قوّت تفریط کی طرف جھکتی ہے تو ذلّت پسندی، کم حوصلگی، بے طاقتی، خوف اور دناءت کے قالب میں ظہور کرتی ہے۔ اسی طرح شہوت کی قوّت میں جب کامل اعتدال ہوتا ہے تو اس کو عفّت کہتے ہیں۔ یہی صفت مختلف سانچوں میں ڈھل کر مختلف ناموں سے پکاری جاتی ہے۔ یعنی پاک دامنی، پرہیزگاری

جود و سخا، شرم و حیا، صبر و شکر، قناعت، بے طمعی، خوش طبعی، ترقی کی خواہش، نسل و اولاد کی آرزو، خانگی مسرت کی مناسب طلب وغیرہ۔ پھر یہ صفت جب افراط و تفریط کی طرف مائل ہوتی ہے تو اس سے حرص و طمع، بے شرمی، فضول خرچی، بخل، ریا، اوباشی، تملق، حسد، رشک وغیرہ اوصافِ ذمیمہ پیدا ہو جاتے ہیں۔

مسیحی اور اسلامی اخلاقیات کا فرق مسیحیت کی تعلیم کا منشا انسان کی ان دونوں غضبی اور شہوی قوتوں کا استیصال ہے اور اسلامی تعلیم کی غرض ان دونوں کو افراط و تفریط سے ہٹا کر ان میں توسط اور اعتدال پیدا کرنا ہے۔ مسیحیت کے نزدیک نفس کی یہ دونوں قوتیں بذاتہٖ بُری ہیں اور اسلام کے نزدیک یہ دونوں قوتیں بجائے خود بُری نہیں ہیں بلکہ کبھی کبھی ان کے استعمال کا موقع و محل بُرا ہوتا ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ نہیں ہے کہ اپنی قوتِ غضب کو فنا کر کے "دشمن کو پیار کرو" اور نہ یہ کہ اپنی قوتِ خواہش کو فنا کر کے مجرّد رہو اور مفلس و غمگین بن کر زندگی گزار دو بلکہ یہ ہے کہ اپنے ذاتی دشمنوں کو بہتر یہ ہے کہ معاف کرو اور خُدائی دُشمنوں کے حق میں دعائے خیر کرو کہ انہیں ہدایت ملے اور خُدا کے حلال کئے ہوئے طیبات اور لذائذ سے لطف اٹھاؤ۔ لیکن شریعت کی مقرر کردہ حدود سے کبھی آگے نہ بڑھو۔ امام غزالیؒ کے بقول اسلام نے غصّہ کے دبانے والے کی تعریف کی ہے، غصّہ کے مٹانے والے کی نہیں، اس نے وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ کہا ہے وَالْفَاقِدِيْنَ الْغَيْظَ نہیں۔

مسیحی اخلاق کی کمزوریاں دُنیا میں علم و ہنر، خوشی و مسرت، ولولہ و انبساط، رونق و ترقی، جدّ و جہد جو کچھ ہے وہ انہی دونوں قوتوں کی جلوہ آرائیاں ہیں۔ اگر یہ دونوں قوتیں یک قلم مٹ جائیں یا ان میں افراط و تفریط پیدا ہو جائے تو نیکی، سعادت اور خوش بختی کی آدھی دُنیا مر جائے۔ نہ عفّت کا کوئی مفہوم ہو، نہ عصمت کے کوئی معنی ہوں، نہ عدل کا وجود ہو، نہ امن و امان کا نشان ملے، نہ کسی کی ملک محفوظ اور نہ کسی کی جان سلامت رہے، نہ انسان کی بلند ہمّتی، استقلال، ثباتِ قدم اور سعی و محنت کے جوہر نمایاں ہوں۔ قوموں کی ترقی اور ملکوں کا نظام درہم برہم ہو جائے اور خُدا کی یہ دُنیا ایک ایسا ویرانہ بن جائے جس میں

حرکت وجنبش کا نام نہ رہے۔

مسیحی اخلاقی تعلیم میں یہ نکتہ ملحوظ نہیں رہا ہے کہ نفسِ غصہ اور خواہش بُری چیز نہیں ہے بلکہ بے جا غصہ اور ناجائز خواہش بُری چیز ہے۔ نیز یہ کہ جس طرح غصہ اور خواہش بُری چیزیں ہیں اسی طرح وہ معائب بھی جو ان دونوں قوتوں کی تفریط اور کمی سے پیدا ہو جاتے ہیں مثلاً بے آبروئی، بے غیرتی، ذلّت پسندی، دنارت، بے طاقتی، تملّق، کم حوصلگی، بے عملی، مستی، فاقہ زدگی بھی بُرے ہیں۔ اسلام نے اپنے پیروؤں میں ان دونوں قوتوں کو اعتدال کے ساتھ جمع کیا ہے۔ اس نے جہاں ان کو رُحَمَآءُ بَیۡنَهُمۡ (آپس میں رحم دل) اور اَذِلَّةٍ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ (مومنوں کے فرمانبردار) کی تعلیم دی وہیں اَشِدَّآءُ عَلَى الۡكُفَّارِ (کافروں پر بھاری) اور اَعِزَّةٍ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ (کافروں پر گراں) بننے کی بھی تعلیم دی اور ان کو بتایا کہ عزت صرف خدا اور رسول اور ان کے فرمانبرداروں کے حصہ میں ہے، وَلِلّٰهِ الۡعِزَّةُ وَلِرَسُوۡلِهٖ وَلِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ۔ مسیحی قوموں کو اس وقت تک ترقی کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا جب تک اسلامی فلسفۂ اخلاق کی ان تعلیمات سے پروٹسٹنٹ بن کر انہوں نے فائدہ نہیں اٹھایا۔ لیکی تاریخ اخلاق یورپ کی دوسری جلد میں کہتا ہے:

لیکی کا اعتراض مسیحی اخلاق پر لیکن انکسار اور فروتنی کا وصف تمام تر مسیحیت کا پیدا کردہ ہے۔۔۔۔ اور گو یہ وصف بھی ایک زمانہ تک نہایت موزوں ومناسب رہا تاہم تمدّن کی روز افزوں ترقی کی رفتار کا آخر تک ساتھ نہ دے سکا۔ ترقی تمدّن کے لئے لازمی ہے کہ قوم میں خودداری ہو اور حرّیت کے جذبات موجود ہوں اور انکسار وتواضع اس کے دُشمن ہیں۔ یہ خانقاہانہ طرزِ زندگی کا مثل ہے۔ فوجی طرزِ زندگی کا اقتضا یہ ہے کہ استبدادی حکومت ہو۔ تاہم سپاہیوں میں تو پھر بھی فی الجملہ خودی و خودداری موجود ہوتی ہے لیکن اسے بالکل مٹا دینا جو خانقاہانہ زندگی کا مطمحِ نظر تھا کسی طرح ترقیٔ تمدّن کے حق میں مُفید نہیں پڑ سکتا تھا۔ اور پھر بڑے بڑے زاہدوں میں تو اس جذبہ سے اور فضائل پیدا ہوتے بھی رہتے ہیں لیکن عوام میں تجربہ سے معلوم ہوا کہ انکسار بالکل غلامانہ زندگی کے مرادف ہو

جاتا ہے۔ اسی کو دیکھ کر متأخرین حکمائے اخلاق نے بجائے انکسار کے خودی پر زیادہ زور دیا اور اس کے دو مظاہر ہیں، ایک مردانگی اور دوسرے خودداری۔ انہی پر زور دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ پروٹسٹنٹ ممالک میں جو صاف گوئی، آزاد خیالی، خوش معاملگی، بلند حوصلگی، غیرت و حمیت اور عالی ظرفی نظر آتی ہے وہ کیتھولک علاقوں میں نہیں پائی جاتی۔ بلکہ اُن کے بجائے دنارت، پست ہمتی، کم ظرفی، بُزدلی اور گداگری کے مناظر سامنے آتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اوّل الذکر میں سیاسی حرّیت کی جو جلوہ آرائیاں ہیں اُن سے آخر الذکر یکسر خالی ہیں۔ (فصل ۱۱)

اسلام اور بلند اخلاق لیکن اس کے بالمقابل معلّم اسلام علیہ السلام کی تعلیم جو کچھ ہے اس کا اندازہ آپؐ کے صرف ایک سبق سے ہو سکتا ہے۔ فرمایا:

ان اللہ یحب معالی الامور و	بے شک اللہ معالی امور کو پسند اور
یبغض سفسافھا۔ (مستدرک حاکم)	محقّرات امور کو ناپسند کرتا ہے۔

معالی امور سے مقصود عالی حوصلگی کے بڑے کام اور محقّرات سے مراد چھوٹی اور دُنی باتیں ہیں اس حدیث میں گویا ارشاد ہوا کہ ایک مسلمان کو خدا کا دوست بننے کے لئے ضرورت ہے کہ اس کی نظر ہمیشہ اونچی اور مقصد ہمیشہ بلند رہے اور دنارت کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے الگ رہے۔

اسی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی ایک اور تعلیم کا حوالہ دینا بھی اس باب میں اسلام کے نقطۂ نظر کو واضح کر دینے کے لئے کافی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

المؤمن القویّ خیر و احبّ الی	کمزور مسلمان سے قوّت ور مسلمان زیادہ
اللہ من المؤمن الضّعیف و فی	بہتر اور خُدا کے نزدیک پیارا ہے۔
کلّ خیر احرص علی ما ینفعك	اور ہر ایک میں بھلائی ہے۔ ہر وہ چیز
واستعن باللہ ولا تعجز و ان	جو تجھے نفع دے اس کی پوری خواہش

اصابك شيء فلا تقل لو انّي فعلت كان كذا وكذا ولكن قل قدر الله وما شاء فعل فانّ لو تفتح عمل الشيطان۔

(صحیح مسلم: کتاب القدر، باب فی الامر بالقوۃ)

کر اور خدا سے مدد چاہ۔ اس راہ میں کمزوری نہ دکھا اور اگر تجھے اس میں کچھ تکلیف پہنچ جائے تو یہ نہ کہہ "اگر میں یوں کرتا تو یوں ہوتا"۔ بلکہ یہ کہہ کہ اللہ نے مقدر کر دیا تھا اور جو چاہا اس نے کیا کیوں کہ یہ اگر داور مگر شیطان کا کاروبار کھولتا ہے۔

تقدیر، توکّل، صبر اور شکر یہ حدیث اُن تمام مسائل کی شرح کرتی ہے جن کو اسلام کی اصطلاح میں تقدیر توکّل، صبر اور شکر سے ادا کیا جاتا ہے اور جن کی پوری تفصیل مسئلہ قضا و قدر کے ضمن میں جلد چہارم میں اور عبادتِ قلبی کے تحتِ عنوان جلد پنجم میں کی جاچکی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ چاروں تعلیمات اسی لئے ہیں کہ مسلمانوں میں حوصلہ مندی، پُرامیدی، استقلال اور ثباتِ قدم پیدا ہو۔ مسلمان میں سب سے پہلے بڑے کام کا عزم پیدا ہونا چاہیئے پھر اس عزم کے پیدا ہونے کے ساتھ خُدا پر بھروسہ اور توکّل کر کے کام شروع کر دینا چاہیئے۔ اگر کام میں کامیابی ہوئی تو فخر وغرور کے بجائے دل سے خُدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے اور یہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ اسی کے فضل وکرم سے ہوا۔ اور اگر ناکامی ہو تو دل میں یاس اور نا اُمیدی کے بجائے صبر وثبات پیدا ہونا چاہیئے اور سمجھنا چاہیئے کہ خدا کا منشا یہی تھا (یہی تقدیر ہے)۔

حدیث بالا میں جو کچھ فرمایا گیا وہ درحقیقت قرآن پاک کی ان آیتوں کی تشریح ہے:

فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ○ اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ

جب تو پکّا ارادہ کر لے پھر خدا پر بھروسہ کر بے شک اللہ متوکّلوں کو پیار کرتا ہے۔ اگر خدا تمہاری مدد کرے گا تو کوئی تم پر غلبہ پانے والا نہیں اور اگر وہ چھوڑ دے

يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ	تو پھر اس کے بعد کون تمہاری مدد
فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ○	کر سکتا ہے خُدا ہی پر ایمان والوں کو
(آل عمرٰن : ۱۵۹-۱۶۰)	بھروسہ کرنا چاہیئے۔
مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِى الْاَرْضِ	کوئی مصیبت نہیں آتی زمین پر اور نہ تم پر
وَلَا فِىْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ	لیکن یہ کہ وہ اس کے پیدا کرنے سے
مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ	پہلے کتاب (الہی) میں درج ہوتی ہے۔
عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ○ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا	یہ اللہ پر آسان ہے۔یہ اس لئے
عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ	تاکہ اس پر جو تم سے جاتا رہے غم نہ کرو
اٰتٰىكُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ	اور جو تم کو اللہ دے اس پر اترایا نہ
فَخُوْرٍ ○	کرو۔ اللہ کسی اترانے والے ،
(الحدید : ۲۲-۲۳)	بڑائی مارنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ تقدیر، توکّل اور صبر و شکر کی تعلیم اسلام میں پستی اور دنارت کے لئے نہیں بلکہ مسلمانوں میں ہمت، جرأت، بہادری اور ثابت قدمی پیدا کرنے کے لئے ہے۔اسی تعلیم کا اثر تھا کہ صحابہ نے تمام خطرات سے نڈر ہو کر بڑی بڑی سلطنتوں اور فوجوں کا مقابلہ کیا اور کامیاب رہے۔ اُن کو مشکلات میں خُدا کے دوسرے برگزیدوں کی یہ دُعا سُنائی گئی :

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ	اے ہمارے پروردگار ہم پر صبر و ثبات کا
اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ	پانی بہا اور ہمارے پاؤں کو مضبوط گاڑ
الْكٰفِرِيْنَ ○ (البقرۃ : ۲۵۰)	اور ہم کو کافر لوگوں پر فتح یاب کر۔

اور بتایا کہ مشکلات میں دوسرے پیغمبروں کے ساتھیوں نے کیا کیا:

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ (آل عمران: ۱۴۶-۱۴۷)	اور کتنے نبی تھے کہ اُن کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والوں نے لڑائی لڑی تو خدا کی راہ میں جو مشکل یا مصیبت پیش آئی اس سے وہ سُست نہ ہوئے اور نہ کمزور رہوئے۔ اور خدا ثابت قدم رہنے والوں کو پیار فرماتا ہے اور ان کا کہنا نہ تھا لیکن یہی کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے گناہ اور ہمارا حد سے بڑھ جانا معاف فرما اور ہمارے پاؤں مضبوط رکھ اور ہم کو کافروں پر فتح دے۔

پھر خاص طور سے حکم ہوتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۣ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (آل عمران: ۲۰۰)	اے وہ جو ایمان لائے ثابت قدم رہو اور دُشمن کے مقابلہ میں ثابت قدم اور بہادر ثابت ہو اور اللہ سے تقویٰ کرو تاکہ کامیاب ہو۔

ان آیتوں سے معلوم ہو گا کہ اسلام نے اخلاق کی بلندی، عالی حوصلگی، بلند ہمتی اور مشکلات میں صبر و ثباتِ قدم کی کیسی اچھی تعلیم دی ہے یعنی جس طرح اس کے نزدیک تواضع، فروتنی اور عاجزی اپنے موقع پر پسندیدہ ہے اسی طرح سطوت اور بہادری و حکومت کا رُعب بھی اپنی جگہ پر محبوب ہے۔

اپنے دُشمنوں کو پیار کرو مسیحی اخلاقی تعلیم کا سب سے زرّیں اصول یہ ہے کہ اپنے دُشمنوں

کو پیار کرو۔ اس میں شک نہیں کہ اس اصول کی ظاہری چمک دمک ایسی ہے کہ ظاہر بینوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں لیکن اہلِ معنی نے اس کے منطقی تضاد کو اچھی طرح سمجھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود انجیل کے مفسروں[1] نے اس حکم کو ناممکن العمل بتایا ہے۔ تم دُشمن کو معاف کر سکتے ہو، دشمن کے ساتھ نیک سلوک کر سکتے ہو، دُشمن کے حق میں دُعائے خیر کر سکتے ہو مگر تم دُشمن سے پیار اور محبت نہیں کر سکتے کہ یہ دل کا فعل ہے جس پر تم کو قدرت نہیں۔

اخلاقِ محمدیؐ نے اس کے بجائے وہ تعلیم دی جن پر ہر خوش نصیب سے عمل ممکن ہے اور اللہ کے بندوں نے ہمیشہ اس پر عمل کیا ہے۔ یعنی دُشمنوں کے ساتھ نیک سلوک کرو، بُرا چاہنے والوں کے ساتھ بھلائی کرو، جو تم کو بد دُعائیں دیں اُن کو دعا دو، جو تمہارا قصور کریں ان کو معاف کرو اور جو تم پر ظلم کریں ان کے ساتھ انصاف کرو۔ فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا	اے ایمان والو! خدا کے لئے کھڑے ہو
قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ ۖ	جایا کرو انصاف کے ساتھ گواہ بن کر اور کسی
وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ	قوم کی دُشمنی تم کو عدل وانصاف کرنے سے
أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ	باز نہ رکھے انصاف کرو کہ انصاف کرنا
لِلتَّقْوَىٰ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ	پرہیز گاری سے بہت نزدیک ہے اور خدا
خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ○ (المائدۃ: ۸)	سے ڈرو کہ اس کو تمہارے کاموں کی خبر ہے۔
وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ	اور بھلائی اور بُرائی برابر نہیں، برائی کو بھلائی
ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا	سے دفع کرو، تو دفعتہً وہ جس کے اور تمہارے
الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ	درمیان دُشمنی ہے، رشتہ دار دوست
وَلِيٌّ حَمِيمٌ ○ وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا	کے مانند ہو جائے گا اور اس پر عمل کی
الَّذِينَ صَبَرُوا ۚ وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا	توفیق انہی کو ہوتی ہے جو صبر کرتے ہیں اور

[1] اسکاٹ صاحب کی تفسیر متی۔

ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ○ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ	انہی کو یہ سعادت ملتی ہے جو بڑی قسمت
مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ	والے ہیں۔ اور اگر شیطان تم کو اکسائے تو
بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○	خدا کی پناہ مانگو کہ وہ سننے والا جاننے
(حٰمٓ السجدۃ: ۳۴-۳۶)	والا ہے۔

۱۔ اس آیتِ پاک میں شروع ہی میں ایک اصول بتا دیا گیا ہے کہ بھلائی اور بُرائی برابر نہیں، ان دونوں کا فرق بالکل نمایاں ہے۔

۲۔ اس آیتِ پاک میں جس نیکی اور حُسنِ سلوک کی تاکید کی گئی ہے وہ اُن لوگوں کے ساتھ کرنے کی ہے جو تمہارے دُشمن ہیں کیوں کہ اس کے بعد ہی ہے کہ تمہارے اس نیک طرزِ عمل سے تمہارا دُشمن تمہارا دوست بن جائے گا۔

۳۔ دُشمن کے ساتھ اس نیکی کرنے کو صبر کا انتہائی درجہ کہا گیا اور اس کو عظیم الشان خوش قسمتی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ اخلاقِ محمدیؐ کے صحیفہ میں اس کا کیا درجہ ہے۔

۴۔ دُشمن کے ساتھ بُرائی کرنے کو اس میں شیطانی تحریک بتایا گیا ہے اور اس سے خوش قسمت مسلمانوں کو خدا کی پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ جو صحابہ میں بڑے مفسر ہیں اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں[۱]:

"اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غیظ و غضب کی حالت میں صبر کا اور کسی کی بُرائی کرنے پر حلم اور عفو دُرگذر کا حکم دیا ہے۔ وہ ایسا کریں گے تو خدا اُن کو شیطان کے پنجہ سے چھڑائے گا اور اُن کا دُشمن بھی دوست کی طرح اُن کے آگے سر جھکا دے گا۔"

ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے گالی دی۔

---

[۱] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۷۱۲، وابن جریر جلد ۲۴ ص ۶۸ مصر۔

وہ سُن کر چُپ رہے۔ اُس نے دوبارہ وہی حرکت کی وہ پھر بھی چپ رہے۔ اُس نے پھر تیسری دفعہ بدزبانی کی تو وہ چپ نہ رہ سکے اور کچھ بول اُٹھے۔ یہ دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم فوراً اُٹھ گئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کی "یارسول اللہ! کیا آپؐ مجھ سے خفا ہوئے"؟ فرمایا "اے ابوبکرؓ جب تک تم چُپ تھے خُدا کا فرشتہ تمہاری طرف سے کھڑا تھا جب تم نے جواب دیا تو وہ ہٹ گیا۔[1]

آپؐ نے فرمایا "صلۂ رحم یہ نہیں ہے کہ صلۂ رحم کرنے والوں کے ساتھ صلۂ رحم کرو بلکہ یہ ہے کہ جو قطعِ رحم کرے اس کے ساتھ صلۂ رحم کرو"[2] یعنی دوستوں کے ساتھ دوستی کوئی بات نہیں بلکہ دُشمنوں کے ساتھ دوستی اصلی خوبی ہے۔

ایک دفعہ ایک اعرابی نے خدمتِ نبویؐ میں آکر عرض کی "یارسول اللہ مجھے وہ بات بتایئے جس کے کرنے سے جنت مل جائے"۔ آپؐ نے اس کو چند باتیں بتائیں منجملہ اُن کے فرمایا "ظالم رشتہ دار پر اپنی عنایتوں کی بارش کردو"[3]۔

اسلام کی نظر میں کافر و مشرک سے بڑھ کر تو کوئی مذہبی دُشمن نہیں ہو سکتا لیکن دیکھو کہ قرآنِ پاک مسلمانوں کو اپنے ایسے دُشمنوں کے ساتھ بھی عفو و درگذر کی کیسی صریح تعلیم دیتا ہے:

قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ	(اے پیغمبر) مسلمانوں سے کہہ دے کہ ان
لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًا	کو جو خدا کے دنوں پر یقین نہیں رکھتے،
بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○	معاف کر دیا کریں تاکہ خدا ایسے لوگوں کو اُن
(الجاثیۃ: ۱۴)	کے کرتوتوں کا بدلہ دے۔

اگر عملی مثالیں چاہتے ہو تو وہ "ریاکار فریسیوں" اور "سانپوں اور سانپوں کے بچوں"[4] والی مسیحیت کے

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الادب باب فی الانتصار [2] صحیح بخاری کتاب الادب جلد ۲ صفحہ ۸۸۶۔

[3] مستدرک حاکم کتاب المکاتب، جلد ۲ صفحہ ۲۱۷ حیدر آباد دکن [4] انجیل متی ۲۳، ۲۵، ۳۳۔

واعظ میں نہیں بلکہ اسلام کے اُس اوّلین داعی و واعظ میں ہے جس نے فاتح بن کر مفتوح ہو کر نہیں، حاکم ہو کر محکوم بن کر نہیں، بیک دفعہ مکّہ کے ان ہزاروں دشمنوں کو معاف کر دیا جن میں سے ہر ایک اس کے خون کا پیاسا رہ چکا تھا[1]، جس نے اس کو معاف کیا جس نے اس کے قتل یا گرفتاری کے لئے اہل مکّہ کا اشتہار و انعام سُن کر اس کا تعاقب کیا تھا[2]، جس نے خیبر میں اپنے زہر دینے والی یہودیہ کو معاف کیا تھا[3]، جس نے اپنے چچا کے قاتل کو معاف کیا تھا[4]، جس نے حمزہؓ کی لاش کو بے حرمت کرنے والی اور اُن کے جگر کو چبانے والی کو معاف کیا[5]، جس نے اپنی قرۃ العین کے ایک طرح کے قاتل کو معاف کیا[6]، جس نے تنعیم کی وادی میں قریش کے اس گرفتار دستہ کو معاف کیا[7] جو اس کے قتل کے ارادہ سے آیا تھا، جس نے نجد کے ایک نخلستان میں جب وہ محوِ خواب تھا اپنے ایک تیغ بکف حملہ آور کو قابو میں پا کر معاف کیا[8]، جس نے اُن طائف والوں کے حق میں دعائے خیر کی[9] جنہوں نے اس پر کبھی پتھروں کی وہ بارش کی تھی جس سے اس کے پاؤں خون آلودہ ہو گئے تھے، جس نے اُحد کے میدان میں اپنے چہرہ کے زخمی کرنے والوں کو نیک دُعا دی[10]، جس نے دُشمنوں کے حق میں بد دُعا کرانے والوں کو کہا کہ میں دنیا میں لعنت کے لئے نہیں بلکہ رحمت کے لئے آیا ہوں[11] صلی اللہ علیہ وسلم۔ انتہا یہ ہے کہ کفار اور مشرکین کے ساتھ معاہدہ کو پورا کرنا تقویٰ (پرہیزگاری) کی شان بتائی گئی:

اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ	لیکن جن مشرکوں سے تم نے عہد باندھا
الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ	پھر انہوں نے تم سے کچھ کم نہ کیا اور نہ

---

[1] صحیح بخاری باب فتح مکّہ۔ [2] صحیح بخاری کتاب الہجرۃ۔ [3] صحیح بخاری باب فتح خیبر و ذکر وفات نبویؐ۔ [4] صحیح بخاری فتح طائف۔ [5] صحیح بخاری باب فتح مکّہ۔ [6] کتب سیر و طبقات صحابہ ذکر اشتہاریان فتح مکہ ہبار بن اسود۔ [7] جامع ترمذی کتاب التفسیر سورۂ فتح صفحہ ۵۰۴۔ [8] صحیح بخاری کتاب الجہاد صفحہ ۲۰۸۔ [9] ابن سعد غزوۂ طائف۔ [10] فتح الباری ج ۷ صفحہ ۲۸۶ مصر باب اُحد۔ [11] صحیح بخاری مبعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم و مشکوٰۃ اخلاق النبی صلی اللہ علیہ وسلم بحوالہ مسلم۔

شَيْئًا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ	تمہارے خلاف کسی کی مدد کی تو ان کا عہد
اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ	ان کی مدّتِ مقرر تک پورا کرو۔ اللہ پرہیزگاروں
اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ	کو دوست رکھتا ہے۔
الْمُتَّقِيْنَ ○ (التوبۃ : ۴)	

کفّار و مشرکین سے عدمِ موالات اس موقع پر اکثر معترض اسلام کے اُن احکام کو پیش کرتے ہیں جن میں مسلمانوں کو کافروں اور مشرکوں کی رفاقت اور موالات سے منع کیا گیا ہے حالانکہ یہ بالکل علیحدہ چیز ہے یقیناً ہر نیک تحریک کے بانی کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی تحریک کے قیام و بقا اور حفاظت کی خاطر اس تحریک کے پیروؤں کو اس کے اُن مخالفوں کے میل جول، رازداری اور رفاقت سے روک دے جو زور یا سازش سے اس کے مٹانے اور برباد کر دینے کے درپے ہوں خصوصاً ایسے وقت میں جب اس تحریک کو تیغ و خنجر اور فوج و لشکر سے مٹا دینے کی کوششیں ہو رہی ہوں اور طرفین میں لڑائی کی سی حالت قائم ہو یا غلط شبہے اور افواہیں پھیلا کر اس کے پیروؤں کو وہ برگشتہ کرنا چاہتے ہوں۔ چنانچہ اس قسم کی آیتیں:

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ	ایمان والے مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو
اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَ	اپنا دوست نہ بنائیں تو جو ایسا کرے گا
مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ	تو اس کو اللہ سے کوئی علاقہ نہیں مگر یہ
فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ	کہ تم ان سے بچاؤ چاہو۔
تُقٰىةً ؕ (اٰل عمرٰن : ۲۸)	

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا	اے ایمان والو! اپنے باپ اور بھائیوں
اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ	کو اگر وہ ایمان کے برخلاف کفر سے
اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ؕ	محبت رکھیں، اپنا دوست نہ بناؤ اور تم

وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○ (التوبۃ : ۲۳)

میں سے جو کوئی اُن سے دوستی رکھے گا تو وہی حد سے گزرنے والے ہوں گے۔

اسی موقع کی ہیں۔ ایک اور بات یہ بھی ہے کہ جب حق و باطل معرکہ آرا ہوں تو اہلِ حق کے درمیان اسی حق کی خاطر جس قدر محبت ہوگی فطرۃً ان اہلِ باطل سے اسی قدر بیزاری اور علیحدگی ہوگی جو اس حق کے مٹانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہوں۔ اس لئے حق کی حفاظت کی خاطر اہلِ حق کو اہلِ باطل سے اس قسم کی محبت اور موالات سے اسلام نے روکا ہے۔ اسلام کے اس قسم کے احکام کے معنی وہی ہیں جو "شہزادہ امن" کے اس اعلان کے ہیں:

"یہ مت سمجھو کہ میں زمین پر صلح کروانے آیا۔ صلح کروانے نہیں بلکہ تلوار چلانے کو آیا ہوں۔

کیوں کہ میں آیا ہوں کہ مرد کو اُس کے باپ اور بیٹے کو اس کی ماں اور بہو کو اس کی ساس سے جُدا کروں۔ آدمی کے دُشمن اُس کے گھر کے لوگ ہوں گے۔ جو کوئی باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ چاہتا ہے وہ میرے لائق نہیں"۔ (متی کی انجیل باب ۱۰۔ ۳۴)

یہی سبب ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے اخلاق میں یہودیوں کے ساتھ وہ نرمی، رحم دلی اور رقیق القلبی نہ تھی جو دوسرے نادان بُت پرستوں اور گنہگاروں کے ساتھ تھی۔ وہ یہودیوں کو بے تکلف سخت سے سخت الفاظ سے خطاب کرتے تھے۔ جب حجاز کے یہودیوں اور سرحدِ شام کے عیسائیوں سے مسلمانوں کی جنگ چھڑی اور بظاہر مال و دولت، ساز و سامان، اسلحہ اور مستحکم قلعوں کے سبب سے اُن کا پلّہ مسلمانوں سے زیادہ بھاری نظر آتا تھا تو مدینہ کے منافقوں اور کمزور دلوں کی عاقبت بینی اور دُور اندیشی ان کو اس پر مجبور کرتی تھی کہ وہ اسلام کے ان دُشمنوں سے ساز باز رکھیں تاکہ ان کے مقابلہ میں اگر مسلمانوں کو شکست ہو تو ان کو پناہ مل سکے۔ اسی کے ساتھ وہ مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا کر ان کو دینِ اسلام سے منحرف کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر مسلمانوں کو ان اہلِ کتاب سے رازدارانہ دوستی و محبت کے تعلقات رکھنے سے منع کر دیا، فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا

اے ایمان والو! یہودیوں اور نصرانیوں

الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ
اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ
مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا
يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○ فَتَرَى
الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ
يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى
اَنْ تُصِيْبَنَا دَآىِٕرَةٌ ۭ فَعَسَى اللّٰهُ
اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ
فَيُصْبِحُوْا عَلٰي مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ
اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ○ وَيَقُوْلُ
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ
اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ
اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ۭ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ
فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ○ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ
فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ
يُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ
اَعِزَّةٍ عَلَي الْكٰفِرِيْنَ ۡ

(المائدۃ: ۵۱-۵۴)

کو رفیق نہ بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے
کے رفیق ہیں اور جو کوئی تم میں سے اُن سے
رفاقت کرے، وہ ان ہی میں ہے، اللہ
بے انصاف لوگوں کو راہ نہیں دیتا۔ اب تو
ان کو دیکھتا ہے جن کے دل میں بیماری ہے
کہ وہ دوڑ کر ان سے ملے جاتے ہیں کہتے
ہیں کہ ہم کو ڈر ہے کہ ہم پر کوئی گردش نہ
آجائے، تو اللہ شاید جلد (مسلمانوں کی)
فتح یا دان کی کامیابی کی، کوئی اور بات
اپنے پاس سے بھیجے تو پھر وہ اپنے دل کی
چھپی بات پر پچھتانے لگیں اور مسلمان کہیں
کہ یہ وہی لوگ ہیں جو اللہ کی پکی قسم کھاتے
تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں خراب گئے
اُن کے عمل، پھر رہ گئے نقصان میں۔ اے
ایمان والو! اگر تم سے کوئی اپنے دین سے
پھرے گا تو خدا کا کچھ ہرج نہیں اللہ اپنے
دین کے لئے اور دوسرے لوگوں کو لائے
گا جن سے راضی ہوگا اور وہ اللہ سے راضی ہوں
گے جو ایمان والوں کے فرمانبردار اور کافروں پر بھاری
ہوں گے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا	اے ایمان والو! اہلِ کتاب اور کفار میں
الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّ	سے اُن کو جو تمہارے دین کو ہنسی مذاق
لَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ	بناتے ہیں اپنا رفیق نہ بناؤ اور خدا سے
مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ	ڈرو اگر یقین رکھتے ہو۔
وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○	

(المائدة: ۵۷)

ان آیتوں میں پوری تصریح ہے کہ کن لوگوں کو اور کن حالات میں اپنا رفیقِ کار، محرمِ اسرار اور مددگار نہ بناؤ اور اس ممانعت کا منشا کیا ہے؟ مزید تصریح آلِ عمران کی اس آیت میں ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا	اے ایمان والو! اپنے غیر کو اپنا بھیدی
بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ	نہ بناؤ وہ تمہاری خرابی میں کمی نہیں کرتے۔
خَبَالًا ۭ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ	جتنی تم کو تکلیف پہنچے اُن کو خوشی ہے، دشمنی
بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ښ	ان کی زبان سے نکلی پڑتی ہے اور جو اُن
وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ۭ قَدْ	کے جی میں چھپا ہے وہ اس سے زیادہ ہے۔
بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ	ہم نے تم کو باتیں جتا دیں اگر تم کو عقل ہے۔
تَعْقِلُوْنَ ○ (آل عمران: ۱۱۸)	

اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ کمزور مسلمانوں کو ساتھ ملا کر مسلمانوں کے منصوبوں اور نقشوں کی جاسوسی کرتے تھے اور بھیدوں کا پتہ چلاتے تھے جس کی روک تھام کے لئے مسلمانوں کو ان کی رفاقت اور سازباز سے روکا گیا ہے۔ سب سے زیادہ تصریح سورۂ ممتحنہ میں ہے۔ فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا	اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں

عَدُوِّیْ وَعَدُوَّکُمْ اَوْلِیَآءَ
تُلْقُوْنَ اِلَیْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ
کَفَرُوْا بِمَا جَآءَکُمْ مِّنَ الْحَقِّ ج
یُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِیَّاکُمْ اَنْ
تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّکُمْ ط اِنْ کُنْتُمْ
خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِیْ سَبِیْلِیْ وَ
ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِیْ صلے تُسِرُّوْنَ
اِلَیْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ صلے وَاَنَا اَعْلَمُ
بِمَآ اَخْفَیْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ ط وَ
مَنْ یَّفْعَلْهُ مِنْکُمْ فَقَدْ ضَلَّ
سَوَآءَ السَّبِیْلِ ○ اِنْ یَّثْقَفُوْکُمْ
یَکُوْنُوْا لَکُمْ اَعْدَآءً وَّیَبْسُطُوْٓا
اِلَیْکُمْ اَیْدِیَهُمْ وَاَلْسِنَتَهُمْ
بِالسُّوْٓءِ وَوَدُّوْا لَوْ تَکْفُرُوْنَ ط ○
لَنْ تَنْفَعَکُمْ اَرْحَامُکُمْ وَلَآ
اَوْلَادُکُمْ ج یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ج

(الممتحنة: ۱-۳)

کو دوست نہ بناؤ کہ تم ان کو دوستی کا پیغام
بھیجو اور وہ اس سچائی کے جو تم کو ملی، منکر
ہیں۔ وہ رسول کو اور تم کو اس لئے گھر سے
نکالتے ہیں کہ تم اپنے پروردگار اللہ پر
ایمان لے آئے۔ اگر تم میری راہ میں لڑائی
اور میری خوشنودی کی طلب میں نکلو تو تم
اُن کو دوستی کے چھپے پیغام بھیجو اور مجھے
خوب معلوم ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو تم
ظاہر کرتے ہو۔ جو تم میں سے ایسا کرتا ہے
وہ سیدھی راہ بھولا ہے۔ اگر وہ (جن کو تم
دوستی کا چھپا پیغام بھیجتے ہو) تم کو موقع سے
پائیں تو تمہارے دشمن ہوں اور تمہاری
تکلیف پہنچانے کے لئے اپنے ہاتھ بڑھائیں
اور بُرائی کے ساتھ اپنی زبانیں کھولیں اور
چاہتے ہیں کہ تم بھی کسی طرح دین کے منکر
ہو جاؤ۔ تم کو تمہاری قرابت اور تمہاری
اولاد قیامت کے دن نفع نہیں پہنچائے گی۔

آگے اس سے بڑھ کر تصریح سنیئے:

لَا یَنْهٰکُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ

خُدا تم کو ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور

يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ	انصاف کرنے سے باز نہیں رکھتا جو تم
يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ	سے مذہب میں لڑائی نہیں کرتے اور نہ
تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ	تم کو تمہارے گھروں سے نکالتے ہیں۔خدا
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ○	انصاف والوں کو پیار کرتا ہے۔وہ انہی
اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ	سے دوستی کرنے کو منع کرتا ہے جو تم سے
قَاتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ	مذہب میں لڑائی لڑیں اور تم کو تمہارے
مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓي	گھروں سے نکالیں اور تمہارے نکالنے
اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ	پر ایک دوسرے کے مددگار بنیں۔جو ان
يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰۗئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○	سے دوستی کا دم بھرے گا تو وہی بے انصاف
(الممتحنۃ:۸-۹)	ہوں گے۔

اس کے ساتھ یہ خوشخبری بھی سُنا دی کہ عنقریب تمہاری فتح ہو گی اور اس وقت یہ دُشمنی محبت سے بدل جائے گی فرمایا:

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَ	اُمید ہے کہ اللہ تمہارے اور تمہارے
بَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ	دُشمنوں کے درمیان دوستی پیدا کر دے
مَّوَدَّةً ۭ وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ ۭ (الممتحنۃ:۷)	اور اللہ قدرت والا ہے۔

ان آیتوں کا مطلب اُن کے شانِ نزول کے جاننے کے بعد بالکل صاف ہو جاتا ہے۔انہی میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ مسلمان قریش کی بے خبری میں مکّہ پر قبضہ کر لینا چاہتے تھے۔تیّاریاں ہو رہی تھیں کہ ایک مسلمان حاطبؓ بن بلتعہ نے اپنی ذاتی منفعت کے لئے چپکے سے ایک خط لکھ کر اور ایک عورت کو دے کر مکّہ کی سمت روانہ کر دیا کہ قریش خبردار ہو جائیں۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہو گئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

دو سواروں کو بھیجا کہ راستہ سے وہ خط اس سے واپس لے آئیں۔ وہ خط آیا تو آپؐ نے حاطبؓ سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ عرض کی "یا رسول اللہ! جلدی نہ فرمایئے بات یہ ہے کہ میں قریش میں رہتا ہوں لیکن ان سے میرا کوئی نسبی تعلق نہیں اور جس قدر مہاجر ہیں وہاں اُن کی قرابتیں اور رشتہ داریاں ہیں جن کے سبب سے ان کے خاندان کے لوگ محفوظ ہیں۔ میری وہاں کوئی قرابت نہ تھی جس کا مکہ والے لحاظ کرتے تو میں نے چاہا کہ میں ان پر یہ احسان کروں تاکہ وہ میرا کچھ لحاظ کریں۔ میں نے دینِ حق سے مرتد ہو کر ایسا نہیں کیا" آپؐ نے فرمایا "تم بدر والے لوگ ہو خدا نے تمہارے گناہ معاف کئے ہیں"۔ اس پر یہ آیت اُتری : یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا ۔ اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو اپنا دوست نہ بناؤ۔[۱]

یہ احکام اسی قسم کے ہیں جو عہدِ عتیق میں بھی مذکور ہیں۔ زبور میں ہے:

"اے خدا تو یقیناً شریروں کو قتل کرے گا پس اے خونیو! میرے پاس سے دور ہو جاؤ کیونکہ وہ تیری بابت شرارت سے باتیں کرتے ہیں۔ تیرے دشمن تیرا نام عبث لیتے ہیں۔ اے خداوند کیا میں ان کا کینہ نہیں رکھتا جو تیرا کینہ رکھتے ہیں؟ کیا میں ان سے جو تیرے مخالف ہو کے روٹھے ہیں بیزار نہیں؟ میں شدت سے ان کا کینہ رکھتا ہوں۔ میں انہیں اپنے دشمنوں میں گنتا ہوں"۔ (۱۳۹ - ۱۹ - ۲۲)۔

یشوع کے صحیفہ میں ہے:

"اگر تم کسی طرح سے برگشتہ ہو اور ان لوگوں کے بقیّہ سے لپٹو جو تمہارے درمیان باقی ہیں اور ان کے ساتھ نسبتیں کرو اور ان سے ملو اور وہ تم سے ملیں تو یقین جانو کہ خداوند تمہارا خدا پھر ان گروہوں کو تمہارے سامنے سے دفع نہ کرے گا بلکہ وہ تمہارے لئے پھندے اور دام اور تمہاری بغلوں کے لئے کوڑے اور تمہاری آنکھوں میں کانٹے

---

[۱] صحیح بخاری جلد ۲ ص ۲۶، تفسیر سورۂ ممتحنہ۔

ہوں گے یہاں تک کہ تم اس اچھی سرزمین پر سے جو خداوند تمہارے خدا نے عنایت کی ہے نابود ہو جاؤ گے۔ (یشوع باب ۲۳۔ ۱۲)۔

قرآنِ پاک اور احادیث میں بعض احکام ایسے بھی ہیں جن میں منکروں، ظالموں، بدکاروں اور گنہگاروں سے علیحدہ رہنے کی نصیحت ہے:

وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا	وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی کفر کرو جس طرح
فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً فَلَا تَتَّخِذُوْا	انہوں نے کفر کیا۔ تو ان میں سے اپنے
مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا	دوست نہ بناؤ یہاں تک کہ وہ خدا کی
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (النساء: ۸۹)	راہ میں ہجرت نہ اختیار کریں۔
وَاِذَا رَاَيْتَ الَّذِيْنَ يَخُوْضُوْنَ	اور جب تو اُن کو دیکھے کہ جو میری آیتوں
فِيْٓ اٰيٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتّٰى	کی شان میں لغو بکتے ہیں تو اُن سے کنارہ
يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ وَاِمَّا	کرے یہاں تک کہ وہ اس کے سوا دوسری
يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ	بات میں لگ جائیں۔ اور اگر تجھ کو شیطان
بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ	بھلا دے تو یاد آنے کے بعد پھر ان
(الانعام: ۶۸)	گنہگار لوگوں کے ساتھ نہ بیٹھ۔
وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ	اور تم پر کتاب میں یہ حکم اتار چکا کہ جب
اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَ	سنو اللہ کی آیتوں سے انکار ہوتے
يُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ	اور ان پر ہنسی ہوتے تو ان کے ساتھ جب
حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ	تک وہ دوسری بات نہ کرنے لگیں نہ بیٹھو
اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ (النساء: ۱۴۰)	ورنہ تم بھی ان ہی کے جیسے ہو جاؤ گے۔

یہ احکام اس لئے ہیں تاکہ بُری صحبت کا بُرا اثر مسلمانوں پر نہ پڑے۔ ان کے معنی قریب قریب وہی ہیں جو سینٹ پال کے ان فقروں کے ہیں:

"میں نے خط میں تم کو لکھا کہ حرام کاروں میں مت ملے رہو لیکن نہ یہ کہ بالکل دُنیا کے حرام کاروں یا لالچیوں یا لٹیروں یا بُت پرستوں سے نہ ملو نہیں تو تمہیں دُنیا سے نکلنا ضرور ہوتا پر میں نے اب تمہیں یہ لکھا ہے کہ اگر کوئی بھائی کہلا کے حرام کار یا لالچی یا بُت پرست یا گالی دینے والا یا شرابی یا لٹیرا ہو تو اس سے صحبت نہ رکھنا بلکہ ایسے کے ساتھ کھانا تک نہ کھانا.... غرض کہ تم اس بُرے آدمی کو اپنے درمیان سے نکال دو" (اول قرنیتون ۵)

"اور تم بے ایمانوں کے ساتھ نالائق جوُے میں مت جُتتے جاؤ کہ راستی اور ناراستی میں کون سا ساجھا ہے، اور روشنی اور تاریکی میں کون سا میل ہے، ایمان دار کا بے ایمان کے ساتھ کیا حصّہ ہے، خدا کی ہیکل کو بتوں سے کون سی موافقت ہے!..... اس واسطے خدا یہ کہتا ہے کہ تم اُن کے درمیان سے نکل آؤ اور جُدا ہو اور ناپاک کو مت چھوؤ"

(دوم قرنیتون ۶)

کفّار و مشرکین کے ساتھ دلی بیگانگی اور روحانی غیریت کے باوجود اسلام دنیاوی معاملات اور اخلاق میں مسلمانوں کو اُن سے عدل و انصاف اور رواداری کی تاکید کرتا ہے۔ عین لڑائی کی حالت میں بھی یہ حکم ہے:

وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ	اور اگر مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے
اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ حَتَّىٰ يَسْمَعَ	پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے یہاں تک
كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ أَبْلِغْهُ مَأْمَنَهُ ۚ	کہ وہ اللہ کا کلام سن لے پھر اس کو تو اس کی
ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُونَ ۝	امن کی جگہ تک پہنچا دے یہ اس لئے کہ وہ نادان
(التوبۃ: ٦)	لوگ ہیں۔

کیا ایک جنگجو مذہبی دشمن کے ساتھ اس سے زیادہ بھی حسن سلوک ہو سکتا ہے؟ کفار سے دلی بے تعلقی کے باوجود قرآن پاک میں یہ صریح حکم ہے کہ اگر کسی مسلمان کے ماں باپ مشرک و کافر ہوں تو بھی اُن کی خدمت بجالانا اور دنیاوی معاملات میں ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا ان کی مسلمان اولاد پر فرض ہے، فرمایا:

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ	اور اگر وہ دونوں (والدین) اس پر ضد
مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا	کریں کہ تو میرے ساتھ اس کو شریک کر
وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا	جس کا تجھے علم نہیں تو ان کی بات نہ مان
وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ثُمَّ	اور دنیا میں ان کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کر
اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ	اور اس کی راہ چل جو میری طرف جھکا پھر
تَعْمَلُوْنَ ○	تم سب کو میری طرف آنا ہے پھر میں تم کو جتاؤنگا
(لقمان: ۱۵)	جو تم کرتے تھے۔

مذہبی دشمنوں کے ساتھ اس سے زیادہ رواداری اور کیا ہو سکتی ہے کہ مذہبی مخالفت کے باوجود ان کی دنیاوی خدمت اور ان کے ساتھ نیک برتاؤ میں کوئی کوتاہی نہ کی جائے۔

سختی کا جائز موقع اس میں شک نہیں کہ اسلام میں نہ صرف کفار بلکہ ان کے ساتھ بھی جن کو قرآن کی اصطلاح میں "منافقین" کہتے ہیں بعض موقعوں پر سختی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جیسے کسی قوم کے ساتھ مسلمانوں کو لڑائی درپیش ہو اور اس وقت خطرہ ہو کہ جو کافر یا منافق مسلمانوں کے ساتھ آباد ہیں وہ دھوکے سے دشمنوں کے ساتھ میل اور سازش نہ کرلیں یا لڑائی کے بغیر بھی وہ مسلمانوں کے اندر رہ کر ان کی جماعت میں تفرقہ پردازی کریں اور طرح طرح کے شبہوں اور افواہوں سے مسلمانوں کی جمعیت میں پریشانی پیدا کریں، اس حالت میں ان کافروں اور منافقوں کی سختی کے ساتھ نگرانی اور دیکھ بھال کی جائے اور مسلمانوں کو اُن کے میل جول سے روک دیا جائے، اور اگر وہ لڑ پڑیں تو بہادری کے ساتھ اُن سے لڑا جائے یہاں تک کہ وہ اپنی اس مذموم حرکت

سے باز آجائیں۔ ان تمام امور کے فیصلہ کا حق امامِ وقت کو حاصل ہے۔ اس موقع کی دو آیتیں سورۂ توبہ میں ہیں:

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوْا ؕ وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ اِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ۚ وَمَا نَقَمُوْۤا اِلَّاۤ اَنْ اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝

(التوبة: ۷۳-۷۴)

اے پیغمبر اُن کافروں اور منافقوں سے جہاد کر اور ان پر سختی کر اور ان کی جائے پناہ دوزخ ہے اور وہ کتنی بُری بازگشت کی جگہ ہے۔ یہ اللہ کی قسم کھاتے ہیں کہ انہوں نے ایسا نہیں کہا۔ حالانکہ انہوں نے یقیناً کفر کی بات کہی اور اسلام کے اظہار کے بعد کفر کیا اور اس بات کا قصد کیا تھا جس کو وہ نہ پا سکے اور انہوں نے عیب نہیں کیا لیکن یہی کہ خدا اور اس کے رسول نے اپنی مہربانی سے ان کو دولت مند کر دیا۔ تو اگر وہ باز آجائیں تو ان کے لئے یہ بہت اچھا ہے اور اگر وہ منہ پھیریں تو اللہ اُن کو اس دنیا میں اور آخرت میں دردناک سزا دے گا اور زمین میں نہ ان کا کوئی دوست ہوگا نہ مددگار۔

یہ آیتیں اس سختی کے موقع کو خود اپنے الفاظ سے ظاہر کر رہی ہیں اور ان کے آگے اور پیچھے جو اور آیتیں ہیں وہ اور اس کی وضاحت کرتی ہیں۔ تین رکوع کے بعد سورہ کے خاتمہ میں مسلمانوں

کو رومیوںؓ کے مقابلہ میں اپنی پوری سختی کے مظاہرہ کی ہدایت کی گئی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ	اے ایمان والو! اُن کافروں سے
يَلُونَكُم مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ	لڑو جو تمہارے ہم سرحد ہیں اور چاہیئے
غِلْظَةً ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ	کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں۔ اور یقین
الْمُتَّقِينَ ○ (التوبۃ: ۱۲۳)	کرو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔

اس سختی کے مظاہرہ کا حکم اس لئے ہے تاکہ وہ مسلمانوں کو کمزور سمجھ کر اُن پر حملہ کی نیت نہ کریں۔

تحریم اور ایلاء کے موقع پر جب بعض منافق اہل بیتِ نبویؐ میں پھوٹ ڈال کر مسلمانوں کی جماعت میں افتراق اور انتشار پیدا کرنا چاہتے تھے، کفار اور منافقین کے ساتھ سختی سے پیش آنے کا حکم ہوا:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ	اے پیغمبر! اُن کافروں اور منافقوں
الْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۚ وَ	سے جہاد کر اور ان پر سختی کر اور اُن کا
مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ○	ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بازگشت کی کتنی
(التحریم: ۹)	بُری جگہ ہے۔

یہ تمام مواقع سیاسی انتظام اور جماعتی نظام کی برقراری سے متعلق ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کفّار اور منافقین کے زمرہ میں وہ کمزور مسلمان بھی شمار کئے گئے ہیں جو اس انتظام اور نظام کی بربادی میں کفّار و منافقین کے ساتھ عملاً شریک ہو گئے تھے۔

قرآن پاک میں ایک اور ایسی آیت ہے جس سے مخالف جو اسلام پر سنگ دلی و بے رحمی کا الزام لگاتے ہیں اپنے مدّعا پر غلط استدلال کر سکتے ہیں۔ اور وہ سورۂ فتح کی حسبِ ذیل آیت ہے جس میں ایک

ۓ تفسیر ابن جریر طبری جلد ۱۰، صفحہ ۴۶، مصر۔

طرف صحابہ کی بہادری اور دوسری طرف اُن کی باہمی محبت اور رحم دلی کی تعریف ہے :

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗۤ	محمدؐ خدا کے رسول اور جو ان کے ساتھ
اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ	ہیں وہ کافروں پر سخت (بھاری) ہیں اور
بَیْنَھُمْ (الفتح : ۲۹)	آپس میں مہرو محبت رکھتے ہیں ۔

اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ کا یہ ترجمہ کہ "وہ کافروں پر سخت ہیں" اس معنی میں نہیں ہے کہ وہ کافروں کے ساتھ سنگ دلی، بے رحمی اور بد اخلاقی کے ساتھ پیش آتے ہیں بلکہ اس معنی میں ہے کہ یہ مسلمان اپنی ہمت، استقلال، باہمی اتحاد اور شدتِ ایمان کے سبب سے ایسے سخت ہیں کہ کفّار اُن سے مرعوب ہیں اور مقابلہ میں مسلمان اُن پر ایسے بھاری ہیں کہ کفّار اُن پر حملہ کرنے کا حوصلہ نہیں کر سکتے اس لئے محاورہ کے مطابق اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ کا یہ ترجمہ نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ کافروں پر سخت ہیں بلکہ یہ کرنا چاہیئے کہ وہ کفّار پر بھاری ہیں یعنی اُن پر غالب اور اُن کے مقابل میں کافی مضبوط ہیں اُن سے کسی طرح دبتے نہیں ۔ چنانچہ علامہ زمخشری نے کشاف میں، ابنِ حیان اندلسی نے بحر المحیط میں، قاضی بیضاوی نے انوار التنزیل میں اس آیت کے وہی معنی قرار دیئے ہیں جو سورۂ مائدہ کی اس آیت کے ہیں :

اَذِلَّۃٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّۃٍ	فرمانبردار ہیں مسلمانوں کے اور بھاری ہیں
عَلَی الْکٰفِرِیْنَ ز (المائدۃ : ۵۴)	کافروں پر ۔

یہ محاورہ قرآن میں کئی جگہ آیا ہے ۔ مثلاً سورۂ ہود میں ہے :

یٰقَوْمِ اَرَھْطِیْٓ اَعَزُّ عَلَیْکُمْ مِّنَ	اے لوگو! کیا میرا خاندان تم پر خدا سے
اللّٰہِ ؕ (ھود : ۹۲)	زیادہ بھاری (مضبوط) ہے ۔

دوسری آیت میں ہے :

عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ (التوبۃ: ۱۲۸) تمہاری تکلیف رسول پر گراں ہے۔

لسان العرب میں ہے:

ورجل شدید قویٌّ والجمع اشدّآء[1] مرد شدید یعنی قوی اور اس کی جمع اشدّاء ہے۔

قرآن پاک میں اَشَدُّ قُوَّةً، اَشَدُّ خَلْقًا، اَشَدُّ تَثْبِيتًا، اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا وغیرہ متعدد آیتوں میں استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ قوی اور مضبوط کے معنی میں آیا ہے۔ دوسرے مشتقات میں بھی یہ معنی مراد لیے گئے ہیں:

اُشْدُدْ بِهٖ اَزْرِيْ (طٰہٰ: ۳۱) اس سے میری کمر کو مضبوط کر۔

وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا (النبأ: ۱۲) اور تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے۔

وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ (ص: ۲۰) اور ہم نے اُن کی سلطنت مضبوط کی۔

فَشُدُّوا الْوَثَاقَ (محمد: ۴) پھر مضبوط باندھو۔

شَدِید کے مشترک معنی یہ ہیں کہ جو اپنی مخالف قوت کے سامنے نہ جھکے بلکہ اس کے مقابلے میں مضبوط اور سخت رہے۔ اور یہی صحابۂ کرام کی صفت تھی۔ انہوں نے کفّار کی بڑی بڑی مخالفتوں کی پروا نہ کی، تکلیفوں اور مزاحمتوں کا پُر زور مقابلہ کیا، دُشمنوں کی تلوار کے نیچے سر رکھ دیا، اُن کے نیزوں کو سینوں میں جگہ دی، اُن کے تیروں کی بوچھاڑ سے لہو لہان ہوئے، مگر جس کو ایک کہا تھا، پھر اس کو دو نہ کہا اور جس کی تصدیق کر چکے تھے پھر اُس سے انکار نہ کیا۔ آخر یہ ہوا کہ کفار اپنی تعداد کی کثرت کے باوجود اُن سے دبنے لگے اور مسلمانوں کی ایمانی قوت کا رُعب اُن پر بیٹھ گیا۔ قرآن نے جو پیشین گوئی کی تھی کہ سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ (آل عمران والانفال) ''میں ان کافروں کے دلوں میں مسلمانوں کا رُعب

---

[1] جلد ۴ صفحہ ۲۱۸ مصر

بٹھادوں گا" وہ بالآخر پوری ہوئی اور فرمایا وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ (الاحزاب والحشر)

"اُن کے دلوں میں مسلمانوں کا رُعب ڈال دیا۔"

مخالفوں کے دلوں میں اسی رُعب بٹھانے کے لئے اللہ تعالٰے نے مسلمانوں کو ہمیشہ سامانِ جنگ مہیا رکھنے کا حکم دیا ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ	اُن کے لئے تم سے جو طاقت ہو سکے اور
قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ	گھوڑوں کا باندھنا وہ تم تیار رکھو کہ
عَدُوَّ اللّٰهِ (الانفال:۶۰)	اس سے دشمنوں کو مرعوب کرو۔

اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ کفار کو ڈرایا کرو بلکہ یہ ہے کہ تمہارا ساز و سامان اور جنگی تیاری اتنی ہو کہ دشمن تمہارے مقابل آنے سے رُعب کھائے اسی لئے جہاد کا پورا سامان ہر وقت تیار رکھنا مسلمانوں پر فرض ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے جہاد کی غرض سے گھوڑوں کے رکھنے کو ثواب کا کام بتایا ہے فرمایا "جو شخص گھوڑا خدا کی راہ میں باندھتا ہے اور اُس کا حق ادا کرتا ہے وہ اس کے لئے ثواب کا موجب ہے جو ضرورت کے لئے باندھتا ہے اس کے لئے پردہ پوش ہے اور جو نمائش کے لئے باندھتا ہے وہ اس کے لئے عذاب[1] ہے" اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شریعتِ محمدیہ میں نیت کا سوال سب سے اہم ہے، اسی لئے ضروری ہے کہ حق کے مخالفوں کے ساتھ ایک مسلمان کو جس عدمِ موالات کا حکم دیا گیا ہے اس کا منشا ذاتی وقومی نفرت اور بیزاری نہ ہو بلکہ وہ صرف حق کی نصرت کی خاطر اور خدا کے لئے ہو لیکن اس کے باوجود ان باطل کے حامیوں کے ساتھ عدل وانصاف اور نیک برتاؤ سے اسلام نے اپنے پیرؤوں کو نہیں روکا ہے۔

خدا کے لئے محبت اور خدا کے لئے ناراضی یہاں کوئی معترض یہ کہہ سکتا ہے کہ اسلام نے سرے سے نفرت اور بیزاری کے جذبات ہی کا خاتمہ کیوں نہیں کر دیا لیکن ایسا کرنا فطرت کے قوانین سے

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجہاد۔

چشم پوشی کرنا ہے۔ محبت اور عداوت، موافقت اور مخالفت، رضامندی اور ناراضی انسان کے فطری جذبات ہیں اور دُنیا کے تمام کام، تمام تحریکیں اور تمام جد وجہد، انہی دو برابر کے جذبات کے نتیجے ہیں۔ اگر انسان کو ان دونوں جذبات سے پاک کر دیا جائے تو اس کی نیک و بد ہر قسم کی گرم جوشیاں سرد پڑ جائیں اور یہ آگ کا شعلہ جس سے انسان کا دل عبارت ہے برف کا تودہ بن جائے۔ اس لئے یہ نہ ممکن ہے اور نہ مناسب ہے کہ اس کے محبت اور ناراضی کے جذبات کو سرے سے فنا کر دیا جائے بلکہ جو ہوسکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے اندر سے ذاتی رجحانات اور شخصی میلانات کا عنصر علیحدہ کر دیا جائے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ نہیں کہ نفس سے غیظ و غضب اور ناراضی کے فطری جذبات کو نکال کر پھینک دو جو یقیناً ناممکن ہے بلکہ یہ ہے کہ ان جذبات کے استعمال کا صحیح موقع و محل متعین کیا جائے۔ چنانچہ اسلام نے ان موقعوں کی تعیین کی ہے اور بتایا ہے کہ کسی سے مخالفت اور آزردگی ذاتی خود غرضی اور شخصی نفع و نقصان کے لئے نہ ہو بلکہ اگر یہ ہو تو صرف حق کی حمایت، نیکی کی اعانت اور خدا کی خوشنودی کے لئے ہو۔ صلح و جنگ، دوستی و دُشمنی، رضامندی و ناراضی اور محبت و عداوت جو کچھ ہو وہ خدا کے لئے ہو۔ الحبّ فی اللہ والبغض فی اللہ۔

یہ کہنا بظاہر بہت خوش نما ہے کہ ہر قسم کی ناخوشی و ناراضی کے جذبات سے انسان کو پاک کر دینا ایک اچھے مذہب کا فرض ہے مگر یہ فرض فطرت کے خلاف ہے۔ ناخوشی و ناراضی کو سرے سے فنا نہیں کیا جاسکتا ہے بلکہ جو ہوسکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس ناخوشی و ناراضی کے موقع و محل کی اصلاح کی جائے۔ یہ ناممکن ہے کہ انسان کسی شے سے اور اس کی ضد سے بھی برابر کی محبت کرے۔ وہ جب خیر سے محبت کرے گا تو شر سے نفرت بھی کرے گا، وہ ایمان کو چاہے گا تو کفر سے بیزار بھی ہوگا، وہ نیکوں سے دوستی کرے گا تو شریروں سے علیحدہ بھی ہوگا، مومن سے خوش ہوگا تو منافق سے ناخوش بھی ہوگا۔ انسان کے سینہ میں صرف ایک دل ہے اور ایک ہی دل میں ایک شے کی اور پھر اسی کی ضد کی دونوں کی محبت یک جا نہیں ہوسکتی جیسا کہ قرآن نے کہا:

مَا جَعَلَ اللّٰہُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَیْنِ فِیْ جَوْفِہٖ ج (الاحزاب:۴) خُدا نے کسی کے سینہ میں دو دل نہیں بنائے۔

سینہ میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے

اسی مفہوم کو حضرت مسیح علیہ السّلام نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے:

"کوئی آدمی دو آقاؤں کی خدمت نہیں کر سکتا اس لئے کہ یا ایک سے دُشمنی رکھے گا یا دوسرے سے دوستی یا ایک کو مانے گا اور دوسرے کو ناچیز جانے گا تم خُدا اور مال دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے" (متی ۶-۲۴)۔

انجیل کے اسی فقرہ کی تشریح مختلف عیسائی رسولوں نے اپنے اپنے طور پر کی ہے، پولوسؔ نے خدا اور آدمی، یعقوبؔ نے خدا اور دنیا، یوحنّاؔ نے خُدا اور دُنیا کے بُرے کاموں کو باہم مقابل ٹھہرا کر کہا ہے کہ جو ایک سے محبّت کرے گا وہ دوسرے سے نہیں۔

یہی مفہوم احادیث کے ان الفاظ میں ہے کہ محبّت اور عداوت دونوں صرف خدا کے لئے ہونی چاہیئے اپنی ذات کے لئے نہیں۔ بیہقی کی شعب الایمان میں ہے کہ آنحضرت صلی اللّٰہ علیہ وسلّم نے ابوذرؓ سے پوچھا کہ "ایمان کی کون سی زنجیر زیادہ مضبوط ہے"۔ عرض کی "خُدا اور اس کے رسول کو بہتر علم ہے"۔ فرمایا "یہ کہ باہمی میل جول خُدا میں ہو محبّت بھی خدا ہی میں ہو اور ناراضی بھی ہو تو خُدا ہی میں ہو"۔ مسند احمد میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللّٰہ علیہ وسلّم نے صحابہ سے دریافت کیا کہ "کون سی نیکی خدا کو زیادہ پیاری ہے"۔ کسی نے نماز کہا، کسی نے زکوٰۃ کہا، کسی نے جہاد بتایا۔ آپؐ نے فرمایا "تمام نیکیوں میں سب سے زیادہ خُدا کو یہ نیکی پسند ہے کہ خُدا ہی کے لئے محبت اور خُدا ہی کے لئے مخالفت ہو"۔

اسلام میں کسی سے دائمی یا موروثی نفرت کی تعلیم نہیں | خُدا کے لئے کسی سے ناخوشی یا مخالفت

لے گلیتون کے نام ۱-۱۰۔ ۲ے یعقوب ۴-۴۔ ۳ے یوحنا ۲-۱۵۔ ۴ے مشکوٰۃ کتاب الادب باب الحب فی اللّٰہ۔

یا نارضامندی کے یہ معنی ہیں کہ نفسانی غرض وغایت کو اس جذبہ میں کوئی دخل نہ ہو۔ نیز یہ کہ شخص سے شخص کی حیثیت سے مخالفت یا بیزاری نہ ہو بلکہ دراصل اس کے افعال، اعمال اور اخلاق سے مخالفت یا بیزاری ہو اور اس کے سبب سے اس شخص سے علیحدگی و بیزاری ہو جس میں یہ صفتیں پائی جاتی ہوں۔ قرآن پاک کی ایک آیت ہے:

حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ؕ (الحجرات: ۷)	خدا نے ایمان کو تمہارا محبوب بنایا اور اس کو تمہارے دلوں میں مزین کیا اور کفر اور بے حکمی اور نافرمانی کو تمہارے نزدیک مکروہ بنایا۔

اس آیتِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے خود مومن یا فاسق و عاصی کی ذات کو نہیں بلکہ ایمان کو محبت کا اور فسق و فجور اور عصیاں کو نفرت و کراہت کا مورد قرار دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کی بیزاری و نارضامندی کا بنیادی سبب کافر و منافق کا کفر و نفاق ہے۔ یہ دور ہو جائے تو وہ بھی برابر کا بھائی ہے۔ فرمایا:

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ؕ (التوبۃ: ۱۱)	تو اگر وہ کفر سے توبہ کریں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔

یہی سبب ہے کہ ان صفات کے ازالہ کے بعد ہی دفعتہً کراہت محبت سے، دشمنی دوستی سے اور نارضامندی رضامندی سے بدل جاتی ہے کیونکہ اسلام میں شخصی یا نسلی یا وطنی کسی پیدائشی یا دائمی نفرت و کراہت کا وجود نہیں۔ نہ ہندوؤں کی طرح اس کی نظر میں کوئی قابلِ نفرت اچھوت ہے نہ ملیچھ ہے نہ چنڈال ہے نہ یہودیوں کی طرح کوئی ناپاک غیر مختون ہے اور نہ غیر قوم ہے اور نہ مجوسیوں کی طرح کوئی پاک نژاد

اور بدگہر کی تفریق ہے اور نہ عیسائیوں کی طرح کوئی کالے گورے اور یوروپین غیر یوروپین کی تقسیم ہے۔ جو کچھ ہے وہ کفر و ایمان اور شرک و توحید کا فرق ہے۔ ایک خالص عرب اور قریشی کافر ہو کر ابوجہل وابولہب ہو سکتا ہے اور ایک معمولی حبشی و عجمی مومن و موحد ہو کر بلالؓ حبشی، صہیبؓ رومی اور سلمانؓ فارسی کا رتبہ پاسکتا ہے۔ وہی عمرؓ، وہی سفیانؓ، وہی عکرمہؓ، وہی خالدؓ جو کل تک کفر کے علمبردار بن کر مسلمانوں کے سخت ترین دشمن تھے بیک نظر اُن کی وہ کایا پلٹ ہوئی کہ وہ مسلمانوں کے سرگروہ ہو گئے اور مسلمان اُن کے فدائی بن گئے اور سب آپس میں بھائی بھائی ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ احسان جتایا:

اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ (آل عمران: ۱۰۳)

(یاد کرو) جب تم باہم دُشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں باہم الفت پیدا کر دی اور تم اس کے فضل و کرم سے بھائی بھائی بن گئے۔

ناپسندیدگی و بیزاری کا دوسرا جذبہ وہ ہے جس کی بنا کسی انسان کی گنہگاری اور عصیاں کاری پر ہے۔ توبہ و ندامت کے ایک حرف سے یہ جذبہ رحمت و شفقت سے مبدّل ہو جاتا ہے۔ بشیرِ عالم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے گنہگاروں کو خدا کی زبان سے یہ مژدہ سُنایا کہ

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ○ (الزمر: ۵۳)

اے میرے وہ بندو جنہوں نے گناہ کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے خُدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ خُدا سب گناہوں کو معاف کر سکتا ہے وہ بخشنے والا اور رحم کھانے والا ہے۔

آپؐ نے فرمایا التائب من الذنب کمن لا ذنب له[1] "گناہ سے توبہ کرنے والا

---

[1] ابن ماجہ باب ذکر التوبہ۔

ایسا ہے جیسا وہ جس کا گناہ نہ ہو۔" یہی سبب ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے گنہگاروں کے ساتھ بھی شفقت فرمائی اور اُن کی طرف ترحم کی نظر سے دیکھا اور ان کو رضائے الٰہی کی بشارت سُنائی۔ ایک صاحب کو شراب پینے کی عادت تھی وہ اس کی سزا بار بار بھگتتے تھے۔ ایک دفعہ جب وہ اسی جرم میں پکڑے آئے تو صحابہ نے کہا خدا اس پر لعنت کرے کہ کس قدر بار بار لایا جاتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ سُنے تو فرمایا تم لوگ اس پر لعنت نہ بھیجو خُدا کی قسم مجھے اس کے متعلق جو معلوم ہے وہ یہ ہے کہ وہ خُدا اور اُس کے رسول کو پیار کرتا ہے[1]۔" اس واقعہ سے علماء نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ گناہگار پر بددُعا نہ کی جائے[2]۔ ماعزؓ بن مالک ایک صاحب تھے جو بشری کمزوری سے زنا کے مرتکب ہوئے۔ واقعہ کے بعد ان کا روحانی احساس بیدار ہوا وہ جانتے تھے کہ اس کی سزا موت ہے تاہم انہوں نے خدمتِ نبویؐ میں حاضر ہو کر اپنی حالت عرض کی اور سزا کی درخواست کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے کئی دفعہ اُن کی درخواست رد کی، لوگوں سے تحقیق کی کہ یہ پاگل تو نہیں۔ سب نے کہا ایسا تو نہیں ہے۔ اس کے بعد ان پر حد جاری کرنے کا حکم دیا۔ وہ میدان میں کھڑے کئے گئے اور اُن پر لوگوں نے ہر طرف سے سنگ باری کی اور اسی حال میں انہوں نے جان دی۔ صحابہ میں بعض ایسے تھے جو اس بہادرانہ سزا پانے کے باوجود ماعزؓ کو بُرا کہتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کو خبر ہوئی تو فرمایا "ماعزؓ کے لئے خُدا سے مغفرت کی دُعا مانگو کہ اس نے وہ توبہ کی کہ اگر وہ کسی پوری قوم میں بانٹی جائے تو اس میں سب کی گنجائش ہوسکتی ہے[3]۔"

اسی طرح قبیلہ غامد کی ایک حاملہ عورت نے آکر خود اپنے جرم کا اقرار کیا اور سزا کی درخواست کی۔ آپؐ نے فرمایا کہ وضعِ حمل کے بعد آنا وہ اس کے بعد آئی۔ فرمایا "بچّہ کی پرورش کر لو جب بچہ دودھ چھوڑ دے تب آنا" وہ کچھ زمانہ کے بعد اس فرض سے بھی سبکدوش ہو کر آئی اور اب بھی اس کے احساس گناہ کا جذبہ کم نہیں ہوا تھا۔ آپؐ نے اس پر حد جاری کرنے کا حکم دیا۔ اس کو سنگسار کیا گیا تو اس کے خون

---

[1] صحیح بخاری کتاب الحدود [2] فتح الباری شرح حدیث مذکور۔ [3] صحیح مسلم کتاب الحدود۔

کی چھینٹیں اڑ کر حضرت خالد بن ولیدؓ کے منہ پر پڑیں۔ انہوں نے عورت کو بُرا کہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے سُنا تو فرمایا کہ "خالد چپ رہو اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اس نے وہ توبہ کی ہے کہ اگر شاہی محصول لینے والا بھی وہ توبہ کرتا تو بخشا جاتا"[1]

ترکِ ہویٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے یہ نکتہ سکھایا ہے کہ انسان کے نیک سے نیک فعل کی اچھائی بھی اس کی غرض وغایت پر موقوف ہے۔ یعنی یہ کہ اگر وہ خدا کی خوشنودی اور رضامندی کے لئے ہے تو وہ نیک اور اچھا ہے اور اگر اس کے علاوہ کسی اور فاسد غرض کے لئے ہے تو وہ نیکی نہیں۔ اسی فاسد غرض اور باطل خواہش کا نام قرآن پاک میں **ھویٰ** ہے ضروری ہے کہ انسان اپنے تمام افعال واعمال و اخلاق کو ہویٰ سے پاک رکھے کہ انسان کا حقیقی خدا وہی ہے جس کے لئے وہ کام کرتا ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو دینِ حق کے پیرو نہیں اور اپنے کاموں کی بُنیاد اخلاص پر نہیں رکھتے، یہ کہا کہ ان کا دین و مذہب اپنی خواہشِ نفسانی کی پیروی ہے اور اُن کے سینوں کے اندر اغراضِ نفسانی اور خواہش وہویٰ کے بُت چھپے ہیں۔ قرآن نے فرقان اور جاثیہ دو سورتوں میں متنبہ کیا :

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ — اے پیغمبر کیا تو نے اس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا خُدا بنا رکھا ہے۔ (الجاثیة : ۲۳)

اسی لئے نفس کے تزکیہ وصفائی اور روح کی بلندی وپاکی کے لئے شریعتِ محمدیؐ نے ترکِ ہویٰ کا طریقہ پیش کیا۔ بودھ کی تعلیم کا اصل الاصول یہ ہے کہ انسان ہر خواہش سے پاک ہوجائے لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیم یہ ہے کہ انسان ہر بُری خواہش سے پاک ہوجائے کیونکہ اگر وہ ہر اچھی اور بُری خواہش سے پاک ہوجائے تو اس کے فعل کی کوئی غرض وغایت نہ ٹھہرے گی اور نہ اس کا کوئی محرک باقی رہے گا۔ اسی لئے اسلام کی تعلیم میں ہر خواہش کے ترک کرنے کا مطالبہ نہیں بلکہ ہر بُری خواہش، ہر باطل غرض اور ہر نفسانی ہوا وہوس کے ترک کا مطالبہ ہے کیونکہ اسی کی پیروی سے گمراہی وضلالت پیدا ہوتی ہے۔ وحیِ محمدی نے فرمایا :

---

[1] صحیح مسلم کتاب الحدود۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ (القصص: ۵۰)

اور اس سے زیادہ گمراہ کون ہے جس نے خدا کی رہنمائی کے بغیر اپنی نفسانی خواہش کی پیروی کی۔

پھر فرمایا:

وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ (ص: ۲۶)

اور خواہشِ نفسانی کی پیروی نہ کرو وہ تجھے اللہ کی راہ سے ہٹا دے گی۔

عدل و راستی جو ہر اچھائی اور نیکی کی روح ہے وہ اسی ہویٰ کے زہر قاتل سے مر جاتی ہے۔ فرمایا:

فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ (النسآء: ۱۳۵)

عدل میں نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو۔

ہوائے نفسانی تمام برائیوں اور بدیوں کی جڑ ہے جس نے اپنے آپ کو اس سے بچایا وہ ہر برائی اور بدی سے پاک ہوا اور اس کے امن کی جگہ جنّت ہے۔ فرمایا:

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۙ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِىَ الْمَاْوٰى ۞ (النازعات: ۴۰-۴۱)

اور لیکن جو کوئی اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور نفس کو بری خواہش سے روکا تو بے شک جنّت ہے اس کے امن سے رہنے کی جگہ۔

اخلاق اور محبّتِ الٰہی دین و دنیا کی سب سے بڑی نعمت محبّت اور پیار ہے خاص کر وہ محبّت اور پیار جو خدا کو اپنے بندہ کے ساتھ ہو یہ غیر فانی نعمت اور یہ لازوال دولت جن ذریعوں سے انسان کو حاصل ہو سکتی ہے ان میں دیگر ضروریاتِ دین کے بعد سب سے بڑا اور اہم ذریعہ حُسنِ اخلاق ہے۔ عقائد کے باب میں محبّتِ الٰہی کے زیرِ عنوان اس کی طرف مجمل اشارہ ہو چکا ہے مگر اس کی تفصیل کا موقع اب ہے اللہ تعالیٰ کی محبّت پر زور تو توراۃ اور انجیل میں بھی ہے مگر اصل سوال یہ ہے کہ خدا کی محبّت کے حصول کا طریقہ کیا ہے

اور یہ دولت انسان کو کیوں کر مل سکتی ہے، اس کا جواب صرف قرآن نے دیا ہے مختصراً یہ کہ ہر کام اور ہر چیز میں داعیِ خیر کی پیروی محبتِ الٰہی کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول کی زبان سے فرمایا:

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ (آل عمران: ۳۱)	کہہ دو اگر تم خدا سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو خدا تم سے محبت کرے گا۔

اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیمات، ارشادات، احکام، اخلاق اور اعمال کی پیروی محبتِ الٰہی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے لیکن قرآنِ پاک نے اس مختصر جواب پر قناعت نہیں کی ہے بلکہ نام بنام اس نے بتایا ہے کہ خدا کی محبت کے مستحق اور سزاوار کون کون ہیں اور اس دولت سے محروم کون ہیں، اس سے اسلامی اصولِ اخلاق کا یہ مسئلہ سمجھ میں آتا ہے کہ اُن کاموں میں سے جو خدا کی محبّت کا ذریعہ ہیں حُسنِ خُلق بھی ہے۔ اور اُن امور میں سے جن سے یہ نعمت چھن جاتی ہے بد اخلاقی اور بد کرداری بھی ہے۔

پہلی صف میں حسبِ ذیل خوش قسمت انسانی جماعتیں داخل ہیں:

وَاللّٰہُ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ ○ (آل عمران: ۶۸)	اور خُدا ایمان والوں کا دوست ہے۔
اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ○ (البقرۃ: ۱۹۵/ المائدۃ: ۱۳)	خُدا اچھے کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ (البقرۃ: ۲۲۲)	خدا توبہ کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَوَکِّلِیْنَ ○ (آل عمران: ۱۵۹)	خُدا توکّل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ○ (المائدۃ: ۴۲/ الحجرات: ۹)	خُدا انصاف کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ○ (التوبة: ۴)	خُدا تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے۔
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ○ (آل عمران: ۱۴۶)	اور خُدا صبر کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ○ (التوبة: ۱۰۸)	اور خُدا پاک وصاف رہنے والوں کو پیار کرتا ہے۔
إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ (الصف: ۴)	خدا ان کو پیار کرتا ہے جو اس کی راہ میں لڑتے ہیں۔

ان آیاتِ پاک میں نو باتیں ایسی بیان کی گئی ہیں جو محبّتِ الٰہی کو اپنی طرف کھینچتی ہیں، ایمان، احسان، توبہ، توکّل، انصاف، تقویٰ، صبر، پاکیزگی، جہاد۔

حسبِ ذیل صفتیں وہ ہیں جو محبتِ الٰہی کے فیضان سے انسان کو محروم کرتی ہیں:

فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ○ (آل عمران: ۳۲)	تو خدا کافروں کو پیار نہیں کرتا۔
إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ○ (البقرة: ۱۹۰ / المائدة: ۸۷)	خُدا حد سے بڑھنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔
إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ○ (النسآء: ۳۶)	خُدا اس کو پیار نہیں کرتا جو اترانے والا اور شیخی مارنے والا ہو۔
إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا أَثِيْمًا ○ (النسآء: ۱۰۷)	خُدا اس کو پیار نہیں کرتا جو خیانت کار گنہگار ہو۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْخَآئِنِیْنَ ○ (الانفال: ۵۸)	خُدا خیانت کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔
اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ خَوَّانٍ کَفُوْرٍ ○ (الحج: ۳۸)	خُدا کسی خیانت کار ناشکرے کو پیار نہیں کرتا۔
اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ ○ (القصص: ۷۶)	خُدا اِترانے والوں کو پیار نہیں کرتا۔
اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ ○ (القصص: ۷۷)	خُدا فساد کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔
اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ ○ (الانعام: ۱۴۱)	خُدا فضول خرچ لوگوں کو پسند نہیں کرتا۔
اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْتَکْبِرِیْنَ ○ (النحل: ۲۳)	خُدا مغروروں کو پیار نہیں کرتا۔
اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ○ (الشوریٰ: ۴۰)	خُدا ظالموں کو پیار نہیں کرتا۔
وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ کَفَّارٍ اَثِیْمٍ ○ (البقرۃ: ۲۷۶)	خُدا ناشکر گنہگاروں کو پیار نہیں کرتا۔

کفر، بدگوئی، بدلہ لینے میں حد سے آگے بڑھ جانا، فخر و غرور، شیخی، خیانت، ناشکری، فساد، اسراف، ظلم، گناہ، وہ بداخلاقیاں ہیں جو انسان کو محبتِ الٰہی کے سایہ سے دور کرتی ہیں۔

اوپر کی تفصیل سے اندازہ ہوگا کہ اسلامی اخلاق کی ترکیب میں محبتِ الٰہی کا کتنا بڑا عنصر شامل ہے۔

تعلیمِ اخلاق کے طریقے اور اسلوب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تعلیم اور تزکیہ کے لئے ہوئی یعنی لوگوں کو سکھانا اور بتانا اور نہ صرف سکھانا اور بتانا بلکہ عملاً بھی اُن کو اچھی باتوں کا پابند اور بُری باتوں سے روک کر آراستہ و پیراستہ بنانا۔ اسی لئے آپ کی خصوصیت یہ بتائی گئی کہ

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ
(البقرۃ: ۱۲۹)

وہ رسول، اُن کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتا اور پاک صاف کر کے نکھارتا ہے۔

اور اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ

وانما بعثت معلما۔
(ابن ماجہ: باب فضل العلماء)

اور میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس معلّم ربانی نے کن طریقوں سے اپنی اخلاقی تعلیم کے فرض کو انجام دیا۔

ایک کامیاب معلّم کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ اس میں اپنے اپنے موقع پر سختی اور نرمی دونوں ہوں۔ وہ ایک جرّاح ہے جس کے ایک ہاتھ میں نشتر ہو جس سے زخم کو چیر کر فاسد مواد کو باہر نکال دے۔ اور دوسرے ہاتھ میں مرہم ہو جس سے زخم میں ٹھنڈک پڑ جائے اور تندرست گوشت اور چمڑے کی پرورش ہو۔ اگر کسی جرّاح کے پاس ان دو میں سے صرف ایک ہی چیز ہو تو وہ نہ زخم کو پاک کر سکتا ہے اور نہ فاسد گوشت پوست کی جگہ

تندرست گوشت و پوست پیدا کر سکتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمِ اخلاق کے طریقوں پر غور کی ایک نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تعلیم میں سختی اور نرمی کے موقع و محل کو خوب پہچانتے تھے اور اس پر عمل فرماتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ آپؐ نے کبھی اپنی ذات کے لئے کسی سے بدلہ نہیں لیا مگر یہ کہ کوئی شریعت کی حدود کو توڑے تو اس کو سزا دیتے تھے[1]۔ قریش کی ایک بیوی چوری کے جرم میں پکڑی گئی بعض مسلمانوں نے اُن کی سفارش کرنی چاہی تو آپؐ نے فرمایا "تم سے پہلے کی قومیں اسی لئے تباہ ہوئیں کہ جب اُن میں معمولی لوگ گناہ کرتے تھے تو اُن کو سزا دیتی تھیں اور جب بڑے لوگ کرتے تھے تو ان کے احکام ٹال جاتے تھے[2]"۔

یہ تو سختی کی مثالیں ہیں نرمی کی مثال یہ ہے کہ ایک دفعہ مسجد نبویؐ میں ایک بدوی آیا اتفاق سے اس کو استنجے کی ضرورت معلوم ہوئی تو وہ وہیں مسجد کے صحن میں بیٹھ گیا صحابہ یہ دیکھ کر چاروں طرف سے اُس کو مارنے کو دوڑے آپؐ نے روکا اور فرمایا کہ تم سختی کے لئے نہیں بلکہ نرمی کے لئے بھیجے گئے ہو۔ اس کے بعد اس بدوی کو بلا کر فرمایا کہ یہ عبادت کے گھر ہیں یہ نجاست کے لئے موزوں نہیں، یہ خدا کی یاد اور نماز اور قرآن پڑھنے کے لئے ہیں پھر لوگوں سے فرمایا کہ اس پر پانی بہا دو[3]۔

اسی طرح ایک دفعہ ایک صاحب سے رمضان میں بحالت روزہ ایک غلطی ہو گئی۔ اس نے لوگوں سے کہا کہ مجھے حضورؐ کے پاس لے چلو۔ انہوں نے کہا "یہ ہم سے نہ ہو گا" تو وہ اکیلا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا اور واقعہ عرض کیا۔ فرمایا "ایک غلام آزاد کرو"۔ عرض کی "یا رسول اللہؐ میرے پاس تو ایک غلام بھی نہیں"۔ فرمایا "دو مہینے لگاتار روزے رکھو" عرض کی "روزہ ہی میں تو یہ گناہ ہوا" فرمایا "تو اچھا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلا دو" عرض کی "ہم تو خود کنگال ہیں" فرمایا کہ اچھا بنی زریق کے صدقہ کے منتظم کے پاس جاؤ اور اس سے صدقہ لے کر پہلے

---

[1] صحیح بخاری باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم یسروا ولا تعسروا۔ [2] صحیح بخاری کتاب الحدود۔ [3] صحیح بخاری کتاب الادب باب یسروا ولا تعسروا و کتاب الطہارۃ و صحیح مسلم باب وجوب غسل البول۔

ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ اور جو بچے وہ تم اور تمہارے گھر والے کھائیں۔ وہ خوش ہو کر اپنے قبیلہ میں آیا اور کہا کہ تم کتنے سخت تھے اور حضورؐ نے کتنی نرمی کی۔

یہ اور اسی قسم کے اور واقعات کو سامنے رکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہاں حدودِ الٰہی کی شکست کا خوف ہوتا تھا وہاں نرمی نہیں برتی جاتی تھی لیکن جن امور میں وسعت ہوتی یا جہاں مستحبات اور اخلاقی فضائل و رذائل کا موقع ہوتا تھا آپؐ نرمی سے سمجھا دیتے، اور لطف و محبت سے فرما دیتے تھے۔

قاہری با دلبری پیغمبری است

اخلاقی فضائل اور رذائل کی تعلیم کے بھی مختلف طریقے اختیار کیے گئے۔ کہیں کسی اخلاقی تعلیم کو حکمِ خداوندی بتا کر، کہیں اچھی اچھی مؤثر تشبیہوں کے ذریعہ کہیں اس کے اچھے یا بُرے نتیجوں کو کھول کر اس طرح بیان کیا کہ سننے والے متاثر ہو کر اس پر عمل کرنے کو فوراً تیار ہو جاتے تھے۔

چنانچہ قرآن نے اپنی تعلیم میں کہیں فرمانِ الٰہی کی صورت اختیار کی اور کہا:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ	بے شک اللہ عدل اور احسان کرنے اور
وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى	رشتہ دار کو دینے کا حکم کرتا ہے اور
عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ	بے حیائی کی بات اور ناپسندیدہ بات اور سرکشی
يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ○	سے منع کرتا ہے۔ تمہیں وہ نصیحت فرماتا ہے
(النحل: ۹۰)	تاکہ تم نصیحت پکڑو۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے ایک شہنشاہِ مطلق کی حیثیت سے اپنے فرمان کو نافذ فرمایا ہے اور حکم دیا ہے کہ یہ کرو اور اُن سے بچو۔ تمام انسانوں کا جو اس قادرِ مطلق کے عاجز و درماندہ بندے ہیں یہ فرض ہے کہ وہ اس کے حکم کی پوری پوری تعمیل کریں۔ اس تعمیل میں بندوں کے چون و چرا کی گنجائش نہیں۔

لہ ابوداؤد باب فی الظہار۔

تعلیم کا دوسرا اسلوب یہ ہے کہ فضائل کو عمدہ تشبیہوں کے ساتھ اور رذائل کو قبیح مناظر اور قابلِ نفرت صورتوں میں اس طرح پیش کیا جائے کہ سننے والا بالطبع فضائل کی طرف مائل اور رذائل سے روگرداں ہو جائے۔

مثلاً خدا کی راہ میں دینا ایک اخلاقی فضیلت ہے جس کی تصویر یوں کھینچی گئی کہ کَمَثَلِ حَبَّةٍ[1] یہ نیکی ایک دانہ ہے، زمین سے ہر دانہ ایک بال ہو کر اُگتا ہے اور ہر بال میں سینکڑوں دانے ہوتے ہیں اسی طرح نیکی کا یہ ایک دانہ سینکڑوں ربانی انعامات کا باعث ہوتا ہے۔

ریا و نمائش کی نیکی بے نتیجہ ہوتی ہے، نہ مخلوق پر اس کا اثر پڑتا ہے اور نہ خدا کے ہاں اس کا کوئی بدلہ ہے۔ قرآن نے اس کو یوں ادا کیا کَمَثَلِ صَفْوَانٍ[2]۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی کسان اپنا بیج ایسی چٹان پر چھینٹ دے جس پر ذرا سی مٹی پڑی ہو، جہاں ذرا زور کی بارش ہوئی تو بیج اور مٹی سب بہ گئی اور چٹان دُھل کر صاف ہو گئی، اس بیج سے ایک دانہ بھی پیدا نہ ہو گا۔

بے ایمانی سے یتیموں کے مال کھا جانے کو یوں ادا کیا کہ "جو ایسا کرتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں"[3] پیٹھ پیچھے مسلمان کی بُرائی کرنے کی کراہت یوں ظاہر کی "کیا کوئی اپنے مردہ بھائی کی لاش کا گوشت نوچ نوچ کر کھاتا ہے"[4] کسی کو کوئی چیز دے کر واپس لینا شرافت اور فیاضی کے خلاف ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس کی بُرائی کو یوں ظاہر فرمایا ہے "جو دے کر واپس لیتا ہے وہ گویا قے کر کے پھر چاٹتا ہے" اس سے زیادہ کوئی مکروہ تشبیہ اس بداخلاقی کی ہو سکتی ہے؟

قبیلہ اسلم کے ایک شخص سے ایک اخلاقی گناہ سرزد ہوا اور بعد کو اس پر یہ اثر ہوا کہ خود آکر عدالتِ نبویؐ میں اپنے گناہ کا اقرار کیا اور شریعت کی حد اپنے اوپر جاری کرنے کی درخواست کی حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے تحقیقات کے بعد اس کے سنگسار کیے جانے کا حکم دیا جب وہ سنگسار ہو چکا تو آپ نے ایک صاحب کو دوسرے سے یہ کہتے سُنا کہ "اس کو دیکھو کہ خدا نے اس کے گناہ پر پردہ ڈال دیا تھا لیکن اس نے اپنے

---

[1] البقرہ: ۲۶۱۔ [2] البقرہ: ۲۶۴۔ [3] النساء: ۱۰۔ [4] الحجرات: ۱۲۔

آپ کو نہیں چھوڑا اور کتے کی طرح سنگسار کیا گیا۔" حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ سُن کر خاموش رہے۔ تھوڑی دور چلے تھے کہ ایک گدھے کی لاش پڑی ملی آپؐ نے پکارا کہ فلاں صاحب کہاں ہیں۔ انہوں نے کہا "ہم یہ ہیں یا رسول اللہ!" فرمایا "تم اُترو اور اس گدھے کی لاش سے کچھ کھاؤ"۔ انہوں نے عرض کی "اے اللہ کے رسول! اس کو کون کھائے گا" فرمایا کہ تم نے ابھی اپنے بھائی کے حق میں جو کہا وہ اس لاش کے کھانے سے زیادہ گھناؤنی بات ہے۔"[1]

غیبت کی برائی کو ذہن نشین کرنے کے لئے اس سے زیادہ مؤثر طرز کوئی ہو سکتا ہے؟

تعلیم کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ اچھے کاموں کے اچھے اور بُرے کاموں کے بُرے نتیجہ کو کھول کر بیان کر دیا جائے جس سے اچھے اخلاق کے اختیار اور بُرے کام کے ترک کا جذبہ ابھرے۔ اسلام نے اس طریقہ کو بھی اختیار کیا ہے۔ مثلاً شراب نوشی اور قمار بازی سے روکنا تھا تو اس کے بُرے نتیجوں کو قرآن میں بوضاحت بیان کیا "مسلمانو! شراب، جوا اور پانسے کے تیر ناپاک ہیں، شیطان کے کام، شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تمہارے آپس میں عداوت اور دُشمنی بڑھے اور تم کو اللہ کی یاد اور نماز سے غافل رکھے۔"[2] شراب اور جوئے کے بُرے نتیجے یہ ہیں کہ اُن کا خاتمہ اکثر کھیلنے والوں کی باہمی دُشمنی اور لڑائی پر بلکہ قتل اور خودکشی تک پر ہوتا ہے اور انسان ان میں پھنس کر اپنے دین و دنیا کے فرض سے غافل اور بے کار ہو جاتا ہے۔ نتیجہ جانی و مالی بربادی ہوتی ہے۔

اسلام نے اخلاق کی تعلیم کا ایک اور طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ وہ فضائل اخلاق کو الوہیت، ملکوتیت اور نبوّت کے محاسن میں اور رذائل کو شیطان کے خصائص میں داخل کرتا ہے جس سے فضائل کے اختیار اور رذائل سے اجتناب کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ مثلاً عفو و درگذر کی تعلیم دی تو یوں فرمایا:

اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ اَوْ ... اگر تم کوئی بھلائی ظاہر کر دیا اس کو چھپاؤ

---

[1] سنن ابی داؤد کتاب الحدود۔ [2] المائدہ: ۹۰ - ۹۱۔

تَعْفُوا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَفُوًّا قَدِیْرًا ۝ (النساء: ۱۴۹)

یا کسی برائی کو معاف کرو تو اللہ ہے معاف کرنے والا قدرت والا۔

قدرت کے باوجود عفو اللہ تعالیٰ کا خاص وصف ہے، بندوں سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایسا ہی کرو۔ تخلقوا باخلاق اللہ گو صرف ایک مشہور مقولہ ہے مگر اس کا استنباط اس آیت سے ہوتا ہے اور بعض مفسّرین نے اس نکتہ کو یہاں بیان کیا ہے،[1]

حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے پوچھا کہ "یا رسولؐ اللہ! اگر کوئی یہ چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے اور سلیقہ کے ہوں، اس کا جوتا اچھا ہو تو کیا یہ بھی غرور ہے؟" فرمایا "نہیں"۔

انّ اللّٰہ جمیل یحبّ الجمال۔ اللہ جمال والا ہے وہ جمال کو پسند کرتا ہے۔

(صحیح مسلم و ترمذی)

اس لئے بندوں کو بھی چاہیئے کہ اپنے طور و طریق و لباس میں سلیقہ اور جمال کا لحاظ رکھیں۔

مسلمانوں میں عزم و استقلال اور بہادری کی تعلیم دینی تھی تو اس کو قرآن نے اس طرح کہا:

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ (الاحزاب: ۲۱)

تمہارے لئے اللہ کے رسول میں پیروی کا اچھا نمونہ ہے۔

حق کے مقابلہ میں ماں باپ، رشتہ دار کسی کے خیال نہ کرنے کی تعلیم حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے نمونے سے دی گئی:

قَدْ کَانَتْ لَکُمْ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ فِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ (الممتحنۃ: ۴)

تمہارے لئے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں میں پیروی کا اچھا نمونہ ہے۔

ان دونوں آیتوں میں اخلاق کی بعض صفتوں کو پیغمبرانہ اوصاف سے تعبیر کر کے اس کی بڑائی ظاہر کی

---

[1] تفسیر بحر محیط ابی حیان اندلسی زیرِ آیت مذکورہ ج ثالث صفحہ ۳۸۵۔

ہے اور اُن کی پیروی کی ترغیب دی ہے۔

فضول خرچی کی بُری صفت سے مسلمانوں کو بچانا تھا تو اس کی بُرائی کو یوں ذہن نشین کرایا۔

اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ ؕ (بنی اسرآءیل: ۲۷) بے شبہ فضول خرچ شیطانوں کے بھائی ہیں۔

اب کون ہے جو شیطانوں کا بھائی ہونا پسند کرے گا۔

غرض یہ اور اسی قسم کی بلاغت کے مختلف اسلوبوں سے اسلام نے اخلاقی فضائل کی خوبی اور رذائل کی برائی جاہل عربوں کے ذہن نشین کر دی۔ جابر بن سلیمؓ ایک صحابی دربارِ نبوت میں اپنی پہلی حاضری کا قصہ بیان کرتے ہیں کہ "میں نے دیکھا کہ مجلس میں ایک شخص بیٹھا ہے جو وہ کہتا ہے اس کو سب لوگ بجالاتے ہیں۔ میں نے پوچھا یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا یہ اللہ کے رسولؐ ہیں۔ یہ سُن کر میں نے دو دفعہ کہا، اے اللہ کے رسولؐ آپ پر سلام (علیک السلام)۔ آپؐ چپ رہے پھر فرمایا "علیک السلام نہ کہو یہ مردہ کا سلام ہے۔ السلام علیک کہو۔ میں نے کہا کہ کیا آپؐ اللہ کے رسول ہیں؟ فرمایا ہاں میں اس اللہ کا رسولؐ ہوں جس کو تم تکلیف میں پکارتے ہو تو وہ اس تکلیف کو دور کر دیتا ہے اور جس سے خشک سالی میں مانگتے ہو تو وہ اُگا دیتا ہے اور جس سے تم جب کسی لق و دق بے نشان بنجر میں ہو، تمہاری سواری وہاں گم ہو جائے، دُعا کرتے ہو تو وہ اس کو تمہارے پاس لوٹا دیتا ہے۔" میں نے عرض کی "یا رسولؐ اللہ! مجھے کوئی نصیحت فرمایئے۔" ارشاد ہوا "کسی کو بُرا نہ کہو۔" جابرؓ کہتے ہیں کہ آپؐ کے اس فرمانے کا یہ اثر ہوا کہ میں نے پھر کسی کو شریف ہو کہ غلام یہاں تک کہ کسی جانور کو بھی بُرا نہیں کہا۔ آپؐ نے پھر یہ نصیحت فرمائی کہ تم کسی چھوٹی سی چھوٹی نیکی کو بھی حقیر نہ جانو یعنی اس کو کیے جاؤ اور تم کو چاہیئے کہ اپنے بھائی سے بات چیت کرو تو تمہارا چہرہ کھِلتا رہے۔ یہ بھی نیکی ہے اور اپنا تہبند آدھی پنڈلی تک اونچا رکھو اگر یہ نہیں تو ٹخنے سے اونچا ضرور رہے کیوں کہ تہبند کو بہت نیچے تک لٹکانا غرور کی

نشانی[۱] ہے اور اللہ غرور کو پسند نہیں فرماتا اور اگر تمہیں کوئی گالی دے اور تم میں جو برائی وہ جانتا ہے تم کو اس کی عار دلائے تو تم اس کی اس برائی سے جو تم جانتے ہو اس کو عار نہ دلاؤ کہ اس کا وبال اسی کی گردن پر ہو گا۔[۲]

اس طریقۂ تعلیم کی بلاغت پر غور کیجئے کہ آپؐ نے بدوی کو خدا کے آگے جھکنے اور اس سے گڑگڑا کر مانگنے کے وہی موقعے یاد دلائے جو اس کی زندگی میں خدا جانے کتنی دفعہ پیش آئے ہوں گے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ اس کا دل سچائی کو پکار اٹھا اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلّم سے دین و دنیا کی نصیحت چاہی۔ ایک حکیم کا فرض یہ ہے کہ مریض کی حالت کو دیکھ کر نسخہ تجویز کرے یہ نہیں کہ ہر ایک کو ایک ہی نسخہ خواہ بیماری کوئی ہو پلاتا چلا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے مختلف پوچھنے والوں کے جواب میں ہر ایک کے مطابق الگ الگ باتیں بتائیں۔ حضرت جابرؓ کو جو تعلیم دی اس کا نچوڑ یہ ہے کہ غرور نہ کرو اور اپنے کو بڑا نہ سمجھو پھر اسی بیماری کے دور کرنے کی چند تدبیریں بتائیں۔

ایک اور شخص نے عرض کی کہ "یا رسولؐ اللہ! مجھے نصیحت فرمایئے"۔ ارشاد ہوا کہ "غصہ نہ کر"۔ اس نے کئی دفعہ اپنا سوال دہرایا آپؐ نے ہر دفعہ یہی جواب دیا کہ "غصہ[۳] نہ کر"۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ آپؐ ہر شخص کا علاج اس کے مرض کے مطابق فرماتے تھے۔ اس شخص میں غصہ ہی اتنا ہو گا کہ اس سے اس کے سبب سے بہت سی برائیاں ہو جاتی ہوں گی اس لئے آپؐ نے اس کے لئے یہ علاج تجویز فرمایا اس کو وہ بادی النظر میں معمولی سمجھا اور بار بار کسی اور علاج کی خواہش ظاہر کی لیکن آپؐ نے ہر بار یہی فرمایا کہ غصہ نہ کیا کرو۔

ایک دفعہ حضرت ابوذرؓ صحابی نے دریافت کیا کہ "یا رسولؐ اللہ سب کاموں میں بہتر کام کیا ہے؟"

۱۔ عرب امراء فخر و غرور کے لئے ایسا کرتے تھے، جیسے عبا کے دامن یا گون کو زمین پر گھسیٹ کر چلنا دوسری قوموں میں شاہانہ غرور کی نشانی تھی۔

۲۔ سنن ابی داؤد باب فی اسبال الازار ۳۔ صحیح بخاری کتاب الادب باب الحذر من الغضب و ترمذی باب ما جاء فی کثرۃ الغضب۔

فرمایا "خدا پر ایمان رکھنا اور اس کی راہ میں جہاد کرنا" پھر پوچھا "کس غلام یا باندی کو آزاد کرنا سب سے بہتر ہے"؟ فرمایا "جس کی قیمت زیادہ ہو اور جو اس کے مالک کی نظر میں زیادہ پسندیدہ ہو" پھر دریافت کیا کہ "اگر ان نیکی کے کاموں میں سے کچھ نہ کر سکوں"؟ فرمایا "تو کسی بے کس کی مدد کرو یا کسی بدسلیقہ کا کام کر دو" پوچھا "اگر یہ بھی نہ بن سکے" فرمایا کہ "شر سے لوگوں کو بچاؤ کہ یہ بھی صدقہ ہے جو تم اپنے آپ پر کر سکتے ہو"[1]۔

کبھی آپؐ یہ کرتے کہ لوگوں سے سوال کرتے۔ وہ جواب دینے کی طرف توجہ کرتے۔ آپؐ ان کی توجہ کو مفید پاکر وہ جواب دیتے جو اُن کے دل میں اُتر جاتا۔ ایک دفعہ صحابہ سے آپؐ نے پوچھا "کہ تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے"؟ لوگوں نے عرض کی "ہم میں مفلس وہ ہے جس کے پاس نہ روپیہ ہو نہ سامان ہو" فرمایا "میری اُمت میں مفلس وہ ہے جو قیامت میں گو نماز، روزہ اور زکوٰۃ کی نیکیاں لے کر آئے گا لیکن اُس نے اِس کو گالی دی ہو گی، اُس پر تہمت لگائی ہو گی، اِس کا مال کھایا ہو گا، اُس کا خون بہایا ہو گا، اِس کو مارا ہو گا تو اُس کی نیکیوں میں سے کچھ کچھ اُن لوگوں کو دے دیا جائے گا۔ اگر اُس کی نیکیاں ختم ہو گئیں اور اُس کے ذمہ لوگوں کا کچھ باقی رہ گیا تو ان کی برائیاں اُس کے نام لکھ دی جائیں گی پھر وہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا"[2]۔

مفلس کی یہ حقیقت کیسی اثر انگیز ہے۔

اسی طرح ایک دفعہ آپؐ نے یہ دریافت کیا کہ "پہلوان تم کس کو کہتے ہو"؟ لوگوں نے کہا "جس کو لوگ کشتی میں پچھاڑ نہ سکیں" فرمایا "نہیں یہ پہلوان نہیں ہے پہلوان وہ ہے جو غصّہ میں اپنے نفس پر قابو رکھے"[3]۔

اُس شخص کو جس کے بچے نہ جیتے ہوں صبر کی تلقین کرنی تھی تو دریافت فرمایا کہ بے اولاد تم

---

[1] ادب المفرد بخاری صفحہ ۵۴ مصر۔ [2] صحیح مسلم کتاب البر باب تحریم الظلم [3] صحیح مسلم باب فضل من یملک نفسہ عند الغضب۔

کس کو کہتے ہو؟ صحابہ نے عرض کی جس کے بچّہ نہ ہو۔ فرمایا "وہ بے اولاد نہیں۔ بے اولاد وہ ہے جس نے اپنے سے پہلے اپنی کوئی اولاد آگے نہیں بھیجی۔[1]" احادیث میں ہے کہ جو بچّے کمسنی میں مرجائیں اور اُن کے والدین صبر کریں تو وہ قیامت میں ان کی شفاعت کریں گے، اس طریقۂ ادا نے کس خوبی سے یہ دل میں بٹھا دیا کہ بے اولادی غم کی چیز نہیں بلکہ اگر اس پر صبر کیا جائے تو وہ قیامت میں درجہ کی بلندی کا باعث ہوگی۔

ایک دفعہ کچھ لوگ بیٹھے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم تشریف لائے اور دریافت فرمایا کہ کیا میں تمہیں بتاؤں کہ تم میں سب سے اچھا کون اور بُرا کون ہے؟ حاضرین چپ رہے (شاید یہ سمجھے ہوں کہ آپ اس جماعت کے اچھے اور بُرے لوگوں کے نام لیں گے) آپؐ نے دوسری بار یہی سوال کیا پھر تیسری بار پوچھا۔ ایک شخص نے کہا "ہاں! یا رسولؐ اللہ فرمائیے۔" ارشاد ہوا "تم میں سب سے اچھا وہ ہے جس سے اچھائی کی اُمید کی جائے اور جس کی بُرائی سے لوگ امن میں ہوں، اور تم میں سب سے بُرا وہ ہے جس سے کسی اچھائی کی امید نہ کی جائے اور جس کی بُرائی سے کوئی امن میں نہ ہو۔[2]"

ایک دفعہ آپؐ نے فرمایا کہ "مجھ سے کون یہ باتیں سیکھ کر ان پر عمل کرتا ہے اور دوسروں کو سکھاتا ہے کہ وہ ان پر عمل کریں"۔ ابوہریرہؓ نے کہا "میں اے اللہ کے رسولؐ!" ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپؐ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا پھر پانچ باتیں گن کر فرمائیں "گناہوں سے پرہیز کرو تو تم سب سے بڑے عبادت گزار ہو جاؤ گے، خُدا نے جو تم کو دیا ہے اس پر راضی رہو تو سب سے بڑھ کر دولت مند ہو جاؤ گے، اپنے پڑوسی کے ساتھ احسان کرو تو مومن بنو گے، لوگوں کے لئے وہی چاہو جو اپنے لئے چاہتے ہو تو مسلمان بن جاؤ گے اور زیادہ ہنسا نہ کرو کہ زیادہ ہنسنے سے دل مرجاتا ہے[3] (یعنی دل کی صلاحیّت جاتی رہتی ہے)۔

---

[1] صحیح مسلم باب فضل من یملک نفسہ عند الغضب۔ [2] ترمذی اواخر کتاب الفتن صحیح۔ [3] جامع ترمذی ابواب الزہد

ایک دفعہ فرمایا "کون مجھ سے اپنے دو جبڑوں اور دونوں پاؤں کے بیچ کی حفاظت کی ضمانت کرتا ہے، میں اس کے لئے جنت کی ضمانت کرتا ہوں[1]"۔ کون جانتا ہے کہ کتنے مسلمان اس ضمانت کے لئے اُٹھے ہوں گے۔ ان فقروں کی بلاغت پر غور کرو۔ دونوں جبڑوں کے بیچ میں زبان ہے جو ہر قسم کی قولی برائیوں کی جڑ ہے اور دونوں پاؤں کے بیچ میں انسان کی شرمگاہیں ہیں جو ہر قسم کی بے حیائیوں اور بدکاریوں کی جگہ ہیں۔ ان دو کی حفاظت کی جائے تو انسان کی برائیوں کے بڑے حصے کی اصلاح ہو جائے۔

ایک دفعہ فرمایا "کون مجھ سے ایک بات کا وعدہ کرتا ہے میں اس کے لئے جنت کی ضمانت کرتا ہوں"۔ آپؐ کے غلام ثوبانؓ نے اُٹھ کر کہا "میں اے اللہ کے رسولؐ!" فرمایا کسی سے کچھ مانگا نہ کرو" چنانچہ انہوں نے کبھی کسی سے سوال نہیں کیا۔

سب کو معلوم ہے کہ ارضِ حرم کے اندر اور وہ بھی حج کے دنوں میں کسی مسلمان کا خون بہانا کتنا بڑا گناہ ہو سکتا ہے۔ حجۃ الوداع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ میں خطبہ دینے کے لئے کھڑے ہوئے تو دریافت فرمایا "لوگو! آج کون سا دن ہے؟" لوگوں نے سمجھا کہ شاید آپؐ اس دن کا کوئی اور نام رکھنا چاہتے ہیں عرض کی "اللہ اور اللہ کے رسولؐ کو زیادہ معلوم ہے"۔ فرمایا "کیا یہ قربانی کا دن نہیں؟" سب نے کہا "جی ہاں!" پھر پوچھا "یہ کونسا مہینہ ہے؟" پھر سب چپ رہے۔ سمجھے کہ اس کا نام کچھ اور بتائیں گے۔ فرمایا "کیا یہ ذی الحجہ نہیں؟" سب نے کہا "جی ہاں!" پھر فرمایا "یہ کون سا مقام ہے؟" پھر سب خاموش رہے کہ آپؐ کوئی اور نام بتائیں گے۔ فرمایا "کیا یہ بلد الحرام نہیں ہے؟" سب نے کہا "جی ہاں!" ان سوالوں سے جب سننے والوں کے دلوں میں اس دن، اس مقام اور اس مہینہ کی حرمت اور عظمت بیٹھ گئی تو فرمایا مسلمانوں کا خون مسلمانوں کا مال اور مسلمانوں کی آبرو تمہارے لئے ایسی ہی محترم ہے جیسا یہ دن، اس مقام میں اور اس مہینہ میں[3]۔

---

[1] صحیح بخاری باب حفظ اللسان [2] مسند احمد ج ۵ صفحہ ۲۷۵ [3] صحیح بخاری الخطبۃ فی ایام منیٰ۔

کبھی خاص خاص صاحبوں کو اُن کی مناسبتِ طبع دیکھ کر خاص خاص طور کی نصیحتیں فرماتے۔
حضرت ابوذر غفاریؓ گویا فطرۃً تارکِ دنیا تھے بڑے ہی زاہد و عابد تھے۔ان کے ذوق طبع کو دیکھ کر اُن سے فرمایا، اے ابوذرؓ! جہاں رہو خُدا سے ڈرتے رہو، برائی کے پیچھے نیکی کرو تو تم اس کو مٹا ڈالو گے اور لوگوں کے ساتھ خوش خلقی سے ملا کرو[1]۔

لوگ عام طور سے سمجھتے ہیں کہ صدقہ اللہ کی راہ میں صرف روپیہ پیسہ دینے کا نام ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کی اس تنگ خیالی کو دور کرنا تھا تو حضرت ابوذرؓ سے فرمایا "تمہارا اپنے بھائی سے ملتے وقت مسکرا دینا بھی صدقہ ہے، اچھی بات کہنا اور بُری بات سے روکنا بھی صدقہ ہے، کسی بھٹکے ہوئے کو راستہ بتا دینا بھی صدقہ ہے، کسی اندھے کو راستہ دکھانا بھی صدقہ ہے، راستہ سے پتھر، ہڈی یا کانٹا ہٹا دینا بھی صدقہ ہے، اپنے ڈول سے دوسرے بھائی کے ڈول میں پانی اونڈیل دینا بھی صدقہ ہے[2]"۔

صدقہ کی جو اہمیت مسلمانوں کے دلوں میں تھی اس کی بنا پر ان اخلاقی نیکیوں کو صدقہ بتا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس طریقۂ ادا سے ان نیکیوں کی کتنی اہمیّت مسلمانوں کے دلوں میں بٹھا دی۔

کبھی آپؐ مسلمانوں سے مختلف اخلاقی باتوں پر بیعت لیتے تھے۔چنانچہ خود قرآن پاک میں ہے کہ جو عورتیں ایمان لانا چاہیں وہ بیعت میں رسولؐ سے ان باتوں کا عہد کریں کہ وہ چوری نہ کریں گی، بدکاری نہ کریں گی، اپنی اولاد کو نہ مار ڈالیں گی، بہتان نہ باندھا کریں گی اور کسی بھلے کام میں رسولؐ کی نافرمانی نہ کریں گی[3]۔

---

[1] ترمذی باب ماجا فی معاشرۃ الناس [2] ترمذی فی صنائع المعروف [3] الممتحنہ : ۱۳۔

عبادہ بن صامتؓ کہتے ہیں کہ آپؐ نے ہم سے ان باتوں پر بیعت لی کہ ہم ہر حالت میں رسولؐ کی پیروی کریں گے اور ہم ہر موقع پر اپنی زبان عدل وانصاف کے ساتھ ٹھیک رکھیں گے اور خدا کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔[1]

یہی عبادہؓ کہتے ہیں کہ مکہ میں ہجرت سے پہلے جب انصار اسلام لائے اور ان میں چند آدمیوں کو چن کر آپؐ نے نقیب بنایا تو ان میں سے ایک میں بھی تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم نقیبوں سے ذیل کی باتوں پر بیعت لی "ہم خدا کا کسی کو شریک نہ بنائیں گے، بدکاری نہ کریں گے، چوری نہ کریں گے اور ناحق کسی کی جان نہ لیں گے، لوٹ مار نہیں کریں گے اور نافرمانی نہ کریں گے۔ اگر ہم اس بیعت کو اپنی عملی زندگی میں پورا کر دکھائیں گے تو ہمیں جنت ملے گی اور اگر اس میں کمی کی تو اس کا فیصلہ خدا کے ہاتھ ہے"۔[2]

اللہ جانتا ہے کہ ان خوش نصیبوں نے اپنے اس وعدہ کو کس کس طرح خوبی سے پورا کیا ہوگا۔

بعض دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک سوال کرتے تھے۔ سوال سن کر لوگ متوجہ ہو جاتے تھے مگر اس سے پہلے کہ لوگ جواب دیں خود ہی جواب دے دیتے تھے۔ دریافت فرمایا کہ "افتراء کس کو کہتے ہیں؟" پھر خود ہی فرمایا "وہ چغلی ہے، لوگوں کے درمیان بات کو ادھر سے اُدھر پہنچانا"۔[3] ایک بار ارشاد ہوا کہ "تم جانتے ہو کہ غیبت کس کو کہتے ہیں؟" لوگوں نے جواب دیا "اللہ اور اس کا رسولؐ جانتا ہے"۔ فرمایا "تم اپنے بھائی کو اس طرح یاد کرو کہ وہ اس کو ناپسند ہو"۔ کسی نے کہا "اگر میرے بھائی میں وہ برائی واقعی موجود ہو؟" تو فرمایا "اگر اس میں ہے تب ہی تو وہ غیبت ہے ورنہ پھر وہ بہتان ہے"۔[4] ایک موقع پر ارشاد ہوا "میں تمہیں بتاؤں کہ جنت والے کون ہیں؟" صحابہ نے عرض کی "ہاں یا رسول اللہ!" فرمایا "ہر کمزور نرم دل جس کو لوگ حقیر جانیں یا جو متواضع ہو (لیکن جس کی ایمانی قوت ایسی ہو کہ) اگر وہ خدا کے بھروسہ پر قسم کھا بیٹھے تو خدا

---

[1] مسند ابن حنبل ج ۵ صفحہ ۳۱۸ [2] صحیح بخاری ج ۲ صفحہ ۱۰۱۵ کتاب الدیات [3] صحیح مسلم باب تحریم النمیمہ [4] صحیح مسلم باب تحریم الغیبۃ۔

اُس کی قسم پوری کر دے" پھر فرمایا "کیا میں تمہیں بتاؤں کہ دوزخ والے کون ہیں؟" صحابہ نے عرض کی "ہاں یارسول اللہ!" فرمایا "ہر درشت مزاج، شیخی خور، مغرور"[1]۔

کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آپ ہی آپ کوئی سوال کرتے اور اُس کو بار بار دہراتے۔ حاضرین اس بار بار کی تکرار سے اس کی اہمیت کا پورا اندازہ کر لیتے اور مشتاق ہو کر پوچھتے کہ "یارسول اللہ! یہ کیا بات ہے؟" اس وقت آپؐ جواب ارشاد فرماتے جس کا اثر ان کی رگ رگ میں سرایت کر جاتا۔ ایک دفعہ خود سے فرمایا "خدا کی قسم وہ صاحبِ ایمان نہ ہوا، خدا کی قسم وہ صاحبِ ایمان نہ ہوا، خدا کی قسم وہ صاحبِ ایمان نہ ہوا" صحابہ نے پوچھا "کون یارسول اللہ؟" فرمایا "جس کا پڑوسی اس کی برائیوں سے امن میں نہ ہو"[2]۔ ایک مرتبہ ارشاد فرمایا: "دینداری اخلاص کا نام ہے، دینداری اخلاص کا نام ہے، دینداری اخلاص کا نام ہے" صحابہ کہتے ہیں کہ ہم نے دریافت کیا کہ "یارسول اللہ کس کے ساتھ؟" فرمایا "اللہ کے ساتھ، اُس کی کتاب کے ساتھ، اُس کے رسول کے ساتھ، مسلمانوں کے سرداروں کے ساتھ اور عام مسلمانوں کے ساتھ"[3]۔

---

[1] صحیح مسلم باب جہنم [2] مشکوٰۃ باب الشفقۃ علی الخلق بحوالہ صحیحین [3] مشکوٰۃ بحوالہ صحیح مسلم۔

اخلاقی تعلیمات کی قسمیں

اسلام کے اصولِ اخلاق کی اس تفصیل اور تشریح کے بعد یہ موقع آیا ہے کہ اس کی اُن اخلاقی تعلیمات کا استقصاء کیا جائے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے عالم کائنات کو ملیں۔ان اخلاقی تعلیمات کو اسلام نے تین حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔حقوق، فضائل ورذائل اور آداب۔

اسلام کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ ہر انسان پر دوسرے انسانوں بلکہ حیوانوں اور بے جان چیزوں تک کے کچھ فرائض عائد ہیں اور یہ ان کے حقوق ہیں جنہیں ہر انسان کو اپنے امکان بھر ادا کرنا ضروری ہے۔ یہ حقوق اور فرائض اسلامی اخلاق کی پہلی قسم ہیں۔

دوسری چیز انسان کے ذاتی چال چلن اور کردار کی اچھائی اور بلندی ہے اس کا نام فضائلِ اخلاق اور اس کے مقابل کا نام رذائل ہے۔مثلاً سچ بولنا اخلاقی فضائل اور جھوٹ بولنا رذائل میں سے ہے۔

تیسری قسم کاموں کو اچھے اور عمدہ طریقہ سے بجالانا ہے۔اس کو آداب کہتے ہیں۔مثلاً اٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے کا طور وطریق۔

ذیل میں اسلامی اخلاق کی ان تینوں قسموں کی الگ الگ تفصیل درج ہوتی ہے۔

حقوق و فرائض

حقوق کے معنی حقوق کی مجمل تشریح تو اوپر ہو چکی لیکن اس موقع پر ضرورت ہے کہ اس کی مزید تفصیل کر دی جائے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ق (البقرۃ: ۲۹)	خُدا نے تمہارے ا کام کے لئے زمین کی ساری چیزیں پیدا کیں۔

اس لئے انسان کو دُنیا کی ہر اس چیز سے جس سے اس کے نفع کا تعلق ہے ایک گونہ لگاؤ ہے۔ اس لگاؤ کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی ترقّی و حفاظت میں کوشش کی جائے اس شے سے وہ نفع اٹھایا جائے جس کے لئے خدا نے اس کو پیدا کیا ہے اور ان موقعوں پر اس کو صرف کیا جائے جن میں خُدا نے اس کے صرف کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور اس کو ہر اس پہلو سے بچایا جائے جس سے اس کی نفع رسانی کو نقصان پہنچے ایسی ذمہ داری کا نام حق ہے جس کو از خود ادا کرنا ضروری ہے۔ ارشاد ہوا:

وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ○ (الذّٰرِيٰت - ۱۹)	اور ان کے مالوں میں سائل کا اور اس کا حق ہے جس پر مالی افتاد پڑی ہو۔
وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ○	اور ان کے مالوں میں سائل کا اور اس

لِلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ○ (المعارج: ۲۴)	کا مقررہ حق ہے جس پر مالی افتاد پڑی ہو۔
وَاٰتِ ذَاالْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ (بنی اسرآئیل: ۲۶)	اور قرابت والے کو اس کا حق دے اور مسکین کو اور مسافر کو۔
فَاٰتِ ذَاالْقُرْبٰی حَقَّهٗ وَالْمِسْكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ (الروم: ۳۸)	تو قرابت والے کو اس کا حق دے اور مسکین کو اور مسافر کو۔

اللہ تعالیٰ نے جب کسی انسان کو دولت عطا فرمائی ہے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ جن کو یہ چیز نہیں ملی ہے ان کو اس میں سے تھوڑا تھوڑا دیا جائے یہ ان کا حق ہے اور اس میں سب سے مقدم رشتہ دار ہیں، پھر غریب، پھر مسافر۔ ایک اور موقع پر اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت مال کی طرف کی ہے:

وَاٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ وَلَا تُسْرِفُوْا (الانعام: ۱۴۱)	اور پیداوار کا حق اس کے کاٹنے کے دن ادا کرو اور فضول خرچی نہ کرو۔

یعنی جب کسی کو اللہ تعالیٰ نے زمین کا کوئی حصہ عنایت کیا اور اس نے اس میں کچھ بویا اور اللہ نے اس میں برکت دی اور پھل پھول نکلے اور ہری بھری کھیتی تیار ہوئی تو انسان کا فرض ہوا کہ اس کا حق ادا کرے۔ اور اس میں سے ان کو بھی کچھ دے جن کو یہ نعمت نہیں ملی۔ اور اس نعمت کو بے موقع خرچ کر کے ضائع نہ کرے کہ یہ بھی اس کے حق کے منافی ہے اور اس کی نفع رسانی کے ضروری موقع و محل کو نقصان پہنچانا ہے۔ حدیث میں آتا ہے:

ان لزوجتك عليك حقا و ان لزورك عليك حقا ولاهلك	تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق اور تیرے ملاقاتی کا بھی تجھ پر حق ہے۔ اور

عليك حقا[1] تیری بیوی بچوں کا تجھ پر حق ہے۔

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ بیوی کا حق شوہر پر یہ ہے کہ وہ اس کو کھانا کھلائے کپڑے پہنائے اور اس کے چہرے پر تھپیڑ نہ مارے[2]۔ ان احکام سے معلوم ہوا کہ ہر انسان پر دوسرے انسان کے کچھ حقوق ہیں بلکہ ہر انسان کا خود اپنے اوپر بھی حق ہے۔ اس کے ایک ایک عضو کا اُس کے اوپر حق ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

فان لنفسك عليك حقا[3] بے شک تیری جان کا تجھ پر حق ہے۔

فان لجسدك عليك حقا تیرے بدن کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیری آنکھوں

ولعينيك عليك حقا[4] کا بھی تجھ پر حق ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہو گا کہ اسلام میں حقوق کی وسعت اس سے بہت زیادہ ہے جتنی عام طور پر سمجھی جاتی ہے۔

حقوق کی وسعت جب انسان کا تعلق کائناتِ ارضی کی ایک ایک چیز سے ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی ذمہ داری بھی اس کی ہر چیز سے متعلق ہے۔ جمادات سے بھی کہ اُن کو بے موقع نہ صرف کیا جائے، نباتات سے بھی کہ ان کو نشوونما اور تربیت کا موقع دیا جائے، حیوانات سے بھی کہ ان کو بے سبب تکلیف نہ پہنچائی جائے اور اُن کے آرام و آسائش کا خیال کیا جائے اور انسانوں سے بھی کہ ان کی ہر ضرورت میں مدد کی جائے اور ان کے فریضۂ محبت کو ادا کیا جائے۔ اور خود انسان کا اپنے اوپر بھی حق ہے کہ اس کا ہر عضو جس غرض کے لئے پیدا کیا گیا ہے اس سے مناسب طور سے وہ کام لے۔

غرض اسلام نے ان حقوق کو تمام کائنات میں اس طرح تقسیم کیا ہے کہ اس کا دائرہ محیطِ اعظم بن کر پھر آہستہ آہستہ سمٹتا ہوا بتدریج کم ہوتا ہوا مرکز پر آکر ختم ہو جاتا ہے۔

---

[1] صحیح بخاری: باب الصوم [2] ابوداؤد: کتاب النکاح [3]، [4] صحیح بخاری: باب الصوم۔

انسانیت کے باہمی حقوق تو بہت کچھ ظاہر ہیں لیکن انسان کے علاوہ اس کائناتِ ارضی کی دوسری بے جان اور جاندار چیزوں کے حقوق کی طرف تھوڑا سا مزید اشارہ توضیحِ مقصد کے لئے مفید ہے۔

انسان کے علاوہ دوسری جاندار اور بے جان چیزوں کے دو حق انسان پر ہیں۔ ایک یہ کہ جس غرض اور منفعت کے لئے وہ پیدا کی گئی ہیں ان سے وہی کام لیا جائے۔ دوسرا یہ کہ ان کی قدرتی نشوونما، پرورش اور ترقی میں وہ رکاوٹ نہ پیدا کرے بلکہ اس کے مناسب اسباب فراہم کرے اور اس کی مناسب غذا، سیرابی اور آرام کی فکر رکھے۔ یہ دونوں حقوق اصل میں قرآن پاک کی اسی حقیقت کے کہ

خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ۚ (البقرۃ: ۲۹) زمین میں جو کچھ ہے وہ خدا نے تمہارے (یعنی انسانوں کے) لئے پیدا کیا۔

کے صریح نتیجے ہیں کہ جب انسان کے لئے یہ سب چیزیں پیدا ہوئیں تو انسان کا فرض ہے کہ اُن سے وہی کام لے جس کے لئے وہ بنائی گئیں۔ اور اس لئے تاکہ وہ وقتِ مقررہ تک انسانوں کو اپنا نفع پہنچا سکیں اُن کی پرورش و ترقی کے قدرتی اسباب کو مہیا کرنا ان پر ضروری قرار دیا گیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے مجمع میں ایک تمثیلی حکایت میں اس نکتہ کو واضح کیا ہے۔ فرمایا کہ "ایک دفعہ ایک آدمی بیل پر سوار جا رہا تھا کہ دفعتًہ اس نے منہ پھیر کر سوار سے کہا کہ میں تو اس کے لئے پیدا نہیں کیا گیا۔ میں تو کھیتی کے لئے پیدا کیا گیا ہوں[1]" اور اسی لئے درخت لگانا ثواب کا کام کہا گیا اور فرمایا گیا کہ "جو مسلمان کوئی درخت لگاتا ہے تو جو پرندے یا جانور یا انسان اس کا پھل کھاتے ہیں اس کا ثواب درخت لگانے والے کو ملتا ہے[2]" اسی سبب سے پھل دار درخت کو بے سبب کاٹنا ناپسندیدہ ہے[3]۔

ایک اور تمثیلی حکایت میں آپؐ نے فرمایا کہ ایک شخص صرف اس لئے بخشا گیا کہ اس نے ایک پیاسے کُتے

---

[1] صحیح بخاری باب الحرث والمزارعۃ جلد اوّل صفحہ ۳۱۲۔ [2] صحیح بخاری ومسلم باب مذکور۔ [3] فتح الباری شرح صحیح البخاری شرح باب مذکور، جلد خامس صفحہ ۷، مصر۔

کو پانی پلا کر اس کی جان بچائی تھی۔ اور ایک اور شخص پر صرف اس لئے عذاب ہوا کہ اس نے ایک بلّی کو باندھا اور اس کو کھانے پینے کو نہیں دیا یہاں تک کہ وہ اسی طرح سسک سسک کر مر گئی۔ ایک اور شخص نے چیونٹی کو جلا دیا تھا، اس پر اس سے باز پُرس ہوئی۔[1]

یہ چند اشارات اس موقع پر اس لئے بھی کئے گئے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔ وہ صرف انسانوں تک نہیں بلکہ تمام جاندار اور بے جان چیزوں تک پھیلا ہوا ہے جس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔

حقوق کی ترتیب مگر ان تمام حقوق کی ادائیگی میں اسلام نے ایک خاص ترتیب ملحوظ رکھی ہے جس کی تفصیل ذیل میں ہے۔

اگر ہم اسلام کے تمام اخلاقی فرائض اور تعلیمات کو صرف ایک لفظ سے ادا کرنا چاہیں تو توراۃ و انجیل کی طرح مختصراً یوں کہہ سکتے ہیں کہ دوسروں سے محبّت کرنا۔ لیکن صرف "محبّت کرنا" کہہ دینا کافی نہیں بلکہ ان چیزوں کی تفصیل کرنی چاہیئے جو اس محبّت کا تقاضا اور اس کے مظاہر ہیں۔ یہی تفصیل و تکمیل اسلام کی اخلاقی تعلیم کا کارنامہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ "ایمان کا کمال یہ ہے کہ تم اپنے بھائی کے لئے بھی وہی محبوب رکھو جو اپنے لئے رکھتے ہو"۔[2] اس سے معلوم ہوا کہ جسم و جان اور مال و ملکیّت کے وہ تمام معاملات جو انسان اپنے جسم و جان اور مال و ملکیت کے لئے چاہتا اور پسند کرتا ہے وہی دوسروں کے لئے چاہنا اور پسند کرنا توراۃ و انجیل کی طرح اسلام کی اخلاقی تعلیم کا بھی سرِ عنوان ہے۔ لیکن اسلام میں یہ سرِ عنوان تشریح کا محتاج ہے اور اس تشریح کے ضمن میں انسانی تعلقات کی تدریجی ترتیب کی بحث آجاتی ہے جس کو اسلام نے ہمیشہ پیشِ نظر رکھا ہے اور ان فرائض کو ہر انسان کے تعلقات کی کمی بیشی اور دوری و نزدیکی کی تدریج و ترتیب کے ساتھ متعیّن اور ہر ایک کا درجہ اور مرتبہ الگ الگ مقرر کر دیا ہے۔ مثلاً ایک حیوان کے مقابلہ میں ایک انسان

---

[1] یہ دونوں واقعے صحیح بخاری میں ہیں۔ [2] صحیحین کتاب الایمان۔

کی مدد، ایک اجنبی شخص کے مقابلہ میں ایک دوست کی، غیروں اور بے گانوں کے مقابلہ میں ایک عزیز کی اور ان عزیزوں میں بھی قرابت کی دوری و نزدیکی کی ترتیب اسی طرح رکھی گئی ہے ۔مگر یہ ترتیبی امداد حق کے ساتھ ہے ۔اگر کوئی عزیز سے عزیز بھی باطل پر ہو تو اس کے مقابلہ میں اس غیر و بے گانہ کی امداد جو حق پر ہے، فرض ہے کہ جو مدد محض قرابت اور عزیز داری کی بنا پر باطل پر کی جاتی ہے اس کا نام اسلام کی اصطلاح میں عصبیت (تعصب) ہے جس سے بچنے کی ہر مسلمان کو تاکید کی گئی ہے ۔[1]

اسلام کے سوا دوسرے مذاہب میں انسانی حقوق کی درجہ وار کوئی تفصیل نہیں ہے ۔انسان اور حیوان کے درمیان بھی خطِ فاصل نہیں قائم کیا گیا ہے ۔مثلاً بودھ کی اخلاقی تعلیمات میں انسان اور حیوان کے، اور پھر انسانوں میں اہلِ ملک، قوم، قبیلہ اور خاندان کی کوئی تمیز نہیں بلکہ سرے سے رشتہ اور قرابت ہی کی اس میں کوئی دفعہ نظر نہیں آتی ۔اسی طرح ہندو قانون میں ایک جانور اور ایک انسان کا قتل برابر کا درجہ رکھتا ہے اور ایک جانور بھی اپنی کسی منفعت رسانی کے باعث انسان کی ماں کا درجہ پاسکتا ہے ۔

یہودیت اور عیسائیت میں تمام قرابت داروں کو چھوڑ کر صرف ماں باپ کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کے برترانہ حقِ اطاعت کو تسلیم کیا گیا ہے لیکن دوسرے قرابت مندوں اور رشتہ داروں کو ان میں کوئی مرتبہ نہیں دیا گیا ہے ۔لیکن اسلام نے اس مسئلہ میں پوری تفصیل سے کام لیا ہے ۔

اس ترتیب کا فلسفہ یہ ہے کہ ترتیب میں جس کا درجہ بڑھ کر ہے اس کے ساتھ تعلقات کی وابستگی دوہری تہری ہوتی ہے ۔مثلاً ایک شخص جو ایک وقت میں ایک ہی کی مدد کر سکتا ہے، اس کی ایک غریب بیمار ماں ہے ۔ایک غریب اور بیمار باپ ہے، ایک غریب اور بیمار بھائی ہے ۔ایک اسی طرح کا اس کا پڑوسی ہے پھر اسی حالت میں اس کا ایک ہم محلہ بھی ہے اور اسی حالت میں اس کا کوئی ہم وطن بھی ہے تو اس کو کس کی امداد کرنی چاہیئے ۔یہی وہ موقع ہے جس میں تدریجی تعلقات کی ترتیب کا سوال پیش آتا ہے ۔ظاہر ہے کہ

---

[1] سنن ابی داؤد ج ۲ باب فی العصبیۃ ۔

تعلقات کے دوسرے تھرے حقوق پہلے ماں کے ہیں، پھر باپ کے ہیں، پھر بھائی کے ہیں، پھر پڑوسی کے ہیں پھر ہم وطن کے ہیں اور اسی ترتیب سے اُن کا ادا کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ نیکی نہ ہوگی کہ اپنی غریب اور بیمار ماں کو چھوڑ کر کوئی اپنے غریب اور بیمار پڑوسی کی خدمت کے لئے آمادہ ہو جائے۔ یہ ایثار نہیں بلکہ ظلم ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اپنے اوپر مزید زحمت گوارا کر کے دونوں کے حقوق سے عہدہ برآ ہو۔ اگر ایسا وہ نہ کر سکے تو اخلاقاً اس کو معذور سمجھا جائے گا۔ شریعتِ محمدیؐ نے اسی فطری ترتیب کو ان آیتوں میں پیش کیا ہے:

وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ۗ (النساء: ۳۶)	اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور رشتہ دار کے ساتھ اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ اور رشتہ دار پڑوسی کے ساتھ اور بیگانہ پڑوسی کے ساتھ اور ساتھی کے ساتھ اور مسافر کے ساتھ اور لونڈی غلام کے ساتھ۔
قُلْ مَا أَنفَقْتُم مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۗ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ۝ (البقرۃ: ۲۱۵)	اے پیغمبرؐ! ان سے کہہ کہ تم جو خرچ کرو وہ اپنے ماں باپ اور عزیزوں اور یتیموں اور غریبوں اور مسافر کے لئے۔ اور جو بھی نیکی کا کام تم کرو اللہ اس سے آگاہ ہے۔
وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ۝ (بنی اسرائیل: ۲۶)	اور رشتہ دار کا حق ادا کر اور مسکین کا اور مسافر کا۔ اور فضول خرچی نہ کر۔

عام طور سے اکثر مذہبوں نے سب سے زیادہ اہمیت ماں باپ کو دی ہے اور اسلام میں بھی یہ اہمیت یہی درجہ رکھتی ہے۔ مگر اس کی تکمیلی شان اس باب میں بھی اسی طرح نمایاں ہے جس طرح تعلیمات کے دوسرے ابواب میں ہے۔

والدین کا حق

والدین یعنی ماں باپ کی عزّت، خدمت اور اطاعت حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیمات میں یکساں ضروری قرار دی گئی ہے بلکہ تینوں میں اُن کا درجہ خُدا کے بعد انسانی رشتوں میں سب سے بڑا بتایا گیا ہے اور خُدا کی اطاعت کے ساتھ ساتھ ان کی اطاعت کی تاکید کی گئی ہے۔ تورات میں توحید کی تعلیم کے بعد ہے:

"تو اپنے ماں باپ کو عزّت دے تاکہ تیری عمر اس زمین پر جو خداوند تیرا خُدا تجھے دیتا ہے دراز ہو۔" (خروج ۲۰ - ۱۲)

پھر دوسری جگہ ہے:

"تم میں سے ہر ایک اپنی ماں اور باپ سے ڈرتا رہے۔" (احبار ۱۹-۳)

انتہا یہ ہے کہ تورات نے قانوناً یہ حکم نافذ کیا کہ

"اور جو کوئی اپنے باپ یا اپنی ماں پر لعن کرے مار ڈالا جائے گا اس نے اپنے باپ یا ماں پر لعنت کی ہے اس کا خون اسی پر ہے۔" (احبار ۲۰- ۹)

"اور وہ جو اپنی ماں باپ پر لعنت کرے مار ڈالا جائے۔" (خروج ۲۱ - ۱۷)

حضرت عیسیٰؑ نے انجیل میں انہی احکام کو دہرایا اور اس بات پر زور دیا کہ ان احکام کی صرف لفظی

تعمیل نہ کی جائے بلکہ ان کے روح و معنی کا خیال کیا جائے۔ فرمایا:

"کیونکہ خدا نے فرمایا ہے کہ اپنے ماں باپ کی عزت کر اور جو ماں یا باپ پر لعنت کرے جان سے مارا جائے۔ پر تم کہتے ہو کہ جو کوئی اپنے باپ یا ماں کو کہے کہ جو کچھ مجھے تجھ کو دینا واجب تھا سو خدا کی نذر ہوا اور اپنے باپ یا ماں کی عزت نہ کرے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ پس تم نے اپنی روایت سے خدا کے حکم کو باطل کیا۔" (متی ۱۵-۴)[1]

نبوتِ محمدیؐ جس کی بعثت ہی اخلاق کی تکمیل کے لئے ہوئی ہے، اس نے تورات وانجیل کی طرح نہ صرف والدین کی عزت اور اُن سے ڈرتے رہنے کی تاکید کی بلکہ اس مسئلہ کے ہر گوشے کی تفصیل کی اور ہر ممکن سوال کا تشفی بخش جواب دیا۔

۱- اس نے سب سے پہلے ماں اور باپ کی مشترکہ حیثیت کی بھی تفصیل کی اور بتایا کہ ماں اور باپ میں بھی سب سے بڑا درجہ ماں کا ہے۔ عورت کی فطری کمزوری، بے چارگی اور حمل، وضعِ حمل اور تربیتِ اولاد کی تکلیفوں کو ہنسی خوشی برداشت کرنا، ماں کی بڑائی، اس کی سب سے پہلے دل دہی کرنے اور اس کی فرمانبرداری کرنے کی سب سے بڑی دلیل ہے:

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ	اور ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ
حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَّ	کے واسطے تاکید کی۔ اس کی ماں نے
فِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ	اس کو تھک تھک کر اپنے پیٹ میں رکھا
(لقمان: ۱۴)	اور دو برس تک دودھ پلایا۔
وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا	اور ہم نے انسان کو تاکید کی کہ وہ اپنے

---

[1] اس کے علاوہ انجیل کے دوسرے ابواب اور صحیفوں میں توراۃ کے الفاظ کا بعینہٖ اعادہ ہے مثلاً متی ۱۹-۱۹ مرقس ۷-۱۰ و ۱۰-۱۹ لوقا ۱۸-۲۰۔

حَمَلَتۡهُ اُمُّهٗ كُرۡهًا وَّوَضَعَتۡهُ كُرۡهًا ؕ وَحَمۡلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوۡنَ شَهۡرًا ؕ (الاحقاف:۱۵)

ماں باپ کے ساتھ نیکی کرے۔ اس کی ماں نے اس کو تکلیف کے ساتھ پیٹ میں رکھا اور تکلیف کے ساتھ جنا۔ پیٹ میں رکھنا اور دودھ پلا کر چھڑانا تیس مہینے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے ارشادات میں اس کی مزید تاکید کی۔ ایک شخص نے خدمتِ اقدس میں آکر دریافت کیا کہ "یا رسولؐ اللہ سب سے زیادہ میرے حُسنِ سلوک کا مستحق کون ہے؟" فرمایا "تیری ماں"۔ پوچھا "پھر کون؟" فرمایا "تیری ماں"۔ اس نے عرض کی "پھر کون؟" فرمایا "تیری ماں"۔ تین دفعہ آپؐ نے یہی جواب دیا۔ چوتھی دفعہ پوچھنے پر ارشاد ہوا "تیرا باپ"[۱]۔ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے چار بڑے بڑے گناہوں کا ذکر کیا اور سرِ فہرست ماں کی نافرمانی کو قرار دیا اور فرمایا کہ تمہارے خدا نے ماؤں کی نافرمانی تم پر حرام کی ہے[۲]۔ ایک دفعہ ایک شخص نے آکر عرض کی کہ "یا رسولؐ اللہ! میں نے ایک بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ کیا میرے لئے کوئی توبہ ہے؟" فرمایا "کیا تیری ماں زندہ ہے؟" جواب دیا "نہیں"۔ دریافت کیا "خالہ ہے؟" گذارش کی "ہے"۔ فرمایا "تو اس کے ساتھ نیکی کر"[۳]۔ یہی اس کی توبہ بتائی۔ ایک اور صحابی نے دریافت کیا کہ "یا رسولؐ اللہ! میں نے جہاد میں شرکت کا ارادہ کیا ہے اور آپؐ سے مشورہ چاہتا ہوں۔" فرمایا "کیا تمہاری ماں زندہ ہے؟" جواب اثبات میں دیا۔ فرمایا "تو اُسی سے چمٹے رہو کہ جنت اس کے پاؤں کے پاس ہے[۴]۔"

ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیم میں مخلوقاتِ انسانی میں جنسِ

---

[۱]، [۲] صحیح بخاری جلد ۲ کتاب الادب۔ [۳] جامع ترمذی کتاب البرّ والصلہ۔ [۴] ترغیب وترہیب منذری جلد ۲ صفحہ ۱۲۴ بحوالہ ابن ماجہ، نسائی وحاکم۔

لطیف ہی کی ایک صنف کو سب سے بڑی برتری حاصل ہے۔ اور یہ برتری بالکل فطری ہے۔ انسان سب سے زیادہ اپنے وجود میں جن کا ممنون ہے اور جو اس کی تخلیق کی مادّی علّت ہیں وہ خالق اکبر کی علّتِ فاعلہ ذات کے بعد ماں اور باپ ہیں۔ لیکن باپ کی مادّی علیت چند لمحوں اور چند قطروں سے زیادہ نہیں مگر ماں وہ ہستی ہے جس نے اس کی ہستی کو اپنا خون پلا پلا کر بڑھایا اور نو مہینے تک اس کی شکل سہہ کر اور سختی اٹھا کر اپنے پیٹ میں رکھا پھر اس کے جننے کی ناقابلِ برداشت تکلیف کو ہنسی خوشی برداشت کیا پھر اس نو پیدا مضغۂ گوشت کو اپنی چھاتیوں سے لگا کر اپنا خون پانی کر کے پلایا اور اس کی پرورش اور غور و پرداخت میں اپنی ہر راحت قربان، اپنا ہر آرام ترک اور اپنی ہر خواہش نثار کر دی۔ ایسی حالت میں کیا ماں سے بڑھ کر انسان اپنے وجود میں مخلوقات میں کسی اور کا محتاج ہے؟ اس لئے شریعتِ محمدیؐ نے اپنی تعلیم میں جو بلند سے بلند مرتبہ اس کو عنایت کیا ہے وہ اس کی سزاوار ہے۔

۲۔ ماں کے ساتھ جو دوسری ہستی بچہ کی تولید و تکوین میں شریک ہے وہ باپ ہے۔ اور شک نہیں کہ اس کی نشو و نما اور تربیت میں ماں کے بعد باپ ہی کی جسمانی و مالی کوششیں شامل ہیں۔ اس لئے جب بچہ ان کی محنتوں اور کوششوں سے قوّت کو پہنچے تو اس پر فرض ہے کہ اپنی اس ماں باپ کی کوششوں سے حاصل کی ہوئی قوّت کا شکرانہ ماں باپ کی خدمت کی صورت میں ادا کرے۔ چنانچہ اسلام نے نہ صرف پہلے صحیفوں کی طرح ان کی "عزّت" کرنے اور ان سے "ڈرتے رہنے" کے وعظ پر اکتفا کی بلکہ اُن کی خدمت، اُن کی اطاعت، اُن کی امداد، اور اُن کی دلدہی، ہر چیز فرض قرار دی بلکہ یہاں تک تاکید کی کہ ان کی کسی بات پر اُف تک نہ کرو، اُن کے سامنے ادب سے جھکے رہو، اُن کی دعاؤں کو اپنے حق میں قبول سمجھو، انہی کی خدمت انسان کا سب سے بڑا جہاد ہے بلکہ انہی کی خوشنودی سے خدا کی خوشنودی ہے۔ قرآنِ پاک میں والدین کے ساتھ حُسنِ سلوک، نیکی اور خدمت کی تاکید بارہ مختلف آیتوں میں نازل ہوئی ہے اور اکثر موقعوں پر یہ تعلیم توحید اور خدا پرستی کی تعلیم کے بعد ہی آئی ہے کہ پہلی تخلیق انسانی

کی علّت فاعلی اور دوسری علّت مادّی ہے۔ سب سے پہلی آیت سورۂ بقرہ میں ہے جس میں تورات کے حکم کی طرف بھی اشارہ ہے۔ فرمایا:

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ	اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا
لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ قف وَبِالْوَالِدَيْنِ	کہ تم نہ پوجو گے مگر اللہ کو۔ اور ماں باپ
اِحْسَانًا (البقرة: ۸۳)	کے ساتھ نیکی کرو۔

یہ آیتِ پاک گو اُس حکم کا اعادہ ہے جو توراۃ کی آیتوں میں ہے لیکن یہاں توراۃ کی طرح صرف ماں باپ کی عزّت اور ڈر کے محدود لفظ نہیں بلکہ "نیکی کرنے" کا وسیع المعنی لفظ رکھا گیا ہے جس سے تعلیم کے مفہوم میں بڑی وسعت آگئی ہے اور ہر قسم کی خدمت، اطاعت اور عزّت کا مفہوم اس کے اندر پیدا ہے۔

اسی سورہ میں دوسری جگہ والدین کی مالی خدمت اور امداد کی نصیحت ہے:

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ	فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو وہ ماں باپ اور
وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ	رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں
وَابْنِ السَّبِيْلِ ط (البقرة: ۲۱۵)	اور مسافروں کے لئے۔

سورۂ نساء میں توحید کے حکم اور شرک کی ممانعت کے بعد ہی والدین کے ساتھ بھلائی کی تاکید کی جاتی ہے:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ	اور اللہ کو پوجو اور اس کے ساتھ کسی کو
شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا	شریک نہ بناؤ۔ اور ماں باپ کے ساتھ
(النساء: ۳۶)	بھلائی کرو۔

کفّار کو جنھوں نے اپنے وہم و خیال اور رسم و رواج سے حلال و حرام کی ہزاروں رسمی و خیالی باتیں پیدا کرلی تھیں اللہ تعالیٰ خطاب کرکے فرماتا ہے کہ یہ کھانے پینے کی چیزیں حرام نہیں، آؤ

ہم بتائیں کہ حقیقت میں حرام چیزیں کیا ہیں، خدا کے ساتھ شرک کرنا اور ماں باپ کے ساتھ نیکی سے پیش نہ آنا:

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ	کہہ دا اے پیغمبر، آؤ میں تمہیں پڑھ کر
عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّ	سناؤں کہ تمہارے پروردگار نے تم پر کیا
بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ج	حرام کیا ہے، یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو
(الانعام: ۱۵۱)	شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا۔

معراج کے احکام دوازدہ گانہ میں خدا کی توحید کے بعد والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم اس اہتمام کے ساتھ دی جاتی ہے کہ اُن کے سامنے اُف بھی نہ کرو، عاجزی سے پیش آؤ، اُن کے حق میں دعا خیر کرو اور بڑھاپے میں اُن کی خدمت کرو۔ فرمایا:

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ	اور تیرے رب نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ
اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا	تم اس کے سوا کسی کو نہ پوجو اور ماں باپ
يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَاۤ	کے ساتھ بھلائی کرنا اگر ان میں سے ایک
اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَاۤ اُفٍّ وَّ	یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ
لَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا	جائیں تو ان کو اُنھ بھی نہ کہو اور نہ ان پر خفا
كَرِيْمًا ○ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ	ہو اور ان سے ادب سے بولو اور ان
الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ	کے لئے اطاعت کا بازو محبت سے جھکاؤ
ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ○	اور کہو کہ اے میرے پروردگار تو ان پر
(بنی اسرائیل: ۲۳-۲۴)	رحمت فرما جس طرح انہوں نے بچپن میں مجھے پالا۔

اللہ اللہ! کس ادب اور محبت کی تعلیم ہے۔

خُدا کی دائمی اور غیر متبدل شریعت میں شرک سے زیادہ بُری چیز کوئی نہیں قرار دی گئی۔اس پر بھی اگر کسی کے ماں باپ مشرک ہوں تو اس حالت میں بھی اُن کی خدمت سے ہاتھ اُٹھانا روا نہیں بجز اس کے کہ اگر وہ اس کو شرک کی دعوت دیں تو اُن کی اس بات کو قبول نہ کیا جائے۔ارشاد ہوا:

وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ؕ وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ؕ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○

(العنکبوت:۸)

اور ہم نے انسان کو جتا دیا کہ ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو اور اگر وہ تجھ کو مجبور کریں کہ تو خدا کے ساتھ اس کو شریک کر جس کا تجھ کو علم نہیں تو اُن کا کہا نہ مان۔تم سب کو میرے پاس لوٹ کر آنا ہے تو میں تم کو تمہارے کرتوت سے آگاہ کروں گا۔

اتنا ہی نہیں بلکہ اگر تمہارے بُت پرست ماں باپ تم کو بُت پرستی کی دعوت دیں تو صرف اُن کی اس دعوت کو قبول نہ کرو لیکن اُن کی دنیاوی خدمت،اور حُسنِ سلوک میں کوئی فرق نہ آنے پائے بلکہ وہ اس حالت میں بھی اپنی جگہ پر قائم رہے۔فرمایا:

وَ وَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ۚ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ وَّ فِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَ لِوَالِدَيْكَ ؕ اِلَيَّ الْمَصِيْرُ ○ وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا

اور ہم نے انسان کو جتا دیا کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو۔اس کی ماں نے اس کو تھک تھک کر پیٹ میں رکھا اور دو سال میں اس کا دودھ چھڑایا کہ وہ میرا اور اپنے ماں باپ کا احسان مانے۔میرے ہی پاس پھر آنا ہے۔اگر وہ دونوں اس پر تجھ کو مجبور کریں کہ میرے ساتھ اس کو

فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا ز — شریک کر جس کو تو نہیں جانتا تو ان کا یہ کہنا نہ مان اور دُنیا میں ان کے ساتھ بھلائی سے گذران کر۔

(لقمان : ۱۴-۱۵)

اس اہتمام کو دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ ماں باپ کی احسان مندی کا ذکر خود اپنی احسان پذیری کے ساتھ کرتا ہے اور اس شرک پرستی کی دعوت اور اس دعوت کے قبول پر اولاد کو بزور مجبور کرنے کے باوجود صرف اسی قدر کہا جاتا ہے کہ مذہب کے باب میں ان کی بات اولاد نہ مانے مگر دوسری دنیاوی باتوں میں اُن کا ادب، ان کی اطاعت اور ان کی خدمت کا وہی عالم رہے۔

حضرت ابراہیمؑ کو دیکھئے کہ باوجود اس کے کہ ان کا باپ مسلمان نہ تھا مگر اپنے وعدہ کی بنا پر خدا سے دعا مانگی جس سے غالباً ان کی مراد یہ ہوگی کہ وہ ایمان لاکر حسن خاتمہ پر مرے:

رَبَّنَا اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ — اے میرے پروردگار مجھے اور میرے ماں باپ کو بخش دے۔

(ابراھیم : ۴۱)

حضرت نوحؑ نے بھی یہی دُعا کی:

رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ (نوح : ۲۸) — اے پروردگار مجھے اور میرے ماں باپ کو بخش دے۔

اس لئے والدین کے حسن خاتمہ اور مغفرت کی دُعا مانگنا انبیاء علیہم السلام کی پیروی ہے۔

آخری بات یہ ہے کہ وہ لوگ جو والدین کے ساتھ حُسن سلوک کرتے ہیں، اُن کی خدمت بجالاتے ہیں اور اُن کے لئے خُدا سے دعائے خیر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اس نیکی کے بدلہ میں ان کے سارے گناہ معاف کر دیتا اور اپنی خوشنودی کی لازوال دولت ان کو عطا فرماتا ہے:

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا ۖ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَّ — اور ہم نے انسان کو تاکید کر کے کہہ دیا کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا اس

وَضَعَتْهُ كُرْهًا ۖ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ
ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ۖ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ
اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ
قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ
نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰي
وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ
وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ ۚ اِنِّيْ تُبْتُ
اِلَيْكَ وَاِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ
الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا
عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ
فِيْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ ۭ وَعْدَ الصِّدْقِ
الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ۝

(الاحقاف: ۱۵-۱۶)

کی ماں نے اس کو تکلیف کر کے پیٹ
میں اٹھایا اور تکلیف کر کے جنی اور پیٹ
میں رکھنا اور دودھ چھڑانا تیس مہینے ہیں،
یہاں تک کہ وہ بچہ سے بڑھ کر جوان ہوا
اور چالیس برس کا ہوا اس نے کہا کہ میرے
پروردگار مجھ کو توفیق دے کہ تیرے اس
احسان کا شکر ادا کروں جو تونے مجھ پر اور
میرے ماں باپ پر کیا اور اس کی کہ میں وہ
کام کروں جس کو تو پسند کرے۔ اور میری
اولاد نیک کر، میں تیری طرف لوٹ کر آیا
اور میں تیرے فرمانبرداروں میں ہوں یہی
وہ ہیں جن کے اچھے کام ہم قبول اور اُن
کے بُرے کاموں سے درگذر کرتے ہیں۔
یہ جنت والوں میں ہوں گے۔ یہ سچائی کا
وہ عہد ہے جس کا ان سے وعدہ کیا گیا۔

ان آیتوں نے والدین اور خصوصاً ماں کی خدمت واطاعت ورضا مندی کو وہ پانی بتایا ہے جس سے گناہوں کی فرد دُھل کر صاف ہوجاتی ہے۔ احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اسی منشائے الٰہی کو مختلف عبارتوں اور طریقوں میں ادا فرمایا ہے۔ کبھی فرمایا ہے کہ "ماں کے پاؤں

کے نیچے جنت ؎ ہے"۔کبھی ارشاد ہوا "رب کی خوشنودی باپ کی خوشنودی میں ہے"۔کسی نے پوچھا"یا رسول اللہ! میرے حسن معاشرت کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے"؟ فرمایا"تیری ماں"۔ دریافت کیا پھر کون"؟ فرمایا"تیری ماں"۔عرض کی"پھر کون" فرمایا"تیری ماں"۔گذارش کی"پھر کون"؟ چوتھی بار فرمایا"تیرا باپ اور اس کے بعد جو اسکے قریب ہے پھر جو اسکے قریب ہے"۔ایک دفعہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم مجلس اقدس میں تشریف فرما تھے۔جاں نثار حاضر تھے۔فرمایا"وہ خوار ہوا، وہ خوار ہوا، وہ خوار ہوا"صحابہ نے پوچھا کون یا رسول اللہ؟"ارشاد ہوا"وہ جس نے اپنے ماں باپ کو یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پایا اور پھر (ان کی خدمت کر کے) جنت نہ حاصل کر لی"۔ایک اور مجلس میں صحابہ نے دریافت کیا کہ تمام کاموں میں خدا کو ہمارا کون سا کام زیادہ پسند آتا ہے؟ فرمایا"وقت پر نماز پڑھنا"عرض کی "پھر کون سا؟"ارشاد ہوا"ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا"۔دریافت کیا"پھر کون سا؟"فرمایا"خدا کی راہ میں محنت اٹھانا (جہاد)۔

ایک دفعہ آپؐ نے والدین کی اطاعت کے ثواب کو ایک نہایت مؤثر حکایت میں بیان فرمایا۔ارشاد ہوا کہ تین مسافر راہ میں چل رہے تھے کہ اتنے میں موسلا دھار پانی برسنے لگا۔تینوں نے بھاگ کر ایک پہاڑ کے غار میں پناہ لی۔قضارا ایک چٹان اوپر سے ایسا گری کہ اس سے اس غار کا منہ بند ہو گیا۔داب ان کی بے کسی و بے چارگی اور اضطراب و بے قراری کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ان کو موت سامنے کھڑی نظر آتی تھی، اس وقت انہوں نے پورے خضوع و خشوع کے ساتھ دربارِ الٰہی میں دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ہر ایک نے کہا کہ اس وقت ہر ایک کو اپنی خالص نیکی کا واسطہ خدا کو دینا چاہیئے۔ایک نے کہا بارِ الٰہا تو جانتا ہے کہ میرے والدین بوڑھے تھے اور میرے چھوٹے چھوٹے

؎ مشکوٰۃ المصابیح بحوالہ احمد و نسائی و بیہقی، کتاب الآداب فی البر والصلہ۔

بچے تھے۔ میں بکریاں چراتا تھا اور انہی پر ان کی روزی کا سہارا تھا۔ میں شام کو جب بکریاں لے کر گھر آتا تھا تو دودھ دوہ کر پہلے اپنے والدین کی خدمت میں لاتا تھا۔ جب وہ پی چکتے تب اپنے بچوں کو پلاتا تھا۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ میں بکریاں چرانے کو دور نکل گیا لوٹا تو میرے والدین سو چکے تھے میں دودھ لے کر ان کے سرہانے کھڑا ہوا نہ اُن کو جگاتا تھا کہ اُن کی راحت میں خلل آجاتا اور نہ ہٹتا تھا کہ خدا جانے کس وقت اُن کی آنکھیں کھلیں اور دودھ مانگیں۔ بچے بھوک سے بلک رہے تھے مگر مجھے گوارا نہ تھا کہ میرے والدین سے پہلے میرے بچے سیر ہوں۔ میں اسی طرح پیالہ میں دودھ لئے رات بھر سرہانے کھڑا رہا۔ اور وہ آرام کرتے رہے۔ خداوندا! اگر تجھے معلوم ہے کہ میں نے یہ کام تیری خوشنودی کے لئے کیا تو اس غار کے منہ سے چٹان کو ہٹا دے۔ یہ کہنا تھا کہ چٹان کو خود بخود جنبش ہوئی اور غار کے منہ سے تھوڑا سرک گئی۔ اس کے بعد باقی دو مسافروں کی باری آئی اور انہوں نے بھی اپنے نیک کاموں کو وسیلہ بنا کر دعا کی اور غار کا منہ کھل گیا۔

اسلام میں جہاد کی اہمیت جو کچھ ہے وہ ظاہر ہے۔ مگر والدین کی خدمت گذاری کا درجہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ ان کی اجازت کے بغیر جہاد بھی جائز نہیں کہ جہاد کے میدان میں سر ہتھیلی پر رکھ کر جانا ہوتا ہے اور ہر وقت جان جانے کا امکان رہتا ہے اس لئے والدین کی اجازت کے بغیر ان کو اپنے اس جسم و جان کو کھونے کا حق نہیں جس کو ان کی خدمت گذاری کے لئے وقف ہونا چاہیئے تھا اسی لئے ابھی اوپر گذر چکا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نیک کاموں میں جہاد کا درجہ والدین کی خدمت گذاری کے بعد رکھا۔ ایک دفعہ ایک صحابی نے خدمتِ اقدس میں آکر شرکتِ جہاد کی اجازت طلب کی۔ دریافت فرمایا کہ تمہارے ماں باپ بھی ہیں؟ عرض کی "جی ہاں"۔ ارشاد ہوا "تو پھر انہی کی خدمت کا فریضۂ جہاد ادا کرو۔"

قرآن پاک کی صریح آیتوں میں خدا کی اطاعت کے ساتھ ساتھ جس طرح والدین کی اطاعت

کا ذکر ہے احادیث میں بھی اس کا وہی درجہ رکھا گیا ہے۔ صحابہ سے فرمایا کہ "تم پر خدا نے ماؤں کی نافرمانی حرام کی ہے"۔ ایک دفعہ صحابہ سے جو خدمت میں حاضر تھے دریافت کیا کہ کیا تم کو بتاؤں کہ دنیا میں سب سے بڑے گناہ کیا ہیں؟ انہوں نے عرض کی "ضرور یا رسول اللہ!" فرمایا "خدا کے ساتھ شرک کرنا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا"۔ آپؐ تکیہ لگائے بیٹھے تھے، سیدھے ہو کر برابر ہو گئے اور فرمانے لگے "اور جھوٹی گواہی اور ہاں جھوٹی گواہی"[1]۔

توراۃ میں حقوقِ والدین کے متعلق جو بعض ایسے احکام تھے جو بے حد سخت تھے وحی محمدیؐ نے بعض حیثیتوں سے اُن میں تخفیف کر دی ہے اور بعض حیثیتوں سے اور زیادہ سخت کر دیا ہے۔ مثلاً توراۃ کا یہ حکم تھا کہ جو کوئی اپنے ماں باپ پر لعنت کرے وہ قتل کر دیا جائے۔ اسلام نے اس گناہ کو دنیا کی قانونی سزا کے بجائے اُخروی سزا کا موجب قرار دیا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ توبہ واستغفار سے معاف ہو سکتے ہیں اور مجرم کو اپنے فعل پر نظرِ ثانی کی تازندگی مہلت ملتی ہے لیکن اگر اس نے اس مہلت سے فائدہ نہ اٹھایا تو پھر عذاب بھی ہے جو دنیاوی سزا سے زیادہ سخت ہے۔ اسلام کے قانون میں ایک دفعہ یہ بھی ہے کہ اگر کوئی سنگ دل باپ اپنی اولاد کے قتل کا مرتکب ہو تو بعض حالتوں میں وہ اس کے قصاص میں قتل نہ ہو گا بلکہ کسی اور سزا کا مستحق ہو گا۔ کیونکہ باپ کو اپنی اولاد سے جو فطری محبت ہوتی ہے اس کا مقتضا یہی ہے کہ اس کے فعل کو بالقصد کی بجائے اتفاقی سمجھا جائے تاآنکہ اس کے برخلاف کوئی قوی شہادت موجود نہ ہو[2]۔

---

[1] یہ تمام واقعات اور اقوال عام کتبِ حدیث میں مذکور ہیں، خصوصیت کے ساتھ دیکھو صحیح بخاری کتاب الادب، صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ، جامع ترمذی کتاب البر والصلۃ، مشکوٰۃ باب مذکور۔ [2] فقہائے اسلام کے خیالات اس قانون کی تشریح کے متعلق مختلف ہیں۔ احناف اور شوافع کے نزدیک لڑکے کے قتل پر باپ سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔ امام مالک کے نزدیک اگر وہ بے رحمی سے پچھاڑ کر ذبح کرے تو قصاص ہے ورنہ نہیں اور ظاہریہ کے اصول کے مطابق قتل عمد کی ہر صورت میں قصاص ہے اور یہی قرآن کا منشا معلوم ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ باپ کے وفورِ شفقت کی وجہ سے اس کا ہر قتل بلاقصد سمجھا گیا ہے اس لئے اکثر فقہا نے اکثر قتل خطا سمجھ کر قصاص کے بجائے اس پر دیت لازم کی ہے الا یہ کہ دلائل و قرائن باپ کے سوء قصد کو ظاہر کرتے ہوں۔

اسی سلسلہ میں ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ تورات نے ایک طرف والدین کو یہ اہمیت دے کر دوسری طرف بیوی کے سامنے اُن کو بالکل بے قدر کر دیا ہے۔ لکھا ہے:

اس واسطے مرد اپنے ماں باپ کو چھوڑے گا اور اپنی جورو سے ملا رہے گا اور وہ ایک تن ہوں گے۔ (پیدائش ۲-۲۴)

حضرت عیسیٰؑ نے بھی جو گو دانجیل کے بیان کے مطابق، ماں باپ اور بیوی تینوں سے ناآشنا تھے تاہم جیسا کہ انجیل کے موجودہ نسخہ میں ہے ماں باپ کے مقابلہ میں بیوی کی طرف داری اور حمایت کی اور اسی لئے طلاق کو ناجائز قرار دیا[1]۔ مگر سوال یہ ہے کہ اگر بیوی اور والدین کے درمیان ناقابلِ حل اختلاف ہو اور اس لئے ان دونوں میں سے کسی کو مجبوراً ترجیح دینی پڑے تو کیا صورت اختیار کی جائے۔ اسلام کا حکم ہے کہ اس حال میں بھی والدین کی اطاعت کرو کہ بیوی کا تعلق ایسا ہے جس کو قانون اور عہد نے پیدا کیا ہے جو ٹوٹ کر جڑ سکتا اور مٹ کر بدل سکتا ہے۔ لیکن والدین کا فطری تعلق ناقابلِ شکست اور ناقابلِ تغیر ہے۔ حضرت ابن عمرؓ کی ایک بیوی تھیں جن سے وہ راضی تھے مگر ان کے پدر بزرگوار حضرت عمرؓ کو بہو پسند نہ تھیں۔ اس اختلاف نے خانگی جھگڑے کی صورت اختیار کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عمرؓ کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے باپ کی اطاعت کریں۔

---

[1] مرقس ۱۰ - ۷ ، ۸ -

اولاد کا حق

اصولی تعلیم جس طرح ماں باپ کے حقوق اولاد پر ہیں اسی طرح اولاد کے بھی کچھ حقوق ماں باپ پر ہیں اور یہ وہ عنوان ہے جس کا سراغ دوسری آسمانی کتابوں میں نہیں ملتا۔ اور اس سے یہ سمجھنا چاہیئے کہ اسلام سے پہلے والدین کو تو اپنی اولاد پر غیر محدود اختیارات حاصل تھے مگر اولاد کا باپ پر کوئی حق تسلیم نہیں کیا گیا تھا اور اس کو والدین کی بزرگی کے خلاف سمجھا گیا تھا۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو مذہب لے کر تشریف لائے اُس کی شریعت میں حقوق کے مسئلہ میں بڑوں چھوٹوں کی تفریق نہیں وہ جس طرح چھوٹوں پر بڑوں کے جائز حقوق تسلیم کرتا ہے اسی طرح وہ چھوٹوں کے بھی بڑوں پر مناسب حقوق قائم کرتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نہایت چھوٹے سے فقرہ میں وہ اصول بتا دیا ہے جو ان تمام حقوق کا نہایت جامع متن ہے۔ اُن حقوق کی جس قدر تشریح کی جائے یہ متن اُن سب پر محیط ہے۔ فرمایا:

لیس منّا من لم یرحم صغیرنا	جو ہمارے چھوٹے پر شفقت نہ کرے
ولم یوقّر کبیرنا	اور ہمارے بڑے کا ادب نہ کرے وہ
(ترمذی)	ہم میں سے نہیں۔

بڑے چھوٹے کے ساتھ شفقت سے پیش آئیں اور چھوٹے بڑے کا ادب اور لحاظ کریں یہ وہ اصول ہے جس پر چھوٹوں اور بڑوں کے باہمی حقوق کی بنیاد اسلام میں قائم کی گئی ہے اور حقیقت

یہ ہے کہ اگر یہ ترازو ٹھیک اور سیدھی رہے تو ہر انسانی جماعت میں چھوٹوں، بڑوں، افسروں، ماتحتوں، آقاؤں، نوکروں، بزرگوں اور عزیزوں کے درمیان کسی قسم کی ناگواری اور آزردگی پیدا نہ ہونے پائے۔ جب کبھی چھوٹوں اور بڑوں میں کسی قسم کی ناگواری پیش آئی ہے تو اس کا سبب یہی ہوا ہے کہ ترازو کے ان دونوں پلڑوں میں توازن قائم نہیں رہا ہے۔ حکیموں اور مقننوں کے بنائے ہوئے نظم و انتظام کے سارے مشرح و مفصل قانون اور قاعدوں کا بے پایاں دفتر جو کام نہیں کر سکتا وہ نبی امی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے یہ دو مختصر سادہ فقرے بڑی خوبی سے انجام دے سکتے ہیں اور دیتے ہیں۔ اگر واقعاً کسی جماعت میں یہ ترازو بے نظام ہو جائے تو بڑے بڑے قانونوں کا بارِ گراں بھی پھر اس کو برابر نہیں کر سکتا۔

اولاد کا سب سے پہلا حق اپنے والدین پر یہ ہے کہ جب خدا نے ان کی اولاد کی زندگی کا واسطہ ان کو بنایا ہے تو وہ بالقصد اس کے نقشِ زندگی کے مٹانے کا سبب نہ بنیں بلکہ اس کی حیات کی تکمیل اور اس کی نشوونما کی ترقی کے وہ تمام ذریعے مہیا کریں جو ان کی قوت اور استطاعت میں ہے یہی سبب ہے کہ اسلام نے حمل کو بالقصد ضائع کرنے (اسقاط) کو گناہ قرار دیا ہے اور ذریعۂ حمل کے ضائع کرنے (عزل) کو اچھا نہیں سمجھا ہے اور پیدا ہونے کے بعد اس کے مار ڈالنے کی جاہلانہ رسم کو جڑ پیڑ سے اکھاڑنے کی پوری کوشش کی ہے۔

اولاد کشی کا انسداد عرب کے سفاکانہ مراسم میں سب سے زیادہ بے رحمی اور سنگ دلی کا کام معصوم بچوں کو مار ڈالنا اور لڑکیوں کو زندہ گاڑ دینا تھا۔ یہ بے رحمی کا کام والدین خود اپنی خوشی اور مرضی سے انجام دیتے تھے۔ اس رسم کے جاری ہونے کے کئی اسباب تھے۔ ایک تو مذہبی تھا یعنی والدین اپنے بچوں کو اپنے دیوتاؤں کی خوشنودی کے لئے خود ذبح کر کے ان پر چڑھا دیتے تھے۔ منت مانتے تھے کہ فلاں کام ہو گا تو اپنے بچےؔ [1] کی قربانی کریں گے۔ یہ قابلِ نفرت رسم نہ

---

[1] سیرۃ ابن ہشام و طبقات ابن سعد و تاریخ طبری وغیرہ کتب سیر میں عبد المطلب کا عبد اللہ کو قربانی دینے کا واقعہ نیز موطا امام مالک باب لا یجوز من النذور فی معصیۃ اللہ۔

صرف عرب میں بلکہ بہت سی بت پرست قوموں میں جاری تھی۔ رومتہ الکبریٰ کے عظیم الشان متمدن قانون میں "اولاد کو مار ڈالنے کا باپ کو بالکل اختیار تھا اس قتل کی کوئی باز پرس نہ تھی اور اولاد کشی کا علانیہ کثرت سے رواج تھا"۔ ہندوستان کے راجپوتوں میں یہ دردناک منظر لڑکیوں کی شادی کی شرم و عار سے بچنے اور بیواؤں کی ستی کی صورت میں اور لڑائیوں میں جوہر کی صورت میں رائج تھا۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ بتوں، دیوتاؤں، دیبیوں کی خوشی اور نذرانے کے لئے ان معصوموں کی جانیں بہت آسانی سے لی جاتی تھیں۔ قرآن پاک کی اس آیت میں نہ صرف عرب بلکہ تمام دُنیا کی قوموں کے اسی عقیدہ کو باطل کیا گیا ہے[2]:

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ۖ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ۝

(الانعام: ۱۳۷)

(جس طرح کھیتوں اور جانوروں میں خدائے برحق کے ساتھ ان کے دیوتاؤں نے اپنا حصّہ لگا لیا ہے) اسی طرح بہت سے مشرکوں کو ان کے دیوتاؤں نے یہ بات خوب صورت کر کے دکھائی ہے کہ وہ اپنی اولاد کو قتل کر دیں تاکہ یہ دیوتا اُن کو ہمیشہ کے لئے، ہلاک کر دیں اور ان کے دین کو ان پر مشتبہ کر دیں۔ اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے۔ تو ان مشرکوں کو اور جو کچھ خدا پر وہ افترا کرتے ہیں کہ خدا نے ان کو ایسا حکم دیا ہے اس کو چھوڑ دے۔

---

[1] لیکی کی تاریخ اخلاق یورپ جلد اول صفحہ ۲۳۔ [2] کشاف زمخشری تفصیل آیت مذکورہ۔

اسی سلسلہ میں آگے چل کر خدا فرماتا ہے:

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ (الانعام: ۱۴۰)

گھاٹے میں ہیں وہ جنہوں نے اپنی اولاد کو نادانی سے بے جانے قتل کیا۔

اس ہولناک گناہ کے ارتکاب کا دوسرا سبب عربوں کا عام فقر و فاقہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اولاد ہو گی تو اس کے کھانے پینے کا سامان کرنا ہو گا اس لئے وہ اس کے خون سے اپنا ہاتھ رنگ کر اس فرض سے سبکدوش ہوتے تھے۔ نبوت محمدیؐ نے ان کو یہ بتایا کہ ہر بچہ اپنا رزق اور اپنی قسمت ساتھ لے کر آتا ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان کو نہیں کھلاتا بلکہ وہ خدا ہی ہے جو سب کو کھلاتا ہے اور وہی ہر جاندار کی روزی کا میرِ سامان ہے:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (هود: ۶)

اور زمین پر کوئی جاندار نہیں لیکن یہ کہ اس کی روزی کا فرض خدا ہی پر ہے۔

اس لئے جاہل عربوں کو تعلیم دی گئی:

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝ (بنی اسرائیل: ۳۱)

اور اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے خوف سے مار نہ ڈالا کرو، ہم ہی ہیں جو ان کو اور تم کو دونوں کو روزی دیتے ہیں۔ ان کا مار ڈالنا بے شبہ بڑا گناہ ہے۔

قتل اولاد کے جرم کو اتنی اہمیت دی گئی کہ اس کی ممانعت کو شرک کی ممانعت کے پہلو بہ پہلو جگہ دی گئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ ان عربوں کو جنہوں نے اپنی طرف سے بہت سی چیزیں حرام بنا لی ہیں بتا دو کہ اصلی چیزیں انسان پر کیا حرام ہیں:

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ

کہہ دے اے پیغمبر! آؤ میں تم کو پڑھ کر

عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ (الانعام: ۱۵۱)

سناؤں کہ تمہارے پروردگار نے تم پر کیا حرام کیا ہے۔ خدا کا کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنا اور مفلسی کے ڈر سے اپنے بچوں کو نہ مار ڈالو۔ ہم تم کو اور اُن کو دونوں کو روزی دیتے ہیں۔

ایک دفعہ ایک صحابی نے دریافت کیا "یا رسول اللہ! سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟" فرمایا "شرک۔" پوچھا "اس کے بعد" فرمایا "والدین کی نافرمانی" پھر عرض کی "اس کے بعد" فرمایا "یہ کہ تم اپنی اولاد کو اس ڈر سے مار ڈالو کہ وہ تمہارے ساتھ کھائے گی"[1] یہ جواب حقیقت میں آیتِ بالا کی تفسیر ہے۔ الٰہی تعلیمات اور نبوت کے اس پر توِ فیض نے دلوں میں یہ یقین پیدا کر دیا کہ رازق خدا ہے۔ اسی کے ہاتھ میں رزق کی کنجی ہے۔ ہر بچہ اپنے رزق کا آپ سامان لے کر آتا ہے۔ اس ایمان اور یقین نے اس جرم کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا اور عرب کی سرزمین اس لعنت سے ہمیشہ کے لئے پاک ہو گئی۔

اولاد کشی کی تیسری صورت جو سب سے زیادہ قابلِ افسوس تھی وہ لڑکیوں کا زندہ دفن کر دینا تھا کہ لڑکیاں شرم و عار کا باعث سمجھی جاتی تھیں جب گھر میں لڑکی پیدا ہوتی تو باپ کو سخت رنج ہوتا اور وہ لوگوں سے منہ چھپاتا پھرتا تھا۔ اہلِ عرب کا عقیدہ تھا کہ فرشتے خدا کی لڑکیاں ہیں۔ قرآن نے کہا کہ تم کو لڑکی ہو تو تمہاری شرم کا باعث ہو اور خدا کو لڑکیوں کا باپ کہو تو شرم نہ آئے۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ

اور جب اُن میں کسی کو اس کے ہونے کی

---

[1] صحیح بخاری کتاب التوحید، و تفسیر سورۂ بقرہ، و سورۂ فرقان، و کتاب الادب و کتاب المحاربین و صحیح مسلم کتاب الایمان۔

لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۝ (الزخرف: ۱۷)

خوشخبری دی جائے جس کی وہ رحمت والے خدا پر تہمت باندھتے ہیں تو اندر ہی اندر غصّہ کے مارے اس کا منہ سیاہ پڑ جاتا ہے۔

رفتہ رفتہ یہ حالت پہنچی کہ اس شرم و عار کے مجسمہ کو پردۂ خاک میں چھپا کر باپ اس مصیبت سے نجات پانے کی فکریں کرتے قرآن مجید نے اہلِ عرب کی اس حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۝ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ؕ (النحل: ۵۸-۵۹)

اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خوش خبری دی جاتی ہے تو اس کا منہ کالا پڑ جاتا ہے اور غصّہ کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔ اس خوش خبری کے رنج سے وہ لوگوں سے منہ چھپاتا پھرتا ہے کہ آیا ذلّت اٹھا کر اس کو اپنے پاس رہنے دے یا اس کو مٹی میں چھپا دے۔ (یعنی زندہ دفن کر دے)

یوں تو اس رسمِ بد کا رواج تمام عرب میں تھا مگر اخبارِ عرب کے بعض واقف کہتے ہیں کہ ایک خاص سبب سے بنو تمیم میں اس کا رواج سب سے زیادہ تھا[۱]۔ بنو تمیم کے رئیس قیس بن عاصم نے خود

---

[۱] مجمع الامثال کرمانی مطبوعہ ایران صفحہ ۳۴۸ وکتاب مجمع الامثال میدانی جلد اول صفحہ ۲۸۰ مطبعۂ خیریہ مصر، زیر مثل اضل من موؤدۃ۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے اقرار کیا کہ انہوں نے اپنے ہاتھ سے آٹھ دس لڑکیوں کو زندہ دفن کیا ہے[1]۔
یہ رسم جس شقاوت اور سنگ دلی کے ساتھ انجام دی جاتی تھی اس کا حسرت ناک نقشہ ایک صاحب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے سامنے خود اپنی آپ بیتی سُنا کر اس طرح کھینچا کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلّم بے چین ہو گئے۔

دارمی میں وضین تبع تابعی سے ایک موقوف روایت[2] ہے کہ ایک شخص نے آکر خدمتِ اقدس میں عرض کی کہ "یارسولؐ اللہ! ہم لوگ جاہلیت والے تھے بتوں کو پوجتے تھے اور اولاد کو مار ڈالتے تھے۔ میری ایک لڑکی تھی جب میں اس کو بلاتا تو دوڑ کر میرے پاس آتی۔ ایک دن وہ میرے بلانے پر خوش خوش دوڑی آئی۔ میں آگے بڑھا اور وہ میرے پیچھے پیچھے چلی آئی۔ میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ جب ایک کنوئیں کے پاس پہنچا جو میرے گھر سے کچھ دور نہ تھا اور لڑکی اس کے قریب پہنچی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کنوئیں میں ڈال دیا۔ وہ ابا ابا کہہ کر پکارتی رہی اور یہی اس کی زندگی کی آخری آواز تھی۔" رحمتِ کونین صلی اللہ علیہ وسلّم اس پُر درد افسانہ کو سُن کر آنسو ضبط نہ کر سکے۔ ایک صحابی نے اُن صاحب کو ملامت کی کہ تم نے حضورؐ کو غمگین کر دیا فرمایا "اس کو چھوڑ دو کہ جو مصیبت اس پر پڑی ہے وہ اس کا علاج پوچھنے آیا ہے" پھر اُن صاحب سے فرمایا "ہاں میاں! تم اپنا قصہ پھر سے سناؤ" انہوں نے دوبارہ پھر بیان کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی یہ حالت ہوئی کہ روتے روتے ریش مبارک تر ہو گئی۔ پھر فرمایا "جاؤ کہ جاہلیّت کے گناہ اسلام کے بعد معاف ہو گئے۔ اب نئے سرے سے اپنا عمل شروع کرو۔"

قبیلہ بنی تمیم کے رئیس قیس بن عاصم جب اسلام لائے تو انہوں نے عرض کی کہ "یارسولؐ اللہ! میں

---

[1] ابن جریر وابن کثیر و درّ منثور سیوطی بحوالہ سنن بیہقی و مسند بزاز و مصنف عبدالرزاق زیر تفسیر سورۂ تکویر۔ [2] سنن دارمی صفحہ اوّل۔ یہ روایت گو مرفوع اور قوی نہیں لیکن اس لئے نقل کر دی ہے کہ کم از کم آج اس جرم کا تخیّل ہی ہمارے سامنے آجائے۔

نے اپنے ہاتھ سے آٹھ لڑکیاں زندہ دفن کی ہیں" فرمایا "اے قیس! ہر لڑکی کے کفارہ میں ایک غلام آزاد کرو" عرض کی "یارسولؐ اللہ میرے پاس اونٹ ہیں" فرمایا "اے قیس! ہر لڑکی کے کفارہ میں ایک اونٹ قربانی کرو"[1]

مردوں کے علاوہ یہ کس قدر تعجب انگیز ہے کہ خود عورتیں بھی اس جرم میں مردوں کی شریک تھیں۔ مائیں خود اپنی لڑکیوں کو اپنے ہاتھ سے اس قربانی کے لئے حوالہ کرتی تھیں۔ ابن الاعرابی جاہلیت کے ایک شاعر کا ایک شعر سناتا ہے:

مالقی الموؤدمن ظلم اُمّہ کما لقیت ذھل جمیعاً وعامر

(زندہ دفن ہونے والے بچّہ نے اپنی ماں کے ظلم سے بھی وہ تکلیف نہیں اٹھائی جو ذہل اور عامر نے اٹھائی)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی خدمت میں ایک عورت نے آکر کہا کہ میں نے نذر مانی تھی کہ اپنے لڑکے کی قربانی کروں گی۔ فرمایا "ایسا نہ کرو، بلکہ کفّارہ دے دو"[2]

اسلام سے پہلے اس رسم کے انسداد کے لئے صرف اسی قدر ہوا کہ ایک دو نیک آدمیوں نے ایسی لڑکیوں کو قیمت دے کر ان کے والدین سے خرید لیا اور اُن کی پرورش کی۔ چنانچہ مشہور شاعر فرزدق کے دادا صعصعہ نے اس میں بڑا نام پیدا کیا تھا۔ اسلام کے بعد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا تو عرض کی "یارسولؐ اللہ! میں نے اسلام سے پہلے تین سو ساٹھ لڑکیوں کو خرید کر موت سے بچایا ہے کیا مجھ کو اس کا ثواب ہوگا" فرمایا "ہاں تم کو اس کا ثواب ملے گا کہ خُدا نے تم کو مسلمان بنا کر تم پر احسان

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری بروایت قتادہ تابعی و تفسیر ابن کثیر بحوالہ عبدالرزاق و بزاز و درمنثور سیوطی بحوالۂ مسند بزاز و حاکم فی الکنی و بیہقی فی السنن زیر سورۃ اذا الشمس کورت [2] موطا امام مالک باب النہی عن النذور فی معصیۃ اللہ۔

کیا ہے[1]۔ اسی طرح زید بن عمرو بن نفیل جو بعثتِ نبویؐ سے پہلے دینِ ابراہیمی کے پیرو تھے وہ بھی اس قسم کی لڑکیوں کو اپنی آغوشِ شفقت میں لیتے تھے اور اُن کی پرورش کرتے تھے جب وہ بڑی ہو جاتی تھیں تو وہ اُن کے باپ کو کہتے تھے کہ کہو تو میں تم کو واپس کر دوں چاہے اُن کو میرے ہی پاس رہنے دو[2]۔ یہ شخصی کوششیں تھیں جو ملک میں بارآور نہ ہوئیں لیکن بعثتِ محمدیؐ کی رحمتِ عام کی جب بہار آئی تو ان شقاوتوں کے موسم پر ہمیشہ کے لئے خزاں چھا گئی۔

لوگ عموماً لڑکیوں کے وجود کو بلا اور مصیبت سمجھتے تھے۔ نبوتِ محمدیؐ نے اس بلا اور مصیبت کو ایسی رحمت بنا دیا کہ وہ نجاتِ اخروی کا ذریعہ بن گئیں۔ فرمایا "جو کوئی ان لڑکیوں میں سے کسی لڑکی کی مصیبت میں مبتلا ہوا پھر اس کے ساتھ محبت و مہربانی کا سلوک کرے تو وہ دوزخ کے عذاب سے اس کو بچالے گی۔ وہ اس کے اور دوزخ کے درمیان پردہ بن کر حائل ہو جائے گی[3]" نیز فرمایا "جو دو لڑکیوں کی بھی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ جوان ہو جائیں تو قیامت میں میرا اور اُس کا مرتبہ" دو انگلیوں کو اُٹھا کر فرمایا کہ "یوں برابر ہوگا[4]"۔ غور کیجئے کہ وہی حقیر ہستی جو پہلے شرم و عار کا موجب تھی عہدِ محمدیؐ میں آکر عزت اور سعادت کا وسیلہ بن گئی۔

ان اخلاقی نصیحتوں کے علاوہ اس رسم کے انسداد کے لئے آپ نے عورتوں اور مردوں سے بیعت لی۔ صلح حدیبیہ کے بعد حکم ہوا کہ جو عورتیں اسلام لائیں اُن سے توبہ کی جو بیعت لی جائے اس میں ایک دفعہ یہ بھی ہو وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ[5] کہ "وہ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی"۔ چنانچہ اس حکم کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے خصوصیت کے ساتھ اس کی بیعت لی۔ فتح مکہ

---

[1] تفسیر در منثور بحوالہ طبرانی، تفسیر سورۂ اذا الشمس کورت [2] صحیح بخاری باب حدیث زید بن عمرو بن نفیل جلد اول صفحہ ۵۴۰ [3] صحیح بخاری کتاب الادب و صحیح الادب و صحیح مسلم کتاب البر [4] مشکوٰۃ بحوالہ صحیح مسلم کتاب الادب فی الشفقۃ علی الخلق [5] الممتحنہ: ۱۲۔

کے دن جب عورت مرد جوق در جوق اسلام کے لئے حاضر ہو رہے تھے تو آپؐ نے عورتوں سے خاص طور سے اس کا اقرار لیا اور انہوں نے اقرار کیا۔[1] عید کے اجتماعِ عام میں عورتوں کے مجمع میں آپؐ تشریف لائے اور دوسری باتوں کے علاوہ اس کا بھی عہد لیا کہ وہ قتلِ اولاد کی مرتکب نہ ہوں گی۔[2] دوسرے موقعوں پر بھی جو خواتین دربارِ رسالت میں حاضر ہوتیں ان سے بھی اس کا عہد لیا جاتا تھا۔[3] بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیشِ نظر عرب کی جو ابتدائی اصلاحیں تھیں ان میں ایک چیز یہ بھی تھی۔ چنانچہ بیعتِ عقبہ میں سب سے پہلے انصار سے جن باتوں پر عہد لیا گیا تھا اُن میں ایک یہ بھی تھا کہ "وہ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گے[4]"۔

حضرت عبادہ بن صامتؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم لوگ دربارِ رسالت میں حاضر تھے۔ آپؐ نے فرمایا کہ "ہم سے اس پر بیعت کرو کہ تم کسی کو خدا کا شریک نہ ٹھہراؤ گے، چوری نہ کرو گے، بدکاری نہ کرو گے اور اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گے۔ جو اس عہد کو پورا کرے گا تو اس کا معاوضہ خدا پر ہے اور اگر کسی نے ان میں سے کسی فعل کا ارتکاب کیا اور اس کو قانونی سزا دی گئی تو یہ اس کے گناہ کا کفارہ ہو جائے گا۔ اور اگر اس کا یہ گناہ دنیا میں مخفی رہا تو خدا کو اختیار ہے چاہے بخش دے چاہے عذاب دے[5]"۔ صحابہؓ سے فرمایا کہ "خدا نے تم پر ماؤں کی نافرمانی اور لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا حرام کیا ہے[6]"۔

---

[1] صحیح بخاری جلد دوم صفحہ ۷۲۶ تفسیر سورۂ ممتحنہ و صحیح مسلم باب بیعۃ النساء۔ [2] صحیح بخاری جلد اول صفحہ ۱۳۲ باب موعظۃ الامام النساءَ یوم العید۔ [3] ترمذی و نسائی و ابن ماجہ باب مصافحۃ النساء و مسند امام احمد حدیث امیمہ بنت رقیقہ و سلمیٰ بنت قیس۔ [4] تفسیر ابن کثیر جلد ۹، صفحہ ۳۴۴ برحاشیہ فتح البیان بحوالۂ ابن ابی حاتم و مستدرک حاکم جلد ۲ صفحہ ۴۶۲ علی شرطِ مسلم۔ [5] صحیح بخاری کتاب الایمان و باب وفود الانصار و مسلم کتاب الحدود و مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۳۱۴ و مستدرک حاکم جلد ۲ صفحہ ۳۱۸۔ [6] صحیح بخاری کتاب الادب و کتاب فی الاستقراض و صحیح مسلم باب النہی عن کثرۃ المسائل۔

ان تمام تدبیروں کے علاوہ قرآن پاک کی ایک مختصر سی آیت نے عرب کی ان تمام قساوتوں ان تمام سنگ دلیوں اور ان تمام سفاکیوں کو مٹانے میں وہ کام کیا جو دنیا کی بڑی بڑی تصنیفات نہیں کر سکتی تھیں۔ قیامت کی عدالت گاہ قائم ہے، مجرم اپنی اپنی جگہ کھڑے ہیں، غضبِ الٰہی کا آفتاب اپنی پوری تمازت پر ہے، دانائے غیب قاضی اپنی معدلت کی کرسی پر ہے، اعمال نامے شہادت میں پیش ہیں کہ ایک طرف سے ننھی ننھی معصوم بے زبان ہستیاں خون سے رنگین کپڑوں میں آکر کھڑی ہو جاتی ہیں۔ شہنشاہِ قہار کی طرف سے سوال ہوتا ہے، اے ننھی معصوم جانو! تم کس جرم میں ماری گئیں:

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝ (التکویر: ۸-۹)	یاد کرو جب (قیامت میں)، زندہ دفن ہونے والی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ تو کس جرم میں ماری گئی۔

کس درجہ بلیغ اور مؤثر طرزِ ادا ہے۔ اس کا یہ اثر تھا کہ یا تو لوگ لڑکیوں کو خود اپنے ہاتھوں سے دفن کر دیتے تھے یا یہ زمانہ آیا کہ ادائے عمرہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے روانہ ہونے کا قصد کرتے ہیں، سید الشہداء حمزہؓ کی یتیم بچی امامہ جو مکہ میں رہ گئی تھی چچا چچا کہتی دوڑی آتی ہے حضرت علیؓ ہاتھوں میں اٹھا لیتے اور حضرت فاطمہ زہراؓ کے حوالہ کرتے ہیں کہ یہ لو تمہارے چچا کی بیٹی ہے۔ حضرت علیؓ کے بھائی حضرت جعفر طیارؓ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ بچی مجھ کو ملنی چاہیئے کہ یہ میرے چچا کی لڑکی ہے اور اس کی خالہ میرے گھر میں ہے۔ حضرت زیدؓ آگے بڑھ کر کہتے ہیں کہ حضور! یہ لڑکی مجھ کو ملنی چاہیئے کہ حمزہؓ میرے مذہبی بھائی تھے۔ حضرت علیؓ کا دعویٰ ہے کہ یہ میری بہن بھی ہے اور پہلے میری ہی گود میں آئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس دل خوش کن منظر کو دیکھتے ہیں پھر سب کے دعوے مساوی دیکھ کر اس کو یہ کہہ کر اس کی خالہ کی گود میں دے دیتے ہیں کہ "خالہ ماں کے برابر ہوتی ہے"[1]۔

---

[1] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۶۱۰ باب عمرۃ القضاء۔

کیا یہ وہی جنس نہ تھی جس کی ہستی شرم و عار کا موجب تھی، جس کی پیدائش کی خبر سُن کر باپ کے چہرہ کا رنگ سیاہ پڑ جاتا تھا اور وہ لوگوں کے مجمع میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا تھا یا یہ حال ہے کہ ایک ایک لڑکی کی پرورش کے لئے دفعتہً چار چار گودیں خالی ہو جاتی ہیں اور فیصلہ مشکل ہوتا ہے۔ وہی اولاد جو پہلے بلا اور مصیبت تھی آنکھوں کی ٹھنڈک کا ذریعہ بنتی ہے:

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ. (الفرقان: ۷۴)	(جنت ان کو بھی ملے گی جو.....) اور جو کہتے ہیں کہ ہمارے پروردگار ہماری بیویوں اور ہماری اولاد سے ہم کو آنکھوں کی ٹھنڈک عنایت فرما۔

اور آخر وہ زمانہ آیا کہ ایک بدوی شاعر کو طنزاً کہنا پڑا:

غدا الناس مذ قام النبيّ الجواريا	پیغمبر کی بعثت کے بعد تو یہ کثرت ہے کہ سب لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں۔

رضاعت و حضانت اولاد کے جینے کا حق تسلیم کرانے کے بعد پہلا فرض یہ ہے کہ اس کی نشو و نما اور دودھ پلانے کے حق کو تسلیم کیا جائے اور جب تک وہ خود سے کھانے پینے کے قابل نہ ہو جائے اس کی خبر گیری کی جائے اور اس کے بعد اس کی نابالغی کے زمانہ تک اس کی نگرانی اور اس کے خرچ کی کفالت کی جائے۔ چنانچہ اسلام نے ان دونوں باتوں کا بوجھ والدین پر اور خاص طور سے جہاں تک مصارف کا تعلق ہے تنہا باپ پر رکھا ہے۔ رضاعت اور حضانت کے عنوان سے اس کی تشریح فقہ کی کتابوں میں مل سکتی ہے۔ مختصر یہ ہے کہ بچہ کو شیر خوارگی کے عالم میں ماں دودھ پلائے۔ اور اگر ماں نہ ہو یا ماں کسی قانون (طلاق وغیرہ) کے سبب سے شوہر سے علیحدہ ہو چکی ہو تو باپ پر اس کی رضاعت کا سامان کرنا اور اس کی اُجرت ادا کرنا فرض قرار دیا

گیا۔ اور اس شیر خوارگی کی پوری مدت بھی دو برس کی مقرر کر دی گئی ہے:

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ۭ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ (البقرۃ: ۲۳۳)	اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو برس دودھ پلائیں۔ یہ مدت اس کے لئے ہے جو چاہے کہ رضاعت کی مدت پوری کرے۔ اور لڑکے والے (باپ) پر ان دودھ پلانے والی ماؤں کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق واجب ہے۔

اور شیر خوارگی کے دنوں میں ماں کے علاوہ کوئی دوسری عورت بھی اگر اپنا دودھ پلا کر اس کی زندگی کا سہارا بنے تو اسلام ہی ایک مذہب ہے جس نے قانوناً اس کی اہمیت کو قبول کیا۔ اور اس کا درجہ بھی ماں کے قریب قریب قائم کر کے اس کی اولاد کو بھی بھائی اور بہن کے رشتہ کا منصب عطا کیا ہے۔ فرمایا:

وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ (النسآء: ۲۳)	اور تمہاری وہ مائیں تم پر حرام ہیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا اور تمہاری دودھ شریک بہنیں۔

دکھانا یہ ہے کہ ان ننھے بچوں کی نشوونما کی خدمت اسلام میں وہ عزت اور احترام رکھتی ہے کہ نسبی رشتہ داریوں کے قریب قریب پہنچ جاتی ہے۔

اوپر کی پہلی آیت میں جب دودھ پلانے والی کے کھانے اور کپڑے کی ذمہ داری باپ پر ڈالی گئی ہے تو ظاہر ہے کہ بچپن تک بچّہ کے کھانے کپڑے کی ذمہ داری بھی باپ ہی پر ہے۔ اور باپ نہ ہو تو دادا پر اور اس کے بعد درجہ بدرجہ ورثا پر ہے۔

تعلیم و تربیّت ظاہری اور جسمانی نشوونما کے بعد اولاد کی باطنی و روحانی تربیّت کا درجہ ہے۔ قرآنِ پاک نے ایک مختصر سے مختصر فقرہ میں جو صرف چار لفظوں سے مرکب ہے اس حق کو ایسے جامع طریقہ سے ادا کر دیا ہے کہ اس کی تفصیل و تشریح میں دفتر کے دفتر لکھے جا سکتے ہیں۔ فرمایا:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ	اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو اور
وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا (التحریم: ۶)	اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ۔

اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچانا بزرگِ خاندان کا فرض ہے۔ یہ آگ جہنم کی آگ ہے مگر اس سے مقصود اُن تمام برائیوں، خرابیوں اور ہلاکتوں سے اُن کی حفاظت ہے جو بالآخر انسان کو دوزخ کی آگ کا مستحق بنا دیتی ہیں۔ اس طرح گھر کے سردار پر اولاد کی اخلاقی تربیّت، دینی تعلیم اور نگہداشت کا فرض عائد کیا ہے۔

خدا نے اُن لوگوں کی تعریف فرمائی جو اپنے بیوی بچوں کے حق میں دعائے خیر کیا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بارِ الٰہا! تو اُن کو ظاہر و باطن کا حُسن، صورت و سیرت کی خوبی، اور دین و دنیا کی بھلائی دے کر میری آنکھوں کی ٹھنڈک بنا۔ فرمایا:

وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا ھَبْ لَنَا	اور (جنّت کے مستحق وہ بھی ہیں) جو
مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّۃَ	کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم
اَعْیُنٍ	کو ہماری بیویوں اور ہماری اولادوں
(الفرقان: ۷۴)	کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عنایت فرما۔

مقصود یہ ہے کہ اولاد کو نیک اور سعادت مند بنانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ اس کی نیکی و سعادت مندی کی دعا بھی مانگتے رہنا چاہیئے۔ ایک سورہ میں خدا ارشاد فرماتا ہے کہ نیک بندے جس طرح اپنے ماں باپ کے حق میں مغفرت کی دُعا مانگتے ہیں اور اُن کی خدمت کی

توفیق چاہتے ہیں اسی طرح وہ اپنی اولاد کے حق میں اپنی کوششوں کی کامیابی کی بھی دُعا کرتے ہیں:

وَاَصْلِحْ لِیْ فِیْ ذُرِّیَّتِیْ ۚ اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْكَ وَاِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ○ (الاحقاف:۱۵)	اور (اے خداوندا) میرے لئے میرے کاموں کو میری اولاد میں صالح بنا۔ میں اپنے گناہوں سے تیری طرف باز آیا اور میں فرمانبرداروں میں ہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اولاد کو ہر طرح صالح اور کارآمد بنانے کی تدبیر اور دُعا بھی ایک اچھے باپ کا فرض ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس باب میں وحیِ الٰہی کے مقصود کو تعلیمِ ربّانی پاکر مختلف طریقوں سے واضح فرمایا۔

ایک اعرابی اقرع بن حابس دربارِ نبویؐ میں آیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم حضرت حسنؓ کو پیار کر رہے تھے۔ اس کو یہ بات ادب اور وقار کے خلاف معلوم ہوئی۔ اس نے کہا "کیا آپؐ بچوں کو پیار کرتے ہیں! میرے دس بچے ہیں میں نے اُن میں سے کسی کو پیار نہیں کیا" حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس کی طرف نظر اٹھائی پھر فرمایا "جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔"[1] دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "اگر اللہ تعالےٰ نے تیرے دل سے رحم و شفقت کو نکال لیا ہے تو میں کیا کرسکتا ہوں۔"[2] ان دونوں کا منشا یہ ہے کہ بچّوں کے ساتھ محبّت و شفقت سے پیش

---

[1] و [2] یہ دونوں روایتیں صحیح بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الولد میں ہیں، نیز دیکھو ابو داؤد کتاب الادب باب قبلۃ الرجل ولدہ۔

آنا چاہیئے کہ جو اپنے بچوں پر رحم نہیں کرتا خدا اس پر رحم نہیں کرتا۔

ایک دفعہ اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے پاس ایک غریب عورت سائل بن کر آئی۔ اس کے ساتھ اس کی دو کمسن بچیاں بھی تھیں۔ اس وقت کاشانۂ نبوی میں ایک کھجور کے سوا کھانے کو کچھ اور نہ تھا۔ اُمّ المومنینؓ نے وہی ایک کھجور اس کے نذر کر دی۔ ماں کی مامتا نے گوارا نہ کیا کہ وہ کھجور آپ کھالے اور ان ننھی جانوں کو اس سدِّ رمق سے محروم رکھے۔ اس نے اس کھجور کے دو آدھے ٹکڑے کر کے دونوں بچیوں کو ایک ایک ٹکڑا دے دیا۔ حضرت عائشہؓ کو غریب ماں کی محبّت کے اس منظر کو دیکھ کر تعجب ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم جب تشریف لائے تو یہ واقعہ عرض کیا۔ حضورؐ نے سُن کر فرمایا جب کسی کو لڑکیوں کی کوئی مصیبت پیش آئے اور وہ اُن کے ساتھ نیکی کرے تو وہ دوزخ کی آگ سے اس کے لئے آڑ بن جائیں گی۔" نیز یہ بھی ارشاد فرمایا کہ "جو شخص دو لڑکیوں کی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ عمر تمیز کو پہنچ جائیں تو قیامت کے دن اُس کا یہ رتبہ ہو گا کہ وہ اور میں (دو انگلیوں کو جوڑ کر فرمایا) اس طرح ملے ہوئے ہوں گے[۱]۔" اس رتبہ کی بلندی کا کوئی اندازہ ہو سکتا ہے؟ ایک اور موقع پر آپؐ نے فرمایا کہ باپ کا اپنے بچّہ کو کوئی ادب سکھانا ایک صاع صدقہ سے بہتر ہے۔ ایک دفعہ یہ فرمایا کہ کوئی باپ اپنے بچّہ کو اس سے بہتر کوئی عطیّہ نہیں دے سکتا کہ وہ اس کو اچھی تعلیم دے[۲]۔

اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ وہ لڑکے کو لڑکی پر صرف جنس کے اختلاف کے سبب ترجیح نہ دے۔ ارشاد ہوا کہ جس کے لڑکی ہو اور وہ اس کو زندہ باقی رہنے دے اور اس کی بے توقیری نہ کرے اور نہ اس پر لڑکے کو ترجیح دے تو خدا اُسے جنت میں داخل فرمائے گا[۳]۔ باہم

---

[۱] صحیح مسلم کتاب البر والصلہ باب فضل الاحسان الی البنات [۲] ترمذی کتاب البر والصلہ باب ماجاء فی ادب الولد۔

[۳] سنن ابی داؤد کتاب الادب باب فضل من عال یتیما۔

لڑکوں میں بھی چھوٹے اور بڑے کے حقوق کا امتیاز شریعتِ محمدؐی میں قائم نہیں۔اسی لئے دُنیا کی اکثر شریعتوں اور قانونوں کے برخلاف اسلام میں بڑے اور چھوٹے کے امتیازی حقوق نہیں کہ ہر ایک کو ان میں سے اپنے باپ کے ساتھ برابر کی نسبت ہے یہاں تک کہ اگر لڑکوں میں سے کسی ایک کو بلا وجہ کوئی ایسا عطیہ دیا جائے جو دوسرے کو نہ ملا ہو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس کو ظلم سے تعبیر فرمایا۔ایک دفعہ کا قصّہ ہے کہ ایک صحابی نے اپنے لڑکوں میں سے کسی ایک کو ایک غلام ہبہ کیا اور چاہا کہ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی شہادت ہو۔انہوں نے خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر اپنی خواہش ظاہر کی۔دریافت کیا کہ کیا تم نے اپنے سب بچّوں کو ایک ایک غلام دیا ہے؟ عرض کی نہیں۔فرمایا "تو میں ایسے ظالمانہ عطیّہ پر گواہ نہ بنوں گا"[۱]۔

اس سے اُس قانون کی جو اسرائیلیوں، رومیوں، ہندوؤں اور دوسری پرانی قوموں میں رائج تھا اور اب بھی ہے کہ صرف بڑا لڑکا جائیداد کا مالک بنے یا اس کو کوئی ترجیحی حق ہو، اصلاح کر دی گئی اور باپ کی نظر میں اس کے تمام لڑکوں کو برابر کا منصب حاصل ہوا اور چھوٹوں پر ظلم کا جو مسلسل قانونی طریقہ جاری تھا اس کا خاتمہ ہوا۔

---

[۱] ابو داؤد کتاب البیوع باب فی الرجل یفضل بعض ولدہ فی النحل۔

حقوقِ زوجین

ماں باپ اور اولاد کے بعد قریب ترین تعلّقات کی فہرست میں تیسرا درجہ زن وشو کا ہے۔اور حقیقت یہ ہے کہ جس طرح والدین کے حقوق کی توضیح بوڑھوں کی تسکینِ روحانی کا ذریعہ اور اولاد کے حقوق کی تفصیل پر ننھے بچّوں کی ہستی اور زندگی کا مدار تھا اسی طرح حقوقِ زوجین کی تشریح پر جوانوں کے بلکہ ہر گھر کے عیش ومسرّت کا انحصار ہے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اسلام سے پہلے جو اخلاقی مذاہب قائم تھے ان سب میں عورت کو اور عورت ومرد کے ازدواجی تعلق کو بہت حد تک اخلاق وروح کی ترقّیِ مدارج کے لئے عائق ومانع تسلیم کیا گیا تھا۔ہندوستان میں بودھ، جین، ویدانت، جوگ اور سادھوپن کے تمام پیرو اسی نظریہ کے پابند تھے۔عیسائی مذہب میں تجرّد اور عورت سے بے تعلّقی ہی کمالِ روحانی کا ذریعہ[1] تھا۔ اسلام نے آکر اس نظریہ کو باطل کیا اور بتایا کہ اخلاق اور روح کی تکمیل جس قدر تجرّد میں ہوسکتی ہے اس سے بدرجہا زیادہ تعلّقِ ازدواج میں ممکن ہے کہ اخلاق نام حُسنِ معاملہ اور حُسنِ سلوک کا ہے۔

---

[1] انجیل قرنیتون ۷۔ ۸۔

جو کسی کا شوہر نہ ہو، جو کسی کی بیوی نہ ہو، جو کسی کا باپ نہ ہو، جو کسی کی ماں نہ ہو، جو کسی کا بھائی نہ ہو، اور نہ کسی کی بہن ہو، نہ کسی سے رشتہ ناتہ رکھے اس پر دنیا کے کیا فرائض عائد ہو سکتے ہیں؟ اور اخلاق کی تکمیل کے لیے اس کو کون سے فطری موقعے مل سکتے ہیں؟ پھر دنیا میں اس عفّت وعصمت کی موت جو اخلاقی قالب کی روح ہے اس تجرّد کی زندگی میں کتنی یقینی ہے۔ مذہبی تجرّد کی وہ پوری اخلاقی تاریخ جو دنیا کے کتب خانہ میں محفوظ ہے اس دعویٰ کی پوری شہادت ہے۔

اسلام نے نکاح کو ہر عمر کے مرد وعورت بلکہ آزاد و غلام ہر ایک کے لئے بہتر بلکہ خیر و برکت کا سبب قرار دیا۔ حکم ہوا:

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ ۭ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ (النور: ۳۲)

اور اپنے میں سے بن شوہر کی عورتوں کا خواہ وہ کنواری ہوں یا رانڈ) اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں میں سے صالحوں کا نکاح کر دیا کرو۔ اگر وہ غریب ہوں گے تو اللہ ان کو اپنی مہربانی سے غنی کر دے گا اور اللہ گنجائش رکھنے والا اور علم والا ہے۔

اس آیتِ پاک کا یہ فقرہ کہ "اگر وہ غریب وتنگ دست ہوں گے تو خدائے تعالیٰ اپنی مہربانی سے اُن کو غنی بنا دے گا" یہ معنی رکھتا ہے کہ ازدواجی زندگی خیر و برکت کا ذریعہ ہے مذہبی حیثیت سے تو اس بنا پر کہ اگر ایک کی تقدیر میں غربت ہوگی تو شاید دوسرے کی تقدیر میں فارغ البالی ہو۔ تو ایک کے ذریعہ سے دوسرے کو فائدہ پہنچے گا۔ اور دنیاوی لحاظ سے دو سببوں سے ایک تو یہ کہ ایک کام کرنے والے کے بجائے گھر میں دو کام کرنے والے ہوں گے، اور آگے اولاد کے ذریعہ

اور کام کرنے والے ہوں گے۔اس فلسفہ کا راز اہلِ دولت نہیں غریب ہی سمجھ سکتے ہیں خصوصاً مزدور اور کاشت کار۔دوسرا سبب یہ ہے کہ جب نکمے سے نکمے آدمی پر بھی بار پڑتا ہے تو وہ ہاتھ پاؤں ہلانے پر تیار ہوتا ہے۔اس لئے جو بے کاری سے غریب ہے بیوی کے بوجھ سے مجبور ہوگا کہ وہ کام کہیں سے پیدا کرے۔خصوصاً اس لئے کہ اس کی محبت اس کو بعض ایسے بڑے بڑے کاموں پر آمادہ کردے گی جس کے لئے وہ بغیر اس نشہ کے کبھی آمادہ نہ ہو سکتا۔آخر میں فرمایا کہ خدا بڑی وسعت والا ہے،اس کی گنجائش میں سب کچھ ہے اور پھر علم والا ہے،غیب کا علم اسی کو ہے اس لئے اس کا یہ حکم حکمت سے خالی نہیں۔

پھر اس فرض کو یہاں تک ضروری قرار دیا کہ فرمایا اگر کوئی غریب مسلمان کسی شریف خاتون کا خرچ نہ اٹھا سکتا ہو تو کسی مسلمان باندی ہی سے نکاح کرلے۔فرمایا:

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ	اور جو تم میں سے اس کی قدرت نہ
يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ	رکھتا ہو کہ شریف مومن عورتوں سے نکاح
مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ	کرسکے تو تمہاری ان مومن باندیوں میں
الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ	سے کسی سے نکاح کرے جو تمہارے
بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ	قبضہ میں ہو۔اور اللہ تمہارا ایمان زیادہ
(النسآء:۲۵)	جانتا ہے تم ایک دوسرے کے ہم جنس ہو۔

آیت کا آخری ٹکڑا خاص غور کے قابل ہے یہ فرمایا کہ اگر شریف و آزاد بیوی کا خرچ اٹھانے کی صلاحیت نہ ہو تو کسی باایمان باندی ہی سے نکاح کرلو۔اب یہاں سے دو شبہے پیش آتے ہیں ایک یہ کہ کیا نو مسلم باندیاں پرانے مسلمانوں کے برابر ہو سکتی ہیں؟ تو فرمایا کہ نئے اور پرانے مسلمان ہونے سے کچھ نہیں ہوتا خدا ہی کو معلوم ہے کہ کس کا ایمان زیادہ اچھا اور خدا کے نزدیک قبول ہے۔دوسرا شبہ

یہ تھا کہ یہ نومسلم عورتیں شریف خاندانوں کے ہم رتبہ کیسے ہوں گی۔ تو فرمایا یہ تفریق بھی غلط ہے ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے برابر ہے اور سارے بنی آدم ایک ہی جنس کے افراد ہیں۔

یہ اہتمام بیان اس لئے ملحوظ ہوا کہ غریب مسلمان ان وسوسوں میں پڑکر نکاح سے باز نہ رہیں۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ شخصی مسرت کی تکمیل میں کسی رفیقۂ حیات کی رفاقت کو اسلام نے کتنی اہمیت دی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اتزوّج النسآء فمن رغب عن سنتی فلیس منّی[1]

میں تو عورتوں سے نکاح کرتا ہوں۔ تو جس نے میرے طریقہ سے روگردانی کی تو وہ مجھ سے نہیں۔

اس نکاح کا مقصد صرف ایک فرض کو ادا کرنا نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کو اپنی رفاقت کے لئے اپنے ایک ہم جنس کی تلاش ہوتی ہے اور یہ خدا کی پیدا کی ہوئی فطرت ہے۔ چنانچہ زن و شو کے باہمی اخلاص و محبت کو خدا نے اپنی نشانیوں میں سے ایک قرار دیا ہے۔ فرمایا:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝

(الروم: ۲۱)

اور اس (خدا کی) نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہاری جنس سے تمہاری بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان کے پاس سکون پاؤ۔ اور تمہارے آپس میں پیار اور مہر پیدا کر دیا۔ بے شک اس میں سوچنے والوں کے لئے کتنی نشانیاں ہیں۔

---

[1] صحیح بخاری و مسلم کتاب النکاح۔

قرآنِ پاک نے ایک لفظ "سکون" سے بیوی کی رفاقت کی جس حقیقت کو ظاہر کیا ہے وہ اس ازدواجی تعلق کے فلسفہ کے پورے دفتر کو اپنے اندر سمیٹے ہے۔اس کا خلوت خانہ عالم کی کشاکش، دنیا کے حوادث اور مشکلات کے تلاطم میں امن، سکون اور چین کا گوشہ ہے۔اس لئے میاں بیوی کے باہمی تعلقات میں اتنی خوشگواری ہونی چاہیئے کہ اس سے اس تعلق کے وہ خاص اغراض جن کے لئے خدا نے اس زناشوئی کے تعلق کو اپنے عجیب وغریب آثارِ قدرت میں شمار کیا ہے پورے ہوں۔یعنی باہمی اخلاص اور پیار، مہرومحبت اور سکون اور چین. اگر کسی نکاح سے قدرت کے یہ اغراض پورے نہ ہوں تو اس میں دونوں یا دونوں میں سے ایک کا قصور ہے۔

میاں بیوی کی باہمی موافقت اور میل جول کو اسلام نے اتنی اہمیّت دی ہے کہ ان لوگوں کی سخت بُرائی کی ہے جو زن و شو کے باہمی میل جول اور مہر و محبت میں فرق ڈالیں۔ فرمایا:

فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ .... مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ (البقرة: ۱۰۲)	تو وہ (یہود) اُن سے وہ سیکھتے ہیں جس سے شوہر اور اس کی بیوی میں تفرقہ ڈالتے ہیں ..... اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

یہ باہمی میل جول کس طرح قائم رہ سکتا ہے؟ اس کی صورت صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ بیوی شوہر کی فرماں برداری اور شوہر بیوی کی دل جوئی کرے۔ زن و شو باہم اپنے اپنے حقوق کے لحاظ سے گو برابر ہیں لیکن مرد کو تھوڑا سا مرتبہ اس لئے زیادہ دیا گیا ہے کہ وہ عورت کی دیکھ بھال اور خبر گیری کرتا ہے اور اس کے جائز مصارف کا بوجھ اٹھاتا ہے اور دوسرے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے

مرد کو مشکلات میں پڑنے اور عورت کی حفاظت اور بچاؤ کی خاطر اس کو جسمانی صلاحیتیں عورتوں سے کچھ زیادہ دی ہیں۔ فرمایا:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ (النسآء: ۳۴)	مرد عورتوں کے سر دھرے ہیں اس لئے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر بزرگی دی ہے اور اس لئے کہ مرد اپنا مال ان پر خرچ کرتے ہیں۔ تو نیک بی بیاں فرماں بردار ہوتی ہیں اور غائبانہ نگہبانی کرتی ہیں کہ خدا نے ان کی حفاظت کی ہے۔

آیت کے اخیر حصہ کا یہ مطلب ذہن میں آتا ہے کہ نیک بی بیاں شوہر کی غیر حاضری میں اپنی اور شوہر کی عزت وآبرو اور مال کا خیال رکھتی ہیں اور ان کی یہی فطرت اللہ نے بنائی ہے۔ اللہ تعالےٰ نے ان میں اپنی عصمت کا خیال اور شوہر کی وفاداری کا فطری جذبہ پیدا کر کے اُن کو محفوظ کر دیا ہے۔ اب اگر کسی عورت سے اس کے خلاف ظہور میں آئے تو وہ فعل خلافِ فطرت ہے۔

مرد وعورت کو ایک دوسرے سے ملا کر اللہ تعالےٰ نے دونوں کے جنسی میلان کو ان کی معاشی اور معاشرتی کمی کی تکمیل کا ذریعہ بنایا ہے۔ اس لئے یہ ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم، ایک دوسرے کے پردہ پوش، ایک دوسرے کی زینت اور ایک دوسرے کی تکمیل کا ذریعہ ہیں۔ قرآن پاک کی بلاغت دیکھئے کہ اس نے ان سارے مطالب کو صرف ایک تشبیہ میں ادا کر دیا ہے:

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ (البقرۃ: ۱۸۷)

عورتیں تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی پوشاک ہو۔

اس پوشاک کے پردہ میں جیسا کہ ابھی کہا گیا بیبیوں معنی پوشیدہ ہیں۔ تم ان کے ستر پوش ہو وہ تمہارے لئے، تم ان کی زینت ہو وہ تمہاری، تم ان کی خوبصورتی ہو وہ تمہاری، تم اُن کی تکمیل کا ذریعہ ہو وہ تمہاری۔ یہی نکاح کے اغراض ہیں اور انہی اغراض کو پورا کرنا حقوقِ زوجین کو ادا کرنا ہے۔

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے عورت اور مرد کی تخلیق اور ان کے باہمی فرائض کی تشریح کی ہے۔ فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ○ (النسآء: ۱)

اے لوگو! اپنے اس پروردگار کا لحاظ کرو جس نے تم کو ایک ذات سے پیدا کیا اور اُسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا۔ اور ان دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو پھیلایا۔ اس خدا کا جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے اپنا حق مانگتے ہو اور رحموں (رشتوں) کا لحاظ رکھو اللہ تمہاری دیکھ بھال کر رہا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم ان آیات کو نکاح کے خطبوں میں عموماً پڑھا کرتے تھے۔ ان آیتوں میں انسانیت کے پہلے جوڑے کی پیدائش کا ذکر ہے جس سے کروڑوں مرد و عورت پیدا ہوئے۔ اور پھر اس واقعہ کو تمہید بنا کر یہ نتیجہ ذہن نشین کرایا ہے کہ تو پھر چاہیئے کہ ہم اپنے کاروبار اور معاملات میں اپنے اس خالقِ حقیقی کا اور ان رحموں (رشتوں)، کا لحاظ کریں جو ہماری خلقت کا ذریعہ اور واسطہ ہیں۔ غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ہر قسم کی قرابتوں اور رشتہ داریوں کی جڑ یہی نکاح ہے۔ یہ نہ ہوتا تو دنیا کا کوئی رشتہ پیدا نہ ہو سکتا۔ اس لئے دنیا کی ہر قرابت اور تعلق کا رشتہ اسی کے بدولت وجود میں آیا ہے۔ اور اس نقطۂ خیال سے بھی دنیا میں نکاح کی اہمیت بہت بڑی ہے کہ اسی سے ساری دُنیا کے عزیزانہ مہر و محبّت اور الفت و مودّت کا آغاز ہوتا ہے۔

نکاح کی اخلاقی غرض یہ ہے کہ مرد و عورت میں صلاح اور عفّت پیدا ہو۔ قرآن نے نکاح کے سلسلہ میں کہا ہے مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ[1] "پاک دامنی کے لئے، نہ کہ شہوت رانی کے لئے"۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایک دفعہ جوانوں کو خطاب کر کے فرمایا "اے جوانوں کے گروہ! تم میں نکاح کی جس کو طاقت ہو وہ نکاح کر لے کہ اس سے نگاہیں نیچی اور شرمگاہیں محفوظ رہیں گی۔ اور جس کو اس کی استطاعت نہ ہو وہ روزہ رکھے کہ اس سے شہوت کا زور ٹوٹتا ہے"[2]۔

نکاح کے ان اغراض کا پورا ہونا اس پر موقوف ہے کہ دونوں میں صلح اور یک جہتی کا رجحان نمایاں رہے اور ہر موقع پر جہاں تعلقات کے شیشہ کو ٹھیس لگنے کا ڈر ہو باہم صلح کے لئے آمادہ رہنا چاہیئے۔ اور اصلاحِ حال کے لئے دونوں کو برابر کوشش کرنا چاہیئے۔ اسی لئے زوجین میں مناقشہ پیش آنے کی صورت میں بھی اصلاحِ حال کی بار بار تاکید کی گئی ہے فرمایا اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا[3] "اگر یہ شوہر اصلاح چاہیں"۔ وَاِنْ تُصْلِحُوْا وَتَتَّقُوْا[4] "اگر اصلاح کرو اور تقویٰ کرو"۔ کہیں اسی

---

[1] المائدہ: ۵ [2] ابن ماجہ باب النکاح [3] البقرہ: ۲۲۸ [4] النساء ۱۲۹

اصلاح کا نام اللہ کی حدوں کو قائم کرنا کہا گیا ہے:

اَنْ یُّقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ (البقرۃ: ۲۳۰) یہ کہ میاں بی بی دونوں اللہ کی حدوں کو قائم رکھیں گے۔

جاہلیت میں دستور تھا کہ مرد قسم کھا لیتے تھے کہ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ حسن سلوک اور نیک برتاؤ نہیں کریں گے اور جب انہیں کوئی سمجھاتا تو کہتے کہ ہم قسم کھا چکے ہیں، مجبور ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کی زبانِ مبارک سے ایسے لوگوں کو فرمایا:

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰہَ عُرْضَۃً لِّاَیْمَانِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَیْنَ النَّاسِ ؕ وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ○ (البقرۃ: ۲۲۴)

اور خدا کو اپنی قسموں کا ہتھکنڈا نہ بناؤ کہ سلوک نہ کرو اور تقویٰ اور لوگوں کے درمیان صلح جوئی نہ اختیار کرو اور اللہ سنتا اور جانتا ہے۔

اس آیت میں اس کے بعد عورتوں سے قسم کھا کر علیحدگی اختیار کر لینے اور طلاق دینے کا ذکر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان نصیحتوں کا زیادہ تر تعلق زن و شو کے معاملہ سے ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مرد کو عورت کے ساتھ حسن سلوک (بر)، پرہیزگاری کا برتاؤ (تقویٰ)، اور صلح جوئی اور درستی کا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔

نیک بیویوں کے اوصاف قرآن پاک نے یہ بتائے ہیں:

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ (النساء: ۳۴)

تو نیک بیویاں شوہروں کی فرماں بردار ہوتی ہیں اور شوہر کے پیٹھ پیچھے شوہر کے مال و دولت اور عزت و آبرو کی حفاظت کرتی ہیں۔

گویا عورت کے فرائض یہ ہیں کہ وہ اپنے مردوں کی فرماں بردار رہیں۔ اُن کے مال و دولت اور ملکیت کی جن کی حفاظت اُن کے سپرد ہے، پوری نگرانی رکھیں۔ اور ان کی عزّت و آبرو کی جو خود اُن کی عزّت و آبرو ہے شوہر کی غیر حاضری میں بھی حفاظت کریں۔ مختصر لفظوں میں عورت کے سہ گانہ فرائض اطاعت، سلیقہ مندی اور عصمت و عفّت ہیں۔ حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ تقویٰ کے بعد صالح عورت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں کہ شوہر اس کو جو کہے وہ مانے، شوہر جب اس کی طرف دیکھے تو وہ اس کو خوش کر دے اور اگر شوہر اس کو قسم دے کر کچھ کہے تو وہ اس کی قسم پوری کر دے اور شوہر گھر پر نہ ہو تو اپنے آپ کی اور اس کے مال کی پوری حفاظت کرے[1]۔

زن و شو کے باہمی حقوق کی تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں ان الفاظ میں فرمائی:

> لوگو! عورتوں کے حق میں میری نیکی کی وصیّت کو مانو کہ یہ تمہارے ہاتھوں میں قید ہیں تم سوا اس کے کسی اور بات کا حق نہیں رکھتے لیکن یہ کہ وہ کھلی بے حیائی کا کام کریں۔ اگر ایسا کریں تو ان کو خواب گاہ میں علیحدہ کر دو اور ان کو ہلکی مار مارو۔ تو اگر وہ تمہاری بات مان لیں تو پھر ان پر الزام لگانے کے پہلو نہ ڈھونڈو۔ بے شک تمہارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے۔ تمہارا حق تمہاری عورتوں پر یہ ہے کہ وہ تمہارے بستر کو دوسروں سے پامال نہ کرائیں جن کو تم پسند نہیں کرتے اور نہ تمہارے گھروں میں ان کو آنے کی اجازت دیں جن کا آنا تم کو پسند نہیں۔ اور ہاں! ان کا حق تم پر یہ ہے کہ ان کے پہنانے اور کھلانے میں نیکی کرو[2]۔

ایک اور موقع پر ایک شخص نے آکر دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! بیوی کا حق شوہر پر کیا ہے؟

---

[1] و [2] ابن ماجہ: کتاب النکاح۔

فرمایا جب خود کھائے تو اس کو کھلائے، جب خود پہنے تو اس کو پہنائے، نہ اس کے منہ پر تھپڑ مارے، نہ اس کو برا بھلا کہے اور نہ گھر کے علاوہ اس کی سزا کے لئے اس کو علیحدہ کرے۔[1] دوسری طرف آپؐ نے عورتوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے شوہروں کی پوری اطاعت کریں۔ یہاں تک فرمایا کہ "اگر خدا کے سوا کسی اور کو سجدہ کرنے کا میں کسی کو حکم دیتا تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔" آپؐ نے یہ طریقۂ تعبیر شوہر کی اطاعت کی اہمیت کے لئے اختیار فرمایا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اسلام میں خدا کے سوا کسی اور کو سجدہ جائز نہیں۔

ایک مشہور حدیث میں آپؐ نے فرمایا:

خیرکم خیرکم لاھلہ — تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنی
(ترمذی و دارمی و ابن ماجۃ) — بیویوں کے لئے سب سے بہتر ہے۔

خیارکم خیارکم لنسآءھم — تم میں سب سے بہتر وہ ہیں جو اپنی
(ترمذی) — بیویوں کے لئے بہتر ہیں۔

انسان کے بہتر اور خوب ہونے کی یہ ایک ایسی پہچان بتا دی گئی ہے کہ اس آئینہ میں ہر شخص اپنا چہرہ آپ دیکھ سکتا ہے۔ جو اپنوں کے ساتھ انصاف اور احسان نہیں کر سکتا وہ دوسروں کے ساتھ کیا کر سکتا ہے کیونکہ نیکی گھر سے شروع ہونی چاہیئے۔

ایک صحابی بڑے عابد و زاہد تھے لیکن وہ اپنی بیوی کی طرف توجہ نہیں کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے ان کا یہ حال سُنا تو ان کو بلوا کر فرمایا:

ولزوجك علیك حقًّا (بخاری۔ کتاب النکاح) — اور تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے۔

اسلام سے پہلے جاہلیت کے زمانہ میں بیویوں کی کوئی قدر و منزلت نہ تھی۔ وہ ہر وقت معمولی معمولی

---

[1] ابن ماجہ، کتاب النکاح۔

قصوروں پر ماری پیٹی جا سکتی تھیں۔حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے اپنی بیوی کو ڈانٹا تو اس نے بھی برابر کا جواب دیا۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ" ہم لوگ اسلام سے پہلے عورتوں کو کسی شمار وقطار میں نہیں سمجھتے تھے۔اسلام آیا تو اس نے ان کے بارہ میں احکام اتارے اور ان کے حق مقرر کئے"[1]

اسلام نے ان کی قدر و منزلت کو یہاں تک بڑھایا کہ ان کو قانوناً مردوں کے دوش بدوش کھڑا کر دیا اور آپس کے قانونی حقوق میں اُن کو برابر کا درجہ عطا کیا۔البتہ اخلاقاً رتبہ میں مردوں کو تھوڑی سی اعزازی برتری دی گئی۔ارشاد ہوا:

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ط (البقرة: ۲۲۸)	اور عورتوں کا حق دستور کے مطابق مردوں پر ویسا ہی ہے جیسا مردوں کا عورتوں پر اور مردوں کو ان پر ایک منزلت حاصل ہے۔

لیکن یہ منزلت بھی ان کو بے وجہ نہیں دی گئی ہے۔یہ اس لئے ہے تاکہ وہ عورتوں کی نگرانی اور نگہبانی کا فرض انجام دے سکیں یعنی وہ گویا اپنی گھریلو عدالت کے اعزازی صدر بنائے گئے ہیں۔یہ نکتہ اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ اوپر کی آیت میاں بیوی کے خانگی جھگڑوں کے دور کرنے کے سلسلے میں ہے۔گھر کے روزمرہ کے مناقشوں کا فیصلہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ دونوں کے قانونی حقوق یکساں ماننے کے ساتھ ساتھ شوہر کو اعزازی فوقیت کا مرتبہ دیا جائے تاکہ وہ اپنے گھر کے نظام کو اچھی طرح چلا سکے۔

اس اعزازی منصب کے لئے شوہر کا انتخاب بھی بے وجہ نہیں۔قرآنِ پاک نے اس کی مصلحتیں بھی بتا دی ہیں۔فرمایا:

---

[1] صحیح بخاری، باب موعظۃ الرجل لحال زوجہا و تفسیر سورہ تحریم۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ	مرد عورتوں کے نگران ہیں اس سبب
بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعْضَھُمْ عَلٰی	سے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر بڑائی
بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِہِمْ	دی ہے۔اور اس لئے کہ انہوں نے اپنا
(النسآء:۳۴)	مال خرچ کیا۔

یعنی مردوں کی اس اعزازی ترجیح کا ایک سبب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فطری طور سے مردوں کو عورتوں پر جسم وطاقت اور عقل وفراست وغیرہ میں جسمانی و ذہنی فوقیت اور بڑائی عطا کی ہے طبّی تحقیقات، انسانیت کی پوری تاریخ اور روزانہ کے مشاہدے دم بدم اس کی تائید میں ہیں اسی لئے اسی کو اس صدارت کا حق فطرۃً ملنا چاہیئے۔دوسرا سبب یہ ہے کہ اسلام نے دَین مہر نان ونفقہ اور پرورش اولاد وغیرہ خانگی معاملات کی ہر قسم کی مالی ذمہ داری مرد پر عائد کی ہے اور وہی اس بوجھ کو اپنی گردن پر اٹھائے ہوئے ہے اس لئے انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس کو اپنے گھر کا حاکم اور صدر نشین بنایا جائے تاکہ گھر کا نظام درست اور آپس میں تعلقات کی خوش گواری قائم رہے۔

اکثر عورتوں میں ضد اور ہٹ ہوتی ہے جو شاید ان کی فطری کمزوری یا عدم تربیت کا نتیجہ ہو۔بعض مرد چاہتے ہیں کہ ان کی ضد اور ہٹ کے مقابلہ میں سختی اور درشتی سے کام لے کر ان کی یہ ٹیڑھ نکال دیں۔آپ نے اُن کو ایک نہایت عمدہ تشبیہ دے کر نصیحت فرمائی کہ "عورتوں کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرو کہ ان کی پیدائش پسلی سے ہوئی جس سے ان کے اسی ٹیڑھاپن کے ساتھ تم کام لے سکو تو لے سکتے ہو اور اگر اس کے سیدھی کرنے کی فکر کروگے تو تم اس کو توڑ ڈالوگے"[1]۔

آپ نے مردوں کو بیویوں کے معاملہ میں خوش اور قانع وراضی رہنے کا ایک نہایت عمدہ نسخہ

---

[1] صحیح بخاری ومسلم کتاب النکاح۔

بتایا۔ فرمایا "اپنی بیوی میں کوئی بُرائی دیکھ کر اس سے نفرت نہ کرو کہ غور کرو گے تو اس میں کوئی دُوسری اچھی بات بھی نکل آئے گی[1]" یہ نصیحت حقیقت میں قرآن پاک کی اس آیت کی تعمیل ہے:

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ۝ (النسآء: ۱۹)	اور بیویوں کے ساتھ معقول طریقہ سے گذران کرو۔ اگر تم کو وہ نہ بھائیں تو ممکن ہے کہ تم کو ایک چیز پسند نہ آئے اور خدا نے اس میں بہت خوبی رکھی ہو۔

اسلام نے انسانی زندگی کی مشغولیتوں کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے، خانگی اور بیرونی۔ خانگی مشغولیتوں کی ذمہ داری عورت پر اور بیرونی مشغولیتوں کا بارِ گراں مرد کے کندھوں پر رکھا ہے۔ اور اس طرح انسانی زندگی کے اندرونی اور بیرونی کاموں کی عظیم الشان عمارت کو ایک دوسرے کے تعاون، موالات، اور یک جہتی کے ستونوں پر قائم کیا ہے۔ اپنے لئے خود روزی کمانا اور سرمایہ بہم پہنچانا عورت کا نہیں بلکہ مرد کا فرض قرار دیا ہے۔ اور مرد پر یہ واجب کیا ہے کہ وہ عورت کے نان و نفقہ اور ضروریات کا کفیل ہو۔ اگر وہ ادا نہ کرے تو حکومتِ وقت کے ذریعہ عورت کو اس کی وصولی کا حق حاصل ہے۔ اور اگر اس پر بھی مرد نہ دے تو بیوی کو اس سے علیحدگی کے دعویٰ کا اختیار حاصل ہے[2]۔ انتہا یہ ہے کہ خاص خاص حالات میں عورت چاہے تو مرد سے اس کے بچّہ کو دودھ پلانے کا معاوضہ بھی لے سکتی ہے جس کی تفصیلات قرآن میں مذکور ہیں۔

اگر کوئی مرد بخالت سے اپنی بیوی اور اولاد کی جائز ضرورتوں کے لئے اپنی حیثیت سے کم دے تو عورت کو حق ہے کہ وہ شوہر کی لاعلمی میں اس کی دولت سے اس کی حیثیت کے مطابق بقدرِ ضرورت لے لیا کرے۔ فتحِ مکّہ کے دن ابوسفیان کی بیوی ہند آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت

---

[1] صحیح مسلم کتاب النکاح باب الوصیۃ بالنساء۔ [2] اس اختیار کی تشریح میں فقہا مختلف ہیں۔ تفصیلات کے لئے فقہ کی کتابوں میں کتاب النفقہ دیکھنا چاہئے۔ نیز دیکھو نیل الاوطار شوکانی جلد ۶ صفحہ ۲۶۳ مصر۔

اقدس میں آکر عرض پرداز ہوئی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ! ابوسفیان بخیل آدمی ہیں وہ مجھے میری اور میرے بچوں کی ضرورت سے کم دیا کرتے ہیں لیکن یہ کہ میں ان کے مال میں سے ان کی لاعلمی میں کچھ لے لوں؟ فرمایا تم قاعدہ کے مطابق اتنا لے سکتی ہو جو تم کو اور تمہارے بچوں کو کافی ہو۔[1]

ایک مشہور حدیث ہے جس میں مرد اور عورت کے باہمی حقوق کی ذمہ داری چند ایسے مختصر لفظوں میں ظاہر کی گئی ہے جن کی تفصیل ایک دفتر میں سما سکتی ہے۔ فرمایا تم میں سے ہر ایک اپنی رعایا کا نگہبان ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی نسبت بازپرس ہوگی۔ ... مرد اپنی بیوی بچوں کا رکھوالا ہے اس سے اس کی پوچھ ہوگی اور بیوی اپنے شوہر کے گھر کی نگران ہے اس سے اس کی پوچھ ہوگی۔[2] نبوت کے ان دو معجزانہ فقروں میں کیا کچھ نہیں کہہ دیا گیا۔

مرد کو کس عورت کے مارنے کا اختیار دیا گیا ہے قرآن پاک میں ایک آیت ہے جس میں مرد کو اختیار دیا گیا ہے کہ بعض حالتوں میں وہ عورت کو مار پیٹ بھی سکتا ہے۔ وہ آیت یہ ہے:

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ	اور جن بیویوں کے "نشوز" کا تم کو ڈر ہو
فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی	تو ان کو سمجھاؤ اور خوابگاہوں میں ان
الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ	سے علیحدگی برتو اور ان کو مارو تو اگر وہ
اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْهِنَّ	تمہارا کہنا مان لیں تو پھر ان پر راہ مت
سَبِیْلًا (النسآء: ۳۴)	تلاش کرو۔

لغت میں "نشوز" کے معنی "اُٹھ جانے" کے ہیں اور عورت کے حق میں اس کے اصطلاحی معنی جو ہیں وہ مفسر ابن جریر طبری کے الفاظ میں حسب ذیل ہیں:

---

[1] صحیح بخاری باب اذا لم ینفق الرجل صفحہ ۸۰۔ [2] بخاری جلد اول صفحہ ۹۰، باب قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِیْكُمْ۔

ومعنى ذلك اذا رأيتم منهن ما تخافون ان ينشزن عليكم من نظر الى ما لا ينبغي لهن ان ينظرن اليه ويدخلن ويخرجن واستريبتم بامرهن۔ (تفسیر طبری ج ۵۔ ص ۳۸)

اور اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تم ان عورتوں کی وہ حالت دیکھو جس سے تم کو ان کے "نشوز" کا ڈر ہو یعنی ادھر دیکھنا جدھر ان کو دیکھنا نہیں چاہیئے اور وہ آئیں اور نکل جائیں اور تم کو ان کی بابت شک ہو جائے۔

عن محمد بن كعب القرظي اذا رأى الرجل تقصيرها في حقه في مدخلها ومخرجها قال يقول لها بلسانه قد رأيتك منك كذا وكذا فانتهى

(تفسیر طبری ج۵۔ ۳۸۔ مصر)

محمد بن کعب قرظی سے ہے جب مرد دیکھے کہ عورت (گھر) سے باہر آنے جانے میں اس کے حق میں قصور کر رہی ہے تو اس سے زبان سے کہے کہ میں نے تجھ سے یہ حرکت دیکھی یہ دیکھی تو اب باز آجا۔

فقہ کی کتابوں میں ہے:

الناشزة هي الخارجة عن منزل زوجها المانعة نفسها منه

(عالمگیری۔ نفقات)

نشوز والی عورت وہ ہے جو اپنے شوہر کے گھر سے باہر نکل جائے اور اپنے آپ کو اس کے سپرد نہ ہونے دے۔

غرض یہ کہ ناشزہ عورت وہ ہے جس میں بداخلاقی کی بعض مشتبہ علامتیں پائی جائیں۔ کچھ مفسروں نے اس کو اور وسعت دی ہے اور بتایا ہے کہ ناشزہ وہ عورت ہے جو اپنے شوہر پر بلندی چاہے، اس کا حکم نہ مانے، اس سے بے رُخی کرے اور اس سے بُغض رکھے[2]۔

---

[1] اصل متن تفسیر میں واستبریتم غالباً غلط چھپا ہے۔ [2] تفسیر ابن کثیر۔

میرے خیال میں یہ دونوں تفسیریں درست ہیں اور درحقیقت پوری آیت پڑھنے سے نشوز کے معنی آپ کھل جاتے ہیں۔آیتِ مذکور پوری یہ ہے:

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ وَالّٰتِىْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِى الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا (النساء: ۳۴)	مرد عورتوں کے نگران ہیں (ایک اس لئے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر بڑائی دی ہے اور (دوسرے) اس لئے کہ مرد اپنا مال (اُن پر) خرچ کرتے ہیں۔تو نیک بیویاں فرمانبردار ہوتی ہیں اور (شوہر کے) پیٹھ پیچھے (شوہر کے گھر بار اور عزت وآبرو کی) حفاظت کرتی ہیں کہ اللہ نے ان کی (یعنی عورتوں کی) حفاظت کی ہے۔اور جن کے نشوز کا تم کو ڈر ہو تو ان کو سمجھاؤ اور ان کو خواب گاہوں میں علیحدہ کر دو اور ان کو مارو۔تو اگر وہ تمہارا کہنا مان لیں تو پھر اُن پر راستہ تلاش نہ کرو۔

اس آیتِ پاک میں مرد کی ترجیح کی جو دو باتیں بیان کی ہیں ان کے نتیجہ یہ بتایا ہے کہ نیک بیویاں وہ ہیں جو اپنے شوہروں کی فرمانبردار ہیں اور ان کے پیٹھ پیچھے ان کے گھر بار اور عزّت وآبرو کی حفاظت کرتی ہیں۔اس کے بعد ہے کہ اب جس عورت سے تمہیں "نشوز" کا ڈر ہو تو اس کو پہلے سمجھاؤ، نہ مانے تو خلوت میں اس سے کنارہ کرو یا اس سے بات کرنا چھوڑ دو۔اس پر

ے اس آیت کی یہ تفسیر قرآن پاک کے اشارات اور احادیث کی تصریحات سے معلوم ہوتی ہے۔

بھی نہ مانے تو اس کو ذرا مارو۔اب بھی اگر کہا مان لے تو پھر اس کو ستانے یا طلاق وغیرہ دینے کے لئے حیلہ اور بہانہ مت ڈھونڈو۔

اب جب اوپر میں بتا چکا کہ مردوں کو عورتوں کی نگرانی اور دیکھ بھال کا حق حاصل ہے۔پھر یہ بھی کہا جا چکا کہ نیک بیویاں وہ ہیں جو شوہروں کی فرمانبردار ہیں اور شوہروں کے پیچھے ان کے گھر بار مال و دولت اور عزّت و آبرو کی حفاظت کرتی ہیں اور اس کے بعد یہ ہے کہ اگر تمہیں عورت کے "نشوز" کا ڈر ہو تو یہ یہ کرو۔اس سے معلوم ہوا کہ عورت کا نشوز یہ ہے کہ اس کے جو دو فرض پہلے بتائے گئے ہیں یعنی شوہر کی فرمانبرداری اور شوہر کے پیچھے اس کے گھر بار اور عزّت و آبرو کی حفاظت جو عورت ان دونوں کو یا ان دونوں میں سے کسی ایک فرض کو بھی ادا نہیں کرتی وہی ناشزہ ہے اور ایسی ہی عورت کی تنبیہ کی اجازت دی گئی ہے۔

"شوہر کی عزّت و آبرو کی حفاظت" کے الفاظ سے جس طرف اشارہ ہے اس کی تصریح احادیث میں موجود ہے۔آپؐ نے فرمایا"سب سے بہتر عورت وہ ہے کہ جب مرد اس کو دیکھے تو خوش ہو جائے اور جب کوئی حکم دے تو وہ مان لے اور جب شوہر گھر پر موجود نہ ہو تو وہ اپنی جان اور اس کے مال کی حفاظت کرے"۔"اپنی جان کی حفاظت" سے مقصود عفّت و عصمت ہے۔

حجّۃ الوداع کے خطبہ میں عورتوں کے حقوق کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو فقرے ہیں ان میں نشوز کے اس معنی کی پوری تصریح ہے۔صحیح مسلم میں ہے:

واتقوا اللّٰہ فی النساء فانّھنّ	عورتوں کے بارہ میں خدا سے ڈرو کہ
عندکم عوان ولکم علیھن	وہ تمہارے بس میں ہیں۔تمہارا اُن پر
ان لا یوطین فرشکم احدا	یہ حق ہے کہ وہ تمہارے بستر کو کسی
تکرھونہ فان فعلن فاضربوھنّ	سے نہ رندوائیں جس کو تم ناپسند

ضربا غیر مبرح | کرتے ہو۔ اگر وہ ایسا کریں تو ان کو اتنا مارو جو تکلیف دہ نہ ہو۔

ابنِ ماجہ میں یہ الفاظ ہیں:

استوصوا بالنساء خیرا فانھن	عورتوں کے ساتھ نیک سلوک کرنے
عندکم عوان لیس تملکون	کے بارہ میں میری وصیت کو قبول کرو۔
منھن شیئا غیر ذلک الا ان	وہ تمہارے قبضہ میں ہیں تم کو اس کے
یاتین بفاحشۃ مبینۃ فان	سوا ان پر کوئی اختیار نہیں مگر یہ کہ وہ
فعلن فاھجروھن فی المضاجع	کوئی کھلی بے حیائی کا کام کریں تو اگر
واضربوھن ضربا غیر مبرح	ایسا کریں تو ان کو خواب گاہوں میں
فان اطعنکم فلا تبغوا علیھن	علیحدہ کر دو اور ان کو اتنا ہی مارو جو
سبیلا	تکلیف دہ نہ ہو۔ تو اگر وہ تمہارا کہا
(کتاب النکاح)	مان لیں تو اُن پر کوئی راستہ نہ ڈھونڈو۔

"شوہر کے بستر کو روندانے" کا کنایہ اس طرف ہے کہ ایسے لوگ اس کے گھر میں آنے جانے نہ پائیں جن کا آنا جانا شوہر کو ناگوار یا مشکوک معلوم ہو۔ اور "کھلی بے حیائی" سے جدھر اشارہ ہے وہ چھپا نہیں لیکن بعض نے اس میں بھی توسیع کی ہے یعنی عورت کی نافرمانی اور بدزبانی اور مشتبہ[1] چال چلن سب کو فاحشۃ مبینہ کی تفسیر میں داخل کیا ہے۔

الغرض آخری درجہ پر عورت کی تنبیہ کی یہ اجازت خاص حالات میں ہے اور شرع

---

[1] یہ پیشِ نظر رہے کہ یہ خانگی سزا صرف مشکوک و مشتبہ حالت میں عورت کی اصلاح کے لئے ہے ورنہ ثبوت کی صورت میں اس جرم کی سزا سنگساری یا تازیانہ ہے جس کا اجرا قاضی کا فرض ہے۔ تفسیر سورۃ النساء: ۱۹۔

کی تصریح ہے کہ یہ "ضرب غیر مبرح" یعنی ایسی مار ہو جس سے عورت کے کسی عضو کو نقصان نہ پہنچے۔ بلکہ یہاں تک تصریح ہے کہ اس سے مقصود مسواک وغیرہ سے مارنا ہے[1] جس سے تنبیہ کے سوا کوئی چوٹ نہیں آسکتی ورنہ عورتوں کو عام طور سے یوں مارنا اسلامی تہذیب کے خلاف ہے۔ یہ زمانہ جاہلیت کا دستور تھا جس کی اسلام نے اصلاح کی ہے۔ ایاس بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ حکم دیا کہ "خدا کی بندیوں (اپنی بیویوں) کو نہ مارا کرو" تو حضرت عمرؓ نے آکر عرض کی کہ "یا رسول اللہ! بیویاں اپنے شوہروں پر دلیر ہوگئیں" تو آپؐ نے مارنے کی رخصت عطا کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی عورتیں اہل بیتِ نبویؐ کے سامنے اپنے شوہروں کی شکائتیں لے کر آئیں۔ یہ دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "آلِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گرد بہت سی عورتیں چکر کاٹتی رہیں جو اپنے اپنے شوہروں کی شکائتیں لے کر آئی تھیں۔ یہ (یعنی بیویوں سے ایسی بدسلوکی کرنے والے) تم میں سے اچھے لوگ نہیں"[2]

ایک صحابیہ نے اپنے نکاح کے متعلق آپؐ سے مشورہ لیا اور ایک شخص کے پیغام کا ذکر کیا۔ آپؐ نے فرمایا "وہ اپنا ڈنڈا اپنے کندھے سے نیچے نہیں اتارتا"[3] یعنی وہ مار پیٹ کیا کرتا ہے اور ذرا ذرا سی بات پر خفا ہوتا رہتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے اس کے اس فعل کو ناپسند فرمایا۔ ایک صحابی نے آکر شکایت کی کہ "یا رسول اللہ! میری بیوی بدزبان ہے"۔ فرمایا "طلاق دے دو" عرض کی "اس سے میری اولاد ہے اور مدت سے میرے ساتھ ہے" فرمایا "تو اس کو سمجھایا کرو، اس میں صلاحیت ہوگی تو قبول کرے گی لیکن اپنی بیوی کو لونڈی کی طرح مارا نہ کرو"[4] ایک دوسرے موقع پر فرمایا "کوئی اپنی بیوی کو غلام کی طرح کوڑے نہ مارا کرے، یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ ایک وقت کوڑے مارے اور دوسرے وقت اس سے ہم بستر ہو"[5]

---

[1] تفسیر طبری جلد ۵ ص۲۸۔ [2] مصوبت ابوداؤد و ابن ماجہ و دارمی۔ [3] صحیح مسلم باب المطلقہ ثلثاً۔ [4] مشکوٰۃ کتاب النکاح باب عشرۃ النساء بحوالہ ابوداؤد۔ [5] مشکوٰۃ بحوالہ صحیح بخاری و مسلم۔

اہلِ قرابت کے حقوق

ماں باپ، اولاد اور زن و شو کے بعد درجہ بدرجہ دُوسرے اہلِ قرابت کا حق ہے۔ عربوں کے محاورہ میں اس کا نام "صلہ رحم" ہے، محمّد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی اخلاقی تعلیم میں صلہ رحم اور حقوقِ قرابت کی اہمیت دُنیا کے تمام مذاہب سے زیادہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ وحیِ محمدیؐ میں اس کی طرف بار بار توجہ دلائی گئی ہے۔ قرآنِ پاک میں کم ازکم بارہ آیتوں میں اس کی صریح تاکید ہے اور اس کو انسان کا احسان نہیں بلکہ اس کا فرض اور حق بتایا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ (الروم: ۳۸)	تو قرابت دار کو اس کا حق ادا کر۔
وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ (بنی اسرائیل: ۲۶)	اور قرابت والے کو اس کا حق ادا کر۔

دوسری جگہ یہ تصریح فرمائی کہ مال و دولت کی محبت اور ذاتی ضرورت اور خواہش کے باوجود صرف خدا کی مرضی کے لیے خود تکلیف اُٹھا کر اپنے قرابت مندوں کی امداد اور حاجت روائی اصل نیکی ہے:

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى (البقرۃ: ۱۷۷)	اور اصل نیکی اس کی ہے جس نے مال کو اسکی محبت پر قرابت مندوں کو دیا۔

والدین کے بعد اہلِ قرابت ہی ہماری مالی امداد کے مستحق ہیں۔ فرمایا:

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ (البقرۃ: ۲۱۵) — کہدے اے پیغمبر! کہ فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو تو وہ ماں باپ اور رشتہ داروں کیلیے۔

ماں باپ کے بعد درجہ بدرجہ دُوسرے رشتہ داروں کے ساتھ حُسنِ سلوک خدائے تعالیٰ کے اُن خاص احکام میں ہے جن کا انسان سے عہد لیا گیا:

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِى الْقُرْبٰى (البقرۃ: ۸۳) — (اور بنی اسرائیل سے عہد لیا گیا کہ خدا ہی کو پوجنا) اور ماں باپ اور رشتہ دار کے ساتھ نیکی کرنا۔

سورۂ نحل میں اہلِ قرابت کی امداد کو عدل اور احسان کے بعد اپنا تیسرا خاص حکم بتایا:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِى الْقُرْبٰى (النحل: ۹۰) — بے شک اللہ انصاف اور حُسنِ سلوک اور قرابت دار کو دینے کا حکم کرتا ہے۔

ایک مسلمان کی دولت کے بہترین مستحق والدین کے بعد اس کے قرابت والے ہیں فرمایا:

قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ (البقرۃ: ۲۱۵) — کہدے اے پیغمبر کہ فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو تو وہ اپنے ماں باپ قرابت والوں، یتیموں اور غریبوں کے لیے۔

اگر کسی قرابت مند سے کوئی قصور ہو جائے تو اہلِ دولت کو زیبا نہیں کہ وہ اسکی سزا میں اپنی امداد کا ہاتھ اس سے روک لیں۔ ارشاد ہوا:

وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ — اور جو لوگ تم میں بڑائی اور کشایش

وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِي الْقُرْبٰى	والے ہوں وہ قرابت مندوں اور
وَالْمَسٰكِيْنَ (النور: ۲۲)	محتاجوں کے دینے کی قسم نہ کھا بیٹھیں ۔

خدا کی خالص عبادت اور توحید اور ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کے بعد تیسری چیز اہلِ قرابت کے ساتھ نیکی ہے ۔ فرمایا:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ	اور اللہ کی عبادت کرو اور کسی چیز
شَيْـًٔـا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ	کو اس کا ساتھی نہ بناؤ اور ماں باپ
بِذِي الْقُرْبٰى (النساء: ۳۶)	اور قرابت والے کے ساتھ نیکی کرنا۔

حقِ قرابت کو اسلام میں وہ اہمیت حاصل ہے کہ داعیِ اسلام علیہ السلام اپنی اُن تمام محنتوں، زحمتوں، تکلیفوں اور مصیبتوں کا جو تبلیغ اور دعوتِ حق میں اُن کو پیش آئیں اور اپنے اُس احسان وکرم کا جو ہدایت، تعلیم اور اصلاح کے ذریعہ ہم پر فرمایا بدل، معاوضہ اور مزدوری اپنی اُمت سے یہ طلب فرماتے ہیں کہ رشتہ داروں اور قرابت مندوں کا حق ادا کرو اور اُن سے لطف و محبت سے پیش آؤ۔ فرمایا:

قُلْ لَّآ اَسْــَٔـلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا	کہہ اے پیغمبر! کہ میں تم سے اس پر
الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ؕ	بجز اس کے کوئی مزدوری نہیں مانگتا
(الشوریٰ: ۲۳)	کہ ناتے میں محبت اور پیار کرو ۔

عربی زبان میں قرابت کا حق ادا کرنے کو وصلِ رحم (رحم ملانا) کہتے ہیں۔ اسی لفظ کی دوسری معروف شکل صلۂ رحم (رحم ملانا) ہے اور قرابت کے حق کو نہ ادا کرنے کو قطعِ رحم (رحم کاٹنا) کہتے ہیں کہ رحمِ مادری ہی تعلقاتِ قرابت کی جڑ ہے۔ کسی امر میں دو انسانوں کا اشتراک اُن کے باہمی تعلقات اور حقوقِ محبت و اعانت کی اصلی گرہ ہے۔ یہ اشتراک کہیں

ہم عمری، کہیں ہم درسی، کہیں ہمسائگی، کہیں ہم مذاقی، کہیں ہم پیشگی، کہیں ہم وطنی، کہیں ہم قومی کی مختلف صورتوں میں نمایاں ہوتا ہے۔ اس اشتراک کے عقدِ محبت کو استوار اور مضبوط رکھنے کے لیے جانبین پر حقوق کی نگہداشت اور فرائض محبت کی ادائگی واجب ہے۔ لیکن ان تمام بندھ کر ٹوٹ جانے والے اشتراکوں سے بڑھ کر وہ اشتراک ہے جس کا موطن رحمِ مادر ہے۔ یہ ہم رحمی خالقِ فطرت کی باندھی ہوئی گرہ ہے جو متفرق انسانی ہستیوں کو خاص اپنے دستِ قدرت سے باندھ کر ایک کر دیتی ہے اور جس کا توڑنا انسان کی قوت سے باہر ہے۔ اس لیے اس کے حقوق کی نگہداشت بھی انسانوں پر سب سے زیادہ ضروری ہے۔

اُن لوگوں کو جو محبت کی فطری گرہ کو توڑنے کی کوشش کریں وحیِ محمدیؐ نے فاسق کا خطاب دیا ہے اور اُن کو ضلالت کا مستحق ٹھہرایا ہے:

وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ (البقرۃ: ۲۶-۲۷)	اس سے وہ انہی کو گمراہ کرتا ہے جو حکم نہیں مانتے جو خدا کا عہد باندھ کر توڑتے ہیں، اور خدا نے جس کے جوڑنے کو کہا اس کو کاٹتے ہیں۔

ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کی اسی فطری گرہ کی تشریح استعارہ کے ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ رحم (شکم مادر کا نام) رحمان (اللہ) سے مشتق ہے اس لیے محبت والے خدا نے رحم کو خطاب کر کے فرمایا کہ "جس نے تجھ کو ملایا اس کو میں نے ملایا۔ جس نے تجھ کو کاٹا اس کو میں نے کاٹا[1]"۔ اسی مفہوم کو استعارہ کے اور گہرے رنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں ادا فرمایا کہ "رحم انسانی عرش الٰہی کو پکڑ کر کہتا

---

[1] صحیح بخاری، کتاب البر والصلۃ۔

ہے، "جو مجھے ملائے اس کو خدا ملائے اور جو مجھے کاٹے اس کو خدا کاٹے"[1]۔ ایک اور موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حسنِ تعبیر کا اس سے بھی زیادہ نازک طریقہ اختیار فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ جب اللہ نے مخلوقات کو پیدا کیا تو رحم انسانی نے اس رحمت والے خدا کا دامن (اصل میں حقوہ ہے) تھام لیا۔ خدا نے فرمایا ٹھہر جا! یہ اس کا مسکن ہوگا جو تیری گرہ کاٹنے سے بچے گا۔ کیا تو اس سے خوش نہیں کہ جو تجھ کو ملائے اس کو میں اپنے سے ملاؤں، جو تجھ کو کاٹے اس کو میں اپنے سے کاٹوں[2]"۔ یعنی رحم مادر اور اس رحمان کے رحم (وکرم) کے درمیان حرفوں کا یہ اشتراک محبت کے معنوی اشتراک کے بھید کو فاش کرتا ہے۔ اور اس سے وہ اہمیت ظاہر ہوتی ہے جو اسلام کی نظر میں اہلِ قرابت کی ہے۔

رحم اور رحمان کے اس جوڑ کی طرف خود قرآن پاک کی ایک آیت میں بھی اشارہ ہے۔ سورۂ نساء میں فرمایا:

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ	اور جس خدا کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے درخواست کرتے ہو
(النسآء: ۱)	اس کا اور رشتوں کا خیال رکھو۔

اس آیتِ پاک کی تشریح ذیل کی حدیث سے سمجھیے:

ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر عرض کی کہ یا رسول اللہ! مجھے کوئی ایسی بات بتائیے جو مجھے جنت میں لے جائے۔ فرمایا خدا کی بندگی کرو، کسی کو اس کا ساجھی نہ بناؤ، نماز پوری طرح ادا کرو، زکوٰۃ دو، اور قرابت کا حق (صلۂ رحم) ادا کرو[3]۔

---

[1] صحیح بخاری و مسلم کتاب البر والصلہ [2] صحیح بخاری و مسلم کتاب البر والصلہ۔ [3] صحیح بخاری کتاب الادب باب فضل صلۂ رحم۔

جبیر بن مطعمؓ صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جو صلہ رحمی یعنی قرابت کا حق ادا نہ کرے گا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا[1]" (یعنی جنت میں اس کا داخلہ اس وقت تک رُکا رہے گا جب تک اس کا یہ گناہ معاف نہ ہولے گا یا وہ اس گناہ سے پاک نہ ہو چکے گا)۔

ابو ہریرہؓ صحابی کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "جس کو یہ پسند ہو کہ اس کی روزی میں وسعت اور اس کی عمر میں برکت ہو تو اس کو چاہیے کہ صلہ رحمی کرے[2]"۔ اس حدیث کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان نیک اعمال کا اثر اللہ نے یہ رکھا ہے کہ اس سے مال و دولت میں فراخی اور عمر میں زیادتی ہوتی ہے کیونکہ صلہ رحم کی دو ہی صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ضرورت مند رشتہ داروں کی مالی مدد کی جائے، دُوسری یہ کہ خدا کی دی ہوئی عمر میں سے کچھ حصہ اُن کی خدمت میں صرف کیا جائے۔ پہلے کا نتیجہ خدا کی طرف سے مالی وسعت اور کشادگی اور دوسرے کا نتیجہ عمر میں برکت اور زیادتی کی صُورت میں ملتا ہے۔

اس حدیث کی تشریح مادی توجیہ سے بھی کی جا سکتی ہے۔ انسان کے خانگی افکار اور خاندانی جھگڑے بہت کچھ اس کے لیے اضمحلال، تکدُّر اور دلی پریشانی کا سبب ہوتے ہیں۔ لیکن جو لوگ اپنے خاندان والوں کے ساتھ نیکی کے برتاؤ، صلہ رحم اور خوش خلقی سے پیش آتے ہیں ان کی زندگی میں خانگی مسرّت، انشراح اور طمانیتِ خاطر رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے اُن کی دولت اور عمر دونوں میں برکت اور زیادتی ہوتی ہے۔ ترمذی میں یہ حدیث ان لفظوں میں ہے: "صلہ رحم سے قرابت والوں میں محبت، مال میں کثرت اور عمر میں برکت ہوتی ہے۔"

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب اثم القاطع [2] صحیح بخاری کتاب الادب باب من بسط له فی الرزق بصلة الرحم۔

احادیث میں اس کی بھی تصریح ہے کہ صلۂ رحم کا کمال یہ نہیں ہے کہ جو بدلہ کے طور پر صلۂ رحم کا جواب صلۂ رحم سے دے بلکہ یہ ہے کہ جو قطعِ رحم کرتا ہے اس کے ساتھ صلۂ رحم کیا جائے[1] یعنی جو قرابت کا حق ادا نہیں کرتے ہیں ان کا حق ادا کیا جائے۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب، باب لیس الواصل بالمکافی۔

ہمسایہ کے حقوق

ہمسایہ اور پڑوسی وُہ دو آدمی ہیں جو ایک دُوسرے کے قریب رہتے اور بستے ہیں۔ اِنسانیت اور اس کے تمدُّن کی بنیاد باہمی اشتراکِ عمل، تعاون اور موالات پر قائم ہے۔ اس دنیا میں ہر انسان دُوسرے انسان کی مدد کا محتاج ہے۔ اگر ایک بھُوکا ہے تو دُوسرے پر حق ہے کہ اپنے کھانے میں سے اُس کو بھی کھلائے۔ اگر ایک بیمار ہے تو جو تندرست ہو اس کی تیمار داری کرے، ایک پر اگر کوئی مصیبت آئے تو دوسرا اُس کا شریک اور ہمدرد بنے اور اس اخلاقی نظام کے ساتھ انسانوں کی مجموعی آبادی باہمی محبت اور حقوق کی ذمّہ داریوں کی گرہ میں بندھ کر ایک ہو جائے۔ ہر انسان بظاہر جسمانی اور مادی حیثیت سے جتنا ایک دُوسرے سے علیحدہ اور بجائے خود مستقل ہے اخلاقی اور روحانی حیثیّت سے فرض ہے کہ وہ اتنا ہی زیادہ ایک دُوسرے سے ملا ہوا اور ایک کا وجود دُوسرے کے وجود سے اتنا ہی پیوستہ ہو۔ اسی لیے ہر مذہب نے ان دو نوں انسانوں پر جو ایک دُوسرے کے قریب آباد ہوں آپس کی محبت اور امداد کی ذمہ داری رکھی ہے کہ وہی وقت پر اوروں سے پہلے ایک دُوسرے کی مدد کو پہنچ سکتے ہیں۔

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ انسان کو انہیں سے تکلیف اور دُکھ پہنچنے کا اندیشہ بھی زیادہ

ہوتا ہے جو ایک دُوسرے سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کے باہمی تعلقات خوشگوار اور ایک دُوسرے سے ملائے رکھنا ایک سچے مذہب کا سب سے بڑا فرض ہے۔ تاکہ برائیوں کا سدِّ باب ہو کر یہ پڑوس دوزخ کے بجائے بہشت کا نمونہ ہو اور ایک دُوسرے کی محبّت اور مدد پر بھروسہ کرکے گھر سے باہر نکلے اور گھر میں قدم رکھے۔

اِسلام نے انہی اصولوں کو سامنے رکھ کر ہمسائیگی کے حقوق کی دفعات بنائی ہیں۔ عربوں میں دوسری قوموں سے زیادہ اسلام سے پہلے بھی پڑوس اور ہمسائیگی کے حقوق نہایت اہم تھے بلکہ وہ عزّت و افتخار کا موجب تھے۔ اگر کسی عرب کے پڑوسی پر کوئی ظلم ہو جائے تو وہ دُوسرے پڑوسی کے لیے بے غیرتی اور عار کا موجب تھا اور اس لیے اس کی خاطر لڑنے مرنے کو وہ اپنی شرافت کا نشان سمجھتا تھا۔ اِسلام نے آکر عربوں کے اس احساس کو چند ترمیموں اور اصلاحوں کے ساتھ اور زیادہ قوی کر دیا۔

وحیِ محمدیؐ نے ہمسایہ کے پہلو بہ پہلو ایک اور قسم کے ہمسایہ کو جگہ دی ہے جس کو عام طور سے پڑوسی اور ہمسایہ نہیں کہتے مگر وہ ہمسایہ ہی کی طرح اکثر ساتھ ہوتا ہے، جیسے ایک سفر کے دو رفیق، ایک مدرسہ کے دو طالبِ علم، ایک کارخانہ کے دو ملازم، ایک استاد کے دو شاگرد، ایک دوکان کے دو شریک کہ یہ بھی درحقیقت ایک طرح کی ہمسائیگی ہے اور اس کا دوسرا نام رفاقت اور صحبت ہے۔ ان سب قسموں کے ہمسایوں میں تقدّم اُس کو حاصل ہے جس کو ہمسایہ ہونے کے علاوہ قرابت یا ہم مذہبی کا یا کوئی اور دُوسرا تعلق بھی ہو۔ قرآن پاک نے یہ تصریح پوری طرح کی ہے۔ ارشاد ہے:

وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ	اور (خدا نے) ہمسایہ قریب اور ہمسایہ
وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ (النسآء: ٣٦)	بیگانہ اور پہلو کے ساتھی کیساتھ (نیکی کا حکم دیا ہے)

اس "قریب" اور "بیگانہ" کے معنوں میں اہلِ تفسیر نے اختلاف کیا ہے۔ ایک کہتا ہے کہ "قریب" کے معنی رشتہ دار اور عزیز اور "بیگانہ" کے معنی غیر اور اجنبی کے ہیں۔ دوسرے کی رائے ہے کہ "نزدیک" کے معنی ہم مذہب کے ہیں، اور "دور" سے مطلب دُوسرے مذہب والے ہیں، جیسے یہودی، عیسائی، مشرک وغیرہ[1]۔ لیکن حقیقت میں یہ اختلاف بے معنی ہے۔ تعلیمِ محمدیؐ کا منشا یہ ہے کہ پڑوسیوں اور ہمسایوں میں اُن کو ترجیح دی جائے گی جن کے ساتھ اس پڑوس اور ہمسائگی کے علاوہ محبت اور رابطہ کا کوئی دُوسرا تعلق بھی موجود ہو۔ وُہ خواہ قرابت اور عزیزداری ہو یا ہم مذہبی ہو یا کسی اور قسم کی رفاقت ہو۔ بہرحال حق کے ساتھ دُوہرے تعلقات کو اکہرے تعلق پر ترجیح حاصل ہے۔

اس حکمِ الٰہی کی تفسیر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے مختلف طریقوں سے فرمائی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ نے اس کو ایمان کا براہِ راست اثر اور نتیجہ فرمایا۔ ایک دن صحابہ کے مجمع میں آپ تشریف رکھتے تھے کہ ایک خاص دِلنشیں انداز سے فرمایا "خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا، خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا، خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا۔" جان نثاروں نے پوچھا "کون یا رسُول اللہؐ!" فرمایا وہ جس کا پڑوسی اس کی شرارتوں سے محفوظ نہیں[2]۔" ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا "جو خدا اور روزِ جزا پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے[3]۔" ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا "جو شخص خدا اور روزِ جزا پر اعتقاد رکھتا ہے وہ اپنے پڑوسی کو ایذا نہ دے[4]۔"

ایک اور موقع پر اس کو تقربِ الٰہی کا ذریعہ ظاہر کیا۔ ارشاد فرمایا "خدا کے نزدیک ساتھیوں میں بہتر وہ ہے جو اپنے ساتھی کے لیے بہتر ہے اور پڑوسیوں میں بہتر وہ ہے جو

---

[1] ابن جریر طبری، تفسیر آیت مذکور۔ [2] صحیح بخاری کتاب الادب باب اثم من لا یامن جارہ بوائقہ۔ [3،4] صحیح بخاری کتاب الادب۔

اپنے پڑوسی کے لیے بہتر ہے[1]۔" ام المومنین حضرت عائشہؓ کی تعلیم کی غرض سے اُن سے فرمایا کہ "جبریلؑ نے مجھے پڑوسی کے حقوق کی اتنی تاکید کی کہ میں سمجھا کہ کہیں اُن کو وراثت کا حق نہ دلا دیں[2]۔" حقیقت میں یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ہمسایوں کا تعلق رشتہ داروں کے تعلق کے قریب قریب پہنچ جاتا ہے۔

پڑوسیوں میں محبت کی ترقی اور تعلقات کی استواری کا بہترین ذریعہ باہم ہدیوں اور تحفوں کا تبادلہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی بیویوں کو اس کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔ اسی بنا پر ایک دفعہ حضرت عائشہؓ نے پوچھا "یارسول اللہ! میرے دو پڑوسی ہیں تو میں ان میں سے کس کے پاس بھیجوں۔" فرمایا "جس کے گھر کا دروازہ تمہارے گھر سے زیادہ قریب ہو[3]۔"

اس ہدیہ اور تحفہ کے لیے کسی بیش قیمت چیز کی ضرورت نہیں بلکہ کھانے پینے کی معمولی چیزیں بھی اس کے لیے کافی ہیں۔ کچھ نہ ہوسکے تو گوشت کا شوربا ہی ہو اور وہ زیادہ پانی بڑھا کر ہی کیوں نہ ہو۔ اپنے ایک توکل پیشہ صحابی ابوذرؓ کو نصیحت فرمائی کہ "اے ابوذرؓ! جب شوربا پکاؤ تو پانی بڑھا دو اور اس سے اپنے ہمسایوں کی خبرگیری کرتے رہو[4]۔"

ان تحفوں کے بھیجنے بھجانے کا زیادہ موقع عورتوں کو پیش آتا ہے۔ اس لیے آپ نے خصوصیت کے ساتھ عورتوں کو مخاطب کرکے فرمایا کہ "اے مسلمانوں کی بیویو! تم میں کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کے لیے حقیر نہ سمجھے اگرچہ بکری کی کھر ہی کیوں نہ ہو[5]۔"

---

[1] ترمذی ابواب البر والصلہ، باب ماجاء فی حق الجار۔ [2] صحیح بخاری کتاب الادب۔ [3] صحیح بخاری کتاب الادب باب حق الجوار فی قرب الابواب۔ [4] صحیح مسلم کتاب البر والصلہ باب ماجاء فی حق الجوار۔ [5] صحیح بخاری کتاب الادب باب لاتحقرن جارۃ لجارتها۔

یہ نصیحت دونوں بیویوں کے لیے ہے یعنی نہ تو بھیجنے والی بیوی اپنے معمولی تحفہ کو حقیر سمجھ کر اپنی پڑوسن کو نہ بھیجے اور نہ دُوسری بیوی اس معمولی تحفہ کو دیکھ کر اُس کی حقارت کرے۔

ایک مُسلمان کی مروت اور شرافت کا یہ اقتضا نہیں کہ خود آرام سے رہے اور اپنے پڑوسی کے رنج و تکلیف کی پروا نہ کرے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا "مومن وہ نہیں جو خود سیر ہو اور اس کا پڑوسی اس کے پہلو میں بھوکا رہے[1]"۔

بُرائی بُرائی ہے جہاں بھی ہو اور گناہ گناہ ہے جہاں بھی سرزد ہو۔ لیکن اگر وہ اس جگہ ہو جہاں لازمی طور سے نیکی ہونی چاہیے تھی تو ظاہر ہے کہ اس گناہ اور بُرائی کا درجہ عام گناہوں اور برائیوں سے بدرجہا زیادہ ہے۔ بدقسمت انسان چوری ہر جگہ کر سکتا ہے مگر ظاہر ہے کہ پڑوس کے مکان میں چوری کرنا کتنا بُرا ہے۔ بدکاری ہر جگہ اُس سے ممکن ہے مگر پڑوس کے گھر میں جہاں سے دن رات کی آمد و رفت ہے اور جہاں کے مرد پڑوس کے شریف مردوں پر بھروسہ کرکے باہر جاتے ہیں اخلاقی خیانت کس قدر شرمناک ہے۔

اسی لیے توراۃ میں یہ حکم تھا:

"تو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی مت دے۔ تو اپنے پڑوسی کے گھر کا لالچ مت کر۔ تو اپنے پڑوسی کی جورو اور اس کے غلام اور اس کی لونڈی اور اس کے بیل اور اس کے گدھے اور کسی چیز کا جو تیرے پڑوسی کی ہے لالچ نہ کر۔"

(خروج ۲۰ - ۱۷)

"تو اپنے پڑوسی سے دغابازی نہ کر، نہ اس سے کچھ چھین لے۔" (احبار ۱۹ - ۱۳) -

اسلام نے اپنے پیغمبر علیہ السّلام کی زبانِ حکمت سے اس اگلی تعلیم کی تکمیل اُن الفاظ میں

---

[1] مشکوٰۃ از بیہقی وادب المفرد امام بخاری

فرمائی جن میں تورات کی طرح صرف ممانعت پر بس نہیں کی ہے بلکہ اس کو دس گنا زیادہ بُرا کرکے دکھایا۔ ایک سوال کے جواب میں فرمایا:

"زنا حرام ہے۔ خدا و رسُول نے اُس کو حرام کیا ہے لیکن دس بدکاریوں سے بڑھ کر بدکاری یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کرے۔ چوری حرام ہے۔ خدا و رسُول نے اس کو حرام کیا ہے لیکن دس گھروں میں چوری کرنے سے بڑھ کر یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کے گھر سے کچھ چرائے[1]"

دو صحابیہ تھیں جن میں سے ایک رات بھر نمازیں پڑھا کرتیں، دن کو روزے رکھتیں صدقہ وخیرات بھی بہت کرتیں مگر زبان کی تیز تھیں۔ زبان سے پڑوسیوں کو ستاتی تھیں۔ لوگوں نے اُن کا حال آپؐ سے عرض کیا تو فرمایا "اس میں کوئی نیکی نہیں اُس کو دوزخ کی سزا ملے گی"۔ پھر صحابہ نے دوسری بیوی کا حال سنایا جو صرف فرض نماز پڑھ لیتیں، اور معمُولی صدقہ دے دیتیں، مگر کسی کو ستاتی نہ تھیں۔ فرمایا "یہ بیوی جنتی ہو گی[2]"

حضرت مسیحؑ نے فرمایا تھا:

تو اپنے پڑوسی کو ایسا پیار کر جیسا کہ آپ کو۔ (مرقس ۱۲-۳۰)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تکمیلی تعلیم میں نہ صرف یہ کہ پڑوسی کو خود اپنے مانند پیار کرنے پر قناعت فرمائی۔ بلکہ جو نہ کرے اس کی سب سے بڑی دولت یعنی ایمان کے چھن جانے کا خطرہ ظاہر فرمایا۔ ارشاد ہے:

"تم میں کوئی مومن نہ ہو گا جب تک اپنے پڑوسی کی جان کے لیے وہی پیار نہ رکھے جو خود اپنی جان کے لیے پیار رکھتا ہے[3]"

---

[1] ادب المفرد امام بخاری باب حق الجار۔ [2] ادب المفرد امام بخاری باب لا یوذی جارہ۔ [3] صحیح مسلم کتاب الایمان۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنی جان کی محبت نہیں بلکہ خدا اور رسُول کی محبت کا اس کو معیار قرار دیا۔ فرمایا :

"جس کو یہ پسند ہو کہ خدا اور اس کا رسُول اس کو پیار کرے یا جس کو خدا اور اس کے رسُول کی محبّت کا دعوٰی ہو تو اس کو چاہیے کہ وہ اپنے پڑوسی کا حق ادا کرے[۱]"

اسی لیے فرمایا کہ قیامت کے دِن بارگاہِ الٰہی میں سب سے پہلے وہ دو مدعی اور مدعا علیہ پیش ہوں گے جو پڑوسی ہوں گے[۲]۔ اِنسان کی خوش خلقی اور بد خلقی کا سب سے بڑا معیار یہ ہے کہ اُس کو وہ اچھا کہے جو اس سے سب سے زیادہ قریب ہو۔ چنانچہ ایک دن صحابہ نے پوچھا کہ "یارسُول اللہ ہمیں کیسے معلوم ہو کہ ہم اچھا کر رہے ہیں یا بُرا"۔ فرمایا "جب اپنے پڑوسی کو تم اپنی نسبت اچھا کہتے سُنو تو سمجھو کہ اچھا کر رہے ہو اور جب بُرا کہتے سُنو تو سمجھو کہ بُرا کر رہے ہو[۳]"۔

کوئی پڑوسی اگر بُرائی کرے تو گھر چھوڑ کر دوسرا بہتر پڑوس تلاش کرو مگر اس کی بُرائی کے بدلہ میں تم اس کے ساتھ بُرائی نہ کرو۔ یہ احسان خود اس کو شرمندہ کرے گا۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک صحابی نے آکر شکایت کی کہ "یا رسُول اللہ میرا پڑوسی مجھے ستاتا ہے"۔ فرمایا "جاؤ صبر کرو"۔ اس کے بعد پھر شکایت لے کر آئے۔ پھر یہی نصیحت کی۔ وہ پھر آئے اور یہی عرض کی۔ فرمایا "جا کر تم اپنے گھر کا سامان راستہ میں ڈال دو" (یعنی گھر سے منتقل ہونے کی صورت بنا دو)۔ اُن صحابی نے یہی کیا۔ آنے جانے والوں نے پوچھا بات کیا ہے؟ انہوں نے حقیقتِ حال بتائی۔ سب نے اُن کے پڑوسی کو بُرا بھلا کہا۔ یہ دیکھ کر وہ ایسا

---

[۱] مشکوٰۃ از بیہقی [۲] احمد بن حنبل۔ مسند عقبہ بن عامر [۳] سنن ابن ماجہ۔

شرمندہ ہوا کہ وہ اُن کو منا کر پھر گھر میں واپس لایا اور وعدہ کیا کہ وہ آئندہ نہ ستائے گا[1]۔

ان تعلیمات کا یہ اثر تھا کہ ہر صحابی اپنے پڑوسی کا بھائی اور خدمت گزار بن گیا تھا۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ حضرت جابرؓ گوشت کا بڑا لوتھڑا لٹکائے جا رہے ہیں۔ پوچھا کیا ہے؟ عرض کی "امیر المومنین گوشت کھانے کو جی چاہا تھا تو ایک درم کا گوشت خریدا ہے۔" فرمایا "اے جابرؓ! کیا اپنے پڑوسی یا عزیز کو چھوڑ کر صرف اپنے پیٹ کی فکر کیا چاہتے ہو؟ کیا یہ آیت یاد نہ رہی[2]:

يَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُم بِهَا

(الاحقاف: ۲۰)

جس دن کافر دوزخ پر پیش ہوں گے (اُن سے کہا جائے گا) تم اپنے مزے اپنی دُنیا کی زندگی میں لے جا چکے اور اس سے فائدہ اٹھا چکے۔"

غور کرو کہ گوشت کا وہ لوتھڑا بھی جس میں اپنے پڑوسی اور محتاج عزیز کا حصّہ نہ ہو وہ دنیا کی مکروہ لذّت قرار پاتی ہے جس کے مواخذہ کا اُن کو ڈر لگتا ہے۔

ہمسایوں میں دوست و دُشمن اور مسلم و غیر مسلم کی تمیز بھی اُٹھ گئی تھی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک دفعہ ایک بکری ذبح کی۔ اُن کے پڑوس میں ایک یہودی بھی رہتا تھا۔ انہوں نے گھر کے لوگوں سے دریافت کیا کہ تم نے میرے یہودی ہمسایہ کو بھی بھیجا کیونکہ میں نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو کہتے سنا ہے کہ مجھے جبریلؑ ہمسایہ کے ساتھ نیکی کرنے کی اتنی تاکید کرتے رہے کہ میں سمجھا کہ وہ اُس کو پڑوسی کے ترکہ کا حصّہ دار بنا دیں گے[3]۔

---

[1] ادب المفرد بخاری باب شکایۃ الجار، و ابوداوٗد کتاب الادب، باب حق الجوار۔ [2] موطا امام مالک باب ما جاء فی اکل اللحم۔ [3] ابوداوٗد کتاب الادب باب حق الجوار۔

یتیموں کے حقوق

وہ کمسن بچّہ جو باپ کے سایۂ محبّت سے محروم ہے جماعت کے ہر رکن کا فرض ہے کہ اس کو آغوشِ محبّت میں لے، اس کو پیار کرے، اس کی ہر طرح خدمت کرے اس کے متروکہ مال و اسباب کی حفاظت کرے، اس کی تعلیم و تربیت کی فکر رکھے، عقل و شعور کے پہنچنے کے بعد اُس کے باپ کی متروکہ جائیداد اس کو واپس دے اور یتیم لڑکیوں کی حفاظت اور اُن کی شادی بیاہ کی مناسب فکر کرے۔ یہ وہ احکام ہیں جو مکّہ کا یتیم پیغمبر اپنے ساتھ لایا۔

عربوں میں روزانہ کے قتل و غارت اور بدامنی کے سبب سے یتیموں کی کثرت تھی مگر جیسا کہ چاہیے اُن کے غور و پرداخت کا سامان نہ تھا۔ وُہ اپنے باپ کی وراثت سے محروم رہتے تھے کیونکہ چھوٹے بچوں کو وُہ وراثت نہیں دیا کرتے تھے[1] اور نہ سنگدل عربوں میں عام طور سے اُن کے ساتھ رحم و شفقت کا جذبہ تھا۔ قرآنِ پاک میں اُن کی اس بدسلوکی کا ذکر بار بار ہے:

اَرَاَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ ؕ　　کیا تونے اس کو دیکھا جو انصاف

[1] تفسیر ابن جریر طبری، سورۃ النساء ج ۴ ص ۱۰۷۔

فَذٰلِكَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ○ (الماعون: ۱-۲) | کو جھٹلاتا ہے۔ سو وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔

ایک اور آیت میں اُن متولیوں کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو یتیموں کے جوان ہو جانے کے ڈر سے ان کے باپوں کی متروکہ وراثت کو جلد جلد کھا کر ہضم کر جانا چاہتے ہیں:

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ○ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ○ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا ○ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ○ (الفجر: ۱۷-۲۰)

نہیں یہ بات نہیں بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے۔ اور نہ ایک دوسرے کو مسکین کے کھانے پر آمادہ کرتے ہو۔ اور مردے کا مال پورا سمیٹ کر کھا جاتے ہو۔ اور دنیا کے مال و دولت پر جی بھر کر ریجھتے ہو۔

اسلام سے پہلے کے مذاہب میں اس واجب الرحم فرقہ کے ساتھ رحم و شفقت اور ان کی امداد و پرورش کا ذکر بہت کم ملتا ہے۔ توراۃ میں عشر اور زکوٰۃ کے مستحقین میں دُوسرے لوگوں کے ساتھ یتیم کا نام بھی دو ایک جگہ ملتا ہے "کہ شہر کے پھاٹک کے اندر جو یتیم ہوں وہ آئیں اور کھائیں اور سیر ہوں[1]"۔

انجیل نے ان بیچاروں کی کوئی داد رسی نہیں کی ہے اور نہ کسی تعلیم میں اُن کا ذکر کیا ہے۔ اس مظلوم فرقہ کی اصلی داد رسی کا وقت اس وقت آیا جب مکہ کا یتیم دینِ کامل کی شریعت لے کر دنیا میں آیا۔ وحیِ الٰہی نے سب سے پہلے خود اسی کو خطاب کرکے یاد دلایا:

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ○ ...... | کیا تجھ کو خدا نے یتیم نہیں پایا، تو

---

[1] استثنا ۱۴-۲۹ و ۲۶-۱۲-

فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ (الضحیٰ: ۶و۹)	اس نے پناہ دی .... تو یتیم پر ستم نہ کرنا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم جب تک مکّہ معظّمہ میں بے بسی کے عالم میں رہے یتیموں کے متعلق اخلاقی ہدایتیں فرماتے رہے اور قریش کے جفا پیشہ رئیسوں کو اس بیکس گروہ پر رحم وکرم کی دعوت دیتے رہے۔ چنانچہ مکّی آیتوں میں یہ تعلیمات وحی ہوتی رہیں۔ دولتمندوں کو غریبوں کے ساتھ فیاضی کی تلقین کے سلسلہ میں فرمایا گیا کہ انسانی زندگی کی گھاٹی کو پار کرنا اصل کامیابی ہے۔ اس گھاٹی کو تم کیونکر پار کر سکتے ہو؟ ظلم وستم کے گرفتاروں کی گردنوں کو چھڑا کر، بھوکوں کو کھلا کر اور یتیموں کی خدمت کر کے:

اَوْ اِطْعَامٌ فِیْ يَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ ۝	یا بھوک والے دن میں کسی رشتہ دار
يَّتِيْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ (البلد: ۱۴-۱۵)	یتیم کو کھلانا۔

نیکوں اور نیک بختوں کی تعریف میں فرمایا کہ یہ وہ ہیں جو

وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ	اور اس کی محبّت کے ساتھ کھانا کسی
مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا (الدھر: ۸)	غریب اور یتیم کو کھلاتے ہیں۔

مدینہ میں آنے کے بعد ان اخلاقی ہدایتوں نے قانون کی صورت اختیار کی۔ سورۂ نساء میں اس بیکس گروہ کے متعلق خاص احکام آئے، ان کو وراثت کا حق دلایا گیا اور متولّی جو جاہلیت میں طرح طرح کی بددیانتی کرتے تھے اُن سے کہا گیا:

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا	اور یتیموں کو اُن کے وارثوں کا چھوڑا
الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪ وَلَا تَاْكُلُوْۤا	ہوا مال دے دو اور اُن کے اچھے
اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ	مال کو اپنے برے مال سے بدلا نہ

حُوْبًا كَبِيْرًا ○	کرو۔ اور نہ اپنے مال کے ساتھ ملا کر اُن کا مال کھا جاؤ۔ یہ بڑے گناہ
(النسآء: ۲)	کی بات ہے۔

دولت مند یتیم لڑکیوں کو اُن کی جائیداد پر قبضہ کر لینے کی غرض سے متولی اپنے نکاح میں لے آتے تھے اور بے والی و وارث جان کر ان کو ستاتے تھے۔ اس پر حکم آیا:

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ	اگر تم کو ڈر ہے کہ ان یتیم بچیوں کے حق میں انصاف نہ کر سکو گے تو (اُن کو چھوڑ دو اور) عورتوں سے جو تمہیں
(النسآء: ۳)	پسند ہو نکاح کر لو۔

یتیم بچوں کے مال کو بددیانتی اور اسراف سے خرچ بھی نہیں کر دینا چاہیے۔ اور نہ جب تک اُن کو پورا شعور آئے وہ اُن کے سپرد کیا جائے۔ بلکہ اُن کے سن رشد کو پہنچنے کے بعد اُن کی عقل کو دیکھ بھال کر اُن کی یہ امانت اُن کو واپس کی جائے۔ فرمایا:

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَکُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَکُمْ قِیٰمًا وَّ ارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَاکْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ○ وَابْتَلُوا الْیَتٰمٰی حَتّٰۤی اِذَا بَلَغُوا النِّکَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ (النسآء: ۵-۶)	اور بے وقوفوں کو اپنے مال جس کو خدا نے تمہارے قیام کا ذریعہ بنایا ہے نہ پکڑا دو اور اُن کو کھلاتے اور پہناتے رہو اور اُن سے معقول بات کہو۔ اور یتیموں کو جانچتے رہو جب وہ نکاح کی (طبعی) عمر کو پہنچیں تو ان میں اگر ہوشیاری دیکھو تو اُن کا مال اُن کے حوالہ کر دو۔

ان آیاتِ پاک میں بلاغت کا ایک عجیب نکتہ ہے۔ غور کرو کہ آیت کے شروع میں جہاں متولیوں کو ناسمجھ یتیموں کے مال کو اپنے پاس سنبھال کر رکھنے کا حکم ہے وہاں مال کی نسبت متولیوں کی طرف کی ہے کہ "تم اپنا مال اُن کو نہ دو" اور آیت کے آخر میں جہاں بلوغ اور سنِ رشد کے بعد متولیوں کو یتیموں کو مال واپس کر دینے کا حکم ہے وہاں اُس مال کی نسبت یتیموں کی طرف کی گئی ہے کہ "تم اُن کا مال اُن کو واپس کر دو"۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک یہ امانت متولیوں کے پاس رہے تو اس کی ایسی ہی حفاظت اور نگہداشت کرنی چاہیے جیسی اپنے مال کی اور جب واپسی کی نوبت آئے تو اس طرح ایک ایک تنکا تک چن کر واپس کیا جائے جیسا کسی غیر کا مال دیانت کے ساتھ واپس کیا جاتا ہے جس پر تمہارا کوئی حق نہیں۔

متولیوں کو جو یتیموں کے مال کو اس ڈر سے جلد جلد خرچ کرکے برابر کر دیتے تھے کہ یہ بڑے ہو کر تقاضا نہ کر بیٹھیں اس بددیانتی پر تنبیہ فرمائی گئی:

وَلَا تَأْكُلُوهَا إِسْرَافًا وَبِدَارًا أَنْ يَكْبَرُوا (النسآء:٦)	اور اُڑا کر اور جلدی کرکے اُن کا مال نہ کھا جاؤ کہ کہیں یہ بڑے نہ ہو جائیں۔

صاحبِ جائیداد یتیموں کے متولی اگر خود کھاتے پیتے ہوں تو اُن کے لیے ان یتیموں کی جائیداد کی دیکھ بھال اور نگرانی کا معاوضہ قبول کرنا بھی خلافِ اخلاق قرار دیا گیا۔ اور اگر تنگدست ہوں تو منصفانہ معاوضہ لینے کی اجازت دی گئی:

وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۖ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ ۚ (النسآء:٦)	اور جو (متولی) بے نیاز ہے اس کو چاہیے کہ بچتا رہے اور جو محتاج ہے تو منصفانہ دستور کے مطابق کھائے۔

اور آخر میں یہ جامع تعلیم دی گئی:

وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ؕ	اور یہ کہ یتیموں کے لیے انصاف پر
(النسآء: ۱۲۷)	قائم رہو۔

سورۂ انعام میں یہودیوں کی ظاہری شریعت نوازی اور جانوروں کی حلت و حرمت میں بے معنی جزئیات پرستی اور روحانی گناہوں سے بے پروائی دکھا کر جن اصلی روحانی و اخلاقی تعلیمات کی طرف توجہ دلائی اُن میں ایک یہ ہے کہ

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ	اور بہتری کی غرض کے سوا یتیم کے
هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ	مال کے پاس نہ جاؤ یہاں تک
(الانعام: ۱۵۲)	کہ وہ اپنی طاقت کی عمر کو پہنچے۔

سورۂ اسرار (بنی اسرائیل) کے آٹھ اخلاقی اصول میں سے ایک یہ بھی ہے کہ سوائے بہتری کی نیت اور اصلاح کے خیال کے صاحبِ جائیداد یتیموں کی جائیداد کے پاس بھی کسی اور غرض سے نہ پھٹکنا چاہیے اور دیانت داری کے ساتھ ہمیشہ اپنا دامن بچائے رکھنا چاہیے۔[1]

یہ تو صاحبِ جائیداد یتیموں کی نسبت تعلیم ہے۔ جو یتیم غریب و مفلس ہوں اُن کی مناسب پرورش اور امداد عام مسلمانوں کا فرض ہے۔ چنانچہ قرآن پاک نے بقرہ، نسا، انفال اور حشر میں بار بار اُن کی پرورش اور اُن کے ساتھ نیک سلوک اور احسان کرنے کی ہدایت کی وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ خیرات وصدقات کے بہترین مصرف قرار دیئے گئے۔

اپنی اس متواتر وحی کی تشریح میں بے والی و وارث اُمت کے سرپرست صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے اُن نیک دلوں کو جو بے والی و وارث یتیموں کے کفیل

---

[1] بنی اسرائیل: ۳۴۔

ہوں خود اپنے برابر جگہ دی۔ فرمایا "میں اور کسی یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں یوں دو انگلیوں کی طرح قریب ہوں گے۔[۱]" یہ بھی فرمایا کہ "جو کسی یتیم بچہ کو اپنے گھر لاکر لائے اور اُس کو کھلائے پلائے گا تو اللہ تعالیٰ اُس کو جنت کی نعمت عطا فرمائے گا بشرطیکہ اُس نے کوئی ایسا گناہ نہ کیا ہو جو بخشائش کے لائق نہ ہو۔[۲]" نیز ایک دفعہ ارشاد فرمایا کہ "مسلمانوں کا سب سے اچھا گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ بھلائی کی جارہی ہے اور سب سے بدتر گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ بدسلوکی کی جاتی ہو۔[۳]"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات نے عرب کی فطرت بدل دی۔ وہی دل جو بیکس و ناتواں یتیموں کے لیے پتھر سے زیادہ سخت تھے وہ موم سے زیادہ نرم ہوگئے۔ ہر صحابی کا گھر ایک یتیم خانہ بن گیا۔ ایک ایک یتیم کے لطف و شفقت کے لیے کئی کئی ہاتھ ایک ساتھ بڑھنے لگے اور ہر ایک اس کی پرورش اور کفالت کیلئے اپنی آغوشِ محبت کو پیش کرنے لگا۔[۴] بدر کے یتیموں کے مقابلہ میں جگر گوشۂ رسول فاطمہؓ بتول اپنے دعویٰ کو اُٹھا لیتی ہیں۔[۵] حضرت عائشہ صدیقہؓ اپنے خاندان[۶] اور انصار[۷] وغیرہ[۸] کی یتیم لڑکیوں کو اپنے گھر لے جاکر دِل و جان سے پالتی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ صحابی کا یہ حال تھا کہ وہ کسی یتیم بچہ کو ساتھ لیے بغیر کبھی کھانا نہیں کھاتے تھے۔[۹]

صحابہ نے صرف یہی نہیں کیا کہ یتیموں کو اُن کا حصہ دینے اور اُن کے مال و دولت کی تولیت اور نگرانی میں دیانت داری برتنے لگے بلکہ ان کی جائیدادوں کی حفاظت

---

[۱] صحیح بخاری باب فضل من یعول یتیماً و صحیح مسلم باب فضل الاحسان الی الیتیم [۲] ترغیب و ترہیب منذری جلد ۲ صفحہ ۱۳۲ و صفحہ ۱۳۳ بحوالہ ترمذی (حدیث حسن صحیح) [۳] ترغیب و ترہیب منذری جلد ۲ صفحہ ۱۳۲ و صفحہ ۱۳۳ بحوالہ ابن ماجہ و ادب المفرد باب من یعول یتیماً [۴] صحیح بخاری باب عمرۃ القضاء [۵] ابوداؤد باب مواضع قسم الخمس [۶] موطا امام مالک کتاب الزکوٰۃ و زکوٰۃ اموال الیتمی و زکوٰۃ الحلی و کتاب الطلاق [۷] مسند احمد جلد ۶ صفحہ ۲۶۹ [۸] تذکرۃ الحفاظ ذہبی ذکر مسروق بن اجدع تابعی، و مسند جلد ۶ صفحہ ۳۲ [۹] بخاری ادب المفرد باب فضل من یعول یتیماً۔

میں فیاضی اور سیرچشمی کا پورا ثبوت دیا۔ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں ایک یتیم نے ایک شخص پر ایک نخلستان کے متعلق دعویٰ پیش کیا مگر وہ دعویٰ ثابت نہ ہو سکا اور آپؐ نے وہ نخلستان مدعا علیہ کو دلا دیا۔ وہ یتیم اس پر رو پڑا۔ آپؐ کو رحم آیا اور اُس مدعا علیہ سے فرمایا کہ تم یہ نخلستان اس کو دے دو خدا تم کو اس کے بدلہ جنّت دے گا۔ وہ اس ایثار پر راضی نہ ہوا۔ ابوالدحداحؓ صحابی حاضر تھے انہوں نے اُس شخص سے کہا کہ تم اپنا یہ نخلستان میرے فلاں باغ سے بدلتے ہو۔ اس نے آمادگی ظاہر کی انہوں نے فوراً بدل دیا اور وہ نخلستان اپنی طرف سے اس یتیم کو ہبہ کر دیا۔[1]

آج دنیا کے شہر شہر میں یتیم خانے قائم ہیں مگر اگر یہ سوال کیا جائے کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے بھی یہ بدقسمت گروہ اس نعمت سے آشنا تھا تو تاریخ کی زبان سے جواب نفی میں ملے گا۔ اسلام پہلا مذہب ہے جس نے اس مظلوم فرقہ کی دادرسی کی۔ عرب پہلی سرزمین ہے جہاں کسی یتیم خانہ کی بنیاد پڑی اور اسلام کی حکومت دنیا کی پہلی حکومت ہے جس نے اس ذمہ داری کو محسوس کیا۔ اور عرب، مصر، شام، عراق، ہندوستان جہاں جہاں مسلمانوں نے اپنی حکومتوں کی بنیادیں ڈالیں ساتھ ساتھ ان مظلوموں کے لیے بھی امن وراحت کے گھر بنائے، اُن کے وظیفے مقرر کیے، مکتب قائم کیے، جائیدادیں وقف کیں[2] اور دنیا میں ایک نئے انسٹیٹیوشن کی طرح ڈالی۔ اور قانوناً اپنے قاضیوں کا یہ فرض قرار دیا کہ وہ بے والی و سرپرست یتیموں کے سرپرست ہوں۔ اُن کی جائیدادوں کی نگرانی، اُن کے[3]

---

[1] استیعاب ابن عبدالبر تذکرہ ابوالدحداحؓ [2] تاریخ اسلام میں یہ واقعات مذکور ہیں [3] حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا السلطان ولی من لا ولی لہ (کتاب النکاح) فقہ کی کتابوں میں قاضیوں کے یہ فرائض لکھے ہیں قاضیوں کو جو شاہی فرامین تقرر کے وقت ملتے تھے اُن میں بھی خصوصیت کے ساتھ ان کی تصریح ہوتی تھی۔

معاملات کی دیکھ بھال اور ان کی شادی بیاہ کا انتظام کریں۔ اور یہی وہ دستور ہے جس کی پیروی آج یورپ کے ملکوں میں کی جاتی ہے اور لندن کے لارڈ میئر یا آرفنس کورٹ کے حکام مسلمان قاضیوں کے ان فرائض کی نقل کرتے ہیں۔

بیوہ کے ساتھ حسنِ سلوک

یتیموں کے بعد اصنافِ انسانی میں سب سے ناچار اور ناتواں گروہ جنسِ لطیف کے ان افراد کا ہے جن کو قدرت نے شوہروں کے سایہ سے محروم کر دیا ہے۔ اب وہ بے یار و مددگار، اور بے مونس و غمخوار ہیں۔ نہ اُن کے کھانے پینے کا کہیں سہارا ہے اور نہ اُن کے تن ڈھانکنے اور ستر پوشی کی کسی کو فکر ہے۔ عورت جس کو خدا نے دنیا کی عملی مشکلات سے پرے رکھا تھا اور اس کی ذمہ داری اُس کے شوہر کے حوالہ کر دی تھی اب وہ ناچار اُن سے دوچار ہے۔ اب غم و الم اور فکر و تردد کے علاوہ بڑی مشکل یہ درپیش ہے کہ ایک بے حامی و بے محافظ عورت کو دیکھ کر نہ صرف اس کے جسمانی ستانے والے بلکہ اس کے روحانی اور اخلاقی حملہ آور گدھ کی طرح اس کے پس و پیش منڈلاتے رہتے ہیں اور موقع کی تاک میں رہتے ہیں۔ دنیا کے روزمرہ کے واقعات اور اخبارات کی اطلاعات کافی سے زیادہ ثبوت ہیں۔

یہودی مذہب میں بیوہ عورت ایک بھائی کے مرنے کے بعد اُس کے دوسرے بھائی کی مِلک ہو جاتی تھی۔ وہ جس طرح چاہتا تھا اس سے معاملہ کر سکتا تھا۔ عورت کی مرضی کو اس زن و شوئی کے مجبورانہ تعلق میں کوئی دخل نہ تھا۔ عیسوی مذہب میں یہ جبری

قانون تو جاتا رہا مگر وہ کوئی دوسرا ایجابی پہلو پیش نہ کرسکا۔ ہندوؤں میں اب اس کی زندگی کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اب اُس کو اپنے شوہر کی چتا سے لپٹ کر بے موت مرجانا چاہیے اور اگر زندہ رہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ وہ دنیا کی تمام آرائشوں اور لذتوں سے علیحدہ ہو کر ساری عمر سوگ میں گزار دے۔ عربوں میں رواج یہ تھا کہ وہ شوہروں کے وارثوں کی ملکیت بن جاتی تھی اور وہ جو چاہتے اس کے ساتھ کرسکتے تھے۔ اس کو تکلیفیں دے دے کر اس سے دینِ مہر معاف کراتے تھے اور اس کو اپنی مرضی کے بغیر کہیں شادی نہیں کرنے دیتے تھے۔

اسلام آیا تو اس مظلوم گروہ کی فریاد رسی ہوئی۔ اس نے سب سے پہلے تو یہ کیا کہ ان کے غیر محدود سوگ کے زمانہ کو محدود کر دیا اور صرف اتنی مدت تک کے لیے رکھا جس میں تھوڑا بہت اس کا طبعی غم فراموش ہو سکے اور یہ بھی پتہ لگ سکے کہ اس کو اپنے شوہر سے کوئی حمل تو نہیں۔ اس کے لیے سوگ کا ایک زمانہ متعین کیا جس کی حد چار مہینے دس دن قرار دی اور اس کا نام عدت رکھا یعنی "شمار کے دِن"۔ اس مدت کے گزر جانے کے بعد قانونی حیثیت سے اُس کو ہر قسم کے جائز زیب و آرائش کی اجازت دے دی۔ اس کا دینِ مہر اگر اب تک ادا نہ ہوا ہو تو اس قرض کا ادا کرنا اس شوہر کے ترکہ میں سب سے اوّل ضروری ٹھہرایا پھر اس ترکہ میں سے اگر شوہر کی اولاد ہو تو عورت کو آٹھواں حصّہ اور نہ ہو تو چوتھائی حصّہ دلوایا۔ عورت کو اپنی دوسری شادی کے متعلق پوری آزادی بخشی اور اس کے سر سے دیوروں اور شوہر کے دوسرے عزیزوں کی ہر قسم کی جابرانہ حکومت کا قلع قمع کر دیا اور ان تمام امور کو نہ صرف اخلاق بلکہ اسلام کے قانون کا جز بنا دیا۔

اِس بے یار و مددگار طبقہ کی دوسری ضروری امداد یہ ہے کہ جس سوسائٹی سے اس کو اوروں نے نکال دیا ہے اس میں دوبارہ اس کو عزت کے ساتھ داخلہ کا موقع دیا جائے۔ اور کسی شریفِ شریکِ زندگی کی معیت کا شرف اس کو دوبارہ بخشا جائے اور جس مہر د عنایت کے سایہ سے وہ محروم ہو گئی ہے وہ اس کو پھر عطا کیا جائے۔ قرآن نے اس کے بارہ میں صرف نصیحت و موعظت پر اکتفا نہیں کی بلکہ مسلمانوں کو صریحًا یہ حکم دیا:

وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ (النور: ۳۲) اور اپنے میں سے بے شوہر والی عورتوں کا نکاح کر دو۔

اس سے پہلے کہ یہ حکم اترے بلکہ خود نبوت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس بیکس فرقہ کی امداد کی طرف توجہ فرمائی اور عین اس وقت جب ایک نوجوان کے تمام ولولے برانگیختہ ہوتے ہیں اور بہتر سے بہتر اور نوجوان سے نوجوان عورت کا مشتاق ہوتا ہے آپ نے پچیس برس کی عمر میں چالیس برس کی ایک ادھیڑ بیوہ سے شادی کی۔ اور پچیس برس تک اس طرح اُس کے ساتھ کامل رفاقت کی کہ اس اثنا میں کوئی دوسرا نکاح نہیں کیا۔ اُن کی وفات کے بعد وقتاً فوقتاً دس عورتوں سے نکاح کیے جن میں سے آٹھ حضرت سودہؓ، حفصہؓ، زینبؓ ام المساکین، اُم سلمہؓ، جویریہؓ، ام حبیبہؓ، میمونہؓ اور صفیہؓ بیوہ تھیں جن کی کفالت کا بار آپؐ نے اپنے دوشِ مبارک پر اٹھایا اور اس طرح اپنے پیرووں کے لیے اس کو مستحسن اور مسنون طریقہ خود اپنے عمل سے بھی بنا دیا۔

یہ تو آپؐ کا عمل تھا۔ قول یہ ہے کہ اس مظلوم فرقہ کی امداد کو آپ نے ایسی نیکی قرار دیا کہ رات رات بھر (نفل) نمازیں پڑھ پڑھ کر اور اکثر (نفل) روزے رکھ رکھ کر جو ثواب حاصل کیا جا سکتا ہے وہ اس فرقہ کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے والا بآسانی حاصل کر سکتا

ہے۔ فرمایا:

السّاعی علی الارملة والمسکین	بیوہ اور مسکین کے لیے دوڑ دھوپ
کالسّاعی فی سبیل اللہ واحسبہ	کرنے والا ایسا ہے جیسا خدا کی راہ
قال کالقائم لایفتر وکالصّائم	میں دوڑنے والا (اور راوی کہتا ہے
لا یفطر۔[1]	کہ میں گمان کرتا ہوں کہ آپ نے یہ بھی فرمایا
	کہ) اور جیسا وُہ نمازی جو نماز سے نہیں
	تھکتا اور وُہ روزہ دار جو کبھی اپنا روزہ نہیں توڑتا۔

صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں:

السّاعی علی الارملة والمسکین	بیوہ اور غریب کے لیے دوڑ دھوپ
کالمجاھد فی سبیل اللہ وکالّذی	کرنے والا خُدا کی راہ کے مجاہد کی
یصوم النھار ویقوم اللّیل۔	طرح ہے اور اس کے برابر ہے جو
(صحیح بخاری کتاب الادب)	دِن بھر روزہ رکھے اور رات بھر نماز پڑھا کرے۔

اِن بیواؤں کی تسکین کی خاطر جو اپنی گود میں ننّھے بچے رکھتی ہوں اور اس لیے وُہ تکلیف اُٹھاتی ہوں لیکن اِن ننھے بچوں کی پرورش کی مصروفیت کے سبب سے اپنے کو اس وقت تک دُوسرے نکاح کے بندھن میں نہیں باندھتی ہیں جب تک وُہ بڑے ہو کر علیحدہ نہ ہو جائیں اور یا وہ دُنیا سے رخصت نہ ہو جائیں، یہ فرمایا "میں اور محنت و مشقّت کے سبب سے وہ کالی پڑ جانے والی بیوی قیامت کے دن مرتبہ میں ان دو انگلیوں کی طرح قریب ہوں گے۔ وُہ حسن و جمال اور جاہ و عزّت والی بیوی جو

[1] صحیح بخاری و صحیح مسلم و مؤطا امام مالک بحوالہ مشکوٰۃ، باب الشفقة والرحمة علی الخلق۔

شوہر کے مرنے کے بعد بیوہ ہو جائے لیکن اپنے ننھے یتیم بچوں کی خدمت کی خاطر اپنے کو روکے رہے یہاں تک کہ وُہ اس سے علیحدہ ہو جائیں یا مر جائیں[1]۔" اسی مقصد کو ابو یعلیٰ کی مسند میں ہے کہ آپؐ نے اس طرح ایک واقعہ کی صُورت میں بھی بیان فرمایا کہ "قیامت[2] کے دِن میں سب سے پہلے جنّت کا دروازہ کھولوں گا تو دیکھوں گا کہ ایک عورت مجھ سے بھی پہلے اندر جانا چاہتی ہے۔ میں پوچھوں گا تُو کون ہے؟ تو وہ کہے گی، کہ میں ایک بیوہ ہوں جس کے چند ننھے یتیم بچے تھے۔"

---

[1] سنن ابی داوٗد، کتاب الادب باب فضل من عال یتیماً [2] حاشیہ سنن ابی داوٗد بحشیۃ ابی الحسنات محمد بن عبداللہ ابن نورالدین پنجابی، مطبوعہ اصح المطابع لکھنؤ۔

حاجت مندوں کے حقوق

ہر انسان خواہ وہ کسی قدر صاحبِ دولت اور بے نیاز ہو کسی نہ کسی وقت اس پر ایسی افتاد پڑتی ہے کہ اُس کو دُوسروں کا دست نگر بننا پڑتا ہے اور اس کو دوسروں سے مدد لینے کی ضرورت ہو جاتی ہے۔ اس لیے انسانی جماعت کے ہر رُکن کا فرض ہے کہ وہ اپنے ایسے مصیبت زدہ بھائی کی ہر طرح مدد کرے اور اپنی موجودہ بہتر حالت پر مغرور ہو کر کبھی کسی حاجت مند کی حاجت روائی سے بے پروائی نہ برتے۔ اور نہ یہ سمجھے کہ اس کو کبھی کسی دوسرے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

قرآن پاک میں دو موقعوں پر ذرا سے فرق سے ایک آیت ہے:

فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَ الْمَحْرُوْمِ ○ (الذّٰریٰت : ۱۹)	جن (مسلمانوں) کے مالوں میں مانگنے والوں اور محروم کے لیے حق ہے۔
فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ○ لِّلسَّاۗىِٕلِ وَالْمَحْرُوْمِ ○ (المعارج : ۲۴-۲۵)	جن (مسلمانوں) کے مالوں میں مانگنے والے اور محروم کے لیے مقررہ حق ہے۔

سائل مانگنے والے کو کہتے ہیں لیکن عام شہرت کی بنا پر سائل کے معنی صرف "بھیک منگے" کے لینا ٹھیک نہیں ہے بلکہ اس سے ہر وہ ضرورت مند مراد ہو سکتا ہے جو تم سے کسی

مالی مدد کا خواستگار ہو۔ محروم کی تشریح میں اہلِ تفسیر کا اختلاف ہے۔ بعض اس کو محروم کہتے ہیں جس کا مالِ غنیمت میں کوئی حصہ نہیں، کسی نے اس کے ظاہر معنی لیے ہیں کہ جو دولت سے محروم ہو، کوئی متعفف کے معنی لیتا ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ اس سے مراد وہ مصیبت زدہ ہے جس کی کمائی یا کھیتی پر کوئی آسمانی افتاد پڑ گئی ہو اور اب وہ دوسروں کی مدد کا محتاج ہو گیا ہو۔ اسی معنی کی تائید اہلِ لغت اور بعض اہلِ تفسیر کے بیان اور قرآن پاک[1] سے ہوتی ہے۔

دُوسری بحث یہ ہے کہ اس حق سے مراد زکوٰۃ ہے یا عام صدقہ۔ مفسّرین دونوں آیتوں میں دونوں طرف گئے ہیں مگر صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذاریات میں جس میں مطلق "حق" کا بیان ہے، مطلق صدقہ اور مالی امداد مراد ہے اور معارج میں جس میں مطلق "حق" کا نہیں بلکہ "مقرّرہ حق" کا بیان ہے "زکوٰۃ" مراد ہو۔ کیونکہ "مقررہ حق" کا مفہوم عام صدقہ پر نہیں بلکہ زکوٰۃ ہی پر صادق آتا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایسے حاجت مندوں کی جن پر کوئی مالی مصیبت اور افتاد پڑی ہو دونوں طرح سے مدد مسلمانوں کے حقوق میں سے ایک حق ہے۔

قرآن پاک میں دُوسرے موقع پر ہے:

وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝ (الضحیٰ: ۱۰) — اور تو سوال کرنے والے کو جھڑکا نہ کر۔

یہاں "سوال کرنے والے" کے معنی اغنیٰ کے قرینہ سے عام طور سے بھیک مانگنے والے کے سمجھے جاتے ہیں مگر لفظ کا عموم وسعت کو چاہتا ہے یعنی ہر ضرورت مند جو تم سے کسی قسم کی مدد کا خواستگار ہو، خواہ وہ جسمانی ہو، مالی ہو، علمی[2] ہو، یہاں تک کہ کوئی لنگڑا تم سے

---

[1] دیکھو لسان العرب لفظ محروم و محارف اور تفسیر ابن جریر میں سورۂ ذاریات و معارج کی آیت مذکورہ اور سورۂ قلم میں اصحاب الجنۃ کے قصہ میں محرومون اور سورۂ واقعہ میں بل نحن محرومون کے معنی۔ [2] طبری میں ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے واما من سالک من ذی حاجۃ فلا تنھر زمخشری نے کشاف میں لکھا ہے کہ بعضوں نے اس سائل سے مراد طالب علم لیا ہے۔

صرف تمہارے کندھے کا سہارا چاہتا ہے تو وہ بھی سائل کے تحت میں ہے۔ اس کے سوال کو بھی سختی سے رد نہ کرو بلکہ امکان بھر اس کو پورا کرو اور نہ کر سکو تو نرمی اور خوبصورتی سے عُذر کرو۔

مدد کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ تم کسی دوسرے سے اس مستحق کی مدد کی سفارش کرو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيْتًا ۝ (النساء: ۸۵)

جو نیک بات کی سفارش کرے گا تو اس کے ثواب میں اس کا بھی حصہ ہو گا اور جو بُری بات کی سفارش کرے گا تو اس کے گناہ میں وہ بھی حصہ پائے گا۔ اور اللہ ہے ہر چیز کا نگہبان۔

اگرچہ یہ آیت عبارت کے نظم و نسق کے لحاظ سے لڑائی کے سلسلہ میں ہے یعنی اگر کوئی کمزور قبیلہ درخواست کرے کہ طاقت ور قبیلہ کے مقابلہ میں اس کی امداد کی سفارش کی جائے تو اس نیک کام میں اس کی سفارش کی جائے اور وہ قبول کی جائے۔ تاہم الفاظِ قرآنی کی وُسعت ہر نیک کام کی سفارش تک وسیع ہے اور اس میں اصول بتا دیا گیا ہے کہ کسی نیک غرض کی جد و جہد میں جتنا حصہ بھی لیا جائے حصہ لینے والا بھی اس نیک کام کے ثواب میں شریک ہو گا۔ ایسا ہی بُرے کام کی جد و جہد میں حصہ لینا اس کے گناہ میں شریک ہونا ہے۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۠ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَ

اور نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دُوسرے کی مدد کیا کرو۔ اور

الْعُدْوَانِ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۖ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ○ (المائدۃ: ۲)	گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ایک دُوسرے کے مددگار نہ بنو۔ اور ڈرو اللہ سے۔ بےشک اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

غرض یہ ہے کہ حاجت مندوں کی حاجت برآری، ضرورت مندوں کی ضرورت کو پورا کرنا اور جو جس قدر بھی مدد تم سے چاہے اگر تمہاری طاقت میں ہو تو وہ اُس کو دینا، ہر مُسلمان پر ایک حق کی حیثیت رکھتا ہے جس کو ہر مُسلمان کو ادا کرنا چاہیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گویا انہی آیات کی تشریح اپنے ان الفاظ میں فرمائی ہے:

من کان فی حاجۃ اخیہ کان اللہ فی حاجتہ ومن فرّج عن مسلم کربۃ فرّج اللہ عنہ کربۃً من کربات یوم القیامۃ۔ (صحیحین)	جو شخص اپنے بھائی کی حاجت پوری کرنے میں لگا رہے گا تو خدا اس کی ضرورت پوری کرنے میں لگا رہے گا۔ اور جو کسی مُسلمان کی کسی مصیبت کو دُور کرے گا تو اللہ قیامت کی مصیبتوں میں سے کسی مصیبت کو اس سے دُور فرمائے گا۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا:

واللہ فی عون عبدہٖ ما کان العبد فی عون اخیہ (ترمذی)	اللہ اپنے بندہ کی مدد میں اس وقت تک رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں رہتا ہے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی سائل یا حاجت مند آتا تو آپ صحابہ سے فرماتے کہ "تم سفارش کرو تو تمہیں بھی ثواب

ملے گا۔[۱]" ایک دفعہ ارشاد ہوا کہ اگر کچھ اور نہ ہو سکے تو بیکس حاجت مند کی مدد ہی کیا کرو۔[۲] یہ بھی فرمایا کہ بھولے بھٹکے ہوئے کو اور کسی اندھے کو راستہ بتانا بھی صدقہ[۳] ہے۔ یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ جو شخص راستہ چلتے میں کوئی کانٹا راستہ سے ہٹا دے تو خداوند تعالیٰ اس کے اس کام کی قدر کرتا ہے اور اُس کا گناہ معاف کرتا ہے[۴]۔

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الادب باب تعاون المومنین وباب قول اللہ من یشفع شفاعۃ حسنۃ۔

[۲] صحیح بخاری کتاب الادب باب کل معروف صدقۃ [۳] ترمذی کتاب البر والصلۃ [۴] ترمذی کتاب البر والصلۃ۔

بیمارؑ کے حقوق

دُنیا کا ایک اور کمزور طبقہ جو ہماری ہمدردیوں کا مستحق ہے بیماروں اور مریضوں کا ہے۔ یہ عموماً اپنی اس حالت میں اپنی خبر گیری اور خدمت آپ نہیں کر سکتے۔ ان ہمدردی کے لائق انسانوں کی دیکھ بھال، خدمت، غمخواری اور تیمار داری بھی انسانیت کا ایک فرض ہے اور اس فرض کا نام عربی میں "عیادت[1]" ہے۔

---

[1] عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ عیادۃ المریض کے معنی صرف بیمار پرسی کے ہیں یعنی کسی بیمار کو بیماری کی حالت میں دیکھنے کو جانا۔ لیکن واقعہ ایسا نہیں ہے۔ بیمار کی عیادت کے معنی بیمار پرسی کے بھی ہیں اور اس کی تیمار داری، غمخواری اور خدمت گذاری کے بھی ہیں۔ بیمار کو بیماری کی حالت میں صرف دیکھنے کو جانا تو عیادت کی معمولی قسم ہے، اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اس کی غمخواری کرے، اس سے زیادہ یہ ہے کہ اس کی پوری تیمار داری اور خدمت گذاری کرے۔ عرب کا ایک قدیم شاعر جو حجاج کے زمانہ میں تھا کہتا ہے؛

ذہب الرقاد فما یحس رقاد
مما شجاک و نامت العواد

تجھے جو غم پہنچا اس سے نیند چلی گئی تو نیند معلوم نہیں ہوتی اور عیادت کرنے والے سو گئے

قاعدہ یہ ہے کہ کسی بیمار کے تیمار دار اور خدمت گذار اس کی آخری حالت میں شب و روز اس کی خدمت میں جاگتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ان کی کئی کئی راتیں جاگتے کٹ جاتی ہیں۔ لیکن جب بیمار سے مایوسی ہو جاتی ہے اور وہ موت کے قریب ہو جاتا ہے یا مر جاتا ہے تو پھر ان پر نیند طاری ہو جاتی ہے اور وہ سو جاتے ہیں۔ اب اگر "عیادت" کے معنی صرف بیمار پرسی کے ہوتے تو عیادت کرنے والوں کے سو جانے کا کوئی مطلب نہ ہوتا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ "عیادت" کی وسعت میں خدمت گذاری اور تیمار داری سے لے کر بیمار پرسی تک سارے مدارج داخل ہیں اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ عیادت کے معنی صرف بیمار کے دیکھنے کو جانے ہی کے ہوں تب بھی یہ سمجھنا چاہیے کہ جب صرف اس کے دیکھنے جانے کا ثواب اتنا ہے تو اس کی خدمت اور تیمار داری کا ثواب کتنا ہوگا۔

ان بیماروں کے ساتھ اسلام نے سب سے پہلی ہمدردی تو یہ دکھائی ہے کہ وہ بہت سے فرائض جن کے ادا کرنے سے وہ مجبور ہو رہے ہیں یا جن کے ادا کرنے سے ان کی تکلیف کی زیادتی کا خیال ہے اُن کو یک قلم معاف یا کم کر دیا ہے اور قرآن نے اس کے لیے کلی اصول بنا دیا ہے:

وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ (النور: ۶۱)	اور نہ بیمار پر کوئی تنگی ہے۔
لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَىٰ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ (الفتح: ۱۷)	نہ اندھے پر تنگی ہے (کہ وہ جہاد میں شریک ہو) اور نہ لنگڑے پر اور نہ بیمار پر۔
لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضَىٰ (التوبہ: ۹۱)	نہ کمزوروں پر اور نہ بیماروں پر (جہاد کے عدم شرکت کی باز پرس ہے)۔

بیماروں کے لیے وضو معاف ہے وَإِنْ كُنتُم مَّرْضَىٰ [1] (یا تم بیمار ہو تو تیمم کرو) اسی طرح ان سے تہجد کی لمبی نمازیں معاف ہیں عَلِمَ أَن سَيَكُونُ مِنكُم مَّرْضَىٰ [2] (خدا کو معلوم تھا کہ تم میں کچھ بیمار بھی ہوں گے) اسی طرح حج کے احکام میں بھی بیمار کے لیے رعایت فرمائی گئی۔ فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا [3] (تو تم میں جو بیمار ہو) روزہ توڑنے کی اس کو اجازت دی گئی، کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی قوت نہ ہو تو بیٹھ کر، اور بیٹھنے کی بھی طاقت نہ ہو تو لیٹ کر نماز کی رخصت دی گئی۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب خدا نے اُن سے اپنے فرائض معاف کر دیئے تو بندوں کو کس حد تک اُن سے اپنے اخلاقی مطالبہ میں کمی کر دینی چاہیے۔

اسلام نے مسلمان کی بیماری کی تکلیف کو صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرنے کی حالت

---

[1] المائدہ: ۶۔ [2] المزمل: ۲۰ [3] البقرہ: ۱۹۶۔

میں غم کے بجائے خوشخبری بنا دیا ہے۔

اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ مومن کو دنیا میں جو تکلیف بھی پہنچتی ہے وہ اُس کے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے۔ اگر وہ بیمار ہو جائے اور صبر کے ساتھ بیماری کی تکلیفوں کو برداشت کرے تو آخرت کے عذابِ شدید سے بچانے کے لیے وہ اُس کے گناہوں کا معاوضہ بن جاتی ہیں اور وہ پاک و صاف ہو جاتا ہے[1]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیماروں کی عیادت کی خاص تاکید فرمائی ہے۔ اس کے آداب تعلیم کیے ہیں، اس کی دعائیں سکھائی ہیں اور اس کا ثواب بتایا ہے۔ فرمایا جو کوئی مسلمان کے کسی غم کو ہلکا کرے گا خدا اُس کے غم کو ہلکا کرے گا[2]۔ اور یہ بھی فرمایا کہ ایک مسلمان کے دُوسرے مسلمان پر پانچ حق ہیں جن میں ایک یہ ہے کہ جب وہ بیمار پڑے تو اس کی عیادت کرے[3]۔ صحابہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو سات باتوں کا حکم دیا تھا جن میں سے ایک بیمار کی عیادت ہے[4]۔ ارشاد ہوا کہ جب کوئی صبح کو کسی بیمار کی عیادت کرتا ہے تو شام تک فرشتے اس کی مغفرت کی دعا مانگتے ہیں اور جب وہ شام کو عیادت کرتا ہے تو صبح تک فرشتے اس کی مغفرت کے لیے بارگاہِ الٰہی میں دعا کرتے ہیں[5]۔ یہ بھی آیا ہے کہ "جب کوئی کسی بیمار کی عیادت کو جاتا ہے تو واپسی تک وہ جنت کے میوے چنتا رہتا ہے[6]" فرمایا کہ جب کوئی کسی کی عیادت کے لیے جائے تو اس کے ہاتھ اور پیشانی پر ہاتھ رکھے اور اس کو تسلّی اور دلاسہ دے اور اس کو شفا پانے کے لیے خدا سے دعا کرے[7]۔

---

[1] صحیح مسلم باب ثواب المومن فیما یصیبہ وسنن ابی داوٗد، اوائل کتاب الجنائز۔ [2] ابو داوٗد کتاب الادب فی المعونۃ للمسلم۔ [3] صحیح بخاری کتاب الجنائز۔ [4] صحیح بخاری، کتاب الجنائز۔ [5] سنن ابی داوٗد، کتاب الجنائز۔ [6] صحیح مسلم باب عیادۃ المریض، بطرق مختلفۃ۔ [7] سنن ابی داوٗد کتاب الجنائز۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی تعلیم سے صحابۂ کرام کو بیماروں کی عیادت کا اس قدر اہتمام تھا کہ وہ اس کو ایک اسلامی حق جانتے تھے بلکہ اس معاملہ میں مسلمان اور غیر مسلمان کی بھی تفریق نہ تھی۔ آپ نے یہودیوں کی عیادت فرمائی ہے[1]، منافقوں کی عیادت کو تشریف لے گئے ہیں[2] اور اسی سے علمانے غیر مسلموں کی عیادت کی بھی اجازت دی ہے[3]۔

حضرت سعد بن معاذؓ جب زخمی ہوئے تو آپ نے اُن کا خیمہ مسجد میں نصب فرمایا تاکہ بار بار اُن کی عیادت کی جا سکے[4]۔ رفیدہؓ ایک صحابیہ تھیں جو ثواب کی خاطر زخمیوں کا علاج اور اُن کی خدمت کیا کرتی تھیں۔ اُن کا خیمہ بھی اسی مسجد میں رہتا تھا تاکہ لڑائیوں کے مسلمان زخمیوں کی تیمارداری اور مرہم پٹی کریں[5]۔ غزوات اور لڑائیوں میں بھی بعض بیبیاں فوج کے ساتھ رہتی تھیں جو بیماروں کی خدمت اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں[6]۔

آپؐ نے اپنے پیرووں کو عمومیت کے ساتھ حکم دیا ہے کہ "بھوکے کو کھلاؤ، قیدی کو چھڑاؤ، اور بیمار کی عیادت کرو[7]"

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عیادت کی فضیلت حسبِ ذیل مؤثر و دلکش طرزِ ادا میں ظاہر فرمائی کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ دریافت فرمائے گا کہ "اے آدم کے بیٹے میں بیمار پڑا تو میری عیادت تو نے نہ کی" وہ کہے گا "اے میرے پروردگار! تو تو سارے جہاں کا پروردگار تھا میں تیری عیادت کیوں کر کرتا" فرمائے گا "کیا تجھے خبر نہ ہوئی کہ

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجنائز۔ [2] صحیح بخاری کتاب الجنائز۔ [3] مجمع البحار علامہ طاہر فتنی لفظ عیادۃ۔ [4] سنن ابی داؤد، کتاب الجنائز

[5] سیرت ابن ہشام، غزوۂ بنی قریظہ و ادب المفرد بخاری باب کیف اصبحت و اصابہ ابن حجر وغیرہ میں حضرت رفیدہؓ کا حال پڑھیے۔ [6] صحیح مسلم، غزوۃ النساء۔ [7] مسند احمد صفحہ ۳۹۴/۴ ۔

میرا بندہ بیمار ہوا مگر تُو نے اس کی عیادت نہ کی اگر کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔"[1]

تعلیم کی یہ طرزِ ادا، بیمار پُرسی، بیماروں کی تیمارداری اور غم خواری کی کیسی دلنشیں تلقین ہے اور صابر و شاکر بیمار کی کیسی ہمّت افزائی ہے کہ اس کا رب گویا اس کے سرہانے کھڑا اپنی مہربانیوں سے اسے نوازتا رہتا ہے اور اس کے درجوں اور رتبوں کو بلند کرتا رہتا ہے۔ اور کیسے خوش قسمت وہ لوگ ہیں جو ان بیماروں کی خدمت کر کے خدا کا قرب پاتے ہیں۔

---

[1] صحیح مسلم باب فضل عیادۃ المریض۔

غلاموں کے حقوق

انسانیت کے کمزور اور ناتواں طبقوں میں غلاموں کی بھی ایک جماعت ہے۔ ہم کو دنیا کی تاریخ جب سے معلوم ہے یہ طبقہ موجود نظر آتا ہے۔ قوی اور فاتح قوموں نے ہمیشہ مفتوح قوم کے افراد کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہے یعنی خود بادشاہ بن کر عیش و راحت، سیر و تفریح، اور حکومت و شہنشاہی کے کام کیے اور مفتوح افراد سے کان کنی، کاشتکاری اور محنت و مزدوری کے مشقت والے کام لیے۔ ہندوؤں میں اچھوت قومیں اسی کی یادگار ہیں، مصریوں میں قیدی بنی اسرائیل کی یہی کیفیت تھی، رُومیوں میں غیر رومی اسی غلامی اور مشقت و محنت کے کاموں میں مصروف رکھے جاتے تھے، اور عربوں میں بھی اُن کے ساتھ یہی برتاؤ تھا بلکہ عربوں میں قبائلی نظام ہونے کے سبب سے ہر وہ شخص جو کسی قبیلہ سے وابستہ نہ تھا وہ مظلوم ہر قبیلہ کے آدمیوں کے ظلم و ستم کا تختۂ مشق تھا کیونکہ اس کو اپنی حفاظت کے لیے کسی قبیلہ کی قوّت حاصل نہ تھی۔ چنانچہ اسلام کے آغاز میں ظالم قریشیوں نے جن لوگوں پر سب سے زیادہ ستم ڈھائے وہ یہی تھے۔

اسلام زیردستوں کی مدد اور کمزوروں کی حمایت میں اٹھا تھا۔ نبوّت سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے جس معاہدۂ فضول میں شرکت کی تھی اور جس کو نبوّت کے

بعد بھی پورا کرنا اپنا فرض جانتے تھے وہ اسی غرض سے منعقد ہوا تھا کہ ان زیردستوں کی حفاظت اور حمایت کی جائے۔ اسی لیے اسلام کی آواز پر قریش کے رئیسوں سے پہلے قریش کے غلاموں اور کنیزوں نے لبیک کہا۔ چنانچہ زید بن حارثہؓ، خباب بن الارتؓ، بلال حبشیؓ یاسر یمنیؓ، عمارؓ، صہیب رومیؓ، ابوفکیہہؓ، عامرؓ بن فہیرہؓ اور سالمؓ غلاموں میں اور لبینہؓ، زنیرہؓ نہدیہؓ، ام عبیسؓ اور سمیہؓ لونڈیوں میں سب سے پہلے اسلام کی آغوش میں آئیں۔ اور زیدؓ بن حارثہ کے سوا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ میں پرورش پا رہے تھے سب نے اسلام کی محبت اور الفت میں سخت سے سخت کڑیاں جھیلیں اور بعض نے اسی راہ میں اپنی جانیں بھی دیں۔

اسلام نے غلاموں کی آزادی اور ان کے ساتھ حسن سلوک کو اپنی تحریک کا لازمی جز بنا لیا تھا۔ غلاموں کی آزادی کو بڑے ثواب کا کام قرار دیا تھا۔ سورۃ بلد میں جو مکہ میں نازل ہوئی تھی جن کاموں کو "گھاٹی" بتایا گیا ہے ان میں ایک فَكُّ رَقَبَةٍ "گردن سے غلامی کی رسی کو کھولنا" بھی ہے۔ چنانچہ مکہ کی پرخطر زندگی میں بھی حضرت خدیجہؓ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور دوسرے اہل ثروت مسلمانوں نے بہت سے غلاموں کو کافروں سے خرید خرید کر آزاد کر دیا تھا۔

مدینہ آکر اس تحریک نے اور فروغ پایا۔ تَحْرِيرُ رَقَبَةٍ یعنی گردن کو آزاد کرنا بہت سی فروگذاشتوں کا کفارہ قرار پایا اور غلاموں کے آزاد کرنے کے لیے بہت سی ترغیبات کا اعلان کیا گیا۔ صحابہ نے اپنے پیغمبرؐ کی اس آواز پر لبیک کہا اور چند روز میں غلاموں کی دنیا کچھ سے کچھ ہو گئی۔ حضرت حکیم بن حزامؓ نے جو فتح مکہ کے دن اسلام لائے ہیں اسلام کے بعد سو غلام آزاد کیے[1]۔ حضرت عائشہؓ نے صرف ایک قسم کے کفارہ میں چالیس

---

[1] صحیح مسلم کتاب الایمان۔

غلام آزاد کیے[1]۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک ہزار اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے تیس ہزار غلاموں کو آزادی کی نعمت عطا کی[2]۔

شرک کی ممانعت کے بعد اللہ کا دوسرا حکم یہ ہے کہ اُس کے بندوں کے ساتھ نیکی کی جاتے۔ ان بندوں میں سرِ فہرست جن لوگوں کے نام ہیں اُن میں یہ مظلوم فرقہ بھی ہے۔ فرمایا:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ بِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۝

(النسآء: ۳۶)

اور اللہ کو پوجو اور کسی کو اس کا ساجھی نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو، اور رشتہ دار کے ساتھ اور یتیموں کے ساتھ، اور عزیز پڑوسی اور بیگانہ پڑوسی کے ساتھ، اور پہلو کے رفیق کے ساتھ، اور مسافر کے ساتھ اور اس کے ساتھ جس کے تمہارے ہاتھ مالک بن گئے ہیں۔ اور اللہ غرور اور فخاری کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

یہ آخری ہستی وہی ہے جس کو دنیا غلام کہہ کر پکارتی ہے۔ لیکن اسلام نے اس کی بھی ممانعت کر دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی آقا اپنے غلام کو میرا عبد نہ کہے بلکہ فتای میرا جوان کہے۔ اور اسی طرح غلاموں کو ممانعت کی کہ "وہ اپنے آقاؤں کو ربّ نہ

[1] صحیح بخاری جلد دوم کتاب الآداب باب الجبوہ [2] یہ دونوں تعدادیں امیر اسماعیل نے شرح بلوغ المرام کتاب العتق میں نقل کی ہیں۔

کہیں بلکہ مولیٰ کہیں[1]"۔ اس طرح ان ذلت کے الفاظ کا بھی خاتمہ کر دیا اور فرمایا کہ "یہ جن کو تم غلام کہتے ہو یہ بھی تمہارے بھائی ہیں جن کو خدا نے تمہارے تحت میں کر دیا ہے۔ پس جس کو خدا نے تمہارے تحت میں کر دیا ہے تو اس کو وہ کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو اور وہی پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو اور اس کو اتنا کام نہ دو جو اس پر بھاری ہو جائے اور جو بھاری کام بھی دے تو اس کے کام میں خود بھی شریک ہو کر اس کی مدد کرے[2]"۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حکم پر صحابہ نے اس طرح عمل کیا کہ اُن کے غلاموں اور آقاؤں کے درمیان تمیز مشکل ہو گئی تھی[3]۔ ان بے خانماں افراد کو اُن کے آقاؤں کے گھروں کا غلام بنا کر نہیں بلکہ ایک طرح سے ارکان اور ممبر بنا رکھا کہ جس غلام کو جو آزاد کرے گا وہ اسی کے علاقہ مندوں (موالی) میں شمار ہو گا[4]۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں اپنے فوجی افسروں کو حکم دیا تھا کہ رومی اور عجمی آزاد غلام جو مسلمان ہو گئے ہوں اُن کو اُن کے قدیم آقاؤں کے خاندانوں میں شمار کرو۔ جو اُن کا حق ہو وہ ان کا ہو اور اگر یہ غلام چاہیں تو اپنا ایک الگ مستقل قبیلہ بنا لیں[5]۔ ان تعلیمات نے ان غلاموں کو غلام نہیں بلکہ اسلام کا سردار اور مملکتوں کا بادشاہ بنا دیا۔ اسلام کی تاریخ ان واقعات سے لبریز ہے، جس کی تفصیل آئندہ جلد میں اپنے مناسب موقع پر آئے گی۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب العتق۔ [2] صحیح بخاری جلد دوم کتاب الآداب باب ماینہی عن السباب۔ [3] صحیح بخاری جلد دوم کتاب الآدب باب ماینہی عن السباب۔ [4] حدیث میں ہے انما الولاء لمن اعتق (ولاء کا حق اسی کو ہے جو آزاد کرے)۔ دوسری حدیث میں او انتمیٰ الی غیر موالیہ فعلیہ لعنۃ اللہ (جو غلام آزاد ہو کر اپنے غیر آقا کی طرف اپنے کو منسوب کرے تو اس پر خدا کی لعنت) امام نووی شرح میں لکھتے ہیں بل ھو لحمۃ کلحمۃ النسب یعنی آزاد غلام اور آقا کے درمیان ولاء کا تعلق نسب کے تعلق کی طرح ہے (صحیح مسلم کتاب العتق) [5] کتاب الاموال ابی عبید قاسم بن سلام المتوفی ۲۲۴ھ مطبوعہ مصر ص ۲۳۵۔

مہمان کے حقوق

موجودہ نظامِ تمدّن میں گو مہمانی کی زحمت ہوٹلوں اور ریسٹرانوں نے اپنے سر لے لی ہے مگر گذشتہ نظامِ تمدّن میں اس کی جگہ نہایت اہم تھی۔ اور اب بھی مہمان نوازی شرقی تمدّن کے خمیر میں داخل ہے اور مغربی تمدّن نے بھی اس کی رسمی حیثیت کو باقی رکھا ہے۔ ہر انسان کسی نہ کسی وقت کسی کا مہمان ہوتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا چاہیے کہ سوسائٹی کے نظام میں اس کی حیثیت مبادلۂ اخلاق کی ہے۔ آج ہم اپنے مہمان کے ساتھ نیک سلوک اور عزت کا برتاؤ کریں گے تو کل وُہ ہمارے ساتھ کرے گا۔ گذشتہ مذاہب کے اخلاق میں مہمان نوازی کی تعلیم کا ذکر خصوصیت کے ساتھ نہیں لیکن اہلِ عرب میں مہمان کا بہت بڑا حق سمجھا جاتا تھا۔ مہمان کی خدمت اور حفاظت میزبان اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اسلام آیا تو اس نے اس فرض کی اہمیت کو اور بڑھا دیا۔

قرآن مجید میں حضرت ابراھیم علیہ السّلام کے مہمانوں کا ذکر سورۃ ذاریات کی ان آیتوں میں آیا ہے:

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ۝ اِذْ دَخَلُوْا	(اے پیغمبر) ابراھیم کے معزز مہمانوں کی حکایت بھی تم تک پہنچی ہے؟ کہ

عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ۝ فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ۝ فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ۝ فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ ؕ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ۝

(الذّٰرِیٰت: ۲۴-۲۸)

جب (یہ لوگ) اُن کے پاس آئے تو (آتے ہی) سلام علیک کی۔ ابراہیم نے سلام کا جواب دیا۔ (اور دل میں کہا کہ یہ) لوگ (تو کچھ) اجنبی (سے معلوم ہوتے) ہیں۔ پھر جلدی سے اپنے گھر جا (ایک موٹا تازہ بچھڑا (یعنی اس کا گوشت بھنوا کر مہمانوں کے لیے) لائے۔ اور ان کے سامنے رکھا (تو انہوں نے تامل کیا۔ ابراہیم) پوچھا آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں۔ (اس پر بھی انہوں نے کھانے سے انکار کیا تب) تو ابراہیم ان سے جی ہی جی میں ڈرے۔ انہوں نے (ان کی یہ حالت دیکھ کر) کہا کہ آپ (کسی طرح کا) اندیشہ نہ کریں، اور ان کو ایک ہوشیار فرزند کی خوشخبری بھی دی۔

اس حکایت سے آدابِ مہمانداری کے متعلق حسبِ ذیل نتیجے نکالے جا سکتے ہیں:

(۱) مہمان اور میزبان میں کلام کی ابتدا باہمی سلام سے ہونا چاہیے۔

(۲) مہمان کے کھانے پینے کا فوراً سامان کرنا چاہیے کیونکہ "روغان" کے معنی سرعت کے ہیں۔

(۳) روغان کے ایک معنی چپکے چلے جانے یا دزدیدہ نگاہوں سے دیکھنے کے بھی ہیں۔ اس لیے مہمانوں کے کھانے پینے کا سامان مخفی طور پر اُن کی نگاہ بچا کر کرنا چاہیے کیونکہ اگر مہمانوں کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے لیے کچھ سامان کیا جا رہا ہے تو وہ ازراہِ تکلف اس کو روکیں گے۔ اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اہل و عیال سے یہ نہیں کہا کہ کھانے پینے کا سامان کرو بلکہ چپکے سے خود کھانے پینے کا سامان کرنے چلے گئے۔

(۴) کسی بہانے سے تھوڑی دیر کے لیے مہمانوں سے الگ ہو جانا چاہیے تاکہ اُن کو آرام کرنے یا دوسری ضروریات سے فارغ ہونے میں تکلیف نہ ہو۔ اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کھانے پینے کا سامان کرنے کے لیے اُن سے الگ ہو گئے۔

(۵) مہمانوں کے سامنے عمدہ سے عمدہ کھانا پیش کرنا چاہیے۔ اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک موٹا تازہ بچھڑا ذبح کیا۔

(۶) کھانا مہمانوں کے سامنے پیش کرنا چاہیے اُن کو کھانے کا حکم نہیں دینا چاہیے۔ اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُن سے کہا کہ آپ لوگ کیوں نہیں کھاتے۔ یہ نہیں کہا کہ آپ لوگ کھائیے۔

(۷) مہمانوں کے کھانے سے مسرور اور نہ کھانے سے مغموم ہونا چاہیے کیونکہ جو لوگ بخیل ہوتے ہیں وہ کھانا تو مہمانوں کے سامنے پیش کر دیتے ہیں لیکن اُن کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ مہمان نہ کھائے یا کم کھائے تاکہ وہ کھانا ان کے اور اُن کے اہل و عیال کے کام آئے۔ اسی لیے جب اُن لوگوں نے کھانے سے انکار کیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کو ناپسند کیا اور اُن کے دل میں خطرہ پیدا ہوا کہ یہ دشمن بن کر تو نہیں آئے ہیں۔

(۸) نہ کھانے کی حالت میں مہمانوں کو عمدہ الفاظ میں عذر کرنا چاہیے۔ اسی لیے

ان فرشتوں نے کہا کہ اگر ہم نہیں کھاتے تو آپ کو خوف زدہ نہ ہونا چاہیے کیوں کہ ہم لوگ کھا پی نہیں سکتے بلکہ صرف آپ کو ایک لائق فرزند کے تولّد کی بشارت دینے کے لیے آئے ہیں۔

سورۂ حجر میں حضرت لوط علیہ السّلام کے مہمان فرشتوں کا جو قصّہ بیان کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آرام و آسایش کا خیال رکھنے کے ساتھ میزبان مہمان کی عزّت و آبرو کا بھی محافظ ہوتا ہے۔ اس لیے اگر کوئی شخص اس کے ساتھ اہانت آمیز برتاؤ کرنا چاہے تو میزبان کا یہ فرض ہے کہ مہمان کی جانب سے مدافعت کرے کیونکہ اس سے خود میزبان کی توہین ہوتی ہے۔ اسی لیے جب قومِ لوط نے ان مہمان فرشتوں کے ساتھ توہین آمیز برتاؤ کرنا چاہا تو حضرت لوط علیہ السّلام نے

قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِىْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ۝ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ۝ (الحجر: ۶۸-۶۹)	کہا یہ میرے مہمان ہیں تو (ان کے بارے میں) مجھ کو فضیحت نہ کرو۔ اور خدا سے ڈرو اور مجھے رسوا نہ کرو۔

یہ تو قرآن مجید کے ضمنی ارشادات تھے لیکن رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے مکارمِ اخلاق میں مہمان نوازی کو بہ تصریح اس قدر اہمیت دی کہ اس کو ایمانِ کامل کا ایک جزء قرار دیا اور فرمایا کہ "جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے پڑوسی کی عزّت کرے۔ اور جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے مہمان کا جائزہ عزّت کے ساتھ دے" کہا گیا کہ "یا رسُولَ اللہ اس کا جائزہ کیا ہے؟" فرمایا کہ "ایک دن اور ایک رات اور مہمانی تین دِن کی ہے اس کے آگے مہمان پر صدقہ ہوگا۔"[1]

---

[1] بخاری کتاب الادب باب من کان یومن باللہ والیوم الآخر فلا یوذ جارہ۔

نیز فرمایا کہ "جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے اور جو شخص خدا اور قیامت کے دن پر ایمان لایا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے قرابت کے تعلقات کو جوڑے رکھے[1]"

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عبداللہ بن عمرؓو کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کیا مجھے یہ نہیں خبر ملی ہے کہ تم رات بھر نماز پڑھتے ہو، اور دن کو روزہ رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا بیشک۔ فرمایا ایسا نہ کرو نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی، روزہ بھی رکھو اور بے روزہ بھی رہو کیوں کہ تمہارے اوپر تمہارے جسم کا حق ہے، تمہاری آنکھ کا حق ہے، تمہارے مہمانوں کا حق ہے اور تمہاری بی بی کا حق ہے[2]۔

ایک حدیث میں ہے کہ "ایک شب کی مہمانی تو واجب ہے پھر اگر مہمان کسی کے یہاں رہ جائے تو مہمانی اس پر قرض ہے چاہے وہ لے چاہے چھوڑ دے[3]"

چونکہ کہیں مہمان ہونا میزبان کے لیے بہرحال یک گونہ تکلیف کا باعث ہے اور کسی کے ہاں بے وجہ مفت کھانا انسانی اور اسلامی غیرت کے خلاف ہے اس لیے ضرورت تھی کہ جہاں میزبان کو مہمان کی خاطر تواضع اور تعظیم و تکریم کی ہدایت کی گئی ہے وہاں مہمان کو بھی یہ بتا دیا جائے کہ وہ کسی دوسرے کے خوانِ کرم سے حدِ ضرورت سے زیادہ فائدہ نہ اٹھائے چنانچہ احادیث میں یہ تصریح کر دی گئی ہے کہ مہمان کو کسی کے یہاں تین دن سے زیادہ نہیں ٹھہرنا چاہیے کیوں کہ اس سے صاحب خانہ کو تکلیف ہوگی اور اس پر بار پڑے گا[4]۔ اس کے علاوہ تین دن سے زیادہ کی مہمانی صدقہ ہو جائے گی جس کو خود غیور اور خود دار مہمان پسند نہ کرے گا۔

---

[1] بخاری کتاب الادب باب اکرام الضیف وخدمتہ ایاہ بنفسہ وقولہ تعالیٰ ضیف ابراھیم المکرمین [2] بخاری کتاب الادب باب حق الضیف [3] ابن ماجہ کتاب الادب باب حق الضیف۔ [4] بخاری کتاب الادب باب اکرام الضیف وخدمتہ ایاہ بنفسہ۔

مسلمانوں کے باہمی حقوق

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے عرب کا بچہ بچہ ایک دوسرے کے خون کا پیاسا اور ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا دشمن تھا۔ ایک ایک خون کا بدلہ کئی کئی پشتوں تک جا کر لیتے تھے۔ اس طرح خاندانوں میں لڑائیوں کا ایک غیر منقطع سلسلہ جاری تھا اور ہر شخص اپنی جگہ پر اپنے کو ہمیشہ خطروں میں گھرا ہوا پاتا تھا۔ اور اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، چلتے پھرتے ہر وقت چوکنا رہتا تھا کہ کوئی اُس پر حملہ نہ کر بیٹھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو اپنے ساتھ خون کے رشتہ سے بڑھ کر ایک اور رشتہ لائے اور وہ دین کا رشتہ تھا جس نے مدّت کے بچھڑوں کو ملا دیا، دشمنوں کو بھائی بھائی بنا دیا، اور خاندانی و قبائلی یگانگی سے بڑھ کر اسلامی برادری کی یگانگی اُن کے اندر پیدا کر دی جس نے اس طرح ان کی ہر قسم کی عداوتوں کا خاتمہ کر دیا اور باہمی دُشمنیوں کو ان کے دلوں سے ایسا بُھلا دیا کہ وہ حقیقت میں بھائی بھائی بن گئے۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا:

یَآاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ	اے مُسلمانو! خدا سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ اور نہ تم مرو لیکن مُسلمان۔ اور خُدا کی رسّی کو مضبوطی سے

اللّٰہِ جَمِیۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا ۪ وَاذۡکُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ اِذۡ کُنۡتُمۡ اَعۡدَآءً فَاَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِکُمۡ فَاَصۡبَحۡتُمۡ بِنِعۡمَتِہٖۤ اِخۡوَانًا ۚ

پکڑے رہو اور ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو، اور تم اپنے اُوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو کہ تم دشمن تھے تو اللہ نے تمہارے دِلوں کو جوڑ دیا پھر تم بھائی بھائی ہوگئے۔

(آل عمرٰن: ۱۰۲-۱۰۳)

مُسلمانوں کے اس باہمی میل ملاپ اور محبّت کو اللہ تعالیٰ نے اپنا خاص فضل ظاہر فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اگر کوئی روئے زمین کا سارا خزانہ بھی لٹا دیتا تو ان دشمنوں کو باہم ملا کر ایک نہیں کر سکتا تھا:

وَاَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِہِمۡ ؕ لَوۡ اَنۡفَقۡتَ مَا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا مَّاۤ اَلَّفۡتَ بَیۡنَ قُلُوۡبِہِمۡ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ اَلَّفَ بَیۡنَہُمۡ ؕ اِنَّہٗ عَزِیۡزٌ حَکِیۡمٌ ○

اور خدا نے مُسلمانوں کے دل ملا دیئے۔ اگر تو زمین میں جو کچھ ہے سب خرچ کر دیتا تب بھی تو ان کے دلوں کو ملا نہ سکتا لیکن خدا نے ملا دیا۔ بیشک وُہ (ہر مشکل پر) غالب آنے والا اور مصلحت جاننے والا ہے۔

(الانفال: ۶۳)

تو اب مُسلمانوں کو یہ چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے اس فضل کی قدر کریں اور سب مل کر خدا کے دین کی رسّی کو جو اُن کی یگانگی کا اصلی رشتہ ہے مضبُوط پکڑیں۔ اور باہم اختلاف پیدا کر کے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائیں کیونکہ اس رسّی کی مضبوطی اسی وقت تک ہے جب تک سب مل کر اس کو پکڑے رہیں فرمایا:

وَاَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ وَلَا تَنَازَعُوۡا

اور اللہ اور رسُول کا کہا مانو اور

فَتَفۡشَلُوۡا وَتَذۡهَبَ رِيۡحُكُمۡ (الانفال: ۴۶)

آپس میں جھگڑا نہ کرو (کہ ایسا ہو گا تو) ہمّت ہار دو گے اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی۔

یہی باہمی اتّفاق و اتّحاد ملّتِ اسلامیہ کی عمارت کا ستون ہے اور مُسلمانوں کی جماعت کا شیرازہ۔ اس شیرازہ کے استحکام کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ مُسلمانوں میں باہم اُلفت و محبّت ہو۔ اب اگر اتّفاق سے اُن میں اختلاف پیش آجائے تو اُس کے دور کرنے کی صورت یہ ہے کہ دونوں خدا و رسُول کے حکم کی طرف رجوع کریں:

فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِيۡ شَيۡءٍ فَرُدُّوۡهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوۡلِ (النسآء: ۵۹)

تو اگر تم (مسلمانوں) میں کسی بات میں جھگڑا ہو تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو۔

اگر یہ جھگڑا بڑھتے بڑھتے جنگ تک پہنچ جائے تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ جو فریق ظالم ہو سب مل کر اس سے لڑیں اور اس کو صلح پر مجبور کریں۔ اور جب وُہ راضی ہو جائے تو عدل وانصاف سے اُن میں صلح کرا دیں۔

وَاِنۡ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اقۡتَتَلُوۡا فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَهُمَا ۚ فَاِنۡۢ بَغَتۡ اِحۡدٰىهُمَا عَلَى الۡاُخۡرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيۡ تَبۡغِيۡ حَتّٰى تَفِيۡٓءَ اِلٰٓى اَمۡرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنۡ فَآءَتۡ فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَهُمَا بِالۡعَدۡلِ وَاَقۡسِطُوۡا ؕ اِنَّ

اگر مُسلمانوں کے دو گروہ لڑ پڑیں تو اُن میں صلح کرا دو۔ پھر اگر ایک دُوسرے پر ظلم کرے تو ظلم کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجُوع ہو۔ تو اگر وہ رجُوع کرلے تو ان میں عدل کے ساتھ صلح

اللہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ○ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ (الحجرات : ۹-۱۰)	کرادو اور انصاف کرو۔ خدا منصفوں کو دوست رکھتا ہے۔ مومن تو آپس میں بھائی ہی ہیں تو اپنے دونوں بھائیوں کے درمیان صلح کرادو۔

آیت کے اخیر ٹکڑے نے بتایا کہ باہم مسلمانوں میں بھائی بھائی کا رشتہ ہے۔ یہ رشتہ جنگ وخونریزی کے بعد بھی نہیں کٹتا۔ انہی آیتوں کے تحت میں وہ حدیث ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انصر اخاک ظالما او مظلوما (بخاری)	تم اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔

صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ اگر وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد کی جاسکتی ہے لیکن اگر وہ ظالم ہو تو اس کی مدد کیوں کر کی جائے۔ فرمایا اس طرح کہ اُس کے ہاتھوں کو ظلم سے روکا جائے۔

کیسا ہی بڑے سے بڑا کافر، اور سخت سے سخت دشمن ہو جس وقت اُس نے کلمۂ شہادت پڑھا اور شریعتِ اسلامی کو قبول کیا وہ دفعتہً ہمارا مذہبی بھائی ہوگیا۔ خدا نے فرمایا:

فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ فَاِخْوَانُکُمْ فِی الدِّیْنِ (التوبۃ: ۱۱)	تو اگر یہ کافر (کفر سے) توبہ کرلیں اور نماز کھڑی کریں اور زکوٰۃ دیں تو وہ تمہارے مذہبی بھائی ہیں۔

غلام بھی اگر کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوجائے تو وہ اسلام کے رشتہ میں داخل ہوگیا۔ اگر اس کے باپ کا نام ونسب نہیں معلوم تو کوئی حرج نہیں وہ دین کے رشتہ سے ہر مسلمان کا بھائی

ہے۔ فرمایا:

فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ (الاحزاب: ۵)

تو اگر تم اُن کے باپوں کے نام نہ جانو تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں اور علاقہ مند۔

ایک مسلمان کسی مسلمان کو قتل کر دے، تب بھی اللہ تعالیٰ مقتول کے رشتہ داروں کو قاتل کا بھائی قرار دے کر اُن کے جذبۂ رحم کی تحریک فرماتا ہے۔ارشاد ہوتا ہے:

فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ (البقرة: ۱۷۸)

تو اگر قاتل کو اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا جائے۔

ایک مسلمان پر دُوسرے مسلمان کی غیبت حرام ہے کیوں کہ

اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا (الحجرات: ۱۲)

کیا تم میں کوئی پسند کریگا کہ وہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔

یتیموں کے مال کی دیکھ بھال اور خوبی سے اس کا انتظام کرنا متولیّوں کا فرض ہے اور اگر وہ اُن کو اپنے اندر شامل کر کے نیک نیّتی کے ساتھ اُن کو اپنے کنبہ کا جز بنالیں اور ملا جلا کر خرچ کریں تو یہ بھی درست ہے کیونکہ یہ اُن کے بھائی ہیں جن کی خیر خواہی اُن کا فرض ہے۔ فرمایا:

وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ (البقرة: ۲۲۰)

اور اگر تم ان کو اپنے میں ملا لو (تو یہ بھی جائز ہے) کیونکہ وہ تمہارے بھائی ہیں۔

ایک مسلمان بھائی کا دُوسرے مسلمان بھائی پر یہ بھی حق ہے کہ وہ ایک دُوسرے کے

حق میں دعائے خیر کریں۔ وہ یوں کہتے ہیں :

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ (الحشر: ۱۰)	اے ہمارے پروردگار ہم کو اور ہمارے اُن بھائیوں کو جو ہم سے پہلے ایمان لائے معاف کر۔

ایک مُسلمان کے دِل میں دوسرے مُسلمان کی طرف سے کینہ ہونا ایسی بُرائی ہے جس کے دُور کرنے کے لیے خُدا سے گڑگڑا کر دُعا مانگنی چاہیے اور کہنا چاہیے :

وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ○ (الحشر: ۱۰)	اور ہمارے دِلوں میں مُسلمانوں کی طرف سے کینہ مت رہنے دے اے ہمارے پروردگار تو مہربان رحم والا ہے۔

مُسلمانوں کی یہ صفت ہے کہ باہم وہ ایک دوسرے سے رحم و شفقت کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ خدا نے مدح فرمائی :

رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (الفتح: ۲۹)	وہ (مُسلمان) آپس میں رحم و شفقت رکھتے ہیں۔

مُسلمان کی یہ صفت ہونی چاہیے کہ وہ دوسرے مُسلمان سے جھک کر ملے اور نرمی کا برتاؤ کرے :

اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ (المائدہ: ۵۴)	مُسلمانوں سے جھکنے اور نرمی کرنے والے۔

مُسلمانوں کی اِس باہمی اخوت و محبّت اور مہربانی کی مزید تشریح اور تاکید محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی زبانِ فیض ترجمان سے یوں فرمائی ہے۔ "مُسلمانوں کو باہم ایک

دُوسرے پر رحم کرنے، محبّت کرنے، اور شفقت کرنے میں جسمِ انسانی کی طرح دیکھو گے کہ اس کے ایک عضو میں بھی تکلیف ہو، تو بدن کے سارے اعضاء بخار اور بے خوابی میں مبتلا ہو جاتے ہیں[1]۔ صحیح مسلم کی ایک اور روایت میں ہے کہ فرمایا "سارے مُسلمان مل کر ایک آدمی کے مثل ہیں کہ اگر اس کی آنکھ بھی دُکھے تو سارا بدن دُکھ محسوس کرتا ہے، اور اگر سر میں دَرد ہو تو پورا جسم تکلیف میں ہوتا ہے[2]۔" مقصود یہ ہے کہ اُمّتِ مسلمہ ایک جسم ہے اور اُس کے سارے افراد اس کے اعضا ہیں۔ بدن کے ایک عضو میں بھی اگر کوئی تکلیف یا دکھ درد ہو تو سارے اعضا اس تکلیف کو محسوس کرتے ہیں اور اس دُکھ دَرد میں شریک ہوتے ہیں یہی مُسلمانوں کا حال ہونا چاہیے، کہ اُن میں سے ایک کو بھی تکلیف پہنچے تو سارے مُسلمانوں کو وہ تکلیف محسوس ہونی چاہیے۔

ایک دوسری تمثیل میں آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ "مُسلمان باہم ایک دُوسرے سے مِل کر اس طرح مضبوط ہوتے ہیں جیسے دیوار کہ اس کے ایک حصّہ سے اس کا دوسرا حصّہ مضبوط ہوتا ہے[3]۔" بخاری میں ہے کہ یہ کہہ کر آپؐ نے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر دکھایا کہ کیسے ایک حصّہ سے دُوسرا حصّہ مضبوط ہوتا ہے۔ اس تمثیل میں آپؐ نے یہ ارشاد فرمایا کہ جس طرح دیوار کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے مِل کر مضبوط ہو کر ناقابلِ تسخیر حصن وحصار بن جاتی ہے اسی طرح جماعتِ اسلامیہ ایک قلعہ ہے۔ جس کی ایک ایک اینٹ ایک ایک مُسلمان ہے۔ یہ قلعہ اسی وقت تک محفوظ ہے جب تک اُس کی ایک اینٹ دوسری اینٹ سے مِلی ہوئی ہے۔ جب یہ اینٹ اپنی

---

[1] صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۸۸۳ کتاب الادب وصحیح مسلم ج ۲ صفحہ ۳۸۹ کتاب البّر والصلۃ والآداب، مصر۔ [2] صحیح مسلم ج ۲ صفحہ ۳۸۹ مصر، کتاب البرّ والصلۃ والآداب [3] صحیح بخاری کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۸۹ وصحیح مسلم کتاب البرّ والصلۃ والآداب ج ۲ صفحہ ۳۸۹ مصر

جگہ سے کھسک جائے گی تو پوری دیوار دھم سے زمین پر آجائے گی۔

ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ "ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے نہ وہ اس پر ظلم کرے، نہ اس کو بے مدد چھوڑے، اور نہ اس کی تحقیر کرے۔ انسان کے لیے یہ برائی کیا کم ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے۔ مسلمان کا ہر حصہ دوسرے مسلمان پر حرام ہے اُس کا خون، اس کا مال اور اس کی آبرو"[1] یہ صحیح مسلم کی روایت ہے۔ ابوداؤد میں ہے کہ فرمایا "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، تو وہ نہ اس پر ظلم کرے اور نہ اس کو اس کے دشمن کے حوالہ کرے۔ جو کوئی اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں رہے گا تو خدا اس کی ضرورت پوری کرے گا، اور جو کوئی کسی مسلمان کی تنگی کو دور کرے گا تو خدا اس کے بدلہ قیامت میں اس کی تنگی کو دور فرمائے گا، اور جو کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کا پردہ رکھے گا"[2]

ابوداؤد کی دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا "جو کسی مسلمان کی دنیاوی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی تکلیفوں میں سے کوئی تکلیف دور کرے گا۔ اور جو کسی تنگدست پر آسانی کرے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس پر آسانی کرے گا۔ اور جو کسی مسلمان کا پردہ رکھے گا تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کا پردہ رکھے گا اور اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کی مدد میں رہتا ہے، جب تک وہ بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے۔"[3]

---

[1] صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ والآداب ج ۲ صفحہ ۳۸۲ [2] سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۱۹۰: [3] سنن ابی داؤد کتاب الادب جلد ۲ صفحہ ۱۹۴۔

فرمایا "مُسلمان وُہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مُسلمان بچے رہیں[1]۔" یہ صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے۔ دُوسری میں ہے کہ لوگوں نے دریافت کیا کہ "یا رسُولؐ اللہ! سب سے اچھا مُسلمان کون ہے؟" فرمایا "جس کے ہاتھ اور زبان سے مُسلمان بچے رہیں[2]۔" یعنی جو مُسلمان اپنے ہاتھ اور زبان سے کسی دُوسرے مُسلمان کو تکلیف نہیں پہنچاتا وہی سب سے بہتر مُسلمان ہے۔

جریر بن عبداللہؓ بجلی جو ایک مشہور صحابی تھے کہتے ہیں کہ "میں نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تین باتوں پر بیعت کی۔ نماز کو قائم رکھنا، زکوٰۃ دینا، اور ہر مُسلمان کی خیر خواہی کرنا[3]۔" کئی روایتوں میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "مُسلمان کو گالی دینا خدا کی نافرمانی (فسوق) ہے اور اُس سے لڑنا (قتال) خُدا کا انکار (کفر) ہے[4]۔" یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے مُسلمانوں میں باہم برادری اور صلح و آشتی کا حکم دیا ہے۔ اب جو اس کے خلاف کرتا ہے وہ خدا کے حکم کو نہیں مانتا اور یہ ایک معنی میں خُدا کا انکار ہی ہے چنانچہ اسی لیے قرآن پاک میں مسلمان کے ناحق اور بالارادہ قتل کرنے کی سزا وہی رکھی ہے جو کافروں کے لیے مخصوص ہے۔ فرمایا "کسی مسلمان کو سزاوار نہیں کہ وہ دُوسرے مُسلمان کو قتل کرے الّا یہ کہ غلطی سے ایسا ہو جائے۔"

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا
اور جو کوئی کسی مُسلمان کو قصداً قتل

فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَ
کرے گا تو اس کا بدلہ دوزخ ہے۔

غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ
وُہ اس میں پڑا رہے گا اور خُدا اس پر

---

[1] صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ صفحہ ۶۔ [2] صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ صفحہ ۶ و صحیح مسلم کتاب الایمان ج ۱ صفحہ ۳۶ مصر۔
[3] صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ صفحہ ۱۳۔ [4] صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ صفحہ ۱۲ و ج ۲ صفحہ ۸۹۳۔

لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ۝ خفا ہوا اور لعنت کی اور اس کے لیے بڑا عذاب تیار کیا۔ (النساء: ۹۳)

حجۃ الوداع کے نہایت اہم خطبہ میں آپ نے پہلے لوگوں کو چپ کرایا۔ پھر فرمایا "دیکھو میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔[۱]" ایک اور موقع پر فرمایا کہ "جو ہم (مسلمانوں) پر ہتھیار اٹھاتے وہ ہم میں سے نہیں۔[۲]"

جان تو بڑی چیز ہے کسی مسلمان کی آبرو کے پیچھے پڑنا بھی بڑا گناہ ہے۔ فرمایا "سب سے بڑا ربا (سود) کسی کی آبرو کی طرف بے سبب ہاتھ بڑھانا ہے۔[۳]" اگر کوئی مسلمان کسی ایسے مخمصہ میں گرفتار ہو جس میں اس کی آبرو جانے کا ڈر ہو تو ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کے بچانے کی کوشش کرے۔ ارشاد ہوا "جو کسی مسلمان کو کسی ایسے موقع پر بے مدد چھوڑے گا جس میں اس کی عزت پر حرف آتا ہو اور اس کی آبرو جاتی ہو تو خدا بھی اس کو ایسی جگہ بے مدد چھوڑ دے گا۔ اور جو کوئی کسی مسلمان کی ایسے موقع پر مدد کرے گا تو خدا بھی اس کی ایسے موقع پر مدد فرمائے گا۔[۴]"

اگر دو مسلمانوں میں کسی ناراضی کے سبب سے بول چال بند ہو جائے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین روز سے زیادہ ایسا کرنے سے منع فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ "کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی کو چھوڑ دے، ملاقات ہو تو وہ ادھر منہ پھیرلے اور یہ ادھر منہ پھیرلے۔ اور ان دونوں میں بہتر وہ ہے جو کہ پہلے

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الایمان صفحہ ۲۳۔ [۲] صحیح بخاری کتاب الدیات ج ۲ صفحہ ۱۰۱۵ و کتاب الفتن ج ۲ صفحہ ۱۰۴۰۔ [۳] سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۱۸۹۔ [۴] سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۱۸۹۔

سلام کی ابتدا کرتے[1]۔" ایک اور طریقہ سے یہ روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا "آپس میں کینہ نہ رکھو، حسد نہ کرو اور ایک دُوسرے کو پیٹھ پیچھے بُرا نہ کہو۔ اے خدا کے بندو بھائی بھائی ہو جاؤ۔ اور کسی مُسلمان کے لیے حلال نہیں کہ وُہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ بولنا چالنا چھوڑ دے[2]۔"

ایک مُسلمان کے لیے اس کی عزت و آبرو سے بڑھ کر معاملہ اُس کے ایمان کا ہے۔ قرآن نے کہا کہ جب تم کو کوئی اپنے اظہارِ اسلام کے لیے سلام کرے تو اس کو یہ نہ کہو کہ تُو مُسلمان نہیں :

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَىٰ إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۚ (النساء : ۹۴)	اور اس کو جو تمہاری طرف سلامتی کا کلمہ ڈالے یہ نہ کہو کہ تُو مومن نہیں۔

مقصد یہ ہے کہ جو کوئی اپنے کو مُسلمان کہے یا وہ مُسلمان ہونے کا دعوٰی کرے کسی مُسلمان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کہے کہ تم مسلمان نہیں۔ ایک لڑائی میں ایک صحابی نے ایک کافر کو زد میں پا کر حملہ کیا اس نے فوراً کلمہ پڑھ دیا مگر اس پر بھی اُن صحابی نے اس کو قتل ہی کر دیا۔ یہ خبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی۔ آپ نے اُن کو بُلا کر دریافت کیا۔ انہوں نے عرض کی "یا رسُولَ اللہ اس نے صرف ڈر سے کلمہ پڑھا تھا"۔ آپ نے کس بلیغ انداز میں فرمایا "تم اس کے لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ کیا کرو گے"۔ ایک روایت میں ہے کہ فرمایا "کیا تم نے اس کا سینہ چیر کر دیکھ لیا تھا[3]"۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۹۲۱ و سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۱۹۲۔ [2] صحیح بخاری کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۸۹۶۔ [3] پہلی روایت صحیح بخاری غزوہ حرقات اور کتاب الدیات میں ہے، دُوسری روایت کے لیے دیکھو فتح الباری کتاب الدیات شرح حدیث مذکور۔

ایک دفعہ ارشاد ہوا کہ "مومن کو لعنت کرنا یا اس پر کفر کی تہمت رکھنا اس کے قتل کے برابر ہے[1]" یہ بھی فرمایا کہ "جو کوئی اپنے بھائی کو "اے کافر" کہے تو وہ کفر دو میں سے ایک پر لوٹے گا[2]" یعنی اگر وہ درحقیقت کافر نہ تھا تو اس نے ایک مسلمان کو کافر کہا اور یہ خود ایک درجہ کا کفر ہے۔

جان، ایمان اور آبرو کے بعد مال کا درجہ ہے۔ ارشاد ہوا کہ "جو کوئی قسم کھا کر کسی مسلمان کا حق مارے گا تو خدا اس کے لیے دوزخ واجب اور جنت حرام کرے گا۔ ایک شخص نے عرض کی "یا رسول اللہ! اگر کوئی معمولی سی چیز ہو تب بھی" ؟ فرمایا "درخت کی ایک شاخ ہی کیوں نہ ہو[3]"

فرمایا "ہر مسلمان پر اس کے مسلمان بھائی کے پانچ حق ہیں۔ سلام کا جواب دینا اس کے چھینکنے پر "خدا تم پر رحمت کرے" کہنا، اس کی دعوت کو قبول کرنا، بیمار ہو تو عیادت کرنا اور مر جائے تو اس کے جنازہ کے ساتھ چلنا[4]" یعنی یہ کم سے کم حقوق ہیں جن سے دو مسلمانوں کے درمیان خوش خلقی اور حسن تعلق کا اندازہ ہوتا ہے۔ ارشاد ہوا کہ "جب کوئی مسلمان اپنے بیمار مسلمان بھائی کی عیادت کو جاتا ہے تو وہ جب تک واپس نہ ہو جنت کی روش پر ہوتا ہے[5]" حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا کہ "جو کوئی ایمان و اخلاص کے ساتھ کسی مسلمان کے جنازہ کے پیچھے چلتا ہے یہاں تک کہ اس پر نماز پڑھتا

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۸۹۳۔ [2] صحیح بخاری کتاب الادب صفحہ ۹۰۱ و صحیح مسلم کتاب الایمان ج ۱ صفحہ ۴۳ مصر۔ [3] صحیح مسلم کتاب الایمان ج ۱ صفحہ ۶۵ مصر۔ [4] سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۲۰۱۔ [5] صحیح مسلم ج ۲ صفحہ ۳۸۴ کتاب البر والصلۃ۔

ہے اور اس کے دفن سے فراغت پاتا ہے تو اس کو ثواب کی دو رتّی (قیراط) ملتی ہے جن میں سے ہر رتّی اُحد کے پہاڑ برابر ہو گی[۱]۔" یعنی یہ رتّی دنیاوی پیمانہ کے حساب سے نہ ہو گی بلکہ یہ اُس پیمانہ سے ہو گی جس کا ایک ذرّہ اپنی بڑائی میں پہاڑ کا حکم رکھتا ہے۔

یہ تمام حقوق جن کی جزئیات کا احاطہ نہیں ہو سکتا اُس برادرانہ الفت و محبّت کی فروع ہیں جن کے بغیر کسی مومن کا ایمان کامل نہیں ہوتا۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے اسلام کا کلمہ پڑھنے والوں کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ "تم میں سے کوئی کامل مومن نہ ہو گا جب تک وُہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی نہ چاہے جو وہ اپنے لیے چاہتا ہے[۲]۔" الغرض ملّتِ اسلامیہ کی جماعت کا ہر رُکن دُوسرے کے ساتھ ایسی محبّت کرے جیسی وہ خود اپنے ساتھ کرتا ہے۔ اس کا نفع اپنا نفع اور اس کا نقصان اپنا نقصان سمجھے۔ ابو داؤد میں ہے کہ آپ نے فرمایا "مُسلمان مُسلمان کا آئینہ ہے اور مُسلمان مُسلمان کا بھائی ہے۔ اس کے نقصان کو دور کرتا ہے اور اس کے پیچھے اس کی حفاظت کرتا ہے[۳]۔"

دیکھئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے جماعتِ اسلامیہ کی عمارت کیسی مستحکم بنیادوں پر قائم فرمائی تھی۔ اگر آج بھی ان ہدایتوں پر عمل کیا جائے تو اس عمارت کی دیواریں ایسی شکستہ نہ رہیں جیسی آج ہیں۔ ہر جماعت انہی اصولوں پر دنیا میں بنی ہے اور آئندہ بھی بنے گی۔

---

[۱] صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ صفحہ ۱۲۔ [۲] صحیح بخاری کتاب الایمان ج ۱ صفحہ ۶۔

[۳] سنن ابی داؤد کتاب الادب ج ۲ صفحہ ۱۹۲، تیسرے فقرہ کے مطلب میں شارحین کا اختلاف ہے۔

انسانی برادری کا حق

ایک انسان کے دُوسرے اِنسان پر انسانی برادری کی حیثیت سے بھی کچھ فرائض ہیں جن سے عہدہ برآ ہونا ہر مُسلمان کا مذہبی فرض ہے۔ تبلیغ یعنی غیر مسلم اِنسانوں کو اسلام کی دعوت کا جو حکم ہے اِس کے دُوسرے اسباب کے علاوہ ایک سبب یہ بھی ہے کہ جس چیز کو ایک مُسلمان سچائی سمجھتا ہے اُس کا انسانی فرض ہے کہ وہ اس سے دُوسرے اِنسان کو آگاہ اور باخبر کرے۔ اور یہ انسانی خیر خواہی کا لازمی نتیجہ ہے۔

قرآن پاک نے تورات کے بعض احکام کو دہرایا ہے جن میں سے ایک یہ بھی ہے:

وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا — اور لوگوں سے اچھی بات کہو۔

(البقرة: ۸۳)

لوگوں سے اچھی بات کہنا اور اچھائی سے پیش آنا اِنسانیّت کا فرض ہے جس میں کسی دین و مذہب کی تخصیص نہیں۔ دین و مذہب اور نسل و قومیّت کا اختلاف اِس منصفانہ برتاؤ سے باز نہ رکھے۔ اسی لیے ارشاد ہوا:

وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی — اور کسی قوم کی عداوت تم کو اس پر

اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ — آمادہ نہ کرے کہ تم عدل اور انصاف

لِلتَّقْوٰی (المآئدۃ: ۸)

نہ کرو۔ عدل اور انصاف (ہر حال میں) کرو کہ یہ بات تقویٰ کے قریب ہے۔

ہر قسم کا بُرا سلوک اور بے رحمانہ برتاؤ جو ایک انسان دُوسرے انسان اور ایک قوم دُوسری قوم کے ساتھ کرتی ہے اس کا اصل سبب یہی ہوتا ہے کہ ایک دُوسرے کے حق میں عدل سے کام نہیں لیتا۔ بلکہ اس پر ظلم اور بے انصافی کے لیے آمادہ رہتا ہے۔ یہ آیتِ پاک انسان کے اسی مادۂ فاسد کے سرچشمہ کو بند کرتی ہے۔ ابوہریرہؓ اور انس ابن مالکؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لا تباغضوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا وکونوا عباد اللہ اخوانا (بخاری)

آپس میں ایک دُوسرے سے کینہ نہ رکھو، ایک دُوسرے پر حسد نہ کرو، اور نہ ایک دُوسرے سے منہ پھیرو۔ اور سب مل کر خدا کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔

بعض روایتوں میں الفاظ یہ ہیں:

ایّاکم والظنّ فانّ الظنّ اکذب الحدیث ولا تحسّسوا ولا تجسّسوا ولا تناجشوا ولا تحاسدوا ولا تباغضوا ولا تدابروا وکونوا عباد اللہ اخوانًا (صحیح بخاری: کتاب الادب)

بدگمانی سے بچو کہ بدگمانی بہت جھوٹی بات ہے۔ لوگوں کی عیب جوئی نہ کرو۔ آپس میں حسد نہ کرو۔ آپس میں بغض نہ رکھو۔ اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو اور سب مل کر خدا کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔

اس حدیثِ پاک میں انسانی برادری کا وہ نقشہ کھینچا گیا ہے جس پر سچائی سے عمل

کیا جائے تو یہ شر اور فساد سے بھری ہوئی دنیا دفعۃً جنت بن جائے۔ فرمایا من لایرحم لایُرحم[1] "جو رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جاتا" "جو بندوں پر رحم نہیں کرتا اس پر خدا رحم نہیں کرتا یا یہ کہ جو دُوسرے پر رحم نہیں کرتا دوسرا بھی اس پر رحم نہیں کرے گا۔ مستدرک حاکم میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "تم زمین والوں پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم فرمائے گا"[2]۔ یہ حدیث رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی شانِ رحمت کو کتنی عمومیت کے ساتھ ظاہر کرتی ہے۔ ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ "جو مُسلمان کوئی درخت لگائے گا اس سے جو انسان یا پرندہ بھی کچھ کھائے گا اس کا ثواب اس لگانے والے کو ملے گا"[3]۔ اس فیض کے عموم میں انسانیت کی قید بھی نہیں ہے۔ ایک دفعہ آپؐ نے ایک شخص کا قصہ بیان کیا جس نے ایک جانور کے ساتھ نیک سلوک کیا تھا کہ اس کو اس کے اس کام پر ثواب ملا۔ صحابہ نے پوچھا "اے خدا کے رسُول! کیا جانوروں کے ساتھ نیک سلوک کرنے میں بھی ثواب ہے؟" فرمایا: "ہر تر جگر کے ساتھ نیک سلوک کرنے میں ثواب ہے"۔ یعنی ہر اُس ہستی کے ساتھ جس میں زندگی کی تری ہے نیک سلوک کرنے میں ثواب ہے[4]۔ اس ثواب کے دائرہ میں ہر وہ ہستی شریک ہے جو زندگی سے بہرہ ور ہے۔

جامع ترمذی میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذرؓ سے ارشاد فرمایا: "جہاں بھی ہو خدا کا خیال رکھو۔ بُرائی کے پیچھے بھلائی کرو تو اس کو مٹا دو گے اور لوگوں کے ساتھ حُسنِ اخلاق سے پیش آؤ"[5]۔

---

[1] صحیح بخاری۔ [2] مستدرک حاکم کتاب البر والصلہ ج ۴ ص ۱۵۹۔ [3] و [4] یہ حدیثیں صحیح بخاری جلد دوم کتاب الادب کے مختلف ابواب میں ہیں۔ [5] جامع ترمذی باب ماجا۔ فی معاشرۃ الناس صفحہ ۳۳۱۔

ابوھریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حضورؐ نے پانچ باتیں گنائیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ واحب للناس ماتحب لنفسک یعنی تم لوگوں (ناس) کے لیے وہی چاہو جو تم اپنے لیے چاہتے ہو تو مسلمان بن جاؤ گے۔ الناس کا لفظ عام ہے جس میں تمام انسان داخل ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب تک سارے انسانوں کی بھلائی کا جذبہ دل میں نہ ہو انسان پورا مسلمان نہیں بنتا کیوں کہ دوسروں کے لیے وہی چاہنا جو اپنے لیے چاہو اخلاق کی وہ تعلیم ہے جو انسانی برادری کے ہر قسم کے حقوق کی بنیاد ہے۔ ایک اور حدیث میں یہ تعلیم ان لفظوں میں ہے کہ "تم اپنے بھائی کے لیے وہی چاہو جو اپنے لیے چاہتے ہو" بھائی کے لفظ سے مسلمان بھی مراد ہو سکتا ہے اور ایک عام انسان بھی۔ تورات اور انجیل کے اندر یہی تعلیم ان لفظوں میں ہے کہ "تم اپنے پڑوسی کو ایسا چاہو جیسا کہ تم اپنے آپ کو چاہتے ہو" اسلام میں پڑوسیوں کے حقوق کا بیان علیحدہ باب میں گزر چکا ہے۔ اس پر یہاں ایک نظر ڈال لینی چاہیے کہ صحابہ کرام نے اس تعلیم کی پیروی میں یہودی اور عیسائی پڑوسیوں کا حق بھی مسلمان پڑوسیوں ہی کی طرح مانا ہے۔

صدقہ و خیرات کے باب میں گو فقراء اور مساکین میں مسلمانوں کی ترجیح ایک قدرتی بات ہے تاہم حضرت عمر فاروقؓ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں نامسلمان ذمی مسکینوں کے حق کو بھی تسلیم کیا۔ قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ایک بڈھا جو اندھا بھی تھا ایک دروازہ پر کھڑا بھیک مانگ رہا ہے۔ حضرت عمرؓ نے پیچھے سے اس کے بازو پر ہاتھ مارا اور پوچھا کہ تم کو بھیک مانگنے کی ضرورت کیا پڑی؟ اس نے کہا جزیہ ادا کرنے اور اپنی ضرورت پوری کرنے اور اپنی اس عمر کے سبب سے بھیک

لہ ترمذی ابواب الزہد غریب۔

مانگتا ہوں۔ حضرت عمرؓ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لائے اور اپنے گھر سے اُس کو کچھ دیا۔ پھر اس کو بیت المال کے خزانچی کے پاس بھیجا اور کہلوایا کہ "اس کو اور اس جیسے لوگوں کو دیکھو۔ خدا کی قسم ہم انصاف نہیں کریں گے اگر ہم اس کی جوانی کی کمائی تو کھائیں اور اس کے بوڑھے ہونے پر اس کی مدد چھوڑ دیں۔ قرآن میں صدقہ کی اجازت فقراء اور مساکین کے لیے ہے۔ فقراء تو وہی ہیں جو مسلمان ہیں اور یہ لوگ مساکین اہل کتاب میں ہیں اُن سے جزیہ نہ لیا جائے۔"[1]

اسلام کا یہ عام فیصلہ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ دُوسرے عام صدقے غیر مسلموں کو دیئے جا سکتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایک یہودی خاندان کو صدقہ دیا۔ ام المومنین حضرت صفیہؓ نے اپنے دو یہودی رشتہ داروں کو ۳۰ ہزار کی مالیت کا صدقہ دیا۔ امام مجاہد نے مشرک رشتہ دار کا قرض معاف کرنے کو ثواب کا کام بتایا۔ ابن جریج محدث کہتے ہیں کہ قرآن[2] نے "اسیر" کے کھلانے کو ثواب بتایا ہے اور ظاہر ہے کہ صحابہ کے قبضہ میں مشرک ہی قید ہو کر آتے تھے۔ ابو میسرہؓ اور عمرو بن میمونؓ اور عمرو بن شرجیلؓ صدقہ فطر سے عیسائی راہبوں کی مدد کیا کرتے تھے۔[3] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے زمانہ میں حضرت عمرؓ نے اپنے مشرک بھائی کو تحفہ بھیجا[4] اور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے بعضوں کو ان کے مشرک والدین کے ساتھ صلۂ رحمی کی اجازت دی۔[5]

تفسیر کی روایتوں میں ہے کہ صحابہ جب مذہبی اختلاف کی بنا پر غریب مشرکوں کی مدد سے کنارہ کرنے لگے تو یہ آیت اتری[6]:

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ — اُن کو راہ پر لے آنا تیرے اختیار کی بات

---

[1] کتاب الخراج قاضی ابو یوسف صفحہ ۷۲، بصر۔ [2] سورۃ دہر: ۸۔ [3] کتاب الاموال امام ابو عبیدہ صفحہ ۶۱۳ و ۶۱۴ مصر [4] بخاری کتاب الجمعہ۔ [5] مسلم باب فضل الصدقۃ علی الاقربین [6] طبری۔

يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ (البقرة: ۲۷۲)	نہیں لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے راہ پر لے آتا ہے۔ اور جو بھلائی سے خرچ کرو، وہ تمہارے ہی لیے ہے۔

یعنی تم کو تمہاری نیکی کا ثواب بہر حال ملے گا۔

مسند احمد میں ہے کہ آپ نے مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا:

لا یؤمن احدکم حتّٰی یحبّ للنّاس ما یحبّ لنفسه وحتّٰی یحبّ المرء لایحبّه الّا للّٰہِ عزّ وجلّ (مسند احمد ج ۳ ص ۲۷۲)	تم میں سے کوئی اس وقت تک پورا مومن نہیں ہوگا جب تک وہ اور لوگوں کے لیے وہی نہ پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ اور جب تک وہ آدمی کو صرف خدا کے لیے پیار نہ کرے۔

اس حدیث میں محبتِ انسانی کی وسعت ساری انسانی برادری تک وسیع کر دی گئی ہے۔

جانوروں کے حقوق

اسلام دنیا میں لطف و محبت کا جو عام پیغام لے کر آیا تھا اس کا سلسلہ حیوانات تک وسیع ہے۔ اس نے حیوانات کے ساتھ متعدد طریقوں سے سلوک کرنے کی ہدایت کی۔ اہلِ عرب وحشت اور قساوت کی وجہ سے حیوانات پر طرح طرح کے ظلم کرتے تھے۔ وہ جانوروں کو اندھا دھند مار کر گرا دیتے تھے اور لوگوں سے کہتے تھے کہ تم اُن کو کھا جاؤ اور اس کو فیاضی سمجھتے تھے۔ دو آدمی شرط باندھ کر کھڑے ہو جاتے تھے اور باری باری سے اپنا اپنا ایک اُونٹ ذبح کرتا چلا جاتا تھا۔ جو رُک جاتا وہ ہار جاتا۔ یہ سب جانور دوست واحباب کی دعوت میں نذر ہو جاتے تھے۔ یہ بھی فیاضی سمجھی جاتی تھی۔ ان واقعات کا ذکر اشعارِ عرب میں موجود ہے۔ ایک دستور یہ بھی تھا کہ جب کوئی مرجاتا تو اس کی سواری کے جانور کو اُس کی قبر پہ باندھتے تھے اور اس کو دانہ گھاس اور پانی نہیں دیتے تھے اور وہ اسی حالت میں سوکھ کر مرجاتا۔ ایسے جانور کو بلیّہ کہتے تھے۔ اسلام آیا تو اس نے اس سنگ دلی کو مٹا دیا۔ عرب میں ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ جانور کو کسی چیز سے باندھ کر اُس پر نشانہ لگاتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس قسم کے جانوروں کے گوشت کو ناجائز قرار دیا اور عام حکم دیا کہ کسی ذی رُوح چیز کو اس طرح نشانہ نہ بنایا

جائے[1]۔ ایک بار ایک لڑکا اسی طرح ایک مرغی کو باندھ کر تیر کا نشانہ بنا رہا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے مرغی کو کھول دیا اور مرغی کے ساتھ اس لڑکے کو لے کر اُس کے خاندان میں آئے اور کہا کہ اپنے لڑکے کو اس سے منع کرو کیوں کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طریقہ سے جانور یا اور کسی جاندار کو نشانہ بنانے کی ممانعت فرمائی ہے۔ اسی طرح کچھ اور لوگ مرغی کو باندھ کر نشانہ بنا رہے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا گزر ہوا تو وُہ لوگ بھاگ گئے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے کہا کہ ایسا کس نے کیا ہے؟ جو لوگ ایسا کرتے ہیں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو ملعون قرار دیا ہے[2]۔ اس سے بھی زیادہ بے رحمانہ طریقہ یہ تھا کہ زندہ اُونٹ کے کوہان اور دُنبہ کے دُم کی چکتی کاٹ کر کھاتے تھے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں آکر یہ حالت دیکھی تو فرمایا کہ اس طریقہ سے زندہ جانوروں کا جو گوشت کاٹ کر کھایا جاتا ہے وہ مُردار ہے[3]۔ یہ ایک خاص صورت تھی لیکن عموماً زندہ جانوروں کے مثلہ کرنے یعنی اُن کے کسی عضو کے کاٹنے کی ممانعت فرمائی اور ایسا کرنے والے پر لعنت بھیجی[4]۔

بلا ضرورت کسی جانور کے قتل کرنے کو بہت بڑا گناہ قرار دیا[5]۔ ایک حدیث میں ہے کہ "کسی نے اگر کنجشک یا اس سے بھی کسی چھوٹے جانور کو اس کے حق کے بغیر ذبح کیا تو خدا اس کے متعلق اس سے باز پرس کرے گا" صحابہ نے پوچھا یا رسُول اللہ! اس کا حق کیا ہے؟ فرمایا یہ کہ اس کو ذبح کرے اور کھائے یہ نہیں کہ اس کا سر کاٹ کے

---

[1] ترمذی ابواب الصید باب ما جاء فی کراہیۃ اکل المصبورۃ صفحہ ۲۵۵ [2] بخاری کتاب الذبائح والصید باب مایکرہ من المثلۃ والمصبورۃ والمجثمۃ [3] ترمذی ابواب الصید باب ما جاء ما قطع من الحی فھو میت [4] بخاری کتاب الذبائح والصید باب مایکرہ من المثلۃ والمصبورۃ والمجثمۃ [5] مستدرک حاکم جلد دوم صفحہ ۱۸۲۔

پھینک دے[1]"۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جن جانوروں کا گوشت کھایا نہیں جاتا اور وہ درندہ بھی نہیں اُن کا مارنا جائز نہیں۔ سنن نسائی میں ہے کہ جو شخص کنجشک کو بلا ضرورت مارے گا وہ قیامت کے دن خدا کے یہاں فریاد کرے گی کہ "فلاں نے مجھ کو بلا ضرورت مارا ہے۔ اس سے اس کا کوئی فائدہ نہ تھا[2]"۔ جو جانور کوئی نقصان نہیں پہنچاتے یا اُن سے انسانوں کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے اُن کا مارنا بھی جائز نہیں۔ چنانچہ آپؐ نے خاص طور پر چیونٹی، شہد کی مکھی، ہُدہُد اور صُرد کے مارنے کی ممانعت فرمائی ہے[3]۔

جو جانور ضرورةً مارے یا ذبح کیے جاتے ہیں اُن کے مارنے یا ذبح کرنے میں بھی ہر طرح کی نرمی کرنے کا حکم دیا۔ ایک حدیث میں ہے کہ "آپؐ نے فرمایا کہ خدا نے ہر چیز پر احسان کرنا فرض کیا ہے۔ اس لیے جب تم لوگ کسی جانور کو مارو تو اچھے طریقہ سے مارو اور جب ذبح کرو تو اچھے طریقہ سے ذبح کرو۔ تم میں ہر شخص اپنی چھری کو تیز کرلے اور اپنے ذبیحہ کو آرام پہنچائے[4]"۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے کہا کہ "یا رسولؐ اللہ! میں بکری کو ذبح کرتا ہوں تو مجھے اس پر رحم آتا ہے" یا یہ کہ مجھے اس پر رحم آتا ہے کہ بکری کو ذبح کروں۔ فرمایا "کہ اگر تم بکری پر رحم کرتے ہو تو خدا تم پر رحم کرے گا[5]"۔ یہی وجہ ہے کہ دانت سے کاٹ کر یا ناخن سے خراش دے کر جانوروں کے ذبح کرنے کی ممانعت فرمائی[6] کیونکہ اس سے جانوروں کو تکلیف ہوتی ہے۔ کنکر، پتھر یا غلیل چلانے کی بھی ممانعت فرمائی اور

---

[1] مشکوٰۃ کتاب الصید والذبائح صفحہ ۳۵۰۔ [2] نسائی کتاب الضحایا صفحہ ۶۷۹۔ [3] مشکوٰۃ کتاب الصید والذبائح صفحہ ۳۶۲۔ [4] مسلم کتاب الصید والذبائح باب الامر باحسان الذبح والقتل وتحدید الشفرۃ۔ [5] مسند ابن حنبل جلد ۳ صفحہ ۴۳۶۔ [6] نسائی صفحہ ۶۷۴۔

فرمایا کہ "اس سے نہ شکار ہو سکتا ہے نہ دشمن شکست کھا سکتا ہے البتہ اس سے دانت ٹوٹ سکتا ہے اور آنکھ پھوٹ سکتی ہے۔"[1] مطلب یہ کہ بلا ضرورت جانوروں اور پرندوں کو جسمانی صدمہ پہنچانا جائز نہیں۔ جانوروں کے ساتھ جو بے رحمیاں کی جاتی تھیں ان کا اصل سبب یہ تھا کہ اہلِ عرب کو یہ معلوم نہ تھا کہ جانوروں کو دکھ درد پہنچانا گناہ کا کام ہے اس لیے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اہلِ عرب کو بتایا کہ جس طرح انسانوں کی ایذا رسانی ایک شرعی جرم ہے اسی طرح جانوروں کی ایذا رسانی بھی ایک مذہبی گناہ ہے۔

چنانچہ ایک عورت کی نسبت آپؐ نے فرمایا کہ اس پر صرف اس لیے عذاب ہوا کہ اُس نے ایک بلّی کو باندھ دیا اور اس کو کھانا پانی کچھ نہ دیا۔ اور آخر وہ اسی طرح بندھی بندھی مر گئی[2]۔ بلکہ لوگ چونکہ انسانوں کی بہ نسبت جانوروں کو زیادہ ستاتے ہیں اس لیے وہ اس معاملہ میں بہت زیادہ گنہگار ہیں۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا کہ تم لوگ جانوروں کے ساتھ جو بدسلوکیاں کرتے ہو اگر خدا اُن کو معاف کر دے تو سمجھو کہ اس نے تمہارے بہ کثرت گناہ معاف کر دیئے[3]۔

ایک دفعہ آپؐ صحابہ کے ساتھ کسی سفر کے پڑاؤ میں تھے۔ آپ ضرورت سے کہیں تشریف لے گئے تھے جب واپس آئے تو دیکھا کہ ایک صاحب نے اپنا چولہا ایسی جگہ جلایا ہے جہاں زمین میں یا درخت پر چیونٹیوں کا سوراخ تھا۔ یہ دیکھ کر آپؐ نے دریافت کیا کہ "یہ کس نے کیا ہے؟" اُن صاحب نے کہا "یا رسُولؐ اللہ! یہ میں نے کیا ہے۔" آپؐ نے فرمایا "بجھاؤ بجھاؤ"[4] (غرض یہ تھی کہ ان چیونٹیوں کو تکلیف نہ ہو یا جل نہ جائیں)

---

[1] بخاری کتاب الذبائح والصید باب الخذف والبندق۔ [2] بخاری کتاب الانبیاء صفحہ ۴۹۵۔ [3] مسند ابن حنبل جلد ۶ صفحہ ۴۴۱۔ [4] مسند ابن حنبل ج ۱ ص ۳۹۶ عن عبد اللہ بن مسعودؓ۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک پیغمبرؑ کسی درخت کے نیچے اترے تو ان کو ایک چیونٹی نے کاٹ لیا۔ انہوں نے پہلے اپنا سامان اس جگہ سے ہٹایا پھر تمام چیونٹیوں کو آگ سے جلا دیا۔ اس پر خدا نے اُن کو وحی کے ذریعہ سے متنبہ کیا کہ صرف ایک ہی چیونٹی کو کیوں نہیں جلایا[1]، یعنی قصاص کی مستحق صرف وہی چیونٹی تھی جس نے کاٹا تھا تمام چیونٹیوں کا قصور نہ تھا۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک سفرِ جہاد میں صحابہؓ کرام ایک چڑیا کے دو بچے پکڑ کر لائے۔ چڑیا فرطِ محبت سے اُن کے گرد منڈلانے لگی۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم قضائے حاجت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ واپس آکر یہ حالت دیکھی تو فرمایا کہ اس کے بچوں کو پکڑ کر کس نے اس کو بے قرار کیا ہے اس کے بچّوں کو چھوڑ دو۔ صحابہؓ کرام نے چیونٹیوں کے ایک گھر کو بھی جلا دیا تھا۔ دریافت کرنے پر جب معلوم ہوا کہ یہ خود صحابہ کا فعل تھا تو فرمایا کہ آگ کی سزا دینا صرف خدا ہی کے لیے سزاوار ہے[2]۔

اسی طرح اہلِ عرب کو یہ معلوم نہ تھا کہ جس طرح انسانوں کے ساتھ سلوک کرنا ثواب کا کام ہے بعینہٖ اسی طرح جانوروں اور پرندوں کے ساتھ سلوک کرنا بھی موجبِ ثواب ہے۔ اسی عدمِ واقفیت کی بنا پر ایک صحابی نے آپؐ سے دریافت کیا کہ میں نے خاص اپنے اُونٹوں کے لیے پانی کے جو حوض بنائے ہیں اُن پر بھولے بھٹکے اُونٹ بھی آجاتے ہیں۔ اگر میں اُن کو پانی پلا دوں تو کیا مجھ کو اس پر ثواب ملے گا؟ فرمایا کہ ہر پیاسے یا ہر ذی حیات کے ساتھ سلوک کرنے پر ثواب ملتا ہے[3]۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص راستہ میں جا رہا تھا کہ اس کو سخت پیاس لگ

---

[1] بخاری جلد اوّل کتاب بدء الخلق صفحہ ۴۶۷۔ [2] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی کراہیۃ حرق العدو بالنار۔

[3] ابن ماجہ باب الادب باب فضل صدقۃ الماء۔

گئی۔ اتفاق سے اس کو ایک کنواں مل گیا اور اس نے کنوئیں میں اُتر کر پانی پی لیا۔ کنوئیں سے نکلا تو دیکھا کہ ایک کتا پیاس سے زبان نکال رہا ہے اور کیچڑ چاٹ رہا ہے۔ اس نے اپنی پیاس کی شدّت کو یاد کرکے اُس پر ترس کھایا اور کنوئیں میں اتر کر پانی لایا اور اس کو پلایا۔ خدا کے نزدیک اس کا یہ عمل مقبول ہوا اور خُدا نے اس کو بخش دیا۔ صحابہؓ کرام نے اس واقعہ کو سنا تو بولے کہ "یا رسولؐ اللہ کیا جانوروں کے ساتھ سلوک کرنے میں بھی ثواب ملتا ہے"؟ فرمایا کہ ہر ذی حیات کے ساتھ سلوک کرنا موجبِ ثواب ہے[۱]۔ صرف جانداروں ہی تک نہیں بلکہ نباتات تک کی خدمت اور پرورش کو بھی اجر کا موجب بتایا اور فرمایا کہ جو مُسلمان درخت نصب کرتا ہے یا کھیتی باڑی کرتا ہے اور اُس کو چڑیا یا انسان یا جانور کھاتا ہے تو یہ ایک صدقہ[۲] یعنی ثواب کا کام ہے۔

اس اصول کے بتانے کے بعد عملی طور پر جانوروں کے ساتھ سلوک کرنے کے متعدد اصول بتائے، یعنی:

(۱) جو جانور جس کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے اس سے وہی کام لینا چاہیے۔ چنانچہ فرمایا کہ ایک شخص ایک بیل پر سوار ہو کر جا رہا تھا، بیل نے مڑ کر کہا کہ میں اس کے لیے نہیں پیدا کیا گیا ہوں۔ صرف کھیتی باڑی کے لیے پیدا کیا گیا ہوں[۳]۔ نیز فرمایا کہ اپنے جانوروں کی پیٹھ کو منبر نہ بناؤ۔ خُدا نے اُن کو تمہارا فرمانبردار صرف اِس لیے بنایا ہے کہ وہ تم کو ایسے مقامات میں پہنچا دیں جہاں تم بڑی مشقت سے پہنچ سکتے تھے۔ تمہارے لیے خُدا نے زمین کو پیدا کیا ہے اپنی ضرورتیں اسی پر

---

[۱] بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الناس والبہائم۔ [۲] بخاری ابواب الحرث والمزارعۃ باب فضل الزرع والغرس اذا اکل منہ۔ [۳] بخاری ابواب الحرث والمزارعۃ باب استعمال البقر للحراثۃ۔

پوری کرو[1]۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض موقعوں پر اونٹ کی پشت پر بیٹھ کر خطبہ دیا ہے، اس لیے اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بلا ضرورت سواری کے جانوروں کی پیٹھ پر بیٹھے رہنا مناسب نہیں کہ اس سے جانور کو غیر ضروری تکلیف ہوتی ہے صرف سفر کی حالت میں اس پر سوا ہونا چاہیے۔

(۲) جانوروں کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا چاہیے۔ چنانچہ فرمایا کہ جب تم لوگ سرسبزی اور شادابی کے زمانہ میں سفر کرو تو اونٹوں کو زمین کی سرسبزی سے فائدہ پہنچاؤ اور جب قحط کے زمانہ میں سفر کرو تو اس کو تیزی کے ساتھ چلاؤ[2] تاکہ قحط کی وجہ سے اس کو گھاس یا چارے کی جو تکلیف راستہ میں ہوتی ہے اس سے وہ جلد نجات پائے۔ ایک بار آپؐ نے ایک اونٹ دیکھا جس کا پیٹ بھوک کی وجہ سے پیٹھ سے لگ گیا تھا۔ فرمایا "ان بے زبان جانوروں کے معاملہ میں خدا سے ڈرو۔ ان پر سوار ہو تو ان کو اچھی حالت میں رکھ کر سوار ہو اور ان کو کھاؤ تو ان کو اچھی حالت میں رکھ کر کھاؤ"[3]۔

ایک بار آپؐ ایک انصاری کے باغ میں رفع حاجت کے لیے گئے۔ اس میں ایک اونٹ تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر بلبلایا اور آب دیدہ ہو گیا۔ آپؐ اس کے پاس گئے اور اس کی کنپٹی پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا "یہ کس کا اونٹ ہے؟" ایک انصاری نوجوان نے آ کر کہا کہ "میرا یا رسول اللہ"! فرمایا "اس جانور کے بارہ میں جس کا خدا نے تم کو مالک بنایا ہے خدا سے نہیں ڈرتے، اس نے مجھ سے شکایت کی کہ تم اس کو

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الوقوف علی الدابۃ۔ [2] مسلم کتاب الامارۃ باب مراعاۃ مصلحۃ الدواب فی السیر و النہی عن التعریس فی الطریق۔ [3] ابوداؤد کتاب الجہاد باب ما یؤمر بہ من القیام علی الدواب والبہائم۔

بھوکا رکھتے ہو اور اس پر جبر کرتے ہو۔"[1]

(۳) جانوروں کے منہ پر مارنے یا اس پر داغ دینے کی ممانعت فرمائی اور ایسا کرنے والے کو ملعون قرار دیا۔[2]

(۴) جانوروں کے باہم لڑانے سے بھی منع فرمایا[3] کہ اس سے وہ بے فائدہ گھائل اور زخمی ہو کر تکلیف پاتے ہیں۔

پچھلے صفحوں پر پھر ایک نظر ڈال لیجیے تاکہ معلوم ہو کہ اسلام کے سینہ میں جو دل ہے وہ کتنا نرم ہے اور کس طرح رحم و کرم سے بھرا ہوا ہے۔

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد باب مایومر بہ من القیام علی الدواب والبہائم۔

[2] ابوداؤد کتاب الجہاد باب وسم الدواب [3] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی التحریش بین البہائم۔

فضائلِ اخلاق

اخلاقِ حسنہ کی جزئیات اس کثرت سے ہیں کہ اُن کا احاطہ بھی مشکل ہے۔ قدیم حکمائے اخلاق نے ان کی دو قسمیں کی ہیں۔ ایک اُمہاتِ اخلاق اور دُوسری فروعِ اخلاق۔ اُمہاتِ اخلاق سے مراد اخلاق کے وہ جوہری ارکان ہیں جو دُوسرے اخلاق کی اصل و مرجع ہیں اور جن میں کمی و بیشی سے اخلاق کی مختلف قسمیں پیدا ہوتی ہیں اور جن کے اعتدال سے فضائل اخلاق کا وجود ہوتا ہے۔

ان کے نزدیک انسان کے اندر تین فطری قوّتیں ہیں، قوّتِ علمیہ، قوّتِ شہوانیہ، اور قوّتِ غضبیہ۔ قوّتِ علمیہ کے اعتدال کا نام حکمت، قوّتِ شہوانیہ کے اعتدال کا نام عفّت اور قوّتِ غضبیہ کے اعتدال کا نام شجاعت ہے۔ اور انہی کے عدمِ اعتدال کو رذائل کہتے ہیں۔ پھر ان دونوں قسموں کے اختلافِ مدارج سے اچھے اور بُرے اخلاق کے مختلف مراتب ظہور میں آتے ہیں۔

یہ تقسیمیں محض فلسفیانہ ہیں یا یوں کہیے کہ علمی اور نظری ہیں۔ لیکن اسلام کے پیشِ نظر اخلاق کی علمی و نظری حیثیت نہیں بلکہ عملی ہے۔ کیونکہ اُس کا منشا انسان کو فقط اخلاق کا علم بخشنا نہیں بلکہ انسان کو فضائلِ اخلاق کا عامل بنانا اور رذائلِ اخلاق سے عملاً

بچانا ہے۔ اس لیے اُس کو اس سے بحث نہیں کہ فلاں خلق کی اصلیت کیا ہے اور اس سے دوسرے اخلاق کس طرح پیدا ہوتے ہیں۔ بلکہ اس سے بحث ہے کہ انسان کو کس طرح اچھے اخلاق کا پابند بنایا اور بُرے اخلاق سے بچایا جائے۔ اسی لیے اپنی تعلیم میں اُس نے اہلِ فلسفہ کا رنگ اختیار نہیں کیا ہے اور نہ یہ طریقہ انبیاء علیہم السّلام کی تعلیم و تربیت کا ہے۔

اسلام کی ہر شے میں خواہ وہ عقیدہ سے متعلق ہو یا عبادت سے یا اخلاق و معاملات سے، مرکزی چیز اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ہے۔ ہر وہ کام اچھا ہے جس کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے اور وہ بُرا ہے جس کو وہ ناپسند فرمائے۔ گو یہ دُوسری بات ہے کہ وہ جس کو پسند فرماتا ہے اس میں عقلی خوبیاں اور جمہور کا فائدہ بھی ہوتا ہے۔ اور جس کو وہ ناپسند فرماتا ہے اس میں عقلی بُرائیاں اور خلقِ خدا کا نقصان بھی ہوتا ہے۔ اس بنا پر اسلام کی نظر سے اخلاق کی یہ دو قسمیں ہیں: وہ اخلاق جن کو خدا پسند فرماتا ہے یہ فضائل کہلاتے ہیں اور وہ کام جن کو وہ ناپسند کرتا ہے رذائل کہلاتے ہیں۔ ہم نے اُوپر اخلاق اور محبتِ الٰہی کے عنوان میں وہ آیتیں لکھ دی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے بہت سے اوصاف کو پسند یا ناپسند فرمایا ہے۔

جن اوصاف کو خدا پسند فرماتا ہے اُن کو ابھی ہم نے اصطلاح میں فضائل کا نام دیا ہے۔ یہ فضائل بہت سے ہیں اور قرآن پاک اور احادیثِ شریفہ میں جا بجا اُن کی تصریح ہے۔ لیکن اُن کے بیان میں اخلاقِ شرعی کے مصنفوں نے کوئی خاص ترتیب نہیں رکھی ہے اسی لیے اُن کی اہمیت کے درجے اور رتبے نہیں مقرر ہوئے۔

میرا خیال یہ ہے کہ فضائل میں سب سے پہلے اُس اخلاقی فضیلت کو جگہ ملنی چاہیے جو خود اللہ تعالیٰ کا وصف ہو اور جس کے ساتھ رسُولوں اور پیغمبروں کی توصیف اکثر کی گئی ہو اور مُسلمانوں کو اُس سے متصف ہونے پر کتابِ الٰہی اور پیامِ نبوّت میں زیادہ زور دیا گیا

ہو اور جو بجائے خود بہت سی اخلاقی خوبیوں کی بنیاد ہو۔

گو اس معیار کو سامنے رکھ کر فضائل کی ترتیب کو قائم کرنا بہت مشکل کام ہے۔ اور غور و فکر کرنے والوں میں اس بارہ میں اختلاف بھی ممکن ہے۔ لیکن جہاں تک میری تلاش اور محنت کو دخل ہے اس میں کامیابی کی کوشش کروں گا۔

فضائل کی مختصر فہرست

جن فضیلتوں کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے اور جن کو گنا کر اس نے اپنے اچھے بندوں کی توصیف کی ہے یا اُن اوصاف والوں کے لیے اپنی بخشش اور بخشایش کا وعدہ فرمایا ہے قرآن پاک اور احادیث نبوی میں جابجا اُن کی تفصیل ہے جیسے

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ الَّذِيْنَ
هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ○
وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ○
وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ ○
وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ○
اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ
اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ○
فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ
هُمُ الْعٰدُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ هُمْ
لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ○
وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ

ایمان والے مراد کو پہنچ گئے۔ جو اپنی
نماز میں عاجزی کرتے ہیں، جو بیکار
باتوں کی طرف رُخ نہیں کرتے، جو زکوٰۃ
دیتے اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت
کرتے ہیں، لیکن اپنی بیویوں سے اور
اپنی (شرعی) باندیوں سے کہ اُن پر
کوئی الزام نہیں۔ تو جو اس کے سوا کے
خواہاں ہوں تو وہی حد سے بڑھنے
والے ہیں۔ اور وہ جو اپنی امانتوں اور
اپنے عہد کا لحاظ رکھتے ہیں اور جو
اپنی نمازوں کے پابند ہیں۔ یہی اصل

يُحَافِظُوْنَ ۝ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝	وارث ہیں جو فردوس کے وارث ہوں گے اور وُہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

(المؤمنون : ۱-۱۱)

ان آیتوں میں جن اخلاقی فضائل کا بیان آیا ہے وہ یہ ہیں، نکمی اور بے کار باتوں سے کنارہ کشی، عصمت اور پاک دامنی، امانت داری اور ایفائے عہد۔ ایک دُوسری جگہ ہے:

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ	اور لیکن اصل نیکی اُس کی ہے جو اللہ پر اور آخرت پر اور فرشتوں پر اور کتاب (الٰہی) پر اور پیغمبروں پر ایمان لایا اور اپنا مال اس کی محبت کے ساتھ رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور غریبوں کو اور مسافر کو اور مانگنے والوں کو اور گردنوں کو چھڑانے میں دیا اور نماز کھڑی کی اور زکوٰۃ دی اور اپنے قول کو جب انہوں نے اقرار کرلیا پورا کرنے والے اور مصیبت میں اور تکلیف میں اور لڑائی کے ہل چل کے وقت ثابت قدم رہنے والے

(البقرۃ : ۱۷۷)

ان آیتوں میں جو اخلاقی اوصاف گنائے گئے ہیں وہ یہ ہیں: سخاوت، قول و قرار کو پورا

کرنا اور مشکلوں میں ثابت قدمی۔

سورۂ آل عمران میں ہے:

اَلصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْمُنْفِقِیْنَ (آل عمران: ۱۷)	ثابت قدم رہنے والے اور سچ بولنے والے اور (خدا کی) فرمانبرداری کرنے والے اور (خدا کی راہ میں) خرچ کرنے والے۔

اس آیت میں ثابت قدمی، سچائی اور فیاضی کو سراہا گیا ہے۔ اسی سورہ میں ان متقیوں کا حال ہے جو خدا کی مغفرت اور آسمان و زمین کے برابر کی جنّت کے مستحق ہوں گے:

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ (آل عمران: ۱۳۴)	جو خوشحالی اور تنگ دستی دونوں حالتوں میں (خدا کے نام پر) خرچ کرتے ہیں اور غصّہ کو روکتے اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں۔ اور اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اس اوپر کی آیت میں فیاضی، عفوو درگذر اور احسان کی تعریف کی گئی ہے۔ سورۂ معارج میں ہے:

وَالَّذِیْنَ فِیْٓ اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ وَالَّذِیْنَ یُصَدِّقُوْنَ بِیَوْمِ الدِّیْنِ ۝ وَالَّذِیْنَ ھُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّھِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۝	اور جن کے مال میں مانگنے والے اور مصیبت زدہ کا حصّہ مقرر ہے۔ اور جو روزِ جزا کو سچ مانتے ہیں۔ اور جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔

اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ۝
وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝
اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ
اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝
فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ
هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ
لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝
وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ۝

(المعارج: ۲۸-۳۳)

بے شبہ اُن کے رب کا عذاب نڈر
ہونے کی چیز نہیں۔ اور جو اپنی شرمگاہوں
کی حفاظت کرتے ہیں مگر اپنی بیویوں اور
شرعی باندیوں سے کہ اس میں اُن
پر کوئی ملامت نہیں۔ جو اس کے علاوہ
چاہیں وہ حد سے آگے بڑھنے والے
ہیں۔ اور جو اپنی امانتوں کا اور اپنے
عہد کا پاس کرتے ہیں اور جو اپنی
گواہیوں پر قائم رہتے ہیں۔

ان آیتوں میں سخاوتِ نفس، عفت و عصمت، امانتداری، ایفائے عہد اور سچی گواہی کو ایک مومن کی ان فضیلتوں میں شمار کیا ہے جو اس کے جنت میں جانے کی سبب ہوئی ہیں۔

سورہ احزاب میں اُن مردوں اور عورتوں کا ذکر ہے جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی بخشائش اور بڑی مزدوری کا وعدہ فرمایا ہے:

وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَ
الصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَ
الْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَ
الْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ
وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَ
الْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَ

اور سچ بولنے والے اور سچ بولنے
والیاں اور صبر کرنے والے اور صبر
کرنے والیاں اور عاجزی کرنے والے
اور عاجزی کرنے والیاں اور صدقہ
دینے والے اور صدقہ دینے والیاں
اور روزہ رکھنے والے اور روزہ رکھنے

اَلْحٰفِظٰتِ (الاحزاب: ۳۵) والیاں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے اور حفاظت کرنے والیاں۔

ان میں سچائی، صبر، عاجزی اور عصمت و عفّت کے اوصاف کا ذکر ہے۔

سورۂ فرقان میں خدا کے اچھے بندوں کی پہچان یہ بتائی گئی ہے:

(۱) وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّ اِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ۝ (الفرقان: ۶۳)

(۱) اور رحم والے اللہ کے بندے وہ ہیں جو زمین میں ہولے چلتے ہیں اور جاہل جب اُن سے (جہالت کی باتیں کریں) تو وہ کہیں سلامت رہیے۔[1]

(۲) وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ۝ (الفرقان: ۶۷)

(۲) اور جب وہ خرچ کریں تو نہ تو فضول خرچی کریں اور نہ تنگی کریں اور دونوں کے بیچ کی راہ ہو۔

(۳) وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ (الفرقان: ۶۸)

(۳) اور جو ناحق کسی بے گناہ کی جان نہیں لیتے اور نہ بدکاری کرتے ہیں۔

(۴) وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ۝ (الفرقان: ۷۲)

(۴) اور جو جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور جب وہ بیہودہ مشغلہ کے پاس سے گزریں تو شریفانہ وضع سے گزر جائیں۔

پہلی آیت میں عاجزی اور فروتنی اور بردباری، دوسری آیت میں اعتدال اور

---

[1] یا سلام کہیں۔

میانہ روی، تیسری میں عدمِ ظلم اور عفت اور چوتھی میں سچائی اور متانت و سنجیدگی کی تعریف کی گئی ہے۔ سورہ رعد میں وہ صفتیں بتائی گئی ہیں جو عقبیٰ میں کام آئیں گی:

اَلَّذِیْنَ یُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا	جو لوگ اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں
یَنْقُضُوْنَ الْمِیْثَاقَ ۙ وَالَّذِیْنَ	اور قول کو توڑتے نہیں۔ اور جس کے
یَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ	جوڑنے کو خدا نے کہا ہے اس کو جوڑے
وَیَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَیَخَافُوْنَ سُوْٓءَ	رکھتے ہیں اور اپنے مالک سے ڈرتے
الْحِسَابِ ۭ وَالَّذِیْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ	ہیں اور بری طرح حساب ہونے سے
وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ	سہمے رہتے ہیں۔ اور جنہوں نے اپنے
وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّ	مالک کی خوشی کے لیے صبر کیا اور نماز
عَلَانِیَةً وَّیَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ	کھڑی کی اور ہم نے جو اُن کو دیا اس
السَّیِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى	سے چھپے اور کھلے (اچھے کاموں میں)
الدَّارِ ۝	خرچ کیا اور برائی کو بھلائی سے دور
(الرعد: ۲۰-۲۲)	کرتے ہیں انہی کے لیے پچھلا گھر ہے۔

اس ایفائے عہد سے وہ عہد بھی مراد ہو سکتا ہے جو بندہ اپنے خدا سے کرتا ہے۔ اور اس سے وہ عہد بھی سمجھا جا سکتا ہے جو خدا کا نام لے کر بندہ بندہ سے کرتا ہے۔ اور جس کے جوڑنے کا حکم ملا ہے وہ اہلِ قرابت اور حقداروں کے حقوق ہیں۔ ان دو کے سوا ان آیتوں میں اُن کی تعریف کی گئی ہے جو برائی کے بدلہ لوگوں سے بھلائی کرتے ہیں یا یہ کہ بھلائی کر کے برائی کو دھو دیتے ہیں۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا	اس پچھلے گھر کو ہم اُن کے لیے کریں

لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ○ (القصص : ۸۳)

گے جو زمین میں غرور اور فساد کرنا نہیں چاہتے۔ اور آخر انجام پرہیزگاروں کے لیے ہے۔

یعنی غرور و نخوت نہیں کرتے۔

وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ○ (الشوریٰ : ۳۷)

اور جو بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں اور جب انہیں غصّہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں۔

یعنی غصّہ آنے پر بھی بے قابو نہیں ہوتے اور معاف کر دیتے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ○ (المائدۃ : ۴۲)

بیشک اللہ انصاف والوں کو پیار کرتا ہے۔

عدل و انصاف کی فضیلت کے لیے اس سے بڑھ کر کیا چاہیے کہ وہ خدا کے پیار اور محبت کا ذریعہ ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ○ (البقرۃ : ۱۹۵)

بے شک اللہ نیک کام کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

اس پیار اور محبت کے استحقاق میں ہر نیکی کا کام کرنے والا داخل ہے۔

حدیثوں میں جن اخلاقی فضیلتوں کا بیان ہے وہ متفرق طور سے پچھلے صفحوں میں گزر چکی ہیں اور آگے بھی اپنی اپنی جگہ پر آئیں گی۔

صدق

اوپر کے معیار کے مطابق اخلاقی خوبیوں کے سرِ فہرست ہونے کی حیثیت جس فضیلت کو حاصل ہے وہ میرے خیال میں سچائی ہے۔ اس ایک فضیلت کے نیچے منطقی اور نفسیاتی نتیجہ کے طور پر بہت سی اہم اخلاقی فضیلتیں آجاتی ہیں۔

انسان کے ہر قول اور عمل کی درستی کی بنیاد یہ ہے کہ اُس کے لیے اس کا دل اور اسکی زبان باہم ایک دُوسرے سے مطابق اور ہم آہنگ ہوں۔ اسی کا نام صدق یا سچائی ہے۔ جو سچا نہیں اُس کا دِل ہر بُرائی کا گھر ہو سکتا ہے اور جو سچا ہے اس کے لیے ہر نیکی کے حصُول کا راستہ آسان ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی "یا رسُول اللہ! مجھ میں چار بُری خصلتیں ہیں۔ ایک یہ کہ بدکار ہوں، دُوسری یہ کہ چوری کرتا ہوں تیسری یہ کہ شراب پیتا ہوں، چوتھی یہ کہ جھُوٹ بولتا ہوں۔ ان میں سے جس ایک کو فرمایئے آپ کی خاطر سے چھوڑ دوں"۔ ارشاد ہوا کہ جھُوٹ نہ بولا کرو۔ چنانچہ اس نے اس کا عہد کیا۔ اَب جب رات ہوئی تو شراب پینے کو اس کا جی چاہا اور پھر بدکاری کے لیے آمادہ ہوا تو اس کو خیال گزرا کہ صبح کو جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم پوچھیں گے کہ رات تم نے شراب پی اور بدکاری کی؟ تو کیا جواب دوں گا۔ اگر ہاں کہوں گا تو شراب اور زنا کی سزا دی جائے گی۔ اگر نہیں کی تو عہد کے خلاف

ہوگا۔ یہ سوچ کر ان دونوں سے باز رہا جب رات زیادہ گزری اور اندھیرا خوب چھا گیا تو چوری کے لیے گھر سے نکلنا چاہا لیکن پھر اسی خیال نے اُس کا دامن تھام لیا کہ کل پوچھ گچھ ہوئی تو کیا کہوں گا۔ ہاں کروں گا تو ہاتھ کٹے گا اور نہیں کرتا ہوں تو بدعہدی ہوتی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اس جرم سے بھی باز آیا۔ صبح ہوتی تو وہ دوڑ کر خدمت نبوی میں حاضر ہوا اور عرض کی "یارسول اللہ! جھوٹ نہ بولنے سے میری چاروں بُری خصلتیں مجھ سے چھوٹ گئیں"۔ یہ سُن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسرور ہوئے۔[1]

یہ روایت سند کے رو سے کتنی ہی کمزور ہو مگر نتیجہ کے لحاظ سے بالکل درست ہے۔ سچائی کی عادت انسان کو بہت سی بُرائیوں سے بچاتی ہے۔ جو سچّا ہوگا وہ ہر بُرائی سے پاک ہونے کی کوشش ضرور کرے گا، وہ راست باز ہوگا، راست گو ہوگا، ایمان دار ہوگا، وعدہ کو پورا کرے گا، عہد کو وفا کرے گا، دلیر ہوگا، دل کا صاف ہوگا، ریاکار نہ ہوگا، اس کے دل میں نفاق نہ ہوگا، پیچھے کچھ اور سامنے کچھ اُس کی شان نہ ہوگی، خوشامدی نہ ہوگا، سب کے بھروسہ کے قابل ہوگا، لوگوں کو اس کے قول وفعل پر اعتبار ہوگا، جو کہے گا کرے گا۔ غرض جس پہلو سے دیکھئے سچّائی بہت سی اخلاقی خوبیوں کی اصل بنیاد قرار پاتی ہے۔

صدق: صفاتِ ربانی میں سے سب سے بڑی صفت ہے۔ خدا سے بڑھ کر سچا کون ہو سکتا ہے۔ قیامت کے وعدہ کے سلسلہ میں خدا آپ فرماتا ہے:

وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيثًا ۝ اور کون اللہ سے زیادہ سچا ہے بات میں۔

(النساء: ۸۷)

---

[1] اس قصہ کو مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی نے تفسیر عزیزی سورۂ ق میں کتب سیر کے حوالے سے نقل کیا ہے لیکن مجھے اس کا ماخذ نہیں معلوم ہوا۔

اسی طرح بہشت کے وعدہ کی تقریب سے ارشاد ہے:

وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ۝ (النساء: ۱۲۲)

وعدہ کیا اللہ نے سچ۔ اور کون ہے اللہ سے زیادہ سچا بات میں۔

خدا سچا ہے اسی لیے اس کی ساری شریعت سچی ہے۔ فرمایا:

وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝ (الانعام: ۱۴۶)

اور ہم ہیں سچے۔

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۣ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ

کہہ (اے پیغمبر) اللہ نے سچ فرمایا تو ابراہیم حنیف کے دین کی پیروی کرو۔

(آل عمران: ۹۵)

وَالَّذِيْ جَاۗءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝

اور جو سچائی کو لے کر آیا اور اس سچائی کو سچ مانا وہی تو پرہیزگار ہیں۔

(الزمر: ۳۳)

اس آخری آیت میں "سچائی" سے گو مراد خدا کی شریعت یا کتاب ہے مگر لفظ کا عموم ہر سچائی تک وسیع ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ پرہیزگاروں کی شان یہ ہے کہ وہ سچائی کے ساتھ ہوتے ہیں، ہر سچی بات کو قبول کرتے ہیں اور اپنے ہر قول اور عمل میں سچائی کو پیش کرتے ہیں۔

اہل ایمان کا یہ حال ہے کہ جب خدا اور اس کے رسولوں کے وعدوں کو سچا ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں تو پکار اٹھتے ہیں۔

وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ

اور خدا اور اُس کے رسُول نے سچ کہا۔

(الاحزاب: ۲۲)

چونکہ رسُول خدا سے علم پاتے ہیں اس لیے وُہ بھی سچے ہوتے ہیں:

وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ ○ اور پیغمبروں نے سچ کہا۔

(یٰسٓ: ۵۲)

اسی سے ظاہر ہے کہ صدق اور سچائی پیغمبروں کا سب سے پہلا وصف ہے۔ کیونکہ اُن کی ساری باتیں، دعوے، دلیلیں اور حکم اگر نعوذ باللہ سچائی سے ذرا بھی خالی ہوں تو اُن کی پیمبری اور نبوت کی ساری عمارت دھم سے زمین پر گر جائے۔ اللہ تعالیٰ نے کئی پیغمبروں کو اس صفت سے خاص طور سے موصوف کیا ہے۔ سب سے پہلے تو خود ملت حنیف کے داعی حضرت ابراہیمؑ کو اس سے متصف فرمایا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۬ اِنَّهٗ اور کتاب میں ابراہیم کا حال بیان کر
كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ○ (مریم: ۴۱) کہ وُہ بڑے سچے اور نبی تھے۔

ایک اور پیغمبر حضرت ادریسؑ کو بھی اللہ تعالیٰ نے اس سے نامزد کیا ہے:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ۬ اِنَّهٗ اور کتاب میں ادریس کا حال بیان کر
كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ○ (مریم: ۵۶) کہ وُہ بڑے سچے اور نبی تھے۔

حضرت مریمؑ جنہوں نے اللہ کی باتوں کے سچ ماننے میں ذرا بھی پس و پیش نہیں کیا اس وصف سے ممتاز ہوئیں۔ فرمایا گیا:

وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ؕ (المآئدۃ: ۷۵) اور اُن (عیسٰی) کی ماں بڑی سچی تھیں۔

حضرت یُوسُفؑ جو خواب کی تعبیر میں ایسے سچے نکلے کہ بندوں کی زبان سے صدیق کہلائے:

يُوْسُفُ اَيُّهَا الصِّدِّيْقُ (یوسف: ۴۶) یُوسف! اے بڑے سچے!

حضرت اسمٰعیلؑ نے اپنے باپ سے صبر و شکر کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دیا تو خدا سے صادق الوعد (وعدہ کا سچا) خطاب پایا:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ اِنَّهٗ	اور کتاب میں اسمٰعیل کا ذکر کر،
كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا	بے شبہ وہ وعدہ کا سچا اور بھیجا
نَّبِيًّا ○ (مریم: ۵۴)	ہوا نبی تھا۔

خدا کی خوشنودی والی جنّت جن لوگوں کو ملے گی اُن میں وُہ بھی ہوں گے جو دُنیا میں دوسری صفتوں کے ساتھ سچائی اور راست بازی سے ممتاز تھے:

اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ	صبر کرنے والے اور سچے۔
(آل عمران: ۱۷)	

خُدا نے جن لوگوں کے لیے اپنی مغفرت اور اجرِ عظیم کے وعدے کیے ہیں اُن میں اسلام و ایمان اور خُدا کی فرماں برداری کے بَعد پہلا دَرجہ سچّوں اور راست بازوں کا ہے۔ فرمایا:

اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَ	بے شک اسلام قبول کرنے والے
الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ	مرد اور عورتیں، اور ایمان لانے والے
وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ	مرد اور عورتیں، اور فرمانبردار مرد اور
.... اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ	عورتیں، اور سچے مرد اور سچی عورتیں"
مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ○	.... خدا نے اُن کے لیے مغفرت
(الاحزاب: ۳۵)	اور بڑی مزدوری رکھی ہے۔

اس سچائی کے کاروبار کا صلہ دُوسری زندگی میں ملے گا اور وُہ وہاں ہماری کامیابی کا ذریعہ بنے گی۔ قیامت کی نسبت ہے:

هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِيْنَ	یہ دِن ہے کہ سچے بندوں کو اُن کا سچ

صِدْقُهُمْ (المائدۃ: ۱۱۹) کام آئے گا۔

اس امتحان میں جس سے جس قولی اور عملی سچائی کا ظہور ہو گا اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ اس کو انعام اور عوض بھی عطا فرمائے گا۔ چنانچہ فرمایا:

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ تاکہ اللہ سچ بولنے والوں کو اُن کی
بِصِدْقِهِمْ (الاحزاب: ۲۴) سچائی کا عوض دے۔

اسلام میں سچائی کی اہمیت اتنی بڑھائی گئی ہے کہ یہی نہیں کہ سچائی اختیار کرنے کا حکم پر حکم دیا گیا ہے بلکہ یہ بھی تاکید آئی ہے کہ ہمیشہ سچوں کا ساتھ دو، سچوں ہی کی جماعت سے علاقہ اور رابطہ رکھو اور ان ہی کی صحبت میں رہو کہ ان کی سچائی کے اثر سے تم بھی سچے بنو۔ کعب بن مالکؓ اور اُن کے دو ساتھیوں نے جو تبوک کے سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہ جا سکے تھے ہر قسم کی تکلیفیں سہہ کر جس سچائی کا ثبوت دیا تھا اُس کی طرف اشارہ کر کے خدا فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ اے ایمان لانے والو خدا سے ڈرو
وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ○ اور سچوں کے ساتھ ہو۔

(التوبۃ: ۱۱۹)

اہلِ تفسیر کے نزدیک یہاں اِن سچوں سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور وہ بڑے بڑے صحابی ہیں جن کی سچائی کا بارہا امتحان ہو چکا تھا۔ مگر بہر حال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے بعد بھی یہ آیتِ کریمہ اپنی لفظی وسعت کے سبب سے ہر دور کے مسلمانوں کو سچوں کی معیت اور صحبت کی دعوت دیتی ہے۔

سچائی کے معنی عام طور سے صرف سچ بولنے کے سمجھے جاتے ہیں۔ مگر اسلام کی نگاہ میں اس

کے بڑے وسیع معنی ہیں جس کے لحاظ سے اِس کے اندر اکیلے قول ہی نہیں بلکہ عمل کی بھی ہر سچائی داخل ہے۔ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں بڑی باریک بینی سے اس کی چھ قسمیں کی ہیں اور قرآن و حدیث سے ہر ایک کے معنی بتائے ہیں: بات میں سچائی، ارادہ اور نیّت میں سچائی، عزم میں سچائی، عزم کو پُورا کرنے میں سچائی، عمل میں سچائی اور دین داری کے مقامات اور مراتب میں سچائی۔ لیکن ذرا معنی میں وسعت دیجئے تو اس کی تین ہی قسموں میں ساری سچائیاں آجاتی ہیں یعنی زبان کی سچائی، دِل کی سچائی، اور عمل کی سچائی۔

زبان کی سچّائی

یعنی زبان سے جو بولا جائے وہ سچ بولا جائے اور منہ سے کوئی حرف صداقت کے خلاف نہ نکلے۔ یہ سچائی کی عام اور مشہور قسم ہے جس کی پابندی ہر مسلمان پر فرض ہے۔ وعدہ کو پورا کرنا اور عہد اور قول و قرار کو نباہنا بھی اسی قسم میں داخل ہے اور یہ ایمان اور اسلام کی بڑی نشانی ہے۔ اس کے برخلاف ہر قسم کا جھوٹ دِل کے نفاق کے ہم معنی ہے۔ سورہَ احزاب میں ایک آیت ہے:

لِیَجْزِیَ اللّٰہُ الصّٰدِقِیْنَ	تاکہ اللہ سچّوں کو اُن کی سچّائی کا عوض
بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ	دے اور منافقوں کو سزا دے اگر چاہے
اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ	یا چاہے ان کو توبہ کی توفیق دے۔

(الاحزاب: ۲۴)

اس آیتِ پاک میں صادق کا مقابل منافق کو قرار دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ صدق ایمان کا اور جھوٹ نفاق کا سرمایہ ہے۔ اسی حقیقت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے بیان کے مختلف پیرایوں میں ظاہر فرمایا ہے۔ صفوان بن سلیم تابعی سے مرسلًا روایت ہے کہ ایک شخص

نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے پوچھا کہ کیا مسُلمان نامرد بھی ہو سکتا ہے؟ فرمایا ہو سکتا ہے۔ پھر پوچھا کیا بخیل بھی ہو سکتا ہے؟ جواب دیا "ہو سکتا ہے" پھر دریافت کیا کیا جھوٹا بھی ہو سکتا ہے؟ فرمایا "نہیں"[1]۔ کسی صحابی کہتے ہیں کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ "مومن ہر خصلت پر پیدا ہو سکتا ہے لیکن خیانت کاری اور جھوٹ پر" (نہیں)[2] مطلب یہ ہے کہ مومن میں ہر بُرائی ہو سکتی ہے، مگر خیانت کاری اور جھوٹ کی صفت نہیں ہو سکتی ہے کہ یہ ایمان کے جوہر کے سراسر خلاف ہے۔ اسی لیے ارشاد ہوا "کسی بندہ کا ایمان پورا نہیں ہوگا جب تک وہ جھوٹ کو ہر طرح سے نہ چھوڑ دے یہاں تک کہ مذاق اور جھگڑے میں بھی اگرچہ وُہ حق ہی پر کیوں نہ ہو"[3]۔ ان روایتوں کی معنوی تائید اس مشہور حدیث سے ہوتی ہے جو صحاح کی اکثر کتابوں میں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا "جس میں چار باتیں ہوں وُہ پکّا منافق ہے اور جس میں اُن میں سے ایک بات ہو تو اس میں نفاق کی ایک نشانی پائی جاتی ہے جب تک وہ اُس کو چھوڑ نہ دے۔ جب امانت اُس کے سپرد کی جائے تو خیانت کرے، جب بات کرے جھُوٹ بولے، جب کوئی قرار کرے تو پُورا نہ کرے اور جب جھگڑے تو حق کے خلاف کہے"[4]۔ یہی روایت اِس طرح بھی ہے کہ "منافق کی علامتیں تین ہیں۔ جب کہے تو جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے تو پورا نہ کرے اور جب امین بنایا جائے تو بے ایمانی کرے"[5]۔ صحیح مسلم میں اِس کے بعد ہے "اگرچہ وُہ

---

[1] موطا امام مالک باب ماجاء فی الصدق والکذب۔ [2] عن ابی امامۃ مسند احمد وعن سعد بن ابی وقاص مسند بزار وابی یعلیٰ والطبرانی فی الکبیر والبیہقی من حدیث ابن عمرؓ وقد روی مرفوعاً وموقوفاً۔ [3] مسند احمد عن ابی ہریرہؓ وطبرانی نیز مسند ابی یعلیٰ عن عمر بن الخطابؓ۔ یہ حدیثیں حافظ منذری کی ترغیب و ترہیب جلد دوم باب الترغیب فی الصدق سے لی گئی ہیں۔ [4] صحیح بخاری کتاب الایمان، وصحیح مسلم و ابوداؤد و ترمذی و نسائی۔ [5] صحیح بخاری کتاب الایمان و کتاب الادب و صحیح مُسلم۔

نمازی اور روزہ دار ہی کیوں نہ ہو اور اپنے کو مسلمان ہی کیوں نہ کہتا ہو"[1]

ان روایتوں سے یہ پوری طرح معلوم ہوا کہ سچائی سے ایمان کی اور جھوٹ سے نفاق کی پرورش ہوتی ہے۔ یعنی صدق کی راہ سے ایمان اور نیکی کا جذبہ ابھرتا ہے اور جھوٹ کی راہ سے نفاق اور برائی کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سچ بولنا نیکی کا راستہ بتاتا ہے اور نیکی جنت کو لے جاتی ہے اور آدمی سچ بولتا جاتا ہے اور سچ بولتے بولتے وہ صدیق ہو جاتا ہے۔ اور جھوٹ بدکاری کا راستہ بتاتا ہے اور بدکاری دوزخ کو لے جاتی ہے۔ اور آدمی جھوٹ بولتا جاتا ہے یہانتک کہ جھوٹ بولتے بولتے وہ خدا کے ہاں جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے"[2]

دل کی سچائی صدق کی دوسری قسم دل سے تعلق رکھتی ہے اور اس حیثیت سے صدق اور اخلاص دونوں ایک ہی چیز بن جاتے ہیں اور اس حالت میں بعض موقعوں پر زبان سے سچ کا اظہار بھی اس لیے جھوٹ ہو جاتا ہے کہ وہ دل کی تہہ سے نہیں نکلا۔ منافق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر آپ کی رسالت کا زبانی اقرار کرتے تھے اور آپؐ کی رسالت ایک بالکل سچی بات تھی۔ لیکن چونکہ یہ اقرار ان کے ضمیر کے خلاف تھا اس لیے اللہ تعالےٰ نے فرمایا،

وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ○ (المنٰفقون: ۱)	اور اللہ جتائے دیتا ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں۔

یعنی اپنی شہادت میں جھوٹے ہیں۔ زبان سے تو یہ کہتے ہیں کہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ

---

[1] صحیح مسلم [2] صحیح بخاری کتاب الادب۔

آپ خدا کے رسُول ہیں لیکن اُن کا یہ اقرار اور اُن کی یہ گواہی اُن کے دل کا اقرار اور گواہی نہیں۔ اُن کے دل میں کچھ ہے اور زبان پر کچھ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سچائی اس کا نام ہے کہ زبان سے دل کی صحیح ترجمانی کی جائے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اسی کا نام نفاق ہے جس کی بُرائی سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے۔ اسی طرح اگر کسی عمل کی دلی غرض کچھ اور ہو اور ظاہر کچھ اور کیا جائے تو وہ بھی جھوٹ ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن خدا کے سامنے تین شخص یعنی ایک عالم، ایک شہید اور ایک دولت مند پیش ہوں گے۔ اور ہر ایک اپنے علم، دولت اور جانبازی کے کارنامے بیان کرے گا۔ لیکن ان کارناموں کو سُن کر خدا کہے گا کہ تم جھوٹ بکتے ہو اور فرشتے بھی یہی کہیں گے[1]۔ یہ کارنامے اگرچہ غلط طور پر بیان نہیں کیے گئے تھے تاہم چونکہ اُن میں اخلاص نہ تھا اور وُہ محض شہرت حاصل کرنے کی غرض سے کیے گئے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُن کو جھُوٹ کہا کہ اُن کے کارناموں کی حقیقی غرض خُدا کی خوشنودی نہ تھی بلکہ دنیا کی شہرت اور ناموری تھی جس کا خدا کے یہاں کوئی معاوضہ نہیں۔

عمل کی سچّائی

عمل کی سچائی یہ ہے کہ جو نیک عمل ہو وہ ضمیر کے مطابق ہو۔ یا یوں کہیے کہ ظاہری اعمال باطنی اوصاف کے مطابق ہوں۔ مثلاً ایک شخص نماز میں خشوع وخضوع کا اظہار کرتا ہے اور اس سے اُس کا مقصود صرف نمائش ہے تو یہ شخص ظاہر ہے کہ کھلا ہوا ریاکار اور جھوٹا ہے۔ لیکن ایک عملی جھوٹ اس سے بھی بڑھ کر باریک ہے۔ ایک شخص نمائش کے لیے ایسا نہیں کرتا تاہم ظاہری طور پر اس کی نماز سے جو خشوع وخضوع ظاہر ہوتا ہے اُس کے باطن میں وُہ خشوع وخضوع نہیں ہے۔ اس لیے اس کے ظاہری اعمال اس

---

[1] ترمذی کتاب الزہد باب الریاء والسمعہ۔

کے باطن کی صحیح ترجمانی نہیں کرتے۔ اس بنا پر وہ بھی اپنے ان اعمال میں صادق نہیں۔ اس لیے زبان کی سچائی اور دل کی سچائی کے ساتھ عمل کی سچائی بھی ضروری ہے۔ اسی لیے جن مسلمانوں نے غیر متزلزل ایمان کے بعد خدا کی راہ میں جان و مال سے جہاد کیا وہ خدا تعالیٰ کے نزدیک سچے ٹھہرے۔ خدا نے فرمایا:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ○ (الحجرات: ۱۵)	مسلمان تو وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر (کسی طرح کا) شک (وشبہ) نہیں کیا اور اللہ کے رستے میں اپنی جان و مال سے جہاد کیا۔ یہی سچے لوگ ہیں۔

یہ سچے اس لیے ٹھہرے کہ اُن کا یہ عمل اُن کی دلی کیفیت کا سچا ترجمان ہوا۔ زبان اور دل سے جس ایمان کا اقرار کیا تھا عمل سے اُس کی تصدیق کر دی۔

اس صدقِ عملی کے کئی مرتبے ہیں۔ ایک یہ بھی ہے کہ جو ارادہ کیا جائے اُس میں کسی قسم کا ضعف و تردد نہ پیدا ہو۔ مثلاً ایک شخص احکامِ الٰہی کی تعمیل کا ارادہ ظاہر کرتا ہے لیکن جب اس کی آزمائش کا وقت آتا ہے تو اس کے ارادہ کا ضعف ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس لیے ایسے شخص کو صادق العزم یعنی ارادہ کا پکا نہیں کہہ سکتے۔ اس قسم کا صادق العزم وہی شخص ہو سکتا ہے جو مومن کامل ہو۔ منافق لوگ اس امتحان میں پورے نہیں اتر سکتے کیونکہ عدمِ یقین کی بنا پر وہ دل کے بودے ہوتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ ۚ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ	اور سچے مسلمان تو یہ تمنا ظاہر کرتے ہیں کہ (جہاد کے بارے میں) کوئی

مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ فِيهَا الْقِتَالُ ۙ رَأَيْتَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُونَ إِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۖ فَأَوْلَىٰ لَهُمْ ۝ طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوفٌ ۚ فَإِذَا عَزَمَ الْأَمْرُ فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۝

(محمد: ۲۰-۲۱)

سورت نازل ہو۔ پھر جب کوئی سورۃ اترتی ہے اور اس میں لڑائی کا تذکرہ ہو تو (اے پیغمبر) جن لوگوں کے دلوں میں (نفاق کا) روگ ہے تم اُن کو دیکھو گے کہ وہ تمہاری طرف ایسے (خوف زدہ) دیکھ رہے ہیں جیسے کسی پر موت کی بیہوشی طاری ہو۔ تو اُن پر تُف ہو۔ (رسُول کی) فرمانبرداری چاہیے اور صاف وصحیح جواب دینا چاہیے اور جب بات پختہ ہو جائے پھر یہ لوگ خدا سے سچے رہیں تو یہ اُن کے حق میں بہتر ہے۔

اس مرتبہ سے بڑھ کر صدق عمل کا مرتبہ یہ ہے کہ جو قول وقرار کیا جائے اور جس قول وقرار کے پورا کرنے کا سچا عزم کیا جائے اس کو وقت پڑنے پر پورا کر بھی دکھایا جائے۔ کیونکہ یہ ممکن ہے کہ انسان کسی موقع پر عزم صادق کرلے اور اس میں کسی قسم کا ضعف نہ ہو لیکن جب اس کے پورے کرنے کا وقت آئے تو اس میں ضعف ظاہر ہو۔ اس لیے صحابۂ کرام میں جن لوگوں نے عزم صادق کے ساتھ عملاً اپنے عزم کو پورا کر دکھایا ہے خدا نے اُن کو سچا کہا ہے۔

چنانچہ حضرت انس بن نضر کو غزوۂ بدر میں شرکت کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس کی تلافی

کے لیے انہوں نے کہا کہ اب اگر مجھ کو کسی غزوہ میں شرکت کا موقع ملا تو اپنی جاں بازی کے جوہر دکھاؤں گا۔ چنانچہ اس کے بعد غزوۂ اُحد میں شریک ہوئے اور نیزے، تلوار اور تیر کے تقریباً اَسّی زخم کھا کر شہادت حاصل کی۔ ایفائے عزم کی یہ بہترین مثال تھی۔ اس لیے خداوند تعالیٰ نے اُن کی شان میں یہ آیت نازل فرمائی[۱]:

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝ لِّيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ (الاحزاب: ۲۳-۲۴)	مسلمانوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ خدا کے ساتھ انہوں نے (جان نثاری کا) جو عہد کیا تھا اس میں سچے اترے سو (بعض تو) ان میں سے ایسے تھے جو اپنی پوری کر گئے (یعنی شہید ہوئے) اور بعض ان میں سے ایسے ہیں جو (شہادت کے) منتظر ہیں اور انہوں نے (اپنی بات میں) ذرا سا بھی تو ردّوبدل نہیں کیا تاکہ اللہ سچوں کو اُن کی سچائی کا عوض دے اور منافقوں کو سزا دے اگر چاہے یا اُن کو معاف کرے[۲]۔ بیشک اللہ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

---

[۱] بخاری تفسیر سورۂ احزاب [۲] یعنی ان منافقوں کو توبہ کی توفیق ہو، اور وہ آگے چل کر سچے مومن بن جائیں تو خدا اُن کو معاف فرما دے۔

صدقِ عمل کی سب سے اعلیٰ قسم یہ ہے کہ انسان کے ظاہر و باطن یعنی اس کی زبان کا ہر حرف، دِل کا ہر ارادہ اور عمل کی ہر جنبش حق و صداقت کا پورا مظہر ہو جائے۔ قرآن نے ایسے ہی لوگوں کو صدّیق کہا ہے۔ اُن کا یہ حال ہوتا ہے کہ جو کچھ دِل سے مانتے ہیں عمل سے اس کی تصدیق اور زبان سے اس کا برملا اقرار اور یقین کی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ بعض بعض صحابیوں کے حالات میں اس کیفیت کا ذکر آتا ہے۔ ایک بار ایک صحابی نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے کہا کہ "میں خدا پر سچائی کے ساتھ ایمان لایا ہوں"۔ آپؐ نے کہا کہ سوچ سمجھ کر کہو کیونکہ ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے تو تمہارے ایمان کی کیا حقیقت ہے؟ بولے "میرا دِل دُنیا سے پھر گیا ہے، اس لیے رات کو جاگا کرتا ہوں (نماز) اور دِن کو بھُوکا پیاسا رہتا ہوں (روزہ) گویا میں علانیہ عرشِ الٰہی کو دیکھ رہا ہوں، گویا مجھ کو نظر آتا ہے کہ اہلِ جنّت باہم مِل جُل رہے ہیں۔ گویا میں دوزخیوں کو واویلا کرتے ہوئے دیکھتا ہوں"۔ ارشاد ہوا کہ "تم نے جان لیا۔ اسی پر قائم رہو"[1]

صحابۂ کرام ایمان کی یہی حقیقت سمجھتے تھے اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی خاص صحبتوں میں اُن کو ایمان کا یہی درجہ حاصل ہوتا تھا۔ ایک بار حضرت حنظلہؓ اسیدی حضرت ابوبکرؓ کے پاس سے روتے ہوئے گزرے انہوں نے پوچھا "حنظلہ کیا بات ہے"؟ بولے "میں منافق ہو گیا۔ ہم لوگ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں ہوتے ہیں اور آپؐ جنّت و دوزخ کا ذکر کرتے ہیں تو گویا ہم اُن کو علانیہ دیکھ لیتے ہیں لیکن جب پلٹ کر بال بچوں اور دُنیوی کاروبار میں مشغول ہو جاتے ہیں تو سب بھول جاتے ہیں"۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ ہماری بھی یہی حالت ہوتی ہے۔ اب دونوں بزرگ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں آئے اور

---

[1] اسد الغابۃ تذکرۂ حارث بن مالکؓ۔

یہ واقعہ بیان کیا۔ ارشاد ہوا کہ اگر یہ حالت ہمیشہ قائم رہتی تو فرشتے تم سے تمہاری مجلسوں میں مصافحہ کرتے۔ یہ حالت تو کبھی کبھی پیش آجاتی ہے[1]۔

قرآن پاک کی اس آیت میں گویا اسی قسم کی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ فرمایا:

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ○	ہرگز نہیں اگر تم کو یقینی علم ہوتا
(التکاثر: ۵)	(تو تم سے یہ غفلت نہ ہوتی)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پختہ یقین سے اُس کے نتائج الگ نہیں ہو سکتے۔

سچائی کی اسی اعلیٰ ترین قسم کا تذکرہ قرآن پاک کی ان آیتوں میں ہے:

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ	نیکی یہی نہیں کہ (نماز میں) اپنا منہ
قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ	مشرق یا مغرب کی طرف کرلو بلکہ نیکی
مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ	تو اُن کی ہے جو اللہ اور روزِ آخرت
الْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَ	اور فرشتوں اور (آسمانی) کتابوں اور
اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَ	پیغمبروں پر ایمان لائے اور مال اللہ کی
الْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ	حُب پر رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں
وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ	اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیا اور
الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ	(غلامی وغیرہ کی قید سے لوگوں کی گردنوں
بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَ	(کے چھڑانے) میں (دیا) اور نماز پڑھتے
الصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ	اور زکوٰۃ دیتے رہے۔ اور جب (کسی بات
وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ	کا) اقرار کرلیا تو اپنے قول کے پورے اور

---

[1] ترمذی ابواب الزہد۔

صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ○ | تنگی اور تکلیف میں اور ہل چل کے وقت میں ثابت قدم رہے۔ یہی لوگ ہیں جو سچے نکلے اور یہی ہیں پرہیز گار۔
(البقرۃ : ۱۷۷)

اِن آیتوں میں جن کو صادق کہا گیا ہے ان کے تین قسم کے اوصاف بتائے گئے ہیں۔ اوّل اُن کے ایمان کا کمال، دُوسرے اُن کے نیک عمل اور تیسرے جانچ میں اُن کا ہر طرح پورا اترنا۔ اور جو لوگ علم اور عمل کے اِن تمام فضائل کے درجۂ کمال کو پہنچ جاتے ہیں اُن کو شریعت کی زبان میں جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ، صدّیق کہتے ہیں[۱] جو نبوّت کے بعد انسانیت کا سب سے پہلا مرتبۂ کمال ہے۔ چنانچہ آیتِ ذیل میں نبی کے بعد ہی صدّیق کا نام لیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس جماعت کی رفاقت اور ہمراہی کا ذریعہ اللہ اور رسُول کی کامل اطاعت ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ○
(النسآء : ۶۹)

اور جو اللہ اور رسُول کی اطاعت کرے تو وہ (جنت میں) اُن (مقبول بندوں) کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام کیے یعنی نبی اور صدّیق اور شہید اور (دُوسرے) نیک بندے۔ اور یہ لوگ (کیا ہی) اچھے ساتھی ہیں۔

سورۂ حدید میں ایمانِ کامل اور جانی و مالی جہاد کی بار بار دعوت کے بعد ارشاد ہے :

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ | اور جو اللہ اور اس کے رسُولوں پر

---

[۱] الصدیق الذی یصدق قوله بالعمل (مجمع البحار نعتی)

صدّیق وہ ہے جس کے قول کی تصدیق عمل سے ہو۔

أُولَٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيقُونَ — ایمان لائے وہی صدیق ہیں۔

(الحدید: ۱۹)

اس سے معلوم ہوا کہ صدیقیت اس کامل ایمان کے ذریعہ سے نصیب ہوتی ہے جس سے عمل کبھی جدا نہیں ہوسکتا۔ یہ حدیث اُوپر گزر چکی ہے کہ "انسان سچ بولتے بولتے صدیق ہوجاتا ہے"۔ اس سے معلوم ہوا کہ صرف ایک دو دفعہ سچ بول دینے سے یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے صداقت پر مضبُوطی سے قائم رہنے کی ضرورت ہے۔

اس تفصیل سے اندازہ ہوگا کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیم نے سچّائی کی تلقین کس وسعت اور گہرائی کے ساتھ کی ہے۔ زبان کی سچّائی، دِل کی سچّائی اور عمل کی سچّائی اور جب ان تینوں میں کوئی مسلمان کامل ہو تو وُہ کامل راست باز اور صادق ہے۔

سخاوت

سچائی کے بعد اسلام کی دُوسری بنیادی اخلاقی تعلیم سخاوت ہے۔ سخاوت کے حقیقی معنی اپنے کسی حق کو خوشی کے ساتھ دُوسرے کے حوالہ کر دینے کے ہیں۔ اور اس کی بہت سی صورتیں ہیں۔ اپنا حق کسی کو معاف کرنا، اپنا بچا ہوا مال کسی دُوسرے کو دینا، اپنی ضرورت کا خیال کیے بغیر کسی دُوسرے کو دینا، اپنی ضرورت کو روک کر کسی دُوسرے کو دینا، دُوسرے کے لیے اپنے جسم کی قوّت کو خرچ کرنا، اپنے دماغ کی قوّت کو خرچ کرنا، اپنی آبرو کو خطرہ میں ڈال دینا دُوسروں کو بچانے کے لیے یا حق کی حمایت میں اپنی جان دے دینا، یہ سب سخاوت کی ادنیٰ اور اعلیٰ قسمیں ہیں جن کے امتیاز کے لیے الگ الگ نام رکھے گئے ہیں۔

اس سے معلوم ہوگا کہ سخاوت اور فیاضی کی تعلیم کتنے وسیع معنوں کو گھیرے اور اخلاق کی کتنی ضمنی تعلیموں کو محیط ہے۔ اور ان سب کا منشا یہ ہے کہ اپنی ذات سے دوسروں کو فائدہ پہنچایا جائے اور ظاہر ہے کہ یہی خیال اکثر اخلاقی کاموں کی بنیاد ہے۔

سورۂ بقرہ کے شروع میں اللہ تعالیٰ نے اپنے متقی بندوں کے کچھ اوصاف بتائے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے:

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ○ اور ہم نے اُن کو جو روزی دی اُس

(البقرۃ : ۳) میں سے کچھ (خدا کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔

بعض اہلِ تفسیر نے اس خرچ کرنے سے مراد زکوٰۃ لی ہے۔ مگر صحیح یہ ہے کہ یہ آیت زکوٰۃ کے ساتھ خاص نہیں[1]۔ بلکہ یہاں جس طرح روزی کی تخصیص نہیں کی گئی کہ کیا دی گئی پھل کہ مویشی کہ سونا چاندی یا کوئی اور چیز، اسی طرح اس میں سے کچھ خدا کی راہ میں دینے کی صورت کی بھی تعیین نہیں کی گئی۔ خدا نے جس بندہ کو جو کچھ اپنے فضل سے دیا ہے اس کو اس میں سے اس شخص کو دینا چاہیے جس کو نہیں ملا یا ضرورت سے کم ملا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ جس کو جو ملا ہے اس میں کچھ اُن کو دینا جو اس سے محروم رہے ہیں یا جو اس کے محتاج ہیں متقیوں کی نشانی ہے اور اسی کا نام اخلاق کی اصطلاح میں سخاوت اور فیاضی ہے۔

ایمان کے بعد اسلام کے دو سب سے اہم رکن نماز اور زکوٰۃ ہیں۔ زکوٰۃ کی اصلی رُوح یہی سخاوت اور فیاضی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی نظر میں اس اخلاقی تعلیم کی حیثیت بالکل بنیادی ہے یعنی جس طرح نماز کی عبادت ہر قسم کے حقوقِ الٰہی کی بنیاد ہے اسی طرح سخاوت اور فیاضی بندوں کے ہر قسم کے حقوق کی اساس ہے۔ جب تک کسی میں یہ وصف پیدا نہ ہوگا اس میں اپنے ہم جنسوں کے ساتھ ہمدردی اور محبّت کا جذبہ نہ ہوگا۔ اسی لیے اسلام نے زکوٰۃ کو فرض کر کے انسان کے اسی جذبہ کو ابھارا ہے۔ سارا قرآن انفاق (خرچ کرنا) اور ایتاء (دینا) کے حکم اور تعریف سے بھرا ہوا ہے۔ سورۃ بقرہ میں خصوصیّت کے ساتھ خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی تاکید پر تاکید آئی ہے اور کہیں کہیں اس کو جہاد کی ایک کڑی بنا دیا گیا ہے۔ فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِمَّا اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اس میں

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری جلد اول تفسیر آیت مذکور۔

رَزَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّاۡتِىَ يَوۡمٌ لَّا بَيۡعٌ فِيۡهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالۡكٰفِرُوۡنَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ○

(البقرہ: ۲۵۴)

سے کچھ خرچ کرو جو ہم نے تم کو دیا ہے، اس سے پہلے کہ وُہ دن آئے جس میں نہ خریدنا ہے، نہ دوستی ہے، نہ سفارش ہے۔ اور کافر ہی ہیں ظالم۔

اس آیت پاک کا آخری ٹکڑا (اور کافر ہی ہیں ظالم) غور کے قابل ہے۔ اس ٹکڑے سے قیاس ہوتا ہے کہ جو شخص روزِ جزا کے فائدہ کا خیال نہ کر کے خدا کی راہ میں اپنی کوئی چیز خرچ نہیں کرتا وہ کفر کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ یا یہ کہ وہ کافرِ نعمت ہے جو خدا کی روزی کی نعمت پاکر اُس کے شکرانہ میں اِس میں سے کچھ خدا کی راہ میں نہیں دیتا۔

اس آیت پاک میں اللہ تعالیٰ نے کیسے پُرتاثیر انداز میں بندوں کو اپنی دی ہوئی روزی میں سے خرچ کرنے پر اُبھارا ہے کہ اے لوگو! اس سے پہلے کہ وُہ دن آئے جس میں خدا کی رحمت اور عذاب سے چھٹکارا نہ خرید و فروخت سے حاصل ہو سکتا ہے، نہ دوستی و محبت سے اور نہ سعی و سفارش سے، کچھ اپنی روزی میں سے جو خود تمہاری نہیں بلکہ میری ہی دی ہوئی ہے، خرچ کر کے خُدا کی رحمت اور دوستی کو خرید لو کہ اُس دن یہی کام آنے والا ہے۔

خدا کی راہ میں جو سخاوت کی جائے، ضرور ہے کہ اُس میں خلوص نیت ہو۔ اس سے مقصود نہ تو کسی کو ممنونِ احسان بنانا ہو اور نہ اس کا اولاہنا دینا ہو۔ خود رسُول کو فرمایا وَلَا تَمۡنُنۡ تَسۡتَكۡثِرُ[1] اور احسان نہ کر (یا احسان نہ دھر) کہ (زیادہ بدلہ چاہے) اس خلوص کے ساتھ جو خرچ کیا جائے گا اس کی مزدوری خدا دے گا اور قیامت کے غم و ملال سے اس کو ہر طرح آزاد رکھے گا۔ ارشاد ہے:

---

[1] المدثر: ۶۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ	جو اپنی دولت خدا کی راہ میں خرچ کرتے
سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ	ہیں، پھر اس کے خرچ کیے پیچھے نہ تو
مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى لَّهُمْ	احسان دھرتے ہیں اور نہ اُولاہنا دیتے
اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ج وَلَا	ہیں، اُن کی مزدوری ان کے پروردگار
خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○	کے پاس دھری ہے۔ اور نہ اُن کو ڈر
(البقرة: ۲۶۲)	ہوگا، اور نہ وُہ غمگین ہوں گے۔

آگے چل کر ارشاد ہے کہ جو دیا جائے وہ کوئی نکمی چیز نہ ہو کہ اس کے دینے سے نفس کی بلندی کے بجائے نفس کی دنائت ظاہر ہوتی ہے۔ فرمایا گیا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا	اے وُہ لوگو جو ایمان لائے اس میں
مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ	سے جو تم نے کمایا اور اس میں سے جو ہم
اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَلَا	نے تمہارے لیے زمین سے نکالا، اچھی
تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ	چیزیں خرچ کرو۔ اس میں سے بُری
وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ	چیز کے دینے کا قصد نہ کرو جو کہ تم
تُغْمِضُوْا فِيْهِ ط	دیتے ہو حالانکہ تم آپ اس کو لینے
(البقرة: ۲۶۷)	والے نہیں مگر یہ کہ آنکھ اس کے لینے میں میچ لو۔

مطلب یہ ہے کہ جس کو تم خوشی سے لینا پسند کرو اس کا دینا بھی پسند کرو۔ جب تک ایسا نہ کرو گے اخلاق کا وہ جوہر جس کا نام نیکی اور فیاضی ہے تم کو ہاتھ نہیں آسکتا۔ صاف فرمایا:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا	ہرگز تم نیکی کو نہ پاؤ گے جب تک
مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۵ وَمَا تُنْفِقُوْا	تم اُس میں سے خرچ نہ کرو جو تم کو

مِنۡ شَیۡءٍ فَاِنَّ اللّٰہَ بِہٖ عَلِیۡمٌ ۝ پسند ہے۔ اور جو بھی تم خرچ کرو

(آل عمران: ۹۲) خدا جانتا ہے۔

یعنی خدا دِل کے حال سے خبردار ہے۔ کس نیت سے اور کس طرح کا مال تم دے رہے ہو اس کی حقیقت اوروں سے چھپی رہے تو چھپی رہے مگر ان سب دلوں کے حال جاننے والے سے تو نہیں چھپ سکتی ہے اور اسی لیے وُہ پورا پورا بدلہ بھی دے سکتا ہے۔ اور اس طرح نیکی کے کام میں جو کچھ تم دیتے ہو اس کا نفع بھی لوٹ کر تم ہی کو ملے گا۔ دنیا میں تو اس طرح کہ جماعتی کاموں کی مضبوطی اور جہاد اور محتاجوں کی مدد میں جو کچھ دیتے ہو اس سے اس جماعت کا فائدہ بلکہ زندگی ہے جس کے تم خود بھی ایک ممبر ہو۔ اور دین میں تو ظاہر ہے کہ ہر کام کا بدلہ اسی کو ملے گا جو کرے گا۔ فرمایا:

وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ فَلِاَنۡفُسِکُمۡ ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡنَ اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡہِ اللّٰہِ ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ یُّوَفَّ اِلَیۡکُمۡ وَاَنۡتُمۡ لَا تُظۡلَمُوۡنَ ۝

(البقرۃ: ۲۷۲)

اور جو بھی تم نیکی خرچ کرو تو وہ تمہارے ہی لیے ہے اور تم نہیں خرچ کرتے مگر اللہ کے لیے اور جو بھی تم خرچ کرو، وُہ تم کو پورا دے دیا جائے گا اور تمہارے ساتھ ذرا بے انصافی نہ کی جائے گی۔

اور اسی لیے کہ دنیا میں جو کچھ دے گا وہ آخرت میں اس کو پورا پورا بلکہ بڑھا کر ادا کر دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ کو قرض سے تعبیر کیا ہے اور دل بڑھانے والے انداز سے پکارا ہے:

مَنۡ ذَا الَّذِیۡ یُقۡرِضُ اللّٰہَ کون ہے ایسا جو اللہ کو قرض دے

قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً	اچھا قرض تو اس کے واسطے وہ اس کو بہت گُنا کرے۔

(البقرۃ: ۲۴۵)

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗٓ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ○ (الحدید: ۱۱)	کون ہے ایسا جو اللہ کو قرض دے اچھا قرض تو وُہ اس کو اس کے واسطے دونا کرے۔ اور ہے اس کے لیے عزّت کی مزدوری۔

آگے چل کر پھر فرمایا:

اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ○ (الحدید: ۱۸)	بے شک خیرات کرنے والے اور خیرات کرنے والیاں اور قرض دیتے ہیں اللہ کو اچھا قرض، ان کو دونا دیا جائے گا اور ان کے لیے عزّت والی مزدوری ہے۔

کہیں حکم کی صورت میں ہے:

وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (المزمل: ۲۰)	اور اللہ کو اچھا قرض دو۔

قرض حسنہ یعنی اچھا قرض اسی لیے فرمایا کہ وُہ خلوص سے دیا جائے اور اس کے بدلہ میں لینے والے سے کسی دنیاوی غرض کا مطالبہ نہ ہو، نہ اس پر احسان دھرا جائے، نہ اُس سے بدلہ مانگنے کی نیت ہو۔ بنی اسرائیل سے خدا نے جن باتوں کا عہد لیا تھا اُن کو قرآن میں مسلمانوں کے سامنے بھی دہرایا گیا ہے۔ ان میں نماز اور ایمان کے بعد زکوٰۃ کا

ذکر ہے اور اس کے بعد آخری بات یہ ہے:

وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا	اور (اگر) تم اللہ کو اچھی طرح کا قرض
(المائدة: ۱۲)	دیتے رہے۔

تو ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوگا:

لَاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ	تو میں تم سے تمہاری برائیاں اتاروں
لَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ	گا اور تم کو ان باغوں میں داخل کرونگا
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ	جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔
(المائدة: ۱۲)	

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو بدوی ایمان لائے اور خوش نیتی کے ساتھ کارِ خیر میں خرچ کرتے تھے، خدا نے اُن کی تعریف فرمائی:

وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ	اور بعضے بدوی ایسے ہیں جو اللہ اور
بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ	پچھلے دن پر ایمان لاتے ہیں اور ٹھہراتے
مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَ	ہیں جس کو خرچ کرتے ہیں اللہ سے
صَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ۭ	نزدیک ہونا اور رسول کی دعا لینا۔
(التوبة: ۹۹)	

خدا نے ایسے سخی داتاؤں کو خوشخبری دی:

اَلَآ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ۭ سَيُدْخِلُهُمُ	ہاں! وہ اُن کے حق میں نزدیکی کا سبب
اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ	ہے۔ اُن کو اللہ اپنی رحمت میں داخل
رَّحِيْمٌ ۝ (التوبة: ۹۹)	فرمائے گا۔ بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

متقی سخیوں کے لیے خدا نے اپنی بخشش اور وسیع جنت کا وعدہ فرمایا ہے اور اس کی طرف جھپٹ کر جانے کی منادی کی ہے :

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ	اور اپنے پروردگار کی بخشش اور اس جنت کی طرف دوڑو جس کا پھیلاؤ ہے آسمان اور زمین۔ تیار ہوئی ہے پرہیزگاروں کے واسطے۔ جو خوشی اور تکلیف (دونوں حالتوں) میں خرچ کرتے ہیں۔
(آل عمران : ۱۳۳-۱۳۴)	

سورۂ بقرہ میں اللہ تعالیٰ نے اس خرچ کی جو خدا کی راہ میں کیا جائے ایک مثال دی ہے جس سے یہ اچنبھا کہ ایک معمولی سے صدقہ کا ثواب دس گنا کیوں کر ہو گا دُور ہو جاتا ہے۔ فرمایا :

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝	اُن کی مثال جو اپنے مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، ایک دانہ کی سی ہے جس سے سات بالیں اُگتی ہیں، ہر بال میں سو دانے ہوتے ہیں اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے بڑھا دیتا ہے، اور اللہ کشائش والا ہے، سب جانتا ہے۔
(البقرۃ : ۲۶۱)	

جیسے یہ ایک دانہ سینکڑوں دانے بن جاتا ہے ایسے ہی نیکی کا ایک بیج ثواب کے

سینکڑوں دانے پیدا کر لیتا ہے۔ خدا گنجائش اور کشائش والا ہے اُس کے ہاں ایک کا سو بن جانا کچھ مشکل نہیں ہے۔ اور وُہ جانتا بھی ہے کہ کس نے کتنی اچھی نیّت سے یہ دیا ہے۔ اسی رکوع کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے اُن کی جو خُدا کی خوشنودی کے لیے اچھی نیّت سے اپنا مال دیتے ہیں، ایک اور مثال دی ہے:

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ	اور اُن کی مثال جو اپنا مال خدا کی
ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا	خوشنودی چاہنے کے لیے اور اپنے
مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ	کو پکا کرنے کو دیتے ہیں ایک باغ
بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ	کی سی ہے جو کسی ٹیلہ پر ہو، اس پر
اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ فَاِنْ لَّمْ	مینہ پڑا تو اس نے اپنا پھل دونا دیا،
يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ وَاللّٰهُ	اور اگر مینہ نہیں پڑا تو اوس ہی پڑی
بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ○	اور اللہ تمہارے کام دیکھتا ہے۔

(البقرۃ: ۲۶۵)

اس مثال میں ٹیلہ کی اُونچی صالح زمین سے اچھی نیّت، بارش سے زیادہ اور اوس سے تھوڑا بہت خرچ کرنا اور پھل سے ثواب مراد ہے۔ تو جیسے باغ کسی اچھی زمین میں پانی سے اور وہ نہ ہو تو ذرا سی نمی سے بھی لہلہا اٹھتا ہے ایسے ہی اچھی نیّت سے خدا کی راہ میں جو دیا جائے وُہ ایک کے بدلہ میں سو ہو جاتا ہے۔ اور اللہ ہمارے ہر کام سے باخبر ہے اس لیے ہماری نیتوں کے بھید سے بھی آگاہ ہے۔

اس داد و دہش اور جود و سخا کی بلندی اور پاکیزگی کا بہت اونچا معیار سورۂ لیل میں بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا:

۱۔ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَ اتَّقٰى ۝ وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝ (الیل : ۵-۷)	تو جس نے (راہِ خدا میں) دیا اور پرہیز کیا اور اچھی بات کو مانا، تو ہم اس کے لیے (نیکی کی) سہج بات کا راستہ آسان کریں گے۔
۲۔ وَ سَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۝ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ۝ وَ مَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى ۝ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى ۝ وَ لَسَوْفَ يَرْضٰى ۝ (الیل : ۱۷-۲۱)	۲۔ اور اس (دوزخ کی آگ) سے وُہ پرہیزگار بچایا جائے گا جو اپنا مال پاکیزگی چاہ کر دیتا ہے۔ اور اس پر کسی کا احسان نہیں جس کا بدلہ دیا جائے بلکہ اپنے پروردگار برتر کی خوشی کے لیے، اور وُہ خوش ہو جائے گا۔

پہلی آیت بتاتی ہے کہ راہِ خدا میں دینے کی عادت، اطاعت و عبادت یا نیک کاموں کے کرنے کی رُوح پیدا کر دیتی ہے جس سے ہر نیک کام کا کرنا اس پر آسان ہو جاتا ہے۔ یہ اس نیک عادت کا کتنا بڑا فائدہ ہے۔ دُوسری آیت کہتی ہے کہ ایسے متقی پر جو داد و دہش کا عادی ہے، دوزخ کی آگ حرام ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس جود و سخا کا سبب دنیاوی اُمور یا کسی کے احسان کا بدلہ اتارنا یا کوئی اور غیر مخلصانہ غرض نہ ہو بلکہ مقصود صرف خدا ہو اور یہ ہو کہ مال و دولت کے میل سے اُس کا دامن دِل پاک ہو جائے۔ خدا فرماتا ہے تو خدا بھی اس کے اس نیک عمل کا وہ بدلہ اس کو عنایت فرمائے گا کہ وُہ بھی خوش ہو جائے گا۔ اس دوسری آیت میں یہ اشارہ ہے کہ اس نیک عادت کا اثر یہ بھی ہے کہ اِس سے دِل میں

پاکیزگی آتی ہے۔

کفر اور نفاق کے بعد مال و دولت کی محبت ہی وہ کثیف غبار ہے جو دِل کے آئینہ کو میلا کرتا، اور حق کے قبول سے روکتا رہتا ہے۔ دُنیا کی اصلاحات کی پوری تاریخ اس واقعہ پر گواہ ہے اسی لیے اسلام نے جب اپنی دعوت اور اصلاح کا کام شروع کیا تو سب سے پہلے دلوں کے اسی میل کو دھونا چاہا، اور جود و سخا اور داد و دہش کی بر ملا تعریف اور جمع مال، حرص و طمع اور بُخل کی بہت مذمت کی اور اس بات کی کوشش کی کہ اس کی تعلیم کا یہ اثر ہو کہ اس کے پیروؤں کے دِلوں سے مال و دولت کی محبت ہمیشہ کے لیے جاتی رہے:

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۝ الَّذِىْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۝

(الھمزۃ: ۱-۳)

پھٹکار ہو ہر غیبت کرنے والے عیب کرنے والے پر۔ جس نے دولت اکٹھی کی اور اس کو گن گن کر رکھا۔ سمجھتا ہے کہ اس کی یہ دولت اس کو سدا رکھے گی۔

ایک اور آیت میں مال کی محبت پر کافروں کو طعنہ دیا ہے:

وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝

(الفجر: ۲۰)

اور تم مال و دولت سے بہت ہی محبّت رکھتے ہو۔

یہی محبّت سچائی اور نیکی کے راستہ پر چلنے سے روکتی ہے، اور انسان سمجھتا ہے کہ اگر میں نے یہ راستہ اختیار کیا تو میری یہ دولت مجھ سے چھن جائے گی اور میرا مال خرچ ہو جائے گا۔ اسی وسوسۂ شیطانی کو خدا نے انفاق (خدا کی راہ میں دینا) کے سلسلہ میں ان

لفظوں میں ادا کیا ہے:

اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ وَ	شیطان تم کو محتاجی کا خیال دلاتا ہے
یَاْمُرُکُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰہُ	اور تمہیں بے حیائی کی بات (بخل)
یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَۃً مِّنْہُ وَفَضْلًا ؕ	کو کہتا ہے۔ اور خدا تم سے اپنی طرف
وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ○	سے گناہوں کی بخشایش اور فضل و کرم
(البقرۃ: ۲۶۸)	کا وعدہ کرتا ہے۔ اور اللہ کشایش والا

ہے، جانتا ہے۔

قرآن کی اصطلاح میں دین و دنیا کی ایک بہت بڑی دولت کا نام حکمت ہے۔ یہ دل کی وُہ کنجی ہے جس سے علم اور عمل کا ہر بند خزانہ کھُل جاتا ہے۔ حکمت کا یہ خزانہ اُس وقت تک کسی کو نہیں ملتا جب تک اُس کے دِل سے دُنیا کے مال و دولت کی محبت جاتی نہ رہے۔ اِسی لیے اللہ تعالےٰ نے اس اُوپر والی آیت کے بعد ہی ارشاد فرمایا:

یُّؤْتِی الْحِکْمَۃَ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَ	وُہ دیتا ہے سمجھ (حکمت) جس کو
مَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ	چاہے اور جس کو سمجھ (حکمت) دی گئی
خَیْرًا کَثِیْرًا ؕ	اس کو بڑی دولت ملی۔
(البقرۃ: ۲۶۹)	

یعنی یہ سمجھ لینا کہ شیطان کا یہ وہم دلانا کہ ہم دینے سے محتاج ہو جائیں گے اس کا سراسر دھوکا ہے۔ اور خدا کا یہ وعدہ کہ دینے سے اس کے فضل و کرم کا دروازہ کھلے گا درست ہے، بہت بڑی دانائی کی بات ہے۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہے کہ مال و دولت کی محبت ایک آزمایش ہے اس

آزمایش میں پورا اترنا کامیابی کی شرط ہے۔ پھر فرمایا جو بخالت اور لالچ سے بچا وہی مراد کو پہنچا کیونکہ ہر اُونچے مقصد کے لیے پہلی شرط جان و مال کی بازی لگانا ہے۔ جس کے پاؤں اس بازی میں ٹھہر گئے وہی بامراد ہوا اور جس کے اکھڑ گئے وہ نامراد رہا:

اِنَّمَآ اَمۡوَالُكُمۡ وَاَوۡلَادُكُمۡ فِتۡنَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عِنۡدَهٗۤ اَجۡرٌ عَظِيۡمٌ ○ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسۡتَطَعۡتُمۡ وَاسۡمَعُوۡا وَاَطِيۡعُوۡا وَاَنۡفِقُوۡا خَيۡرًا لِّاَنۡفُسِكُمۡ ؕ وَمَنۡ يُّوۡقَ شُحَّ نَفۡسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ○ اِنۡ تُقۡرِضُوا اللّٰهَ قَرۡضًا حَسَنًا يُّضٰعِفۡهُ لَكُمۡ وَيَغۡفِرۡ لَكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ شَكُوۡرٌ حَلِيۡمٌ ○ (التغابن: ۱۵-۱۷)	تمہارا مال اور تمہاری اولاد تو جانچ ہے۔ اور اللہ کے پاس بڑی مزدوری ہے۔ تو اللہ سے ڈرو جتنا ہو سکے اور (اس کی باتوں کو) سنو اور مانو اور (راہِ خدا میں) خرچ کرو اپنے لیے بھلائی کرو۔ اور جو اپنی جان لالچ سے بچایا گیا وہی کامیاب ہیں۔ اگر اللہ کو قرض دو اچھا قرض تو وہ اس کو تمہارے لیے دونا کرے گا اور تمہارے گناہ معاف فرمائے گا اور اللہ (نیکی کی) قدر پہچانتا ہے اور (برائی کا بدلہ لینے میں) بُردبار ہے۔

ان آیتوں میں انفاق اور کارِ خیر میں دینے کو کامیابی کی کنجی جو کہا گیا ہے وہ انسانیت کی اصلاحی تاریخ کے حرف بحرف مطابق ہے۔ قوموں کی ترقی کا مدار بہت کچھ اس پر ہے کہ وُہ اپنی دولت کو اچھے کاموں میں لگاتی اور افراد میں بانٹتی رہیں یعنی جماعت کے کاموں اور کمائی کے ناقابل یا کمائی سے محروم افراد کی مدد میں اپنا سرمایہ خرچ کرتی رہیں۔ اس کا

فائدہ یہ ہوگا کہ دولت ایک شخص کے پاس اکٹھی نہ ہونے پائے گی اور تموّل کی برائیوں سے لوگ بچے رہیں گے اور بخل اور لالچ کے سبب سے اچھے کاموں کے کرنے سے ہچکچایا نہ کریں گے۔ طور سخاوت کی تعلیم سے اسلام کا ایک بڑا مقصد یہ بھی ہے۔

سخاوت سے جو چیز انسان کو روکتی ہے وہ اُس کے دو قسم کے بیہودہ خطرے ہیں:

۱۔ میری چیز ہے میں دُوسروں کو کیوں دوں!

۲۔ دُوسروں کو دوں گا تو میرے کمی ہو جائے گی جس سے ضرورت کے وقت مجھے تکلیف ہو گی۔

اسلام نے اپنی تعلیم سے انسان کے ان دونوں وسوسوں کا خاتمہ کر دیا ہے۔ اس نے یہ بتایا اور اپنے پیرووں کو اچھی طرح یقین دلایا ہے کہ یہ مال حقیقت میں میرا تیرا کسی کا نہیں وہ صرف خدا کا ہے وہی اس کا مالک ہے، اسی کی چیز ہے اور اسی کی راہ میں دی جانی چاہیے:

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	اور تم کو کیا ہوا ہے جو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے اور آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ ہی کی ہے۔

(الحدید: ۱۰)

بخل کی بُرائی میں کہا:

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ	اور نہ سمجھیں وہ لوگ جو اس میں بخل کرتے ہیں جس کو اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے کہ یہ اُن کے حق

لَهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ (اٰل عمرٰن : ۱۸۰)	میں بہتر ہے۔ بلکہ یہ اُن کے حق میں بُرا ہے۔ قیامت کے دن اُن کے گلے میں اس کا طوق ڈالا جائے گا، جس کا بُخل کیا تھا اور آسمانوں کی اور زمین کی میراث اللہ ہی کی ہے۔

ذرا ذرا سے فرق سے قرآنِ پاک میں بیسیوں جگہ یہ آیت ہے:

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	اور خدا ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔

اسی طرح بیسیوں مقام پر تھوڑے تھوڑے فرق سے یہ آیت آتی ہے:

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	آسمانوں اور زمین کی ملکیت (یا بادشاہی) اُسی کی ہے۔

منافقوں نے سازش سے یہ طے کرنا چاہا کہ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلام کی مالی امداد وہ نہ کریں تاکہ جو مسلمان اکٹھے ہو گئے ہیں، وہ سرمایہ نہ ہونے پر بکھر جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے منافقوں کی اس سازش کی خبر اپنے رسولؐ کو دی اور ساتھ ہی منافقوں کے اس زعمِ باطل کی کہ اسلام کا سرمایہ اُن کے دینے سے ہوگا، تردید کی۔ فرمایا:

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ؕ وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ	وہی لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ خدا کے رسول کے پاس جو لوگ ہیں ان پر خرچ نہ کرو تاکہ[1] وہ چھوڑ کر الگ ہو جائیں

---

[1] (یا) یہاں تک کہ وہ چھوڑ کر الگ ہو جائیں۔

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ○ (المنافقون: ۷)	اور اللہ ہی کے ہیں خزانے آسمانوں کے اور زمین کے اور لیکن منافقین سمجھتے نہیں ہیں۔

منافق یہ سمجھتے تھے کہ اسلام کا یہ سارا سرمایہ جس سے تبلیغ نبوی کی کل چل رہی ہے اُن کے بل بوتے سے ہے۔ خدا نے فرمایا یہ سارا خیال غلط ہے۔ آسمان اور زمین کے خزانہ میں جو کچھ ہے وہ اُسی کا ہے۔ وہ جہاں سے جس کو چاہے جو چاہے دے دے۔ دُوسرے خیال کو طرح طرح سے باطل کیا۔ فرمایا:

لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ○ (الشوریٰ: ۱۲)	اسی کے پاس ہیں آسمانوں کی اور زمین کی کنجیاں۔ پھیلا دیتا ہے روزی جس کے لیے چاہے اور ناپ کر دیتا ہے۔ وہ ہر ایک چیز کی خبر رکھتا ہے۔

یہ حقیقت ظاہر کی کہ روزی کی فراوانی اور تنگی دونوں اِنسان کی جانچ کے دو برابر کے راستے ہیں۔ اگر ایک میں انسان کی فیّاضی، مال کے عدمِ محبت، ایثار، اور جذبۂ شکر کا امتحان ہے تو دُوسرے میں انسان کی قناعت پسندی، بے طمعی اور جذبۂ صبر کی آزمائش ہے۔ فرمایا:

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ ○ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ	سو آدمی جو ہے جب اُس کا مالک اس کو جانچے پھر اس کو عزّت دے اور نعمت دے تو وہ کہتا ہے کہ میرے مالک نے مجھے عزّت دی۔ اور جب

رِزْقَهٗ ۙ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ ۚ	اس کو جانچے تو اس کی روزی اس
كَلَّا	پر تنگ کرے تو کہتا ہے کہ میرے
(الفجر: ۱۵-۱۶)	مالک نے مجھے ذلیل کیا۔ یہ کوئی بات نہیں۔

غرض روزی کی کشایش اور تنگی دونوں خدا کے کام ہیں اور مصلحت سے ہیں۔ دولت مند انسان یہ سمجھتا ہے کہ مجھی میں کوئی بات ہے جس سے مجھے یہ دولت ملی یا مجھی کو کوئی ایسا ہنر یا طریقہ معلوم ہے جس سے یہ ساری دولت میرے چاروں طرف سمٹی آرہی ہے۔ مذہبی تعلیم کے علاوہ دنیا کے واقعات پر گہری نظر اس یقین کے مٹانے کے لیے کافی ہے مگر کم نگاہ لوگ ادھر دیکھتے نہیں۔ قرآن نے اس انسانی جبلت کا نقشہ ان لفظوں میں کھینچ کر اس کی غلطی بتائی ہے:

فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ۡ	سو جب آدمی کو کوئی تکلیف آلگے تو
ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا ۙ	ہم کو پکارے پھر جب ہم اپنی طرف
قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ ؕ	سے اس کو کوئی نعمت دیں تو کہے کہ
بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ	یہ تو مجھے علم[1] پر ملا ہے (خدا فرماتا ہے)
لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ قَدْ قَالَهَا الَّذِيْنَ	بلکہ یہ تو جانچ ہے مگر بہتیرے اس کو نہیں
مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا	سمجھتے۔ یہی بات ان کے پہلوں نے کہی تھی[2]،

---

[1] اس کا ایک مطلب تو اہلِ تفسیر نے یہ لیا ہے کہ مجھے یہ پہلے سے معلوم تھا۔ دوسرا یہ ہے کہ دولت کے حصول کے طریقوں کا مجھے ہنر معلوم تھا۔ اس دوسرے مطلب کی تائید سورۂ قصص میں قارون کے قصہ والی آیت سے ہوتی ہے، (دیکھو رُوح المعانی جلد ۲۴ صفحہ ۱۱ مصر۔)

[2] چنانچہ قارون کو جب راہ خدا میں خرچ کرنے کی نصیحت کی گئی تو اس نے بھی یہی کہا تھا: قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ (القصص: ۷۸) "قارون نے کہا یہ دولت تو مجھے ایک ہنر سے ملی ہے جو میرے پاس ہے۔"

كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ فَاَصَابَهُمْ	تو ان کو ان کی یہ کمائی کام نہ آئی۔ اور جو
سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ؕ وَالَّذِيْنَ	کمایا تھا اس کی برائیاں ان پر پڑیں۔
ظَلَمُوْا مِنْ هٰٓؤُلَاۗءِ سَيُصِيْبُهُمْ	اور جو ان میں سے گنہگار ہیں ان پر
سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ۙ وَمَا هُمْ	بھی ان کی کمائی کی برائیاں پڑنے والی
بِمُعْجِزِيْنَ ۝ اَوَلَمْ يَعْلَمُوْٓا	ہیں۔ وہ تھکا نہیں سکتے۔ کیا ان کو
اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ	یہ خبر نہیں کہ اللہ ہی روزی جس کے
يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ	لیے چاہتا ہے پھیلاتا ہے اور جس
لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝	کو چاہتا ہے) ناپ کر دیتا ہے اس
	میں ایمان والوں کے لیے البتہ
(الزمر: ۴۹-۵۲)	نشانیاں ہیں۔

ہر جاندار کی روزی خدا کے ذمہ ہے۔ اس کا یقین انسان کو آجائے تو سخاوت اور فیاضی کا ہر راستہ اُس کے لیے آسان ہو جاتے۔ اسلام نے انسانوں کو یہی یقین دلایا ہے۔ خدا نے فرمایا:

وَمَا مِنْ دَاۗبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا	اور کوئی چلنے والا نہیں زمین میں مگر
عَلَي اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ	یہ کہ اس کی روزی خدا پر ہے وہ
مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۭ	جانتا ہے جہاں اس کو ٹھہرنا ہے
كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝	(یعنی دوزخ یا بہشت) اور جہاں
	اس کو سونپا جاتا ہے (یعنی قبر)۔
	سب (علم الٰہی کی) کھلی کتاب میں
(ھود: ۶)	موجود ہے۔

دوسرا یقین یہ آئے کہ ہماری روزی میں سے جو کچھ دوسرے کو مل جاتا ہے وہ تقدیر میں اُسی کا حصّہ تھا اِس لیے درحقیقت وُہ ہمارا تھا ہی نہیں۔ اسلام نے اپنے پیروؤں کے اندر سخاوت اور فیاضی کا جوہر پیدا کرنے کے لیے اُن یقینیات کو مسلمانوں کے ریشہ ریشہ میں رچا دینا چاہا ہے۔ وہی سب کو روزی پہنچاتا ہے۔ خدا تعالیٰ پوچھتا ہے:

وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؕ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ؕ (النمل: ۶۴)	اور تم کو کون روزی دیتا ہے آسمان سے اور زمین سے۔ اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی ہے؟

روزی دینا اُسی کا کام ہے:

اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ○ (الذّٰریٰت: ۵۸)	بے شبہ اللہ جو ہے وہی روزی دینے والا ہے، زور آور، مضبوط۔

احادیث میں رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے طرح طرح کے پُر اثر انداز سے اس تعلیم کی تشریح اور تاکید کی ہے۔ فرمایا "تم باندھو نہیں، ورنہ تم پر باندھا جائے گا"[1] یعنی اگر تم اپنی تھیلی کا منہ بند کرو گے اور دُوسروں کو نہ دو گے تو خدا بھی اپنی تھیلی کا منہ تم سے بند کرلے گا اور تم کو نہیں دے گا۔ ایک دفعہ صحابہ سے پوچھا "تم میں سے کس کو اپنے مال سے اپنے وارثوں کا مال زیادہ پیارا ہے؟ لوگوں نے کہا ہم میں کوئی ایسا نہیں جس کو اپنے مال سے اپنے وارثوں کا مال زیادہ پیارا ہے۔ فرمایا "تو اس کا مال تو وہی ہے جس کو اُس نے آگے بھیجا اور جو پیچھے چھوڑا وہ تو اس کے وارث کا مال ہے"[2] ایک دفعہ

---

[1] صحیح مسلم جلد ۱ باب الحث علی الانفاق۔ [2] صحیح بخاری جلد ۲ باب ما قدم من مالہ فھولہ۔

آپؐ نے قرآن پاک کی یہ آیت پڑھی اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ (تم کو مال و دولت اور ناز و نعمت کی بڑھوتری نے غفلت میں ڈال دیا) پھر فرمایا "آدم کے بیٹے کا یہ حال ہے کہ کہتا ہے کہ میرا مال میرا مال! اور تیرا مال تو وہی ہے جو تو نے صدقہ کیا اور آگے چلا یا یا کھالیا تو اُس کو فنا کر چکا اور پہن لیا تو اس کو پرانا کر چکا۔"[1]

فرمایا "اے ابوذرؓ! مجھے یہ پسند نہیں کہ میرے پاس اُحد کے پہاڑ برابر سونا ہو اور تیسرے دِن تک اُس میں سے ایک اشرفی بھی میرے پاس رہ جائے مگر یہ کہ کسی قرض کے ادا کرنے کو رکھ چھوڑوں۔ میں کہوں گا کہ اس کو خدا کے بندوں میں ایسے ایسے داہنے بائیں پیچھے بانٹ دو۔" پھر فرمایا "ہاں جن کے پاس یہاں زیادہ ہے ان ہی کے پاس وہاں قیامت میں کم ہوگا لیکن یہ کہ وہ کہے کہ ایسے ایسے داہنے بائیں پیچھے بانٹ دو۔" فرمایا "رشک دو ہی پر روا ہے۔ ایک اُس پر جس کو اللہ نے دولت دی ہے تو وہ ہاتھوں سے اس کو صحیح مصرف (حق) میں لٹا رہا ہے دوسرے اُس پر جس کو اللہ نے علم دیا ہے تو وہ اُس کے مطابق بتا رہا ہے اور سکھا رہا ہے۔"[3]

اس حدیث کے پہلے ٹکڑے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سخاوت اُس دینے کا نام ہے جو صحیح مصرف (حق) میں ہے اور اُس میں دینا جس کا مصرف صحیح نہ ہو یا جو اپنی حد سے زیادہ ہو اسراف اور فضول خرچی ہے جس کی بُرائی قرآن پاک میں آئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ مسلمان کا قدم میانہ روی اور اعتدال سے باہر نہ پڑے۔ اس کی تفصیل اسراف اور بخل کے بیان میں آئے گی۔

یہ بھی سخاوت نہیں کہ کوئی عمر بھر اپنی دولت کو اپنے کلیجے سے لگائے رکھے۔ اور جب

---

[1] جامع ترمذی باب ماجاء فی الزہادۃ فی الدنیا۔ حدیث حسنٌ صحیح۔ [2] صحیح بخاری کتاب الرقاق باب قول النبی صلعم ما احب ان لی مثل احد ذہباً۔ [3] صحیح بخاری کتاب العلم۔

موت سامنے آکر کھڑی ہو جائے اور یقین ہو جائے کہ اب یہ عمر بھر کی ساتھی ساتھ چھوڑ رہی ہے تو ہتھیلی مل کر افسوس کرے کہ اب ذرا سا بھی موقع مل جائے تو اس کو نیک کاموں میں لٹا جاؤں۔ قرآن پاک نے آدمی کی اس بے بسی کا نقشہ کس پُر اثر انداز میں کھینچا ہے اور مسلمانوں کو اپنی زندگی ہی میں کچھ کر جانے کی نصیحت کی ہے:

وَ اَنۡفِقُوۡا مِنۡ مَّا رَزَقۡنٰكُمۡ	اور ہم نے تم کو جو روزی دی اس میں
مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ يَّاۡتِىَ اَحَدَكُمُ	سے خرچ کرو اس سے پہلے کہ تم میں سے
الۡمَوۡتُ فَيَقُوۡلَ رَبِّ لَوۡ لَاۤ	کسی ایک کو موت آنے لگے تو کہے کہ
اَخَّرۡتَنِىۡۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِيۡبٍۙ	اے میرے مالک تو نے مجھے تھوڑی
فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنۡ مِّنَ الصّٰلِحِيۡنَ ۝	مہلت اور نہ دی کہ میں خیرات کرتا اور
(المنافقون: ۱۰)	نیکوں میں ہو جاتا۔

خدا نے اس کے جواب میں فرمایا:

وَلَنۡ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفۡسًا اِذَا جَآءَ	اور خدا ہرگز کسی کو مہلت اور نہ دے گا
اَجَلُهَا ؕ وَاللّٰهُ خَبِيۡرٌۢ بِمَا	جب اس کا وقت آجائے۔ اور اللہ کو
تَعۡمَلُوۡنَ ۝ (المنافقون: ۱۱)	خبر ہے جو کرتے ہو۔

اس لیے جو کچھ کرنا ہے وقت پر کرنا چاہیے۔ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کون سا صدقہ سب سے بڑا ہے؟ فرمایا "یہ کہ تم صدقہ کرو، اور تم تندرست ہو، مال کی خواہش ہو، اور جینے کی بھی امید ہو، اور تم اس پر ڈھیل نہ دو کہ جب جان حلق تک آجائے تو تم کہو کہ فلاں کو اتنا دو اور فلاں کو اتنا دو حالانکہ وہ تو اب (تمہارے بعد) فلاں کا ہو ہی چکا۔"[1]

فرمایا "اے آدم کے بیٹے! تیرا دینا تیرے لیے بہتر اور تیرا رکھ چھوڑنا تیرے لیے بُرا ہے۔"[2]

---

[1] صحیح مسلم جلد اول صفحہ ۳۰۱ مصر باب بیان افضل الصدقہ [2] صحیح مسلم باب الید العلیا۔

عفّت و پاکبازی

عفّت و پاک بازی ان ساری اخلاقی خوبیوں کی جان ہے جن کا رنگ و عزّت اور آبرو سے ہے۔ اسی لئے اسلام نے اس کو ان اخلاقی محاسن میں گنایا ہے جو مسلمانوں کے چہرہ کا نور ہیں چنانچہ سورہ مومنون میں مسلمانوں کے جو امتیازی اوصاف بتائے گئے ہیں ان میں اس اخلاقی وصف کا بھی خاص طور پر ذکر ہے۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ	اور (وہ مسلمان) جو اپنی شرمگاہوں کی
حٰفِظُوْنَ ○ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ	پاسبانی کرتے ہیں مگر اپنی بیبیوں یا
اَوْمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ	اپنے ہاتھ کی مملوکہ (باندیوں) سے
غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ○ فَمَنِ ابْتَغٰى	تو ان پر کچھ الزام نہیں لیکن جو اس
وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ	کے علاوہ کے طلب گار ہوں تو وہی
الْعٰدُوْنَ ○ (المؤمنون: ۵-۷)	لوگ حد سے باہر نکلے ہوئے ہیں۔

سورہ معارج میں مسلمانوں کے جن اخلاقی اوصاف کی تعریف کی گئی ہے ان میں ایک عفّت اور پاک بازی بھی ہے۔ فرمایا:

وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِفُرُوْجِھِمْ حٰفِظُوْنَ ○ (المعارج: ۲۹)

اور جو اپنی شہوت کی جگہ کی حفاظت کرتے ہیں۔

جن مسلمانوں کے لئے خدا نے اپنی بخشش اور بڑی مزدوری کا وعدہ کیا ہے ان میں وہ بھی ہیں جو عفیف اور پاک دامن ہیں۔

وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَھُمْ وَالْحٰفِظٰتِ (الاحزاب: ۳۵)

اور اپنی شرمگاہوں کی پاسبانی کرنے والے مرد اور پاسبانی کرنے والی عورتیں۔

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوگا کہ عفّت اور پاک دامنی کے لئے قرآن کی اصطلاح "حفظِ فروج" ہے۔ حفظ کے معنی حفاظت اور پاسبانی کے ہیں اور فروج اپنے معنی میں ایک مجازی استعمال ہے۔ کتنے لفظ ہیں جو شرم کے قابل لفظوں سے بچاؤ کے لئے پہلے پہل مجاز کے طور پر بولے گئے مگر بعد کو استعمال کی کثرت سے وہ اپنے مفہوم میں بالکل ہی بے پردہ ہو گئے۔ فرج کے اصلی معنی دو چیزوں کے درمیان خلا کے ہیں اور اسی لئے اس سرحدی مقام کو بھی کہتے ہیں جدھر سے دشمنوں کے حملہ کا ڈر ہو۔ اس بنا پر یہ انسانوں کے اعضا میں سے اُس خلا کا نام ہے جو ان کے دونوں پاؤں کے بیچ میں ہے اور جدھر سے دشمنوں کی آمد کا خطرہ ہر وقت لگا ہو اور جس پر پہرہ چوکی بٹھا کر ہر دم پاسبانی اور نگرانی کی ضرورت ہو۔ اس طریقۂ تعبیر سے اندازہ ہوگا کہ عفّت و پاکبازی کا جو تخیّل ان لفظوں کے اندر پیوست ہے وہ کتنا گہرا اور کتنا بلند ہے۔

عفّت و پاکبازی کے لئے قرآن کا دوسرا لفظ اِحصان ہے جو حِصن سے بنا ہے جس کے معنی قلعہ یا محفوظ مقام کے ہیں۔ اس سے حَصانُ، اِحصانُ، مُحصَنُ اور مُحصِنُ الفاظ بنائے گئے ہیں پہلا لفظ قرآن میں نہیں آیا مگر عربوں کے اشعار میں آیا ہے۔ اس کے معنی پاک دامن عورت کے ہیں۔ دوسرے کے معنی حفاظت میں لینے یا حفاظت میں رکھنے کے ہیں۔ یہ قرآن میں تین موقعوں پر آیا ہے۔ دو دفعہ

حضرت مریمؑ کی عصمت و پاکدامنی کے بیان میں ماضی معروف کے صیغہ ہیں:

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا (التحریم: ۱۲)	اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی شرمگاہ کو محفوظ رکھا۔
وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا (الانبیاء: ۹۱)	اور وہ بی بی جس نے اپنی شرمگاہ کو محفوظ رکھا تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی۔

تیسری جگہ ماضی مجہول کا صیغہ آیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ شوہر نے اس کو اپنے نکاح میں لا کر اپنی حفاظت میں لے لیا۔ لونڈیوں کے بیان میں ہے کہ اگر وہ کسی کے نکاح میں آکر بدکاری کریں تو ان کی سزا کیا ہے۔ فرمایا:

فَاِذَآ اُحْصِنَّ (النسآء: ۲۵)	تو جب وہ نکاح کی قید میں آچکیں۔

اسی سے اس کا اسم فاعل مُحْصِنٌ (حفاظت میں لانے والا) اور اسم مفعول مُحْصَنَۃٌ (حفاظت میں لائی گئی) نکاح کے سلسلہ میں قرآن میں آیا ہے:

مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ (النسآء: ۲۴)	حفاظت میں لانے والے نہ مستی نکالنے والے۔
مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ (النسآء: ۲۵)	حفاظت میں آنے والیاں نہ مستی نکالنے والیاں۔

یعنی نکاح کی غرض یہ ہے کہ عورت کو عصمت اور حفاظت کی قید میں لایا جائے۔ صرف حیوانی خواہش کا دفع کرنا نکاح کا مقصد نہیں اسی لئے قرآن پاک میں اس کے علاوہ مُحْصَنٰتٌ (حفاظت میں رکھی ہوئی بی بیاں) دو معنوں میں آیا ہے۔ ایک بیاہی عورتوں کے معنی میں، جیسے:

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ (النسآء: ۲۴) — اور بیاہی عورتیں (یعنی جو عورتیں کسی کے نکاح میں ہیں وہ دوسرے مرد پر حرام ہیں)۔

دوسرے شریف آزاد بی بیوں کے معنی ہیں جیسے:

وَمَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ مِنْکُمْ طَوْلًا اَنْ یَّنْکِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ (النسآء: ۲۵) — اور جس کو تم میں سے مسلمان شریف وآزاد بیویوں کے نکاح کا مقدور نہ ہو تو مسلمان باندی سے نکاح کرے)۔

عورتوں کی عصمت کے بیان میں قرآن پاک نے ایک اور محاورہ بھی استعمال کیا ہے۔

حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ (النسآء: ۳۴) — پیٹھ پیچھے حفاظت کرنے والیاں۔

یعنی اپنے شوہروں کی غیر حاضری میں عزّت وآبرو کی پوری حفاظت کرتی ہیں۔

اسلام میں عفّت اور پاکبازی کا وہ رتبہ ہے کہ وہ نبوّت ورسالت کا لازمی جزء ہے۔ نبی، نبی کے سلسلۂ نسب اور نبی کے اہلِ بیت کا دامن اس داغ سے ہمیشہ پاک رہتا ہے حضرت عیسیٰؑ کی ماں حضرت مریمؑ کی نسبت یہود نے جو بہتان باندھا تھا قرآن نے اس کی تردید کی اور ان کی عصمت اور پاک دامنی کی شہادت دی۔ اور دو موقعوں پر اس شہادت کی تصریح کی۔

وَمَرْیَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا (التحریم: ۱۲) — اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی شرم گاہ کو محفوظ رکھا۔

وَالَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهَا مِنْ رُّوْحِنَا (الانبیاء: ۹۱) — اور وہ بی بی جس نے اپنی شرم گاہ کو محفوظ رکھا تو ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے جس پاک بازی کا ثبوت دیا اس کی گواہی خود عزیزِ مصر

کی بیوی نے دی:

وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ ؕ (یوسف: ۳۲)	اور میں نے اُس کو اس سے چاہا تو وہ بچا رہا۔

خدا نے فرمایا میں نے ایسا اس لئے کیا:

لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ○ (یوسف: ۲۴)	تا کہ ہم اس سے بُرائی اور بے حیائی کو دور کریں۔ اور وہ بے شبہ ہمارے چُنے بندوں میں تھا۔

معلوم ہوا کہ خُدا کے چُنے ہوئے اور برگزیدہ بندے ایسی بے حیائی کی باتوں سے پاک رکھے جاتے ہیں۔

حضرت یحییٰؑ کی تعریف میں فرمایا گیا:

وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ (آل عمران: ۳۹)	اور سردار ہوگا اور اپنی قوتِ شہوانی پر ضبط رکھتا ہوگا اور نبی ہوگا صالحوں میں سے۔

اسلام میں اہلِ بیتِ نبویؐ کی زندگی جس عفّت، عصمت اور پاک بازی کی تصویر تھی غیب کے دانائے راز نے اس کی گواہی ان لفظوں میں دی:

اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ○ (النور: ۲۶)	یہ لوگ تہمت سے پاک ہیں، اُن کے لئے بخشایش ہے اور عزّت دار روزی۔

عِفّت و پاک دامنی کے خلاف کا نام قرآن کی زبان میں فَاحِشَۃٌ [1] آیا ہے جس کے معنی

---

[1] اس کا منشا یہ نہیں ہے کہ قرآن میں ہر جگہ یہ لفظ اسی معنی میں آیا ہے بلکہ وہ لغت کی رو سے قول اور عمل کی ہر برائی کو شامل ہے۔

بہت بڑی بُرائی کے ہیں، جیسے

اِلَّآ اَنۡ یَّاۡتِیۡنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ (النسآء: ۱۹) — مگر یہ کہ وہ عورتیں کھلی بُرائی کریں۔

وَالّٰتِیۡ یَاۡتِیۡنَ الۡفَاحِشَةَ مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ (النسآء: ۱۵) — اور تمہاری عورتوں میں سے جو کھلی برائی کریں۔

اس بُرائی کا مشہور عربی نام زنا ہے۔ قرآنِ پاک کی ذیل کی آیت میں مسلمانوں کو اس برائی سے روکا گیا ہے:

وَلَا تَقۡرَبُوا الزِّنٰۤی اِنَّهٗ کَانَ فَاحِشَةً وَّ سَآءَ سَبِيۡلًا ۝ (بنی اسرآءیل: ۳۲) — اور زنا کے قریب نہ جاؤ بے شک یہ بڑی بُرائی اور بُرا چلن ہے۔

یہ نصیحت جس طرز سے کی گئی ہے وہ بلاغت کی جان ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ "تم زنا نہ کرنا" بلکہ یہ کہا کہ "تم زنا کے قریب نہ جانا" اس طرزِ ادا نے نہ صرف یہ کہ اس فعلِ بد ہی سے بچنے کی تاکید کی بلکہ اس سے قریب ہو کر گزرنے کی بھی ممانعت کی۔ اس سے یہ نکتہ پیدا ہوا کہ جس طرح اس بدکاری سے بچنا شرافت ہے اس کی تقریب اور تمہید کے کاموں سے بھی بچنا شرافت کا اقتضا ہے کسی غیر محرم کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے یا بے حیائی کے ارادہ سے دیکھنا، تنہائی میں ملنا جلنا، بے وجہ اس کے بدن کو چھونا یا اور کسی طرح سے اس کی بات چیت اور آمد و رفت سے ناجائز لطف اٹھانا یا دوسری غیر شریفانہ حرکات کرنا ایمانی عزت اور اخلاقی شرافت کے سراسر منافی ہے۔

اسی لئے اسلام نے اُن ساری باتوں کو جو بے حیائی اور بدکاری کی تقریب اور تمہید ہیں حرام قرار دیا۔ مرد و عورت کے ناجائز تعلق و محبت کا پہلا قاصد نظر ہے مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں دونوں کو حکم دیا کہ جب وہ ایک دوسرے کے سامنے ہوں تو اپنی نظریں نیچی رکھیں۔

قُلۡ لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ يَغُضُّوۡا مِنۡ — اے پیغمبرؐ! ایمان والوں سے کہہ دے

اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ؕ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ○ (النور: ۳۰)	کہ وہ ذرا اپنی آنکھیں نیچی رکھیں اور اپنے ستر کی حفاظت کریں۔ یہ اُن کے لئے بڑی ستھری بات ہے۔ اللہ جانتا ہے جو وہ کرتے ہیں۔

عورتوں کی ذراسی بے باکی بھی مردوں کو آگے بڑھنے کی جرأت دلاتی ہے اس لئے اُن پر شرافت کی چند پابندیاں عائد کی گئیں مثلاً یہ کہ وہ بھی نگاہیں نیچی رکھیں، غیروں کو اپنے اندر کا بناؤ سنگار نہ دکھائیں، اپنے زیوروں کی جھنکار کسی کو نہ سنائیں، اسی لئے زمین پر ہولے چلیں یا جھنکار کے زیور نہ پہنیں، سینہ کا پردہ رکھیں، باہر نکلیں تو سارے جسم پر چادر ڈال کر نکلیں، باہر نکلنے میں خوشبو نہ ملیں، بیچ راستہ سے کترا کر کنارہ کنارہ چلیں، مرد اور عورت راستہ میں باتیں نہ کریں، مرد و عورت مل جُل کر نہ بیٹھیں، کسی غیر عورت سے کوئی تنہائی میں نہ ملے، اجازت کے بغیر گھر کے اندر کوئی اور قدم نہ رکھے۔ یہ تمام باتیں درحقیقت لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی (زنا کے قریب بھی نہ ہو) کی شرح ہیں۔ فرمایا:

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ	اور اے پیغمبر! ایمان والی بی بیوں سے کہہ دے کہ اپنی آنکھیں ذرا نیچی رکھیں اور اپنے ستر کی جگہ کی حفاظت کریں اور اپنا بناؤ سنگار کھول کر نہ دکھائیں مگر جو طبعاً کھلا رہتا ہے[1] اور اپنی اوڑھنی اپنے گریبانوں (یعنی سینوں کے مقام)

---

[1] جیسے آنکھوں کا سرمہ، ہاتھوں کی مہندی یا انگلیوں کی انگوٹھی۔ اسی لئے چہرہ، ہتھیلیاں اور قدم ستر میں داخل نہیں۔

اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ
بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ
اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ
بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا
مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ
غَيْرِ اُولِي الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ
اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا
عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۠ وَلَا يَضْرِبْنَ
بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ
مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ۭ وَتُوْبُوْٓا اِلَى
اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ
لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (النور: ٣١)

پر ڈال لیں اور اپنا سنگار نہ کھولیں مگر
اپنے شوہر یا اپنے باپ کے آگے یا اپنے
شوہر کے باپ یا اپنے بیٹوں یا اپنے
شوہر کے بیٹوں یا اپنے بھائیوں یا اپنے
بھتیجوں یا اپنے بھانجوں یا اپنی عورتوں[1]
یا اپنے غلاموں یا اپنے اُن مرد نوکروں کے آگے
جن کو غرض نہیں یا ان لڑکوں کے آگے جو عورتوں
کے ستر کے رمز سے ابھی آگاہ نہیں اور نہ مسلمان عورتیں
اپنے پاؤں سے دھمک دیں کہ جس سنگار
کو وہ چھپاتی ہیں اس کا پتہ لگ جائے۔
اور تم سب مل کر اے مسلمانو خدا کے
آگے توبہ کرو، شاید تم بھلائی پاؤ۔

اور حسبِ ذیل ادب گو پیغمبر کی بیویوں کو خطاب کر کے سکھایا گیا ہے مگر عام عورتوں کے لئے اس میں پیروی کا نمونہ ہے:

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ
مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا
تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ
الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ

اے پیغمبر کی بیویو! تم نہیں ہو جیسی ہر
کوئی عورت۔ اگر تم (اللہ کا) ڈر رکھو
سو تم دب کر (مرد سے) بات نہ کرو
کہ جس کے دل میں روگ ہے وہ

---

[1] یعنی سہیلیاں اور خادمائیں اور اکثر جن کا ساتھ رہا کرتا ہے (روح المعانی)۔

قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝ وَقَرْنَ فِيْ	خواہش کرے[1] اور نیک بات کہو
بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ	اور اپنے گھروں میں وقار سے رہو
الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى	اور جیسے نادانی کے پہلے زمانہ میں دستور
	تھا ویسے اپنے کو بناؤ سنگار کر کے
(الاحزاب: ۳۲-۳۳)	دکھاتی نہ پھرو[2]۔

کسی غیر کے گھر کے اندر اجازت کے بغیر قدم نہ رکھا جائے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا	اے ایمان والو! نبی کے گھروں میں
بُيُوْتَ النَّبِيِّ اِلَّاۤ اَنْ يُّؤْذَنَ	اس کے بدون کہ تم کو اجازت دی جائے
لَكُمْ (الاحزاب: ۵۳)	(کھانے کی دعوت کے لئے) داخل نہ ہو۔

گو یہ حکم یہاں خاص واقعہ سے متعلق ہے مگر حکم کا منشا نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے گھروں کے ساتھ خاص نہیں۔ چنانچہ عفّت و پاک دامنی ہی کے سلسلہ میں سورۂ نور میں اسی قسم کا حکم عام مسلمان گھروں کی نسبت بھی ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا	اے ایمان والو! تم اپنے گھروں کے
بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى	سوا دوسرے گھروں میں نہ جایا کرو
تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰۤى	جب تک خبر نہ کر لو اور ان گھر والوں
اَهْلِهَا ؕ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ	کو سلام نہ دے لو۔ یہ بہتر ہے تمہارے
لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ (النور: ۲۷)	حق میں شاید تم یاد رکھو۔

کوئی غیر مرد اگر کسی غیر کے زنانہ مکان سے کوئی چیز مانگے تو چاہیئے کہ پردہ کے اوٹ سے

---

[1] یعنی تم سے جرأت کر کے تمہارا خواہاں ہو۔ [2] التبرج اظهار الزينة للناس الاجانب (لسان العرب)۔

مانگے یہ نہیں کہ دھڑ دھڑا کر اندر گھس جائے۔ چنانچہ کاشانۂ نبویؐ کے تعلق سے حکم ہوتا ہے:

وَإِذَا سَأَلْتُمُوهُنَّ مَتَاعًا فَاسْأَلُوهُنَّ مِن وَرَاءِ حِجَابٍ ۚ ذَٰلِكُمْ أَطْهَرُ لِقُلُوبِكُمْ وَقُلُوبِهِنَّ ۚ
(الاحزاب: ۵۳)

اور جب تم مانگنے جاؤ اُن بیویوں سے کچھ چیز کام کی تو مانگ لو پردہ کے اوٹ سے۔ اس میں تمہارے اور اُن کے دلوں کی بڑی ستھرائی ہے۔

یہ حکم گو شانِ نزول کے لحاظ سے ازواجِ مطہرات کے سلسلہ سے ہے مگر اس میں عام مسلمان گھروں کے لئے بھی حُسنِ ادب کا ایک نمونہ ہے۔

مسلمان عورتیں جب گھر سے باہر نکلیں تو اپنے کو ایک چادر سے ڈھانپ لیں تاکہ اُن کی زیبائش و آرائش کا ہر نقش راہ چلتوں کی آنکھوں سے اوجھل رہے اور یہ پہچان ہو کہ یہ عزت والی شریف بی بیاں ہیں۔ اُن کو چھیڑنا تو کجا اُن کی طرف نظر بھر کر دیکھنا بھی شریعت کا جرم ہے۔ فرمایا:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِن جَلَابِيبِهِنَّ ۚ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰ أَن يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝ لَّئِن لَّمْ يَنتَهِ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَالْمُرْجِفُونَ فِي الْمَدِينَةِ

اے نبی! اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دے کہ اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں نیچی لٹکا لیں۔ اس سے یہ ہوگا کہ وہ پہچان پڑیں گی (کہ یہ شریف ہیں) تو ان کو ستایا نہ جائے۔ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اگر اس پر بھی منافق اور جن کے دلوں میں (بے حیائی کا)

لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا ۝

(الاحزاب: ۵۹-۶۰)

روگ ہے اور مدینہ میں جھوٹ اڑانے والے نہ رُکے تو ہم تجھے ان پر بھڑکائیں گے پھر وہ نہ رہنے پائیں گے اس شہر میں تیرے ساتھ مگر تھوڑے دن۔

ان آیتوں میں اشارہ مدینہ کے بعض شریروں اور منافقوں کی طرف ہے جو مسلمان بی بیوں کو جو خاص خاص ضرورتوں کے لئے اپنے گھروں سے نکلتی تھیں چھیڑتے تھے۔ اور جب انہیں اس پر ڈانٹا جاتا تھا تو کہتے تھے کہ ہم ان کو لونڈی سمجھے تھے۔ اس معاشرتی برائی کو دور کرنے کے لئے اللہ تعالےٰ نے دونوں کو دو حکم دیئے۔ شریروں کی نسبت فرمایا کہ اگر وہ اب اس حرکت سے باز نہ آئیں تو انہیں کافی سزا دی جائے بلکہ ان کو شہر بدر کیا جا سکتا ہے۔ اور مسلمان بی بیوں کے لئے فرمایا کہ جب وہ کسی ضرورت سے اپنے گھروں سے باہر نکلیں تو وہ اپنی ظاہری وضع قطع سے بھی شریف معلوم ہوں اور سوسائٹی کی کم درجہ عورتوں سے اپنی پوشاک و وضع الگ رکھیں۔ اس کے لئے صورت یہ بتائی کہ جب گھر سے نکلنے لگیں تو ایک بڑی چادر سر کے اوپر سے اوڑھ لیں جس سے اندر کا بھڑکیلا لباس، زیور اور دوسرے بناؤ سنگار سب چھپ جائیں اور دیکھنے والوں کو معلوم ہو کہ یہ شریف گھرانوں کی بی بیاں ہیں جن کی عزت کا احترام ہر شریف کا فرض ہے۔

عرب میں اسلام سے پہلے لونڈیوں سے عصمت فروشی کا کام لیا جاتا تھا[1] اور لوگ ان کی کمائی کھاتے تھے اور اس کو عیب نہیں سمجھتے تھے۔ مدینہ کا ایک ممتاز منافق عبداللہ ابن ابی بن سلول اپنی لونڈیوں کو اس پیشہ پر مجبور کرتا تھا۔ مگر اس کے باوجود اسلام سے پہلے مدینہ میں وہ اس عزت کا مستحق سمجھا جاتا تھا کہ اس کے سر پر مدینہ کا تاج رکھا جائے۔ عورتیں بناؤ سنگار

---

[1] تفسیر طبری، تفسیر سورۂ نور صہ ۹۳ مصر و صحیح مسلم و سنن ابی داؤد عن جابر۔

کر کے گھر سے باہر نکلا کرتی تھیں، سینوں کی پوشش کا لحاظ نہیں کرتی تھیں، بدکار عورتیں شراب کی محفل میں ساقی گری کرتی تھیں اور گریبان کھلا رکھتی تھیں کہ جو چاہے دست درازی کر سکے[1] اور نشان کے لئے اپنے گھروں پر جھنڈیاں لگاتی تھیں۔ اسلام نے آکر ان مراسم کی اصلاح کی بدکاری کے انسداد اور عفت و پاکبازی کے خیالات پھیلانے کے لئے ضرورت تھی کہ اس بدترین پیشہ کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا جائے۔ چنانچہ اس پر یہ آیت اتری:

وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوا عَرَضَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۚ وَمَن يُكْرِههُّنَّ فَإِنَّ اللَّهَ مِن بَعْدِ إِكْرَاهِهِنَّ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ (النور: ۳۳)	اور تمہاری لونڈیاں اگر کسی ایک کی ہو کر رہنا چاہیں تو ان سے دنیا کی زندگی کے عارضی فائدہ کے لئے زبردستی بدکاری نہ کرایا کرو، اور جو ان کو اس پر مجبور کرے گا تو ان کی بے بسی کے پیچھے اللہ بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔

اسی لئے اسلام نے اس کو حرام کمائیوں میں سے قرار دیا ہے[2]۔ اسی کے ساتھ یہ بھی کیا کہ کسی مسلمان مرد کے لئے یہ اچھا نہیں سمجھا ہے کہ ایسی پیشہ ور عورتوں کو توبہ سے پہلے اپنے نکاح میں لے کیونکہ اس سے اسلامی معاشرت کی ساری آب و ہوا زہر آلود ہو جاتی۔ سنن ابی داؤد (کتاب النکاح) میں ہے کہ ایک صحابی نے اسی قسم کی ایک پیشہ ور عورت سے نکاح کرنا چاہا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی اجازت چاہی۔ وحیِ الٰہی نے ان کی اس درخواست کا یہ جواب دیا:

اَلزَّانِي لَا يَنكِحُ إِلَّا زَانِيَةً	بدکار مرد بدکار ہی عورت یا مشرکہ

---

[1] سبعہ معلقہ میں طرفہ کے قصیدہ کا یہ شعر پڑھیے۔ رحیب قطاب الجیب منہا رفیقة ۔ بحق الندامی بضة المتجرد ۔

[2] صحیح مسلم باب تحریم مطل الغنی وغیرہ ۔

أَوْ مُشْرِكَةً وَّالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (النور: ۳)

عورت سے نکاح کرے گا اور بدکار عورت سے بدکار ہی مرد یا مشرک نکاح کرے گا۔ ایمان والوں پر یہ حرام ٹھہرایا گیا ہے۔

اس آیت میں انسانی فطرت کی تصویر ہے کہ بدکار عورتوں کو اپنے قبضہ میں لانے کے لئے نکاح کا خیال بدکار ہی مردوں کے دل میں آسکتا ہے۔ اسی لئے اس کے بعد آگے چل کر فرمایا گیا:

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ (النور: ۲۶)

گندی عورتیں گندے مردوں کے لئے ہوتی ہیں اور گندے مرد گندی عورتوں کے لئے، اور پاک عورتیں پاک مردوں کے لئے اور پاک مرد پاک عورتوں کے لئے۔

اسی لئے کسی بدکار مرد کا کسی عفیفہ سے اور کسی پاک باز کا بدکار عورت سے نکاح شریعت میں پسندیدہ نہیں بلکہ بعض علماء کے نزدیک سرے سے جائز نہیں اور ان کی دلیل سورۂ نور کی

---

[1] جمہور کے نزدیک زانی کا غیر زانیہ سے یا زانیہ کا غیر زانی سے قانوناً نکاح درست ہے لیکن اخلاقاً پرہیز کے قابل ہے۔ اور اس آیت سے اس کی جو حرمت سمجھی جاتی ہے اس سے مراد اس کی برائی ہے یا یہ کہ اہلِ ایمان کی شان سے یہ بعید ہے کہ وہ ایسوں سے نکاح کریں یا اَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ اور فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ سے منسوخ ہے یا مخصوص ہے۔ لیکن بعض صحابہ اور علماء کا مسلک یہ ہے کہ زانی مرد کا عفیف عورت سے اور عفیف مرد کا بدکار عورت سے نکاح واقعی حرام ہے۔ بلکہ اگر زن و شوہر میں سے کوئی اس برائی کا مرتکب ہو تو قاضی نکاح کو فسخ کر دے گا۔ چنانچہ روایت ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنے زمانہ میں یہی فیصلہ کیا (باقی اگلے صفحہ پر)

اوپر والی آیت کے علاوہ وہ حدیث ہے جس کو ابوداؤد اور احمد نے ثقات سے روایت کیا ہے۔ ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس پر زنا ثابت ہو اور اس کی سزا اس کو دی گئی ہو اس کا نکاح ایسے ہی سے کیا جائے[1]۔

غرض اہلِ ایمان جن کی شان ستھرائی اور پاک بازی ہے اُن کے ذہن میں بھی ایسا گندہ تصوّر نہیں آنا چاہیئے۔ چنانچہ سورۂ فرقان میں خدا نے جن کو اپنا خاص بندہ کہا ہے ان کی تین صفتیں آخر میں یہ بتائی ہیں جو خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک نہیں کرتے، جو کسی کا خون ناحق نہیں بہاتے اور جو بدکاری نہیں کرتے۔ فرمایا:

وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ	اور جو خدائے برحق کے ساتھ کسی اور
اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ	خدا کو نہیں پکارتے اور کسی ایسی جان
الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ	کا جس کو خدا نے منع کیا ہے خون نہیں
وَلَا يَزْنُوْنَ ج (الفرقان: ۶۸)	بہاتے اور بدکاری نہیں کرتے۔

اس آیت میں یہ نکتہ لحاظ کے قابل ہے کہ ان تین ممنوعہ باتوں میں سے پہلی اس سب سے بڑی سچائی سے متعلق ہے جس کا انکار سراسر کفر ہے۔ اس کے بعد جو دو باتیں ہیں اُن میں سے ایک جان سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری عزت و آبرو سے۔

ابوداؤد کی حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ بعض فقہانے یہ بھی کہا ہے کہ زن وشو میں کفو ہونا شرط ہے۔ اور چوں کہ عفیف بدکار کا کفو نہیں ہو سکتا۔ اس لئے یہ نکاح فریقین میں سے جو عفیف ہے۔ اس کے اعتراض کے بعد قائم نہیں رہ سکتا۔ ایک اور مسلک یہ ہے کہ یہ حرمت اس وقت ہے جب زانی یا زانیہ نے توبہ نہ کی ہو۔ توبہ کرنے کے بعد جائز ہے۔ (دیکھو احکام القرآن جصاص رازی وتفسیرات احمدیہ ملا جیون وتفسیر کبیر رازی وروح المعانی در تفسیر آیت مذکورہ)۔

[1] ابوداؤد کتاب النکاح۔

قرآن پاک میں اس عفت و عصمت کی حفاظت اور بدکاری کے اسباب اور ذریعوں کے انسداد کی جو تدبیریں اختیار کی ہیں جن کا بیان اوپر آیا ہے اور جو حقیقت میں لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰی (بدکاری کے قریب بھی نہ جاؤ) کی تشریحیں ہیں ان کی مزید تشریح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عام احکام اور مواعظ میں بھی فرمائی ہے۔

چنانچہ آپؐ نے ایک صحابی کو فرمایا "کسی غیر محرم پر اتفاقاً نظر پڑ جائے تو پہلی نظر تو بلا ارادہ ہونے کے سبب معاف ہے مگر دوسری دفعہ پھر اس پر نظر ڈالنا روا نہیں"[1]۔ حضرت عائشہؓ کی بڑی بہن حضرت اسماءؓ ایک دفعہ باریک کپڑوں میں سامنے آئیں تو فرمایا کہ "اے اسماء جب عورت بالغ ہو جائے تو چہرہ اور ہتھیلیوں کے سوا اس کے جسم کا کوئی اور حصہ دیکھنا جائز نہیں"[2]۔ حکم دیا کہ "مخنث زنان خانوں میں نہ جانے پائیں"[3]۔ فرمایا "کسی کے گھر جاؤ تو اجازت سے پہلے پردہ اٹھا کر اس کے اندر نہ جھانکو کہ اس کے اہل خانہ کی بے ستری ہو"[4]۔ فرمایا کہ "عورت تیز خوشبو لگا کر باہر نہ نکلے"[5]۔ سبب ظاہر ہے کہ اس کی خوشبو پاس سے گزرنے والوں میں تحریک پیدا کرے گی۔ یہ بھی ارشاد ہوا کہ "عورت بیچ راہ سے الگ ہو کر کنارہ کنارہ چلے"[6]۔ تاکہ مردوں کی بھیڑ بھاڑ اور دھکوں سے بچے۔ یہ بھی تاکید فرمائی کہ کوئی مرد کسی غیر عورت کے گھر اس کے شوہر کی غیر موجودگی میں اکیلا نہ جائے[7] کہ اس سے شیطان کو موقع ہاتھ آتا ہے۔ یہ بھی نصیحت کی گئی کہ گھر کے دروازہ پر پردہ پڑا رہے۔ اگر کسی گھر کے دروازے بند نہ ہوں یا ان پر پردہ پڑا نہ ہو اور کوئی اندر گھس

---

[1] ترمذی کتاب الاستیذان باب ما جاء فی نظرۃ الفجاءۃ۔ [2] ابو داؤد کتاب اللباس باب فیما تبدی المرأۃ زینتہا۔ [3] ابو داؤد کتاب الادب باب فی الحکم فی المخنثین۔ [4] ترمذی کتاب الاستیذان باب الاستیذان قبالہ البیت۔ [5] ابو داؤد کتاب الترجل باب فی المرأۃ تطیب للخروج۔ [6] ابو داؤد کتاب الادب باب فی مشی النساء فی الطریق۔ [7] مسلم کتاب السلام باب تحریم الخلوۃ بالاجنبیۃ والدخول علیہا۔

گیا تو اُس کی ذمہ داری خود گھر والوں پر ہے[1]۔

یہ ساری ہدایتیں اسی لئے دی گئی ہیں کہ مسلمان گھروں کی معاشرت عفت اور پاک دامنی کی تصویر ہو۔

لیکن صرف انہی اخلاقی ہدایتوں پر بس نہیں کی بلکہ ان کے لئے جو سوسائٹی کی عزت و حرمت کو خطرہ میں ڈالیں، شرعی ثبوت کے بعد دنیا میں قانونی سزا بھی مقرر کی تاکہ اس کا خوف لوگوں کو پاک زندگی بسر کرنے پر مجبور کرے:

اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا	بدکاری کرنے والی عورت اور
کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا مِائَۃَ جَلْدَۃٍ	بدکاری کرنے والے مرد ان میں
(النور: ۲)	سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ۔

احادیث میں بیاہے مردوں اور عورتوں میں سے جو بدکاری میں پکڑ کر آئیں ان کو سنگسار کرنے کا بھی حکم ہے۔ اس جرم میں عورتوں کی حیثیت سب سے نازک ہوتی ہے اس لئے قرآن پاک میں ایک طرف یہ آیا کہ مسلمان عورتوں سے جن باتوں پر بیعت لی جائے اُن میں ایک یہ بھی ہو کہ وہ اپنی عزت و آبرو کی پوری حفاظت کریں گی۔ فرمایا:

وَلَا یَزْنِیْنَ وَلَا یَقْتُلْنَ	اور وہ بدکاری نہ کریں گی اور نہ اپنی
اَوْلَادَھُنَّ وَلَا یَاْتِیْنَ	اولاد کو مار ڈالا کریں گی اور نہ اپنے
بِبُھْتَانٍ یَّفْتَرِیْنَہٗ بَیْنَ اَیْدِیْھِنَّ	ہاتھوں اور پاؤں کے بیچ میں بہتان
وَاَرْجُلِھِنَّ (الممتحنۃ: ۱۲)	باندھ کر لایا کریں گی۔

بدکاری نہ کرنے کا مطلب تو ظاہر ہے لیکن اولاد کے نہ مار ڈالنے کی جو بیعت خاص طور

---

[1] ترمذی کتاب الاستیذان باب الاستیذان قبالۃ البیت ۔ یعنی بیوی والے شوہر اور شوہر والی بیوی۔

سے عورتوں سے لی گئی، حالانکہ یہ کام مردوں کا تھا، اس سے خیال ہوتا ہے کہ عجب نہیں کہ اس سے حمل گرانے کی ممانعت کی طرف اشارہ ہو[۱] یا یہ بات بھی عدمِ قتل کے عموم میں داخل ہو۔ اور ہاتھ پاؤں کے بیچ میں تہمت باندھ کر لانے سے اشارہ جاہلیت کے ایک رواج کی طرف ہے۔ جاہلیت میں ایک عورت کئی کئی مردوں سے ملتی تھی۔ جب لڑکا ہوتا تو وہی عورت بتاتی کہ یہ اُن میں سے کس کا لڑکا ہے۔ بعض عورتیں دوسرے کے بچّہ کو اپنا بتا کر اپنے شوہروں کے سر تھوپتی تھیں۔ یہ ساری باتیں عفّت اور پاک دامنی کے خلاف تھیں۔ اس لئے ان سے باز رکھا گیا اور خاص طور سے ان سے عہد لیا گیا کہ وہ اس پر مضبوطی سے قائم رہیں۔ فتح مکّہ کے وقت آپؐ نے قریشی بیویوں[۲] سے اور مدینہ میں انصاری خاتونوں سے بھی اس پر عہد لیا[۳]۔ بلکہ مسلمان مردوں سے ان باتوں کا عہد لیا گیا اور صحابہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے ان پر بیعت[۴] کی۔

دوسری طرف عورتوں کو مردوں کے بہتان اور تہمت سے بچانے کے لئے یہ قاعدہ مقرر ہوا کہ جب کوئی شخص کسی عورت پر اس طرح کا الزام لگائے تو ضروری ہے کہ وہ اس کے ثبوت میں چار چشم دید گواہ پیش کرے۔ اگر پیش نہ کر سکے تو اس کو ایک شریف خاتون کے جھوٹے بدنام کرنے کے جرم میں اسّی کوڑے مارے جائیں گے۔ اور اس کی گواہی پھر کبھی معتبر نہ ہوگی۔ اور اگر یہ الزام خود شوہر لگائے اور گواہ نہ ہوں تو مرد قسم کھائے ورنہ عورت قسم کھائے کہ یہ الزام غلط ہے۔ اور اگر دونوں اپنے دعووں پر قائم رہیں تو اسلام میں دستور یہ رہا ہے کہ اپنے دعویٰ کی سچائی پر قائم رہنے کی بنا پر خود ہی نکاح کو توڑ ڈالا ہے[۵]۔

---

[۱] مفسرین میں صاحب روح المعانی کا بھی ادھر خیال گزرا ہے۔ [۲] صحیح بخاری فتح مکہ۔ [۳] تفسیر طبری، سورۂ ممتحنہ۔

[۴] صحیح بخاری کتاب الایمان باب حلاوۃ الایمان۔ [۵] اس کی تفصیل سورۂ نور میں ہے۔ اس کے بعد نکاح توڑنے یا ٹوٹ جانے کا حکم نہیں مگر شروع سے عملدرآمد اسی پر رہا ہے۔ بخاری باب اللعان۔

اسلام کی نظر میں حقوق اللہ میں تقصیر کا سب سے بڑا گناہ شرک ہے۔ اور حقوقِ عباد میں تقصیر کا سب سے بڑا گناہ کسی کی ناحق جان لینا ہے۔ اور اس کے بعد ہی جس برائی کا نمبر ہے وہ کسی کی عفّت و پاک بازی کے پردہ کو چاک کرنا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے دریافت کیا کہ "اے خدا کے رسول! کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟" فرمایا "یہ کہ تم کسی کو خدا کا شریک بناؤ حالانکہ اُس نے تم کو پیدا کیا"۔ بولے "اس کے بعد؟" فرمایا "یہ کہ اپنے لڑکے کو اس خوف سے قتل کر ڈالو کہ وہ تمہارے ساتھ کھائے گا"۔ بولے "اس کے بعد؟" فرمایا "یہ کہ اپنے پڑوسی کی بی بی کے ساتھ زنا کرو"۔ چنانچہ خداوند تعالیٰ نے اس کی تصدیق کے لئے یہ آیت نازل فرمائی[1]۔

وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـھًا اٰخَرَ وَلَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا یَزْنُوْنَ (الفرقان: ۶۸)	اور جو خدا کے ساتھ (کسی) دوسرے معبود کو نہ پکاریں اور ناحق (ناروا) کسی شخص کو جان سے نہ ماریں کہ اس کو خدا نے حرام کر رکھا ہے اور نہ زنا کے مرتکب ہوں۔

حدیث میں اپنے لڑکے کے مار ڈالنے اور پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کی خصوصیت اس لئے کی گئی ہے کہ یہ دونوں جرم اپنی نوعیت میں بھی حد درجہ شرم کے قابل اور افسوسناک ہیں کہ جن سے یہ اُمید نہیں ہوسکتی اُن سے یہ فعل ظہور میں آیا اور انسانی اعتماد و اعتبار کو صدمہ پہنچا۔

ایک حدیث میں ہے کہ "زانی جس وقت زنا کرتا ہے، شرابی جس وقت شراب پیتا ہے

---

[1] بخاری کتاب الادب باب قتل الولد خشیۃ ان یاکل معہ۔

چور جس وقت چوری کرتا ہے اور لوٹنے والا جس وقت سب کی آنکھوں کے سامنے لوٹتا ہے تو مسلمان نہیں رہتا[1] کیونکہ ایمان نام یقین کا ہے۔ اور خدا پر اور خدا کے احکام پر یقین رکھ کر کوئی اس کے حکم سے سرتابی نہیں کرتا۔ اس حالت میں ہوتا یہ ہے کہ مجرم کے ایمان کا چراغ جذبات کی آندھی میں گُل ہو جاتا ہے اور تھوڑی دیر کے لئے وہ سب کچھ بھول جاتا ہے اور پھر جب اس کا نشہ ہرن ہوتا ہے تو سب کچھ جاننے اور سمجھنے لگتا ہے۔

اسلام میں زانیوں کی سزا بعض حالتوں میں سو کوڑے مارنا اور بعض حالتوں میں سنگسار کرنا ہے۔ لیکن ان کو آخرت میں جو عذاب دیا جائے گا وہ اس سے بہت زیادہ سخت اور بہت زیادہ عبرت انگیز ہے۔ ایک روحانی خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت سے لوگوں کے اُخروی عذاب کی دردناک صورتیں دکھائی گئیں۔ ان میں بدکاروں کے عذاب کی صورت ان کے فعلِ قبیح کے مشابہ یہ تھی کہ تنور کے مانند ایک سوراخ تھا جس کے اوپر کا حصہ تنگ اور نیچے کا حصّہ کشادہ تھا اور اس کے نیچے آگ بھڑک رہی تھی اور اس میں بہت سے برہنہ مرد اور برہنہ عورتیں تھیں۔ جب اس آگ کے شعلے بلند ہوتے تھے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ اس کے اندر سے نکل آئیں گے لیکن جب آگ بجھ جاتی تھی تو یہ لوگ پھر اس کے اندر چلے جاتے تھے[2]۔ یہ عالمِ برزخ کا عذاب تھا جو قیامت تک جاری رہے گا۔

اس کے بخلاف پاکباز اور پاکدامن لوگوں کے فضائل بھی نہایت مؤثر انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن جبکہ خدا کے سایہ کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہوگا خداوند تعالیٰ سات آدمیوں کو اپنے سایہ میں لے گا جن میں ایک شخص وہ ہوگا جس کو ایک معزز اور حسین عورت نے اپنی طرف مائل کرنا چاہا لیکن اس نے یہ کہہ کر

---

[1] بخاری کتاب الحدود باب الزنا و شرب الخمر۔ [2] بخاری کتاب الجنائز۔

انکار کر دیا کہ میں خدا سے ڈرتا ہوں[1]۔

یہ تو وہ شرف ہے جو پاک بازوں کو آخرت میں حاصل ہو گا۔ لیکن پاک بازی کی دنیوی برکتیں بھی کچھ کم نہیں۔ ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے زمانہ قدیم کے تین آدمیوں کا قصہ بیان کیا ہے جو ایک ساتھ سفر کر رہے تھے کہ دفعتہً پانی برسنے لگا۔ تینوں نے پانی سے بچنے کے لئے ایک پہاڑ کے غار میں پناہ لی۔ سوءِ اتفاق سے پہاڑ کے اوپر سے ایک پتھر لڑھک آیا جس سے غار کا منہ بند ہو گیا۔ اب نجات کی صورت اس کے سوا نہ تھی کہ اپنے اپنے اعمالِ صالحہ کے واسطہ سے خدا سے دعا کریں۔ چنانچہ اس طرح ہر ایک نے دُعا کی اور ان اعمال کی برکت سے پتھر رفتہ رفتہ ہٹ گیا۔ ان میں پاکباز آدمی کی دعا یہ تھی۔

> خُداوندا! میرے ایک چچازاد بہن تھی جس سے میں بڑی محبت رکھتا تھا میں نے اس سے اپنی خواہش کا اظہار کیا لیکن جب تک میں اس کو سو دینار نہ دے دوں وہ راضی نہ ہوئی۔ میں نے سو دینار کما کر جمع کئے اور اس کو دے کر اپنی خواہشِ نفسانی پوری کرنی چاہی۔ لیکن اس نے کہا کہ خُدا سے ڈرو۔ میں فوراً رک گیا۔ خداوندا اگر تو جانتا ہے کہ میں نے صرف تیری مرضی کے لئے ایسا کیا ہے تو اس پتھر کو ہٹا لے۔ چنانچہ وہ سرک گیا[2]۔

یہ روایت عفت و پاک بازی کو اُن اعمال میں شمار کرتی ہے جن سے خُدا کا قرب ملتا اور دعا کو قبولیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔

---

[1] بخاری کتاب الحدود باب فضل من ترک الفواحش [2] بخاری کتاب الادب باب اجابۃ دعا من برّ والدیہ۔

دیانتداری اور امانت

آپس کے لین دین کے معاملوں میں جو اخلاقی جوہر مرکزی حیثیت رکھتا ہے وہ دیانتداری اور امانت ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ انسان اپنے کاروبار میں ایماندار ہو اور جس کا جس کسی پر جتنا ہو اس کو پوری دیانت سے رتّی رتّی دے دے۔ اسی کو عربی میں امانت کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود اپنی شرعی تکلیف کو جسے اس نے نوعِ انسانی کے سپرد کیا ہے امانت کے لفظ سے ادا کیا ہے:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى	ہم نے (اپنی) امانت آسمانوں پر اور
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ	زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کی تو
فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ	انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار
مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ	کیا اور اس سے ڈرے اور انسان
كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ؁	نے اس کو اٹھالیا۔ بے شبہ وہ ظالم
(الاحزاب: ۷۲)	اور نادان ہے۔

اس سے ظاہر ہوا کہ یہ پوری شریعت ایک خدائی امانت ہے جو ہم انسانوں کے سپرد ہوئی ہے اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کے مطابق اپنے مالک کا پورا پورا حق ادا کریں۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو خائن ٹھہریں گے۔

خُدا کا فرشتہ جو خدا کا پیام لے کر اس کے خاص بندوں پر اترتا تھا امانت سے متصف ہوتا تھا تاکہ بندوں کے لئے جو حکم خدا کی جانب سے آئے وہ کمی بیشی کے بغیر خدا کا اصلی حکم سمجھا جائے۔ اسی لئے قرآن میں اس فرشتہ کا نام "الامین" رکھا گیا ہے:

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ○ (الشعرآء: ۱۹۳) — اس پیغام کو لے کر امانت والی روح اتری۔

مُطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ ○ (التکویر: ۲۱) — اس کا کہا مانا جاتا ہے وہاں امانت والا ہے۔

اکثر پیغمبروں کی صفت میں بھی یہ لفظ قرآن میں آیا ہے کہ انہوں نے اپنی اپنی اُمّت سے یہ کہا:

إِنِّي لَكُمْ رَسُولٌ أَمِينٌ ○ (الشعراء: ۱۷۸) — میں تمہارے لئے امانت دار قاصد ہوں۔

یعنی خُدا سے جو پیغام مجھے ملا ہے وہ بے کم و کاست تم کو پہنچاتا ہوں۔ اس میں اپنی طرف سے ملاوٹ کچھ نہیں ہے۔

ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کو نبوّت سے پہلے مکّہ والوں کی طرف سے "امین" کا خطاب ملا تھا کیونکہ آپ اپنے کاروبار میں دیانت دار تھے اور جو لوگ جو کچھ آپ کے پاس رکھواتے تھے وہ آپ جوں کا توں اُن کو واپس کرتے تھے۔

نیک عمل مسلمانوں کی صفت یہ بتائی گئی:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ (المؤمنون: ۸)

اور جو اپنی امانتوں اور وعدہ کا پاس رکھتے ہیں۔

بعض روایتوں میں ہے کہ خانہ کعبہ کی کنجی عثمان بن طلحہ بن عبدالدار شیبی کے پاس رہتی تھی فتحِ مکہ کے وقت وہ اُن کے ہاتھ سے زبردستی لے لی گئی اس پر یہ آیت اُتری:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ (النسآء: ۵۸)

بے شبہ تم کو اللہ حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو اُن کے مالکوں کے حوالہ کر دیا کرو۔

اس حکم کے مطابق یہ امانت اُن کو واپس کی گئی۔ انہوں نے سبب پوچھا تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ خدا نے یہی حکم دیا ہے۔ وہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ اسلام کے اس انصاف اور امانت داری کے حکم کا اُن پر یہ اثر ہوا کہ وہ مسلمان ہو گئے۔ بہرحال یہ واقعہ صرف شانِ نزول کا حکم رکھتا ہے اور معنی کے لحاظ سے امانت کی ہر جزئیہ پر اس کا اطلاق یکساں ہوگا۔ اسی لئے اہلِ تفسیر کی تصریحات کے مطابق اس کی وسعت میں وہ امانتِ الٰہی بھی داخل ہے جس کا نام عموم کے ساتھ تکلیفِ شرعی[1] ہے اور وہ امانت بھی داخل ہے جس کا نام عدل وانصاف ہے اور جو حاکموں کو اپنی رعایا کے حقوق کو ادا کرنے پر مجبور کرتا ہے[2]۔ اور وہ تمام امانتیں بھی اس میں داخل ہیں جن کو ان کے مالکوں کے سپرد کرنا ضروری ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہو گا کہ امانت کا دائرہ صرف روپے پیسے، جائیداد اور مالی اشیاء تک محدود نہیں جیسا کہ عام لوگ سمجھتے ہیں بلکہ ہر مالی، قانونی اور اخلاقی امانت تک وسیع ہے۔ اگر کسی کی کوئی چیز آپ کے پاس رکھی ہے تو اس کے مانگنے پر یا یوں بھی اس کو جوں کا توں دے دینا امانت

---

[1] دیکھو تفسیر کشاف زمخشری۔ [2] تفسیر ابن جریر طبری۔

ہے۔ اگر کسی کا کوئی حق آپ پر باقی ہے تو اس کو ادا کرنا بھی امانت ہے۔ کسی کا کوئی بھید آپ کو معلوم ہے تو اس کو چھپانا بھی امانت ہے۔ کسی مجلس میں آپ ہوں اور کچھ باتیں آپ دوسروں کے متعلق وہاں سُن لیں تو ان کو اسی مجلس تک محدود رکھنا اور دوسروں تک پہنچا کر فتنہ اور ہنگامہ کا باعث نہ بننا بھی امانت ہے۔ کسی نے آپ سے اپنے کسی نج کے کام میں مشورہ مانگا تو اس کو سُن کر اپنے ہی تک محدود رکھنا اور اس کو اپنے جانتے صحیح مشورہ دینا بھی امانت ہے۔ اگر کوئی کسی کام پر نوکر ہے تو اس کو اس نوکری کی شرائط کے مطابق اپنی ذمّہ داری کو محسوس کر کے وہ انجام دے تو یہ بھی امانت ہے۔ اگر کوئی کسی کا آٹھ گھنٹے کا نوکر ہے اور اس کی اجازت کے بغیر کچھ وقت چُرا لیتا ہے یا بے سبب سُستی کرتا ہے یا دیر سے آتا اور وقت سے پہلے چلا جاتا ہے تو یہ بھی امانت کے خلاف ہے۔

قرآن پاک اور حدیثوں میں ان جزئیات کی تفصیل پوری طرح مذکور ہے۔

اُن مسلمانوں میں جن کو خُدا نے فلاح پانے کی خوش خبری سنائی ہے، وہ بھی ہیں:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ○	اور جو اپنی امانتوں اور اپنے قول و قرار کی پاسبانی کرتے ہیں۔

(المؤمنون: ۸)

پھر جن مسلمانوں کو جنت میں عزت کی جگہ دی جانے والی ہے اُن میں بھی وہ داخل ہیں:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ○	اور جو اپنی امانتوں اور اپنے قول و قرار کی پاسبانی کرتے ہیں۔

(المعارج: ۳۲)

اگر کسی نے کسی کو کوئی چیز دھرنے کو دی یا سفر میں گواہ و شاہد اور کاتب نہ ملنے کے سبب سے قرض لے کر گرو رکھی

فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ (البقرۃ: ۲۸۳)

تو جو امین بنایا گیا اس کو چاہیئے کہ اپنی امانت ادا کر دے اور چاہیئے کہ اپنے پروردگار اللہ سے ڈرے۔

یعنی لے کر مکر نہ جائے یا دینے میں حیلے حوالے نہ کرے یا اس میں بلا اجازت کوئی تصرّف نہ کرے یا کسی نے ہم پر بھروسہ کر کے ہم سے کوئی بات کہی تو ہم اس کے اس بھروسہ سے غلط فائدہ اٹھا کر اس کے خلاف کوئی حرکت نہ کر بیٹھیں کہ انہی چیزوں کا نام خیانت ہے جس کی ممانعت اسلام نے برملا کی ہے:

وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (الانفال: ۲۷)

اور اپنی امانتوں میں جان بوجھ کر خیانت نہ کرو۔

حضرت موسیٰؑ نے مدین کے سفر میں دو لڑکیوں کی بکریوں کے پینے کے لئے پانی بھر دیا اور اس کی کوئی مزدوری ان سے نہیں مانگی۔ اور اُن لڑکیوں میں سے ایک نے واپس جا کر اپنے بزرگ باپ سے ان کی تعریف کی اور سفارش کی کہ اُن کو نوکر رکھ لیجیے، تو اس موقع پر قرآنِ پاک کی یہ آیت ہے:

يٰٓاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ۡ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ۝ (القصص: ۲۶)

اے میرے باپ! اس کو نوکر رکھ لیجیے، سب سے اچھا نوکر جس کو آپ رکھنا چاہیں وہ ہے جو طاقتور اور امانتدار ہو۔

اس آیت میں سب سے بہتر نوکر کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ جس کام کے لئے اس کو رکھا جائے اس میں اس کی پوری اہلیت اور طاقت ہو اور اس کام کو وہ پوری امانت سے ادا کرے۔ اس سے یہ اصول بنا کہ جس کو جس کام کا اہل سمجھ کر رکھا جائے وہ اس کی اہلیت کا ثبوت دے اور اس کو

پوری دیانت داری کے ساتھ انجام دے۔ اب ایک شخص جو چھ گھنٹے کا نوکر ہو وہ ایک دو گھنٹہ سستی سے چھپے چوری بے کار بیٹھا رہے تو گو عام لوگ اس کو خیانت کا مرتکب نہیں سمجھتے لیکن اسلام کی دور رس نگاہوں میں وہ امین نہیں ٹھہر سکتا۔ یا کوئی شخص اپنے کو کسی کام کا اہل بنا کر کوئی نوکری حاصل کرے مگر حقیقت میں وہ اس کا اہل نہیں تو یہ بھی ایک طرح سے امانت کے خلاف ہے۔

حدیثوں میں امانت کی بہت سی جزئیوں کو ایک ایک کر کے گنایا گیا ہے اور بہت سی ایسی باریک باتوں کو جن کو لوگ امانت کے خلاف نہیں سمجھتے امانت کے خلاف بتایا گیا ہے اور کوئی غور سے دیکھے تو اخلاق کی رو سے وہ یقینی طور سے امانت کے خلاف ہیں۔

جس طرح قرآن پاک کی آیت نے یہ بتایا ہے کہ خدا کی امانت کا بوجھ انسان نے اٹھایا ہے اسی طرح ایک حدیث بھی ادھر اشارہ کرتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے راز دار حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے دو باتیں سُنی تھیں ایک کو تو آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں دوسری یہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ امانت داری لوگوں کے دلوں کی جڑ میں اتری ہے (یعنی اُن کی فطرت ہوتی ہے)، پھر انہوں نے کچھ قرآن جانا، کچھ سنت سے سیکھا (یعنی فطری امانت کے جوہر میں کسب اور اچھی تعلیم سے ترقی ہوتی ہے)، حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ پھر آپ نے اس امانت کے مٹ جانے کا حال بھی سُنایا۔ فرمایا "پھر یہ حال ہوگا کہ آدمی سوئے گا اور امانت اس کے دل سے نکال لی جائے گی اور اس کا ایک ہلکا سا نشان رہ جائے گا اور پھر سوئے گا تو امانت چلی جائے گی اور ایک آبلہ کی طرح کا داغ رہ جائے گا جو اٹھ تو جاتا ہے مگر اس کے اندر کچھ نہیں ہوتا۔ لوگ ایسے ہو جائیں گے کہ لین دین کریں گے لیکن کوئی امانت داری نہیں کرے گا۔ اس وقت امانت داری کی مثال ایسی کم یاب ہو جائے گی کہ لوگ مثال کے طور پر کہیں گے کہ فلاں قوم میں ایک امانت دار شخص ہے۔ آدمی کی تعریف ہوگی کہ کیسا عقلمند، کیسا خوش مزاج اور کیسا بہادر ہے حالانکہ اس کے

دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان داری نہ ہوگی۔"[1]

حدیث کے پہلے ٹکڑے میں انسانوں میں ایمان داری کا جوہر فطری طور سے موجود ہونے کا اور پھر دینداری کی تعلیم سے اس کے بڑھنے کا ذکر ہے۔اس کے بعد بُری صحبت کے اثر سے اس فطری جوہر کے دب جانے اور مٹ جانے کا تذکرہ ہے اور بتایا گیا ہے آخر زمانہ میں وہ ایسا ہی رہ جائے گا جیسا آبلہ کا داغ رہ جائے۔

طبرانی کبیر میں ہے کہ آپ نے فرمایا "جس میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں۔جس کو عہد کا پاس نہ ہو اس میں دین نہیں۔اس ہستی کی قسم جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے کسی بندہ کا اس وقت تک دین درست نہ ہوگا جب تک اس کی زبان درست نہ ہو اور اس کی زبان درست نہ ہوگی جب تک اس کا دل درست نہ ہوگا اور جو کوئی کسی ناجائز راہ سے کوئی مال پائے گا اور اس میں سے خرچ کرے گا تو اس کو اس میں برکت نہیں دی جائے گی۔اور اگر اس میں سے خیرات کرے گا تو قبول نہیں ہوگی۔اور جو اس میں سے بچ رہے گا وہ اس کے دوزخ کی طرف سفر کا توشہ ہوگا۔بُری چیز بُری چیز کا کفارہ نہیں بن سکتی البتہ اچھی چیز اچھی چیز کا کفارہ ہوتی ہے"[2]

حدیث کی کئی کتابوں میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا "جس میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں"[3] اور یہ ظاہر ہے کیونکہ جب دل نے ایک جگہ دھوکا دیا تو ہر جگہ دے سکتا ہے۔

جب کسی سے کوئی مشورہ لیا جائے تو اس کو چاہیئے کہ اپنی رائے ایمانداری سے دے۔ایک دفعہ ایک صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے مشورہ کیا تو آپؐ نے فرمایا "جس سے مشورہ چاہا جائے

---

[1] صحیح بخاری باب رفع الامانۃ وکتاب الفتن والرقاق وصحیح مسلم ومسند احمد وترمذی وابن ماجہ۔ [2] کنز العمال ج ۲ ص۱۵ حیدر آباد۔ از طبرانی کبیر عن ابن مسعودؓ [3] کنز العمال ج ۲ ص۱۵ از طبرانی اوسط وطبرانی کبیر وابن عدی فی الکامل، وبیہقی فی شعب الایمان۔

اس کو امانت سُپرد کی جاتی ہے[1]۔" اسی لئے آپؐ نے فرمایا کہ "مجلس میں جو باتیں ہوں وہ امانت ہیں"۔ یعنی ایک جگہ کی بات دوسری جگہ پہنچا کر فتنہ کا سبب نہ بننا چاہیئے۔ الّا یہ کہ اس سے کسی فتنہ کے روکنے کا کام لیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا المجالس بالامانۃ یعنی نشستیں امانت کے ساتھ ہوں مگر تین موقعوں پر کہیں کسی کے ناحق قتل کی یا کسی کی آبروریزی کی یا کسی کا مال ناجائز طور سے لے لینے کی سازش ہو[2] تو متعلقہ لوگوں کو اس سے آگاہ کر دینا چاہیئے۔

کسی کا راز افشا کرنا بھی امانت کے خلاف ہے۔ بلکہ میاں بیوی کے درمیان پردہ کی جو باتیں ہوتی ہیں وہ بھی ایسے راز ہیں جن کا عام طور سے افشا کرنا بے شرمی کے علاوہ امانت کے خلاف بھی ہے[3]۔ راز کے یہی معنی نہیں ہیں کہ جس کو کہنے والا راز کہہ کر ہم سے کہے بلکہ وہ بھی راز ہے جس سے وہ ہمارے سوا دوسرے کو آگاہ کرنا نہیں چاہتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا "جب کوئی شخص کسی سے بات کرے اور وہ احتیاطاً اِدھر اُدھر اس غرض سے دیکھے کہ کوئی سنتا نہ ہو تو وہ بات بھی امانت ہو جاتی ہے[4]۔" امانت میں خیانت کرنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے نفاق کی ایک نشانی بتائی ہے[5]۔

مرد جب کسی عورت کو اپنی زوجیت میں لیتا ہے تو خُدا کی مقرر کی ہوئی شرطوں کے مطابق لیتا ہے۔ لیکن اگر کوئی مرد کسی عورت کو اپنی زوجیت میں لے کر اس کے حقوق ادا کرنے میں کمی کرتا ہے یا اس کے حقوق کو بالکل نظر انداز کر دیتا ہے تو وہ گویا اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی امانت میں خیانت کرتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں فرمایا کہ "عورتوں کے باب میں خُدا سے ڈرو۔" فرمایا "کیوں کہ تم نے اُن کو اللہ کی امانت اور عہد کے ساتھ اپنی زوجیت[6] میں

---

[1] ادب المفرد بخاری باب المستشار مؤتمن [2] ابوداؤد باب فی نقل الحدیث [3] و [4] ابوداؤد کتاب الادب۔

[5] صحیح بخاری کتاب الایمان باب علامات المنافق [6] صحیح مسلم، حجۃ الوداع۔

لیا ہے۔"

قیامت کی نشانیوں میں آیا ہے کہ "سب سے پہلے اِس اُمّت سے امانت کا جوہر جاتا رہے گا اور سب سے آخر میں جو چیز رہ جائے گی وہ نماز ہو گی اور کتنے نمازی ہیں جن کی نمازوں کا کوئی حصّہ خُدا کے ہاں نہیں[1]۔" فرمایا میری اُمّت اُس وقت تک فطری صلاحیت پر قائم رہے گی جب تک وہ امانت کو غنیمت کا مال اور زکوٰۃ کو جرمانہ نہیں سمجھے[2] گی۔" یعنی جو امانت سپرد کی جائے گی اس کو آمدنی اور کارِ خیر میں دینے کو جرمانہ جب تک مسلمان نہیں سمجھیں گے اُن کی فطری صلاحیت باقی رہے گی۔

---

[1] کنز العمال ج ۲ ص۱۵ از طبرانی و ابن مبارک و حکیم ترمذی و ابن عباس [2] کنز العمال ج ۲ ص۱۵ از سنن سعید بن منصور رحمہ

شرم وحیا

انسان کا یہ وہ فطری وصف ہے جس سے اس کی بہت سی اخلاقی خوبیوں کی پرورش ہوتی ہے۔ عفّت اور پاک بازی کا دامن اسی کے بدولت ہر داغ سے پاک رہتا ہے۔ درخواست کرنے والوں کو محروم نہ پھیرنا اسی وصف کا خاصہ ہے۔ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مروّت اور چشم پوشی اسی کا اثر ہے اور بہت سے گناہوں سے پرہیز اسی وصف کی برکت ہے۔

اس وصف سے متّصف سب سے پہلے خود خُداوند تعالیٰ ہے۔ لیکن اس کے معنی یہاں وہی ہوں گے جو اس کی ذاتِ اقدس کے لائق ہیں۔ مثلاً یہ کہ وہ اپنے بدکار بندوں کو بُرائی کرتے دیکھتا ہے لیکن اُن کو پکڑتا نہیں اور اس کے آگے جو بھی ہاتھ پھیلاتا ہے اس کو نامراد نہیں لوٹاتا۔ حدیث میں آتا ہے کہ آپؐ نے فرمایا "عزّت اور جلال والے خُدا کے آگے جب کوئی بندہ اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر کچھ بھلائی مانگتا ہے تو وہ اس کو نامراد لوٹاتے ہوئے شرماتا ہے"[1] ایک دفعہ تین صاحب مجلس نبویؐ میں آئے آپؐ کے ارد گرد صحابہ کا حلقہ تھا۔ ایک صاحب کو وہاں ذرا سی جگہ ملی اس میں بیٹھ گئے۔ دوسرے صاحب شرما کر پیچھے بیٹھ گئے۔ تیسرے صاحب چلے گئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں

---

[1] بیہقی کتاب الاسماء و الصفات الہ آباد صفحہ ۳۳۰۔

ان صاحبوں کی خبر نہ دوں؟ جو حلقہ کی ذراسی جگہ میں آکر بیٹھا وہ خُدا کی پناہ میں آیا تو خُدا نے پناہ کی جگہ دی. اور جو پیچھے جاکر بیٹھا وہ شرمایا خُدا نے بھی اس سے شرم کی (یعنی معاف کیا)، اور جو چلا گیا اس نے خُدا سے منہ پھیرا تو خُدا نے بھی اس سے منہ پھیرا۔[1]

سورہ بقرہ میں ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیٖۤ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا (البقرۃ: ۲۶)	خُدا کوئی مثال بیان کرنے سے شرماتا نہیں۔

یعنی کسی حق بات کے ظاہر کرنے میں وہ شرماتا نہیں۔ جیسا کہ قرآن میں دوسری جگہ ہے۔ وَاللّٰہُ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ[2] (خُدا حق بات کہنے سے نہیں شرماتا) حدیث میں بھی ہے، اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ[3] (اللہ تعالیٰ حق کے اظہار سے شرماتا نہیں)۔ قرآن اور حدیث کے اس طرزِ ادا سے ظاہر ہے کہ جو بات حق کے خلاف ہے اس کی نسبت خُدا کی طرف خُدا کی غیرت وحیا کے خلاف ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ "خُدا سب سے زیادہ غیرت مند ہے اور اسی لئے اس نے بدکاریوں کو حرام کیا ہے"[4]

موسیٰ علیہ السلام کو مدین کے سفر میں دو لڑکیوں سے سابقہ پڑا تھا۔ وہ اگرچہ بدویانہ زندگی بسر کرنے کی عادی تھیں تاہم یہ وصف اُن میں ایسا نمایاں تھا کہ خُدا نے بھی اُس کا ذکر کیا۔ اُن کی عادت یہ تھی کہ جب تک تمام لوگ اپنے اپنے مویشیوں کو پانی پلا کر پلٹ نہ جاتے وہ اپنے مویشیوں کو پانی نہیں پلاتی تھیں تاکہ مردوں کی کشمکش سے الگ رہیں۔ اور جب ان کے باپ

---

[1] بخاری کتاب العلم وصحیح مسلم باب السلام [2] الاحزاب: ۵۳ [3] بخاری کتاب الادب باب مالایستحی من الحق [4] صحیح مسلم کتاب التوبہ، عربی میں غیرت کا لفظ حیا سے خاص ہے مگر اس موقع پر خدا کے تعلق سے اس کے معنی کچھ حیا کے قریب قریب سے ہوجاتے ہیں۔ غیرت کے اصلی معنی رقابت سے ملتے جلتے ہیں جو محبت میں شرکت کو نہیں چاہتی۔

نے ان میں سے ایک کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بلانے کے لئے بھیجا:

فَجَآءَتْهُ إِحْدٰىهُمَا تَمْشِيْ — تو ان دو لڑکیوں میں سے ایک شرماتی

عَلَى اسْتِحْيَآءٍ (القصص: ۲۵) — ان کے پاس آئی۔

اس آیت میں واقعہ کے اظہار کے ساتھ اس حیا والی لڑکی کی مدح و ستائش بھی مقصود ہے۔

یہ وصف انسان میں بچپن ہی سے فطری ہوتا ہے اور اگر اس کی مناسب تربیت کی جائے تو وہ قائم رہتا ہے بلکہ بڑھتا جاتا ہے۔ اور اگر بُری صحبت لگ جائے اور اچھے لوگوں کا ساتھ نہ رہے تو جاتا بھی رہتا ہے۔ اسی لئے اسلام نے اس کی مناسب نگہداشت کا حکم دیا۔ سترِ عورت کا خیال، نگاہیں نیچی رکھنا، بے حیائی کی باتوں کو بولنے اور دیکھنے سے روکنا، برہنگی کو منع کرنا یہاں تک کہ غسل خانہ اور خلوت میں بھی اس کی اجازت نہ دینا اسی لئے ہے کہ آنکھیں شرم کے منظر سے جھینپتی رہیں۔ اگر تھوڑی تھوڑی بے حیائی کی جرأت بڑھتی جائے گی تو رفتہ رفتہ انسان پکا بے حیا بن جائے گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم جب بچّہ تھے تو خانہ کعبہ کی تعمیر کا کام ہو رہا تھا آپ اینٹیں اٹھا اٹھا کر لا رہے تھے۔ آپؐ کے چچا حضرت عباسؓ نے کہا تم تہبند کھول کر کندھے پر رکھ لو کہ اینٹ کی رگڑ نہ لگے۔ آپ نے ایسا کیا تو آپ پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔ ہوش آیا تو زبانِ مبارک پر تھا "میرا تہبند"۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے تہبند باندھ دیا[۱]۔ نبوّت کے بعد بھی آپ کا یہ حال تھا کہ صحابہ کہتے ہیں:

كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پردہ نشین

أَشَدَّ حَيَاءً مِنَ الْعَذْرَاءِ — کنواری لڑکی سے بھی زیادہ شرمیلے

---

[۱] بخاری کتاب الحج باب فضل مکۃ و بنیانہا۔

فی خدرھا تھے۔

بعض موقعوں پر آپ کو بڑی تکلیف ہوتی تھی مگر شرم کے مارے زبان سے نہیں کہتے تھے جیسا کہ سورۂ احزاب میں مذکور ہے:

اِنَّ ذٰلِکُمْ کَانَ یُؤْذِی النَّبِیَّ فَیَسْتَحْیٖ مِنْکُمْ	تمہاری اس بات سے رسول کو ایذا پہنچتی تھی تو تم سے وہ شرماتا تھا۔
(الاحزاب: ۵۳)	

حیا کا فطری وصف اگرچہ اپنی جگہ پر تعریف کے قابل ہے تاہم وہ کبھی کبھی انسان کے لئے اُس وقت مضر بھی ہو جاتا ہے۔ جب اس میں بُزدلی اور خوف کا عنصر شامل ہو جاتا ہے اور وہ بہت سے اجتماعی کام محض شرم وحیا کی وجہ سے نہیں کر سکتا۔ بلکہ بعض حالتوں میں اس سے اس کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔ اس لئے حیا کی حقیقت میں بُزدلی کا جو جز شامل ہے شریعتِ مطہرہ نے اس کی اصلاح کی ہے اور وہ یہ ہے کہ امرِ حق کے اظہار میں شرم وحیا دامنگیر نہ ہو۔ لیکن دوسروں کی مروت سے چپ رہ جانا ایک قسم کی شرافت ہے جو ایک معنی میں تعریف کے قابل ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک شخص نہایت شرمیلا اور حیادار تھا۔ اس وجہ سے نقصان اٹھاتا تھا۔ اس کا بھائی اس پر ناراضی کا اظہار کر رہا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو فرمایا کہ اس پر غصہ نہ کرو کیوں کہ حیا ایمان سے ہے۔[۲]

یہی حیا جو ایمان کا ایک جز ہے شرعی حیا ہے۔ یعنی جس طرح ایمان کا اقتضاء یہ ہے کہ تمام فواحش ومنکرات سے اجتناب کیا جائے اسی طرح حیا بھی انسان کو ان چیزوں سے روکتی ہے۔ اس لئے وہ دونوں ایک ہی ہیں۔ لیکن جن لوگوں میں فطرۃً حیا کا مادہ موجود ہوتا ہے ان کو اس

---

[۱] و [۲] بخاری کتاب الادب باب الحیا۔

شرعی حیا کے حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے۔اس لئے بذاتِ خود یہ فطری مادّہ ملامت کے قابل نہیں بلکہ اصلاح کے قابل ہے۔اور اصلاح کی صورت یہ ہے کہ جہاں تک اظہارِ حق، وعظ و پند، تبلیغ و دعوت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وغیرہ کا تعلق ہے حیا کے طبعی ضعف کو دور کر دیا جائے اور شریعت نے ان موقعوں پر اسی ضعف کو دور کیا ہے۔مثلاً خدا نے قرآنِ مجید میں جا بجا بہت سی چھوٹی چھوٹی باتوں کو ذکر کیا ہے جس کو کفار اللہ تعالیٰ کی جلالتِ شان کے منافی سمجھ کر اعتراض کرتے تھے۔خُدا نے فرمایا کیسی ہی حقیر بات ہو لیکن اگر وہ بندوں کے فائدہ کی ہے تو اس کے کہنے سے خُدا نہیں شرماتا یعنی شرم کی وجہ سے وہ اس کو نہیں چھوڑ دیتا۔فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسۡتَحۡیٖۤ اَنۡ یَّضۡرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوۡضَۃً فَمَا فَوۡقَہَا ؕ	اللہ کسی مثال کے بیان کرنے میں (ذرا بھی) نہیں جھینپتا (چاہے وہ مثال) مچھر کی ہو یا اس سے بھی بڑھ کر (کسی اور حقیر چیز کی)۔
(البقرۃ:۲۶)	

حضرت زینبؓ کی دعوتِ ولیمہ میں صحابۂ کرام کھانے کے بعد دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو تکلیف تو ہو رہی تھی لیکن فطری حیا کی بنا پر اس کا اظہار نہیں کرتے تھے۔تاہم چوں کہ لوگوں کا اس طرح جم کر بیٹھنا عام اخلاق بالخصوص آدابِ نبوّت کے خلاف تھا اس لئے خُداوند تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ ذٰلِکُمۡ کَانَ یُؤۡذِی النَّبِیَّ فَیَسۡتَحۡیٖ مِنۡکُمۡ ۫ وَ اللّٰہُ لَا یَسۡتَحۡیٖ مِنَ الۡحَقِّ ؕ	اس سے پیغمبر کو ایذا ہوتی تھی اور وہ تمہارا لحاظ کرتے تھے اور اللہ تو حق (بات کے کہنے) میں (کسی کا کچھ) لحاظ کرتا نہیں۔
(الاحزاب:۵۳)	

اپنی ذاتی تکلیف کے لئے لوگوں کو اپنے پاس سے اٹھا دینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی خوش خُلقی اور مروّت کے خلاف تھا اس لئے آپ کو اس سے شرم آتی تھی۔ تاہم اس طرح بیٹھ جانا آداب مجلس کے خلاف تھا اس لئے خُداوند تعالیٰ نے لوگوں کو ٹوکا کہ اخلاق وآداب کی تعلیم دینے میں شرم وحیا کا موقع نہیں۔

یہی حیا تھی جس نے ان مواقع پر صحابہ کرام کو نہایت دلیر، بے جھجک اور آزاد بنا دیا تھا۔ ایک صحابیہ آپؐ سے ایک مسئلہ دریافت کرنے آتی ہیں اور یہ سمجھتی ہیں کہ یہ سوال عورت کی فطری شرم وحیا کے خلاف ہے۔ تاہم اسی شرعی حیا کی بنا پر سوال سے پہلے کہہ دیتی ہیں کہ "یارسولؐ اللہ! خُدا حق بات سے نہیں شرماتا۔ کیا عورت پر جنابت کا غُسل فرض ہے؟"

ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ "مسلمان کی مثال ایک ایسے سرسبز درخت کی ہے جس پر کبھی خزاں نہیں آتی"۔ اکابر صحابہ اس درخت کے نام بتانے سے قاصر رہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سمجھ گئے کہ یہ کھجور کا درخت ہے۔ تاہم چوں کہ کمسن تھے اس لئے شرم سے چپ رہے لیکن چوں کہ یہ شرم وحیا کا موقع نہ تھا اور علمی مجالس میں آزادی کی ضرورت تھی اس لئے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے انہوں نے اس کا تذکرہ کیا تو فرمایا کہ اگر تم اس درخت کا نام بتا دیتے تو مجھے بڑی خوشی ہوتی[1]۔

انصاریہ عورتیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے عورتوں کے مسئلے پوچھتی تھیں اور یہ اُن کا خاص اخلاقی وصف سمجھا جاتا تھا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

نعم النّساء نساء الانصار	انصار کی عورتیں کس قدر اچھی تھیں کہ
لم یکن یمنعھن الحیاء ان	دین کا علم حاصل کرنے سے ان کو

---

[1] بخاری کتاب الادب باب مالا یستحیٰ من الحق للتفقہ فی الدین۔

يتفقهن في الدين[1] — حیا نہیں روکتی تھی۔

ان موقعوں یعنی تبلیغ و دعوت، پند و نصیحت، ارشاد و ہدایت، تعلیم و تعلّم اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے علاوہ اور ہر جگہ حیا انسان کا ایک ایسا اخلاقی جوہر ہے جس سے اس کو فائدہ ہی فائدہ پہنچتا ہے۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

الحیاء لایاتی الا بخیر[2] — حیا سے صرف بھلائی پہنچتی ہے۔

اور جس شخص کو کسی بُرے کام کے کرنے میں باک نہیں ہوتا اس کا نام آزادی اور دلیری نہیں ہے بلکہ بے حیائی اور بے شرمی ہے۔ کیونکہ یہی جذبۂ حیا ہے جو انسان کو بُرائیوں سے باز رکھتا ہے اگر یہ نہ ہو تو پھر بے حیا ہو کر انسان جو چاہے کر سکتا ہے کوئی روک نہیں سکتا۔ اس لئے فرمایا کہ

ان مما ادرك الناس من کلام النبوۃ الاولیٰ اذا لم تستحي فاصنع ما شئت[3] — لوگوں نے پرانے پیغمبروں کی جو باتیں پائی ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ اگر تم میں شرم و حیا نہیں تو جو چاہو کرو۔

امام نووی نے اس حدیث کا ایک دوسرا مطلب بھی بیان کیا ہے کہ اگر تم کوئی ایسا کام نہیں کرتے جو شرم کے قابل ہو تو پوری آزادی سے کر سکتے ہو۔

قرآن و حدیث میں جہاں جہاں فحش، منکر اور سوء وغیرہ کے لفظ آئے ہیں ان سے بے حیائی کے یہی سب کام مراد ہیں۔ اور اسلام نے اس شدت اور جامعیت کے ساتھ ان تمام کاموں سے روکا ہے کہ حیا اسلام کا ایک مخصوص اخلاقی وصف بن گیا ہے۔ اسی بنا پر حدیث میں آیا ہے

---

[1] مسلم کتاب الطہارۃ باب استحباب استعمال المغتسلۃ من الحیض فرصۃ من مسك في موضع الدم۔ [2] بخاری کتاب الادب باب الحیاء۔ [3] بخاری کتاب الادب باب اذا لم تستحي فاصنع ما شئت۔ [4] فتح الباری ج ۱۰ صفحہ ۴۳۴۔

کہ ہر دین کا ایک خاص خُلق ہوتا ہے اور اسلام کا خاص خُلق حیا ہے[1]۔ یہ بھی فرمایا کہ ایمان کی کچھ اوپر ساٹھ شاخیں ہیں اور حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے[2]۔ فطری مواقع کے علاوہ ایک مسلمان کو کبھی بھی یہاں تک کہ تنہائی کی حالت میں بھی شرم وحیا کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہیے یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ برہنگی سے بچو کیونکہ تمہارے ساتھ ایسے فرشتے رہتے ہیں جو صرف بول وبراز اور مباشرت کے وقت تم سے الگ ہو جاتے ہیں تو اُن سے شرماؤ اور اُن کا خیال رکھو[3]۔

مقصد یہ ہے کہ شرم کا پانی آنکھوں سے گرنے نہ پائے۔

---

[1] موطا امام مالک کتاب الجامع باب ماجا فی الحیا [2] صحیح بخاری کتاب الایمان [3] ترمذی کتاب الاستیذان والآداب باب ماجاء فی الاستتار عند الجماع۔

رحم

رحم بھی اِنسان کے بنیادی اخلاق میں سے ہے۔ دُنیا میں ہم ایک دُوسرے کے ساتھ کِسی معاوضہ کا خیال کیے بغیر جو کچھ نیکی کے کام کرتے ہیں ان کو کرید کر دیکھئے تو سب کی تہ میں رحم کا جذبہ کام کرتا نظر آئے گا۔ جس کے دِل میں اس جذبہ کا کوئی ذرّہ نہ ہوگا اُس سے دُوسروں کے ساتھ بے رحمی، ظلم، سنگ دلی اور شقاوت جو کچھ نہ ظاہر ہو وہ کم ہے۔ اسی لیے اِسلام کی اخلاقی تعلیم میں اِس کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اللہ تعالےٰ کے خاص ناموں میں سے اللہ کے بعد جو نام سب سے زیادہ اہم اور عام ہے وہ رحمان یعنی "بڑا رحم والا" ہے۔ اسی کے ساتھ دُوسرا نام "رحیم" آتا ہے یعنی رحم سے بھرا ہوا۔ قرآن پاک میں پہلا نام ایک طرح سے خُدا کے عَلَم کی حیثیت سے لیا گیا ہے اور دُوسرا نام صفت کے طور پر بار بار آتا ہے۔ مُسلمان کو حکم ہے جب وُہ کوئی اچھا کام شروع کرے تو پہلے رحمان و رحیم خدا کا نام لے۔ ہر سُورہ کا آغاز اسی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہے۔ دنیا میں جو کچھ ہے وہ خُدا کی رحمت کے جلووں کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ خُدا کے فرشتے اپنی دعاؤں میں کہتے ہیں:

رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا (المؤمن: ۷)	اے ہمارے پروردگار تونے اپنی رحمت اور علم میں ہر چیز کو سمالیا ہے۔

اس رحمتِ الٰہی کی تفصیل سے سارا قرآن بھرا ہوا ہے :

هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ○ وہی رحم والا مہربان ہے۔

(الحشر: ۲۲)

مُسلمانوں کو بتایا گیا ہے کہ وُہ دُعاؤں میں کہیں :

وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ ○ اور تو سب رحم کرنے والوں میں سب سے بہتر رحم کرنے والا ہے۔

(المؤمنون: ۱۰۹)

دنیا میں رحم و کرم کے جو آثار پائے جاتے ہیں وُہ اسی کی رحمت کے آثار اور پر تو ہیں۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ "خدا نے رحمت کے سو ٹکڑے کیے جن میں سے ننانوے ٹکڑے اپنے پاس رکھ لیے اور زمین پر صرف ایک ٹکڑے کو اُتارا۔ اور اسی ایک ٹکڑے کی بنا پر لوگ ایک دُوسرے پر رحم کرتے ہیں یہاں تک کہ گھوڑا اس خوف سے اپنے بچے پر پاؤں نہیں رکھتا کہ کہیں اس کو صدمہ نہ پہنچ جائے[1]۔"

بنی نوعِ انسان میں محاسنِ اخلاق کا سب سے بڑا مظہر پیغمبروں کی ذات ہے۔ اور پیغمبروں میں سب سے اعلیٰ و اشرف ہستی رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ہے۔ اور خداوند تعالیٰ نے آپ کو اسی وصف کے ساتھ متصف کیا ہے :

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ○

(لوگو!) تمہارے پاس تم ہی میں کے ایک رسُول آئے ہیں۔ تمہاری تکلیف ان پر شاق گزرتی ہے (اور) اُن کو تمہاری بہبود کا ہوکا ہے اور مسلمانوں

---

[1] بخاری کتاب الادب۔

(التوبۃ: ۱۲۸) پر بہت شفیق (اور) رحیم ہیں۔

پیغمبروں کے بعد اگلے پیغمبروں کی اُمتیں ہیں۔ اور ان اُمتوں میں سے خداوند تعالیٰ نے حضرت عیسٰی علیہ السّلام کی اُمت کا یہ خاص اخلاقی وصف بتایا ہے:

وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ؕ | اور جو لوگ اُن کے پیرو ہوئے ان کے دلوں میں ہم نے ترس اور رحم ڈال دیا۔

(الحدید: ۲۷)

اور اس وصف میں اُمتِ محمدیہ بھی اُن کی شریک وسہیم ہے:

وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ | اور جو لوگ محمدؐ کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر زور آور ہیں، آپس میں رحم دل ہیں۔

(الفتح: ۲۹)

آپس کے تعلّقات میں ایک دوسرے کے ساتھ نیکی کا جو برتاؤ کیا جاتا ہے اس کو صلۂ رحم کہتے ہیں کیوں کہ قرابتوں کے سارے رشتے رحم مادری سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور رحِم رَحم اور رحمان جو خدا کا نام ہے ایک ہی اصل سے مشتق ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ رحم کا جذبہ رحمت والے (رحمان) خدا کی رحمت کا پرتو ہے اور اسی سے صلۂ رحم کا جذبہ دنیا میں پیدا ہوا ہے۔

حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

الرحم شجنة من الرحمٰن[1] | رحم رحمان کی جڑ سے نکلی ہوئی ایک شاخ ہے۔

یعنی قرابت کی رحمدلی اور شفقت کے جذبہ کی جڑ خود رحمان کی ذات ہے اور ساری

---

[1] بخاری کتاب الادب باب من وصل وصلہ اللہ۔

رحمدلیوں کے جذبے اسکی شاخیں ہیں۔ بچّوں کی محبّت اسی جذبہ سے پیدا ہوتی ہے۔ حضرت اسامہ بن زیدؓ فرماتے ہیں کہ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ایک زانو پر مُجھ کو اور دُوسرے زانو پر امام حسنؓ کو بٹھا لیتے تھے پھر دونوں زانو کو ملا کر کہتے تھے کہ خداوندا ان دونوں پر رحم کر کیونکہ میں ان دونوں پر رحم کرتا ہوں[1]"

ایک بار ایک شخص اپنے بچّے کو ساتھ لے کر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس آیا اور اس کو لپٹانے لگا۔ آپ نے یہ حالت دیکھ کر فرمایا کہ" تم اس پر رحم کرتے ہو؟" اس نے کہا" ہاں"۔ ارشاد ہوا کہ خداوند تعالیٰ تم پر اس سے زیادہ رحم کرنے والا ہے جس قدر تم اس بچّے پر رحم کرتے ہو۔ اور وُہ سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے[2]۔

ایک بار رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا بوسہ لیا۔ اقرع بن حابس جو ایک درشت خو بدّو تھے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ بولے کہ میرے دس بچّے ہیں۔ میں نے اُن میں سے کسی کا بوسہ نہیں لیا۔ آپ نے ان کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ" جو شخص رحم نہیں کرتا اُس پر رحم نہیں کیا جاتا"۔

ایک اور بدّو نے آپ سے کہا کہ آپ لوگ بچّوں کو چومتے ہیں لیکن ہم لوگ نہیں چومتے۔ ارشاد ہوا کہ" خُدا نے جب تمہارے دِل سے رحم کو نکال لیا تو میرا کیا زور ہے[3]"۔

رحم کی یہ خاص قسم یعنی چھوٹوں پر ترس کھانا اُمتِ محمدیّہ کا ایک عنصر ہے۔ اس لیے فرمایا کہ" جو شخص ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا وُہ ہم میں سے نہیں ہے[4]"۔ اور اگر اس نظر سے دیکھا جائے کہ رحم ہمیشہ چھوٹوں اور زیر دستوں پر کھایا جاتا ہے تو اس حدیث کی وسعت صرف عمر کے چھوٹوں تک نہیں، بلکہ ہر حیثیت کے چھوٹوں تک وسیع ہے۔

---

[1] بخاری کتاب الادب باب وضع الصبی علی الفخذ۔ [2] ادب المفرد باب رحمۃ العیال۔ [3] بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الولد وتقبیلہ ومعانقہ۔ [4] ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ما جاء فی رحمۃ الصبیان۔

خود اپنی قوم کی ہمدردی، محبت اور اعانت کا جذبہ اسی اخلاقی وصف سے پیدا ہوتا ہے۔

اسی لیے قرآن مجید نے صحابۂ کرام کا اخلاقی وصف یہ قرار دیا ہے۔ "رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ" یعنی وہ لوگ آپس میں رحمدل ہیں۔ اور حدیث میں اس وصف کو ایک نہایت عمدہ مثال میں بیان کیا گیا ہے یعنی یہ کہ مسلمانوں کی باہمی رحمدلی، باہمی دوستی اور باہمی مہربانی کی مثال انسان کے جسم کی ہے کہ جب کسی عضو کو درد دکھ پہنچتا ہے تو تمام جسم متاثر ہو جاتا ہے[1]۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ جذبۂ رحم نے اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے مسلمانوں کو اس قدر متحد کر دیا ہے کہ مجموعی طور پر وہ ایک جسم ہو گئے ہیں اور انفرادی طور پر مسلمانوں کے تمام افراد اس جسم کے اعضاء اور جوارح ہیں۔ اس لیے جس طرح ایک عضو کے درد دکھ میں تمام جسم شریک ہو جاتا ہے اسی طرح ایک مسلمان کے درد دکھ میں تمام مسلمانوں کو شریک ہونا چاہیے۔

اسلام نے جس رحم دلی کی تعلیم دی ہے وہ مسلمانوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ نہایت وسیع ہے اور اس میں تمام بنی نوعِ انسان شامل ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد حدیثوں میں عام رحم کی تعلیم دی ہے اور فرمایا ہے کہ جو شخص انسانوں پر رحم نہیں کرتا خدا بھی اس پر رحم نہیں کرے گا۔ یہ بھی فرمایا کہ "رحم کرنے والوں پر رحم کرنے والا خدا رحم کرے گا۔ زمین والوں پر تم رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔"[2]

رحم دلی کی یہ تعلیم صرف بنی نوعِ انسان ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اس میں بے زبان جانور بھی شامل ہیں۔ چنانچہ آپ نے فرمایا کہ "اگر کوئی شخص ذبیحہ جانور پر بھی رحم کرے گا تو خدا قیامت کے دن اس پر رحم کرے گا۔"[3] ایک شخص نے آپ کی خدمت میں عرض کی کہ میں بکری کو ذبح کرتا ہوں تو مجھے اس پر ترس آتا ہے یا یہ کہ مجھے اس پر ترس آتا ہے کہ بکری کو ذبح کر دوں۔ آپ

---

[1] بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الناس والبہائم۔ [2] بخاری ابواب البر والصلۃ باب ما جاء فی رحمۃ الناس۔ [3] ادب المفرد باب رحمۃ البہائم۔

نے دوبار فرمایا کہ "اگر تم بکری پر رحم کرتے ہو تو خدا بھی تم پر رحم کرے گا"[1]

جانوروں کے لڑانے کا جو بے رحمانہ طریقہ جاری ہو گیا تھا اور اب بھی جاری ہے وہ اس رحم دلی کے بالکل مخالف تھا اس لیے اسلام نے اس تفریحی مشغلہ کو ناجائز کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ممانعت فرمائی[2]۔

اس عام رحمدلی کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو ایسے مختصر اور جامع لفظوں میں دی ہے جو بلاغت کی جان ہیں۔ فرمایا:

من لا یرحم لا یرحم[3] جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

اِن دو لفظوں کی تشریح دفتروں میں نہیں سما سکتی۔ رحم دلی کا ہر منظر اور شفقت و کرم کا ہر جذبہ ان ہی دو لفظوں سے اُبھارا جا سکتا ہے۔ اس حدیث کا یہ مطلب ہے کہ جو دُوسروں پر رحم نہیں کرتا اس پر خدا بھی رحم نہیں فرمائے گا اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جو دُوسروں پر رحم نہیں کھاتا تو دُوسرے بھی اس پر رحم نہیں کھائیں گے۔ محدث ابن بطال نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ "اس میں تمام مخلوق پر رحم کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، اس لیے اس میں مسلمان، کافر، مملوکہ اور غیر مملوکہ جانور سبھی داخل ہیں۔ اور اُن کے کھانے پینے کی نگرانی کرنا، اُن پر ہلکا بوجھ لادنا اور اُن کو بہت نہ مارنا یہ سب چیزیں اسی رحم میں شامل ہیں[4]"۔ غرض یہی وہ چیز ہے جس سے ہم یتیموں کی غمخواری، بیکسوں کی تسکین، بیماروں کی تسلی، غریبوں کی امداد، مظلوموں کی حمایت اور زیردستوں کی اعانت کرتے ہیں۔ اور اس حدیث کے حکم کا وسیع دائرہ اِن سب کو گھیرے ہے۔ اس لیے مبارک ہیں وہ جو رحم کرتے ہیں کہ اُن پر رحم کیا جائے گا۔

---

[1] ادب المفرد باب ارحم من فی الارض [2] ابو داؤد کتاب الجہاد باب فی التحریش بین البہائم۔ [3] صحیح بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الناس والبہائم [4] فتح الباری جلد ۱۰ صفحہ ۳۶۸ مصر۔

عدل وانصاف

کسی بوجھ کو دو برابر حصّوں میں اس طرح بانٹ دیا جائے کہ ان دو میں سے کسی میں ذرا بھی کمی یا بیشی نہ ہو تو اس کو عربی میں "عدل" کہتے ہیں[1] اور اس سے وُہ معنی پیدا ہوتے ہیں جن میں ہم اِس لفظ کو اپنی زبان میں بولتے ہیں یعنی جو بات ہم کہیں یا جو کام کریں اس میں سچائی کی میزان کسی طرف جھکنے نہ پائے اور وُہی بات کہی اور وُہی کام کیا جائے جو سچائی کی کسوٹی پر پُورا اترے۔ اس تشریح سے معلوم ہوگا کہ اخلاق کی ترازو میں عدل وانصاف کا پلّہ بھی کچھ کم بھاری نہیں۔

عدل سب سے پہلے خود اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ جن روایتوں میں اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام گنائے گئے ہیں ان میں ایک عدل (عدل والا) بھی ہے۔ علماء نے اس کے معنی یہ بتائے ہیں کہ "اُس کا فیصلہ حق ہوتا ہے، وُہ حق بات کہتا ہے اور وُہی کرتا ہے جو حق ہے۔"[2] قرآن پاک میں کئی دفعہ یہ حقیقت مختلف لفظوں میں دہرائی گئی ہے۔ فرمایا:

وَاللّٰهُ يَقْضِي بِالْحَقِّ ط — اور اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے۔

(المومن: ۲۰)

---

[1] مفردات راغب اصفہانی [2] کتاب الاسماء والصفات بیہقی، صفحہ ۷۱، الٰہ آباد۔

یہ عدلِ عملی کی طرف اشارہ ہے۔ دُوسری آیت میں ہے:

وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ (الاحزاب: ۴) اور اللہ حق بات کہتا ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کے عدلِ قولی کو ظاہر کرتا ہے اور یہ دونوں باتیں قرآن پاک کی ذیل کی آیت میں یکجا ہیں:

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ؕ اور تیرے ربّ کی بات سچائی اور انصاف کے ساتھ پُوری ہو گئی۔

(الانعام: ۱۱۵)

دنیا کا یہ سارا کارخانہ جو آسمان سے لے کر زمین تک پھیلا ہے صرف اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف کے بل بوتے پر قائم ہے۔ وُہ اپنی تمام مخلوقات میں اپنی شہنشاہی پُورے انصاف کے ساتھ قائم کیے ہُوئے ہے اور یہی اس کی وحدانیت کی دلیل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًاۢ بِالْقِسْطِ ؕ (اٰل عمران: ۱۸) خدا نے گواہی دی کہ اُس کے سوا کوئی خدا نہیں اور فرشتوں نے اور علم والوں نے۔ وہی خدا انصاف کو لے کر کھڑا ہے۔

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ عدل و انصاف صرف نظم و سلطنت ہی کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں عدل کی ضرورت ہے اور نظامِ عالم محض عدل کی وجہ سے قائم ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایک نہایت ہی جامع آیت میں جن اچھی باتوں کا حکم دیا ہے ان میں سب سے پہلے عدل و انصاف ہی کرنے کا حکم ہے۔ فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ بے شبہ اللہ انصاف اور نیکی کرنے

اَلۡاِحۡسَانِ (النحل: ۹۰) کا حکم دیتا ہے۔

عدل قانون کا اقتضا ہے اور احسان کرنا اور درگذر کرنا اخلاق کا مطالبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نظمِ عالم کو قائم رکھنے کے لیے سب سے پہلے عدل کا حکم دیا ہے اور اس کے بعد احسان کی تاکید کی ہے جس سے اشخاص کی روحانی تکمیل ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ سارے عالم کی نگہداشت کا فرض کسی شخص کی ذاتی تکمیل کے فرض سے زیادہ اہم ہے۔ پھر اسی مجمل تعلیم پر بس نہیں کیا ہے بلکہ زندگی کے اہم شعبوں کو لے کر اُن میں عدل و انصاف کا حکم دیا ہے۔ مثلاً معاشرتی زندگی میں عدل و انصاف کی سب سے زیادہ ضرورت اُن لوگوں کو ہوتی ہے جو ایک سے زائد عورتوں سے نکاح کرتے ہیں اس لیے ان لوگوں کو اللہ تعالےٰ نے حکم دیا ہے:

فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا تَعۡدِلُوۡا فَوَاحِدَۃً اَوۡ مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ (النساء: ۳)

پھر اگر تم کو اس بات کا اندیشہ ہو کہ (کئی بیبیوں میں) انصاف نہ کرسکو گے تو ایک ہی (بی بی کرنا) یا جو (لونڈی) تمہارے قبضہ میں ہو۔

عورتوں کی طرح تیمیوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے بھی عدل و انصاف کی ضرورت ہے۔ اس لیے فرمایا:

وَ اَنۡ تَقُوۡمُوۡا لِلۡیَتٰمٰی بِالۡقِسۡطِ (النساء: ۱۲۷)

اور (خاص کر) یہ کہ تیمیوں کے حق میں انصاف کو ملحوظ رکھو۔

عام معاملات میں عدل و انصاف کی سب سے زیادہ ضرورت روزانہ کی خرید و فروخت میں وزن و پیمانہ میں ہے۔ اس لیے فرمایا:

وَ اَوۡفُوا الۡکَیۡلَ وَ الۡمِیۡزَانَ

اور انصاف کے ساتھ (پوری پوری)

بِالْقِسْطِ (الانعام: ۱۵۲) ماپ کرو اور (پوری پوری) تول ۔

قرآن مجید کی متعدد آیتوں میں بار بار اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ ناپ اور تول میں بے انصافی نہ کی جائے کیونکہ خرید و فروخت کا معاملہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کی ہر انسان کو ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے وزن و پیمانہ میں کمی کرنے سے جو نقصان پہنچتا ہے وُہ نہایت عام و وسیع ہے۔ اس کے ساتھ نہایت حقیر مقدار میں کمی کرنے سے انسان کی سخت دنارت ثابت ہوتی ہے اور اس سے رُوح میں سخت اخلاقی گندگی پیدا ہوتی ہے۔

عدل و انصاف کی ضرورت خاص طور سے عدالتی معاملات میں ہوتی ہے اور اسلام نے عدالتی کاروبار کے ہر پہلو میں عدل و انصاف کا لحاظ رکھا ہے۔ تحریر دستاویز کے متعلق حکم ہے کہ

وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ (البقرة: ۲۸۲) اور (تمہارے باہمی قرارداد کو) کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھ دے۔

فَاِنْ كَانَ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ (البقرة: ۲۸۲) پھر جس کے ذمہ قرض عائد ہوگا اگر وُہ کم عقل ہو یا معذور یا خود ادائے مطلب نہ کرسکتا ہو تو (جو) اس کا مختار کار ہو وُہ) انصاف کے ساتھ (دستاویز کا) مطلب بولتا جائے۔

شہادت یا فیصلہ کے وقت دو حالتوں میں اکثر لوگوں کا ایمان ڈگمگا جاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ فریق مقدمہ اپنا قرابت دار ہو یا اُس سے گواہ یا حاکم کو عداوت ہو، لیکن اسلام کی اخلاقی تعلیم اس حالت میں بھی عدل و انصاف سے تجاوز کرنے کو جائز نہیں رکھتی:

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ اور اگر گواہی دینی ہو یا فیصلہ کرنا پڑے)

كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ (الانعام: ۱۵۲)	جب بات کہو تو گو (فریق مقدمہ اپنا) قرابت مند ہی (کیوں نہ) ہو انصاف (کا پاس) کرو۔
يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۫ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۫ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۫ (المآئدۃ: ۸)	مسلمانو! خدا واسطے انصاف کے ساتھ گواہی دینے کو آمادہ رہو اور لوگوں کی عداوت تم کو اس جرم (کے ارتکاب) کی باعث نہ ہو کہ (معاملات میں) انصاف نہ کرو۔ (نہیں ہر حال میں) انصاف کرو کہ (شیوہ) انصاف پرہیزگاری سے قریب تر ہے۔

پہلی آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ تمہاری باہمی دوستی و محبت تم کو بے انصاف نہ بنائے اور دوسری آیت میں یہ ارشاد ہے کہ کسی کی دشمنی تم کو انصاف سے باز نہ رکھے اور یہ کہ ہر حال میں عدل و انصاف کرنا تقویٰ کی نشانی ہے۔

یہود اور نصاریٰ اسلام کے کھلے ہوئے دشمن تھے اس پر بھی رسولِ اسلام علیہ السّلام کی زبانِ مبارک سے وحیِ الٰہی یہ کہلواتی ہے:

وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ؕ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ؕ	اور کہدے کہ میں ہر اس کتاب کو مانتا ہوں جو اللہ نے اتاری، اور مجھے (خدا سے) یہ حکم ملا ہے کہ میں تمہارے بیچ میں انصاف کروں، اللہ رب ہے ہمارا اور

لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ ۖ اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝ (الشوریٰ: ۱۵)

تمہارا، ہم کو ہمارے کاموں کا بدلہ ملنا ہے اور تم کو تمہارے کاموں کا، ہم میں تم میں کچھ جھگڑا نہیں، اسی کی طرف سب کو پھر جانا ہے۔

جس عدل اور برابری کا حکم اِس آیتِ پاک میں ہے اس کے کئی پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ جو سچائی مجھ تک پہنچی ہے اس کو میں برابر برابر تم سب کو پہنچا دوں۔ دُوسرا یہ کہ محض دینی مخالفت کی وجہ سے تمہارے ساتھ بے انصافی نہ کی جائے بلکہ وُہ کیا جائے جس کا تقاضا عدل و انصاف کرتا ہے اور تیسرا یہ کہ اب تک تم میں مقدمات کے فیصلہ کی جو صُورت جاری ہے کہ دولت مندوں اور عزت والوں کے ساتھ رعایت کا اور عام لوگوں کے ساتھ سختی کا قانون برتا جائے میرے خدا نے ایسا کرنے سے مجھے منع کیا ہے اور یہ حکم دیا ہے کہ عام و خاص اور امیر و غریب سب کے ساتھ یکساں اور برابری کا سلوک کیا جائے۔ کیونکہ ہمارا تمہارا سب کا رب ایک ہی ہے۔ ہم سب اس کے غلام ہیں۔ اس لیے اس کے سب غلاموں کے لیے ایک ہی قانون ہونا چاہیے۔ ہم کو ہمارے اعمال اور تم کو تمہارے اعمال کا بدلہ ملے گا۔ اِس میں جھگڑے کی کوئی بات نہیں۔ سب کو قیامت میں اُس مالک کے سامنے پیش ہونا ہے۔ جس کا کام اس کو پسند آئے گا اس کو ویسا انعام ملے گا اور اگر بُرا کام کیا ہو تو ویسی ہی سزا ملے گی۔

عدل و انصاف کی راہ میں اِن دونوں سے بھی زیادہ ایک کٹھن منزل ہے اور وُہ یہ ہے کہ اپنے نفس کے مقابلہ میں بھی عدل و انصاف کا سر رشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک تعلیم کی روشنی میں اہلِ ایمان کو اس کٹھن منزل کی رہنمائی بھی پوری طرح کی گئی ہے۔ ارشادِ خداوندی ہوا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا	اے ایمان والو! انصاف کی حمایت میں
قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ	کھڑے ہو اللہ کے لیے گواہ بنو۔ اگرچہ
لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ	تمہارا اپنا اس میں نقصان ہی ہو یا ماں
وَالْأَقْرَبِينَ ۚ إِنْ يَكُنْ غَنِيًّا	باپ کا یا رشتہ داروں کا۔ اگر وہ دولت مند
أَوْ فَقِيرًا فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا ۖ	ہے یا محتاج ہے تو اللہ تم سے زیادہ اُن
فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَنْ تَعْدِلُوا ۚ	کا خیر خواہ ہے۔ تو تم انصاف کرنے میں
وَإِنْ تَلْوُوا أَوْ تُعْرِضُوا فَإِنَّ	اپنے نفس کی خواہش کی پیروی نہ کرو اگر
اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ○	تم زبان ملو گے یا کچھ بچا جاؤ گے تو اللہ
(النساء: ۱۳۵)	تمہارے کام سے واقف ہے۔

ان آیتوں میں عدل کے خلاف ایک ایک ریشہ کو جڑ سے نکال کر پھینک دیا گیا ہے۔ کہا گیا کہ معاملات میں عدل و انصاف کی حمایت تمہارا مقصد ہو۔ جو کچھ کہو یا کرو خدا لگتی کہو اور خدا واسطے کہو۔ عدل و انصاف کے فیصلہ اور گواہی میں نہ تو اپنے نفس کا خیال بیچ میں آئے، نہ عزیزوں اور قرابت داروں کا، نہ دولت مند کی طرفداری کا، نہ محتاج پر رحم کا۔ پھر اس فیصلہ اور گواہی میں کوئی بات لگی لپٹی نہ رکھی جائے، نہ حق کا کوئی پہلو جان بوجھ کر بچا لیا جائے۔ مطلب یہ ہوا کہ فیصلہ اور گواہی میں دولت مند کی خاطر نہ کرو اور نہ محتاج پر ترس کھاؤ اور قرابت کو بھی نہ دیکھو جو حق ہو وہ کرو یا کہو۔ پھر سچ کہنے میں کوئی توڑ مروڑ نہ کرو کہ سننے والا شبہ میں پڑ جائے یا پوری بات نہ کہو کچھ چھپا لو تو یہ سب باتیں عدل و انصاف کے خلاف ہیں۔ کسی غریب کی غربت پر ترس کھا کر فیصلہ میں ردّ و بدل کر دینا بظاہر نیکی کا کام دکھائی دیتا ہے مگر درحقیقت یہ ایک مقدس فریب ہے۔ فیصلہ میں ترس کھا کر بے ایمانی کرنا بھی ویسا ہی ہے جیسا کسی کی خاطر رکھ کر یا کسی کی بزرگی کو

مان کر یا کسی کی بڑائی سے مرعوب ہو کر بے ایمانی کرنا ہے۔ غرض یہ ہے کہ عدل وانصاف کی راہ میں کوئی اچھا یا بُرا جذبہ حاکم کے لیے ٹھوکر کا پتھر نہ بنے۔

اسی طرح اس آیت کا اشارہ ادھر بھی ہوا کہ جو گواہ کسی فریق کو نفع پہنچانے کی غرض سے طرفدارانہ گواہی دیتا ہے وُہ غلطی میں مبتلا ہے۔ اللہ تعالےٰ سے بڑھ کر کوئی اس کا نگران نہیں ہو سکتا۔ اس لیے نہ گواہوں کو طرفداری کرنی چاہیے اور نہ خود کسی فریق کو گواہ کی طرف داری کے ذریعہ سے اپنی منفعت کا خیال دل میں لانا چاہیے بلکہ دونوں کو اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر دینا چاہیے کہ وہی ان کا سب سے بہتر اور سب سے بڑھ کر دلی ہے۔

لوگ عدل وانصاف کے فیصلہ یا گواہی میں اسی لیے غلط بیانی کرتے ہیں کہ جس فریق کی طرف داری مقصود ہے اس کو فائدہ پہنچ جائے۔ تو ارشاد ہوا کہ اللہ اپنے امیر اور غریب دونوں بندوں کے حق میں تم سے زیادہ خیر خواہ ہے۔ تمہاری کم بیں نظر تو آس پاس تک جا کر رہ جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی نظر میں سب کچھ ہے۔ وُہ سب کچھ دیکھ کر اور سب کچھ جان کر اپنے بندوں کے ساتھ وہ کرتا ہے جس میں اُن کی بھلائی ہے۔ غور کیجیے کہ ان لفظوں میں عدل وانصاف کا فلسفہ کس خوبی سے ادا کیا گیا ہے۔ کم حوصلہ انسان اپنے فیصلہ اور گواہی میں کسی خاص انسان کی بھلائی کے لیے جھوٹ بولتا یا غلط فیصلہ دیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس سے اس کو فائدہ پہنچے گا۔ حالانکہ عالم الغیب کے سوا یہ کس کو معلوم ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر اس کے لیے کیا چیز مفید ٹھہرے گی۔ پھر ایک اور حیثیت سے دیکھئے کہ بالفرض ایک خاص آدمی کو اپنی طرف داری سے فائدہ پہنچا بھی دیا تو کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ اس نے اس طرح حقیقت میں سچائی کا خون کر کے نظمِ عالم کو ابتر کرنے کی کوشش کی اور ظلم کی بنیاد رکھی جس سے عالم کے امن وامان کے درہم برہم ہو جانے کا خطرہ ہے غلط گو انسان کی محدود نگاہ میں صرف ایک جزئی واقعہ کے نفع ونقصان کا خیال ہے اور اللہ تعالےٰ

کے عدل و انصاف کے حکم میں سارے عالم کی خیر خواہی کا بھید چھپا ہے جس کا ایک فردِ خاص انسان بھی ہے۔

اسی لیے رشوت دے کر حاکموں کی رائے کو متاثر کرنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں گناہ ہے اور بعض مفسروں کے خیال کے مطابق قرآن پاک کی اس آیت میں

وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا	اور نہ مال حاکموں تک پہنچاؤ تاکہ
فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ	لوگوں کے مال میں سے گناہ کما کر کچھ
بِالْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ○	کھا جاؤ اور تم جان رہے ہو۔

(البقرۃ: ۱۸۸)

اس سے رشوت کی ممانعت کی طرف بھی اشارہ ہے[۱]۔

دو شخصوں یا دو گروہوں میں مصالحت کرانا بھی ایک عدالتی معاملہ ہے۔ اس لیے اس میں بھی عدل و انصاف کا حکم دیا گیا ہے اور کس حالت میں دیا گیا ہے جب دونوں طرف سے تلواریں میان سے نکل چکی ہوں اور ایک دُوسرے کے سر و سینہ پر تڑپ تڑپ کر گر رہی ہوں یعنی اس وقت جب عقل کی قوّت اور نیکی کی استعداد کا چراغ جذبات کی آندھیوں میں بجھ رہا ہو۔ اس عالم میں بھی مسلمانوں سے یہی کہا گیا کہ عدل و انصاف کا دامن ہاتھوں سے نہ چھوٹے۔ فرمایا:

وَإِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ	اور اگر (تم) مسلمانوں کے دو فرقے آپس
اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِن	میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو۔ پھر
بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ	اگر اُن میں کا ایک (فرقہ) دُوسرے پر
فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ	زیادتی کرے تو جو زیادتی کرتا ہے اس

---

[۱] تفسیر رُوح المعانی۔

إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ ۚ فَإِن فَاءَتْ	سے تم (بھی) لڑو، یہاں تک کہ وُہ
فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ	حکم خدا کی طرف رجُوع کرے، پھر جب
وَأَقْسِطُوا ۖ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ	رجُوع لائے تو دونوں میں برابری کے
الْمُقْسِطِينَ ○	ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کو ملحوظ رکھو
(الحجرات: ۹)	بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو
	محبوب رکھتا ہے۔

عدل وانصاف حکومت وسلطنت کی عمارت کا ستون ہے اسی لیے اسلام نے ہر قسم کے مذہبی اور عدالتی فیصلے کے لیے عدل کو ضروری قرار دیا ہے کہ یہ اگر نہ ہو تو کسی مظلوم کی دادرسی ممکن ہی نہیں۔ اسی لیے ایک حاکم کا پہلا فرض یہ ہے کہ عادل ہو۔ ارشاد ہوا:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا	بے شک اللہ تم کو یہ حکم فرماتا ہے کہ
الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُم	امانتیں امانت والوں کو پہنچاؤ، اور
بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُوا	یہ کہ جب لوگوں کے درمیان جھگڑے
بِالْعَدْلِ ۚ	فیصل کرنے لگو، تو انصاف کے ساتھ
(النسآء: ۵۸)	فیصلہ کرو۔

اہلِ تفسیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس آیتِ پاک میں "امانت" سے مراد منصفانہ فیصلہ اور وُہ منصفانہ حق ہے جو ایک کا دُوسرے پر چاہیے۔ خدا نے اس آیت میں اسی منصفانہ فیصلہ اور حق کی امانت کو حقدار تک پہنچانے کا حکم دیا ہے اور منصفانہ فیصلہ کی تاکید کی ہے۔ اور یہ فیصلہ دوست و دُشمن کافر و مسلم سب کے ساتھ یکساں عدل وانصاف کے ساتھ ہونا چاہیے۔ چنانچہ خود رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہودیوں کے مُعاملات میں حکم ہوا:

وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝
(المآئدة: ۴۲)

اور اگر فیصلہ کرو تو اُن میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا، کیونکہ اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

عدل و انصاف کی برتری کی یہ اہمیت لحاظ رکھنے کے قابل ہے کہ عدل و انصاف کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ دو دفعہ اپنی دوستی اور محبت سے نوازنے کی بشارت سناتا ہے۔

اخلاق کے ساتھ یہ مسئلہ سیاست سے بھی تعلق رکھتا ہے یعنی جو شخص فیصلہ کرتا ہے اس کے لیے کن کن اوصاف سے متصف ہونا ضروری ہے۔ قرآن مجید میں اگرچہ اس کی کوئی تصریح نہیں کی گئی ہے تاہم اشاراتِ قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص فیصلہ کرتا ہے اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ آزاد ہو، اپنے فیصلہ کے نفاذ کی قدرت رکھتا ہو، قوتِ نطق سے محروم نہ ہو، صاحبِ علم ہو۔ چنانچہ خداوند تعالےٰ فرماتا ہے:

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ ۙ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ۭ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝

اور خدا (ایک دُوسری مثال دیتا ہے کہ) دو آدمی (ہیں) ان میں کا ایک گونگا اور گونگا ہونے کے علاوہ پرایا غلام کہ خود کچھ نہیں کر سکتا اور (گونگے ہونے کی وجہ سے) وُہ اپنے آقا کا بارِ خاطر بھی ہے کہ جہاں کہیں اُس کو بھیجے اس سے کچھ بھی ٹھیک نہیں بن آتا، کیا ایسا غلام اور وُہ شخص (دونوں) برابر ہو سکتے ہیں، جو (لوگوں کو) عدل و انصاف کی تاکید کرتا ہے

(النحل: ۷۶) اور وُہ خود بھی سیدھے راستے پر ہے۔

اور امام رازی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ جو شخص عدل کا حکم دیتا ہے اس کو صفتِ نطق سے متصف ہونا چاہیے ورنہ وُہ حکم نہ دے سکے گا۔ اور قادر ہونا چاہیے کیونکہ حکم سے علوے مرتبت کا اظہار ہوتا ہے اور جب تک وُہ قادر نہ ہو علوے مرتبت حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور عالم ہونا چاہیے تاکہ ظلم و انصاف میں تمیز کر سکے۔ اس سے ثابت ہوا کہ عدل و انصاف کی صفت قدرت اور علم دونوں کو شامل ہے۔ پہلا شخص گونگا ہے تو دُوسرے کو گویا ہونا چاہیے۔ پہلا شخص کسی قسم کی قدرت نہیں نہیں رکھتا تو دُوسرے کو صاحب قدرت ہونا چاہیے۔ پہلے شخص سے کوئی کام ٹھیک بن نہیں آتا اس لیے دُوسرے شخص کو عالم ہونا چاہیے تاکہ وُہ ہر کام سلیقہ سے کر سکے۔

ان تمام تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام نے عدل و انصاف کا جو حکم دیا ہے وُہ اخلاق معاشرت اور سیاست کے ہر ایک گوشہ کو محیط ہے یعنی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس پر اسلام کی یہ اخلاقی تعلیم حاوی نہ ہو۔

ان آیات کی رو سے اگرچہ ہر مُسلمان کو عادل ہونا چاہیے تاہم امام و حاکمِ وقت کے لیے عادل ہونا اور بھی زیادہ ضروری ہے۔ اس لیے حدیث میں امام عادل کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے اور رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دِن جب کہ خدا کے سایہ کے سوا کوئی دُوسرا سایہ نہ ہوگا سات شخصوں کو خدا اپنے سایہ میں لے گا جن میں ایک شخص امام عادل ہوگا۔[1]

---

[1] بخاری کتاب المحاربین باب فضل من ترک الفواحش۔

عہد کی پابندی

کسی سے جو وعدہ یا کسی قسم کا قول و قرار کرلیا جائے اس کو پورا کرنا ایک راست باز کا شعار ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے اپنی نسبت یہ بار بار فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ۝	بے شبہ خدا وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔
(آل عمران: ۹/ الرعد: ۳۱)	
لَا یُخْلِفُ اللّٰهُ الْمِیْعَادَ ۝	اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔
(الزمر: ۲۰)	
اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ۝	(اے ہمارے پروردگار) تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔
(آل عمران: ۱۹۴)	
وَعْدَ اللّٰهِ ؕ لَا یُخْلِفُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ	اللہ کا وعدہ ہوا ہے، اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔
(الروم: ۶)	
وَلَنْ یُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ؕ	اور اللہ ہرگز نہ ٹالے گا اپنا وعدہ۔
(الحج: ۴۷)	

فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ (البقرة: ۸۰)	تو البتہ اللہ اپنے قول و قرار کے خلاف نہ کرے گا۔
وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ (التوبة: ۱۱۱)	اور اللہ سے زیادہ اپنے عہد کو پورا کرنے والا کون ہے۔

جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کا سچا اور اپنے عہد کا پکا ہے اسی طرح اس کے بندوں کی خوبیوں میں سے ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی سے جو وعدہ کریں وہ پورا کریں اور جو قول قرار کریں اس کے پابند رہیں۔ سمندر اپنا رُخ پھیر دے تو پھیر دے اور پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے تو ٹل جائے مگر کسی مسلمان کی یہ شان نہ ہو کہ منہ سے جو کہے وہ اس کو پورا نہ کرے اور کسی سے جو قول قرار کرے اس کا پابند نہ رہے۔

عام طور پر لوگ عہد کے معنی صرف قول و قرار کے سمجھتے ہیں۔ لیکن اسلام کی نگاہ میں اس کی حقیقت بہت وسیع ہے۔ وہ اخلاق، معاشرت، مذہب اور معاملات کی اُن تمام صورتوں پر مشتمل ہے جن کی پابندی انسان پر عقلاً، شرعاً، قانوناً اور اخلاقاً فرض ہے اور اس لحاظ سے یہ مختصر سا لفظ انسان کے بہت سے عقلی، شرعی، قانونی، اخلاقی اور معاشرتی فضائل کا مجموعہ ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں بار بار اس کا ذکر آیا ہے اور مختلف حیثیتوں سے آیا ہے۔ ایک جگہ اصلی نیکی کے اوصاف کے تذکرہ میں ہے:

وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عَاهَدُوْا (البقرة: ۱۷۷)	اور اپنے قرار کو جب قول دیں پورا کرنے والے۔

بعض آیتوں میں اس کو کامل الایمان مسلمانوں کے مخصوص اوصاف میں شمار کیا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ○ (المؤمنون: ۸)	اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس ملحوظ رکھتے ہیں۔

ایک دُوسری سورہ میں جنّتی مسلمانوں کے اوصاف کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اُس تصویر کا ایک رُخ یہ ہے:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ○ (المعارج ۳۲: ۳۲)	اور وُہ جو اپنی امانتوں کا اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں۔

کسی کی امانت کو رکھ کر بلا کم و کاست ٹھیک وقت پر ادا کر دینا معاملاتی حیثیت سے ایک قسم کے عہد کی پابندی ہے جو عہد کے وسیع معنی میں داخل ہے۔ اس لیے پہلے عہد کی اس خاص قسم کا ذِکر کیا اور اس کے بعد عہد کا عام ذِکر کیا یعنی تاکیداً پہلے ایک خاص عہد کی پابندی کو مُسلمانوں کا مخصوص وصف قرار دیا اس کے بعد عام عہد کا ذکر کیا۔ اِس کے برعکس ایک آیت میں پہلے عہد کی عام پابندی کا اور اس کے بعد عہد کی ایک خاص قسم کی پابندی کا حکم دیا۔

وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا ○ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ○ (بنی اسرآئیل: ۳۴-۳۵)	اور عہد کو پورا کیا کرو کیونکہ (قیامت میں) عہد کی باز پرس ہو گی۔ اور جب ناپ کرو تو پیمانہ کو پورا بھر دیا کرو اور (تول کر دینا ہو تو) ڈنڈی سیدھی رکھ کر تولا کرو۔ (معاملہ کا) یہ بہتر (طریق) ہے اور (اس کا) انجام بھی اچھا ہے۔

قانون یا رسم و رواج سے جو وزن یا پیمانہ مقرر ہو جاتا ہے وُہ درحقیقت ایک معاہدہ ہوتا ہے جس کی پابندی بائع اور خریدار پر فرض ہوتی ہے۔ اِس لیے تاکیداً پابندیٔ عہد کے عام حکم کے بعد اس خاص عہد کی پابندی کا ذکر کیا اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد کے لیے زبانی قول و قرار کی ضرورت نہیں بلکہ عرفِ عام کے سارے مسلّمات سوسائٹی کے قول و قرار ہیں۔

تمام عہدوں میں سے سب سے پہلے انسان پر اُس عہد کو پورا کرنا واجب ہے جو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ہوا ہے۔ یہ عہد ایک تو وُہ فطری معاہدہ ہے جو روزِ الست کو بندوں نے اپنے خدا سے باندھا اور جس کا پورا کرنا ان کی زندگی کا پہلا فرض ہے۔ اور دوسرا وُہ عہد ہے جو خدا کا نام لے کر کسی بیعت اور اقرار کی صُورت میں کیا گیا ہے۔ تیسرا عہد وُہ ہے جو عام طور سے قول و قرار کی شکل میں بندوں میں آپس میں ہوا کرتا ہے اور چوتھا عہد وُہ ہے جو اہلِ حقوق کے درمیان فطرۃً قائم ہے اور جن کے ادا کرنے کا خُدا نے حکم دیا ہے۔ ارشاد ہے:

اَلَّذِیْنَ یُوْفُوْنَ بِعَھْدِ اللّٰہِ وَ لَا یَنْقُضُوْنَ الْمِیْثَاقَ ○ وَالَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ	جو اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اپنے اقرار کو نہیں توڑتے۔ اور جو خدا نے جن تعلقات کے جوڑنے کا حکم دیا ہے اُن کو جوڑے رکھتے ہیں

(الرعد: ۲۰-۲۱)

اِس آیت میں پہلے اِس فطری عہد کے ایفاء کا ذکر ہے جو خدا اور بندہ کے درمیان ہے۔ پھر اس قول و قرار کا جو باہم انسانوں میں ہوا کرتا ہے۔ اس کے بعد اس فطری عہد کا ہے جو خاص کر اہلِ قرابت کے درمیان قائم ہے۔

سورۂ نحل میں اللہ کے عہد کا مقدس نام اس معاہدہ کو بھی دیا گیا ہے جو خدا کو حاضر و ناظر بنا کر یا خدا کی قسمیں کھا کھا کر بندے آپس میں کرتے ہیں۔ فرمایا:

وَاَوْفُوْا بِعَھْدِ اللّٰہِ اِذَا عٰھَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَیْمَانَ بَعْدَ تَوْکِیْدِھَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰہَ	اور اللہ کا نام لے کر جب تم آپس میں ایک دُوسرے سے قرار کرو تو اس کو پُورا کرو۔ اور قسموں کو پکّی کر کے

عَلَیۡکُمۡ کَفِیۡلًا ؕ	توڑا نہ کرو۔ اور اللہ کو تم نے اپنے پر ضامن
(النحل: ۹۱)	ٹھہرایا ہے۔

اس معاہدہ کے عموم میں صحابۂ کرام کے وُہ عہد بھی داخل ہیں جو اسلام لاتے وقت انہوں نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے کیے۔ اور وُہ نیک معاہدے بھی اس کے اندر شامل ہیں جو جاہلیّت میں کسی اچھی غرض سے کیے گئے تھے۔ ساتھ ہی وُہ سب معاہدے بھی اس میں آجاتے ہیں جو خدا کا واسطہ دے کر اور خدا کی قسمیں کھا کر آج بھی مسلمان ایک دُوسرے سے کریں۔

سورۂ انعام میں ایک اور عہدِ الٰہی کے ایفا کی نصیحت کی گئی ہے۔ فرمایا:

وَبِعَهۡدِ اللّٰهِ اَوۡفُوۡا ؕ ذٰ لِكُمۡ	اور اللہ کا قرار پورا کرو۔ یہ اُس نے
وَصّٰىكُمۡ بِهٖ لَعَلَّكُمۡ تَذَكَّرُوۡنَ ۝	تم کو نصیحت کر دی ہے تاکہ تم دھیان
(الانعام: ۱۵۲)	رکھو۔

اس عہدِ الٰہی میں خدا کے وُہ فطری احکام بھی داخل ہیں جن کے بجا لانے کا اقرار تم نے خدا سے کیا ہے یا خدا نے تم سے لیا ہے۔ اسی طرح اُس نذر اور منّت کو مشتمل ہے جس کو خدا کے مقدّس نام سے تم نے مانا ہے۔ اور انسانوں کے اُس باہمی قول و قرار کو بھی شامل ہے جو خدا کی قسمیں کھا کھا کر لوگ کیا کرتے ہیں۔

صلحِ حدیبیہ میں مُسلمانوں نے کفار سے جو معاہدہ کیا تھا اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی کارسازی نے یہ موقع بہم پہنچایا کہ فریقِ مخالف کی قوت روز بروز گھٹتی اور اسلام کی قوت بڑھتی گئی۔ اس حالت میں اس معاہدہ کو توڑ دینا کیا مشکل تھا۔ مگر یہی وُہ وقت تھا جس میں مسلمانوں کے مذہبی اخلاق کی آزمائش کی جاسکتی تھی کہ اپنی قوت اور دشمنوں کی کمزوری کے باوجود وُہ کہاں تک

اپنے معاہدہ پر قائم رہتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالےٰ نے بار بار اس معاہدہ کی استواری اور پابندی کی یاد دلائی اور فرمایا کہ تم اپنی طرف سے کسی حال میں اس معاہدہ کی خلاف ورزی نہ کرو۔ جن مشرکوں نے اس معاہدہ کو توڑا تھا ان سے لڑنے کی اجازت گو دے دی گئی تھی اور مکّہ فتح بھی ہو چکا تھا پھر بھی یہ حکم ہوا کہ اُن کو چار مہینوں کی مہلت دو:

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ	اللہ اور اس کے رسُول کی طرف سے
اِلَى الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ	اُن مشرکوں کو پورا جواب ہے جن
الْمُشْرِكِيْنَ ۞ فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ	سے تم نے معاہدہ کیا تھا۔ تو پھر لو! تم
اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا	اے مشرکو!) ملک میں چار مہینے اور
اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ	یقین مانو کہ تم اللہ کو تھکا نہیں سکتے۔

(التوبۃ: ۱-۲)

آگے چل کر جب یہ اعلان ہوتا ہے کہ اب ان مشرکوں اور مسلمانوں کے درمیان کسی قسم کے معاہدہ کی ذمہ داری نہیں رہی تو ساتھ ہی ان مشرکوں کے ساتھ ایفائے عہد کی تاکید کی گئی جنہوں نے حدیبیہ کے معاہدہ کی حرمت کو قائم رکھا تھا۔ فرمایا:

اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ	مگر جن مشرکوں سے تم نے عہد کیا تھا پھر
الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ	انہوں نے تم سے کچھ کمی نہیں کی اور
شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ	نہ تمہارے خلاف کسی کو مدد دی تو ان
اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ	سے ان کے عہد کو ان کی مقررہ مدت
اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ	تک پورا کرو۔ بے شک اللہ کو خوش
الْمُتَّقِيْنَ ۞ (التوبۃ: ۴)	آتے ہیں تقویٰ والے۔

اور ان مشرکوں کے ساتھ اس ایفائے عہد کو اللہ تعالےٰ تقوٰی بتاتا ہے۔ اور جو اس عہد کو پورا کریں اُن کو متقی فرمایا اور ان سے اپنی محبت اور خوشی کا اظہار فرمایا۔ آگے بڑھ کر اُن مشرکوں سے اپنی برأت کا اعلان کرتے وقت جنہوں نے اس مُعاہدہ کو توڑا تھا اللہ تعالےٰ مسلمانوں کو پھر تاکید فرماتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ جوش میں ان عہد شکن مشرکوں کے ساتھ اُن مشرکوں کے ساتھ بھی خلاف ورزی کی جائے جنہوں نے اس معاہدہ کو قائم رکھا ہے:

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ	مشرکوں کو کیسے اللہ کے پاس اور اس
عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا	کے رسُول کے پاس کوئی عہد ہو مگر وہ
الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ	جن سے تم نے مسجد حرام کے نزدیک
الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ	مُعاہدہ کیا، جب تک وُہ تم سے سیدھے
فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ	رہیں تم اُن سے سیدھے رہو۔ بیشک اللہ
الْمُتَّقِيْنَ ○	کو تقوٰی والے خوش آتے ہیں۔

(التوبة : ۷)

"سیدھے رہنے" کا مطلب یہ ہے کہ جب تک وُہ اپنے عہد پر قائم رہیں تم بھی اس عہد کو پُورا کرتے رہو۔ اور جو لوگ اپنے عہد کو اس احتیاط سے پُورا کریں اُن کا شمار تقوٰی والوں میں ہے جو قرآن پاک کے محاورہ میں تعریف کا نہایت اہم لفظ ہے۔ اور تقوٰی والے اللہ تعالےٰ کی محبت اور رضامندی کی دولت سے سرفراز ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مُعاہدہ کا ایفاء اللہ تعالےٰ کی خوشی اور پیار کا موجب ہے۔ اور یہ وُہ آخری انعام ہے جو کسی نیک کام پر بارگاہِ الٰہی سے کسی کو مل سکتا ہے۔

قرآن مجید میں قریب قریب اسی عہد کے معنی میں ایک اور لفظ عقد کا استعمال کیا گیا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا	مُسلمانو! (اپنے) قراروں کو

بِالْعُقُوْدِ ط (المآئدۃ: ۱) پُورا کرو۔

عقد کے لفظی معنی گرہ اور گرہ لگانے کے ہیں۔ اور اس سے مقصود لین دین اور معاملات کی باہمی پابندیوں کی گرہ ہے۔ اور اصطلاحِ شرعی میں یہ لفظ معاملات کی ہر قسم کو شامل ہے۔ چنانچہ امام رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں:

"اوفوا بالعہد" خداتعالیٰ کے اس قول کے مشابہ ہے "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ" اور اس قول میں تمام عقد مثلاً عقدِ بیع، عقدِ شرکت، عقدِ یمین، عقدِ نذر، عقدِ صلح اور عقدِ نکاح داخل ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اس آیت کا اقتضاء یہ ہے کہ دو انسانوں کے درمیان جو عقد اور جو عہد قرار پا جائے اس کے مطابق دونوں پر اس کا پورا کرنا واجب ہے[1]۔

لیکن عقد کا لفظ جیسا کہ کہا گیا، صرف معاملات سے تعلق رکھتا ہے۔ اور عہد کا لفظ اس سے بہت زیادہ عام ہے۔ یہاں تک کہ تعلقات کو اس ہمواری کے ساتھ قائم رکھنا بھی جس کی توقع ایک دُوسرے سے ایک دو دفعہ ملنے جلنے سے ہو جاتی ہے حُسنِ عہد میں داخل ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضؓ سے مروی ہے کہ "مجھ کو حضرت خدیجہ رضؓ سے زیادہ کسی عورت پر رشک نہیں آیا۔ میرے نکاح سے تین سال پیشتر ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ لیکن رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ان کا ذکر کیا کرتے تھے اور بکری ذبح کرتے تھے تو اس کا گوشت اُن کی سہیلیوں کے پاس ہدیّۃً بھیجا کرتے تھے[2]"۔ یعنی حضرت خدیجہ رضؓ کی وفات کے بعد بھی اُن کی سہیلیوں کے ساتھ وہی سلوک قائم رکھا جو اُن کی زندگی میں جاری تھا۔

امام بخاری نے کتاب الادب میں ایک باب باندھا ہے جس کی سُرخی یہ ہے حُسن العہد من الایمان اور اس باب کے تحت میں اسی حدیث کا ذکر کیا ہے۔

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں حاکم اور بیہقی کے حوالہ سے یہ روایت کی ہے کہ ایک بڑھیا

---

[1] تفسیر کبیر جلد ۵ صفحہ ۵۸۵۔ [2] بخاری کتاب الادب باب حسن العہد من الایمان۔

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ آپ نے اس سے کہا کہ تم کیسی رہیں؟ تمہارا کیا حال ہے؟ ہمارے بعد تمہارا کیا حال رہا؟ اس نے کہا کہ اچھا حال رہا۔ جب وُہ چلی گئی تو حضرت عائشہ رضؓ نے کہا کہ آپ نے اس بڑھیا کی طرف اس قدر توجہ فرمائی؟ فرمایا "عائشہ یہ خدیجہ کے زمانہ میں ہمارے ہاں آیا کرتی تھی اور حُسن عہد ایمان سے ہے"۔ یعنی اپنے ملنے جلنے والوں سے حسبِ توقع یکساں سلوک قائم رکھنا ایمان کی نشانی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک مشہور حدیث میں فرمایا ہے اور حضرت انس رضؓ کہتے ہیں کہ آپ ہر خطبہ میں اس کو ضرور فرمایا کرتے تھے:

لَادِینَ لِمَن لَاعَھدَ لَہٗ[1] جس میں عہد نہیں، اس میں دین نہیں،

یعنی اُس قول و قرار کو جو بندہ خدا سے کرتا ہے یا بندہ بندہ سے کرتا ہے پورا کرنا حق اللہ اور حق العباد کو ادا کرنا ہے جس کے مجموعہ کا نام دین ہے۔ اب جو اس عہد کو پورا نہیں کرتا وُہ دین کی رُوح سے محروم ہے۔

---

[1] احمد طبرانی وابن حبان۔

احسان

یعنی

بھلائی کرنا

بھلائی کرنا ایک ایسی صفت ہے جو ہر نیکی کے کام کو محیط ہے اور اس لیے اس کی صورتیں اتنی بے شمار ہیں کہ اُن کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ ان تمام صورتوں کی ایک عام شکل یہ نکلتی ہے کہ دُوسرے کے ساتھ ایسا نیک سُلوک کرنا جس سے اس کا دِل خوش ہو اور اُس کو آرام پہنچے۔

اللہ تعالےٰ سے بڑھ کر محسن کون ہو گا جس کے احسانات کی حدو پایاں نہیں۔ عرش سے فرش تک جو کچھ ہے وُہ اسی کے احسانوں کی جلوہ نمائی ہے :

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ۝	اور اگر اللہ کے احسان گنو تو ان کو پورا نہ گن سکو گے۔ بیشک انسان بے انصاف ناشکرا ہے۔

(ابراھیم : ۳۴)

حضرت یُوسف علیہ السّلام خدائے تعالےٰ کے اس احسان کا شکر کہ اس نے کسی سعی و سفارش کے بغیر اُن کو قید خانہ سے نجات دی اور وُہ اُن کے ماں باپ اور بھائیوں کو مصر لے آیا، ان لفظوں میں ادا کرتے ہیں :

وَقَدْ اَحْسَنَ بِیْٓ اِذْ اَخْرَجَنِیْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِکُمْ مِّنَ الْبَدْوِ (یوسف : ۱۰۰)	اور خدا نے مجھ پر احسان کیا کہ مجھے قید خانہ سے باہر لایا اور آپ لوگوں کو گاؤں سے یہاں لے آیا۔

اسی طرح قارون کے قصّہ میں اللہ تعالےٰ کے صفت مُحسن سے متصّف ہونے کا ارشاد موجود ہے۔ فرمایا :

اَحْسِنْ کَمَآ اَحْسَنَ اللّٰہُ اِلَیْکَ (القصص : ۷۷)	تو احسان کر جس طرح خدا نے تجھ پر احسان کیا۔

لہ اس موقع پر ایک بات خیال میں رہے۔ عربی میں احسان کے معنی اچھا کام کرنے اور کسی کام کو اچھے طریقہ سے کرنے کے ہیں۔ اُردو میں جن معنوں میں ہم احسان کا لفظ بولتے ہیں عربی میں جب خاص وُہ معنی مراد ہوں گے تو عموماً اس کا استعمال مشتقات میں اِلیٰ یا ب کے صلہ کے ساتھ ہوگا۔ قرآن پاک میں جہاں جہاں مُحْسِنٌ یا مُحْسِنِیْنَ یا مُحْسِنُوْنَ کے لفظ بلا صلہ آئے ہیں ان سے حسبِ موقع احسان کرنے، اچھے کام کرنے یا کام کو اچھائی سے کرنے کے معنی لیے جائیں گے۔ اس اچھے کام کرنے یا اچھائی سے کام کرنے کی وسعت میں احسان و کرم بھی داخل ہو سکتا ہے لیکن وُہ اسی پر محدود نہیں ہے جیسے :

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ (التوبۃ : ۱۲۰)	بے شبہ خدا اچھے کام کرنے والوں کی مزدوری برباد نہیں کرتا۔
لَوْ اَنَّ لِیْ کَرَّۃً فَاَکُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ (الزمر : ۵۸)	کاش اگر میرے لیے لوٹ کر جینا ہوتا تو میں اچھا کام کرنے والوں میں سے ہوتا۔
وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ (اٰل عمران : ۱۳۴)	اور اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

اس دنیا میں، جہاں قدم قدم پر ادلا بدلہ اور داد و ستد کا جذبہ ہر راہ رو کو دامنگیر ہے، احسان، حُسنِ سلوک اور اچھے برتاؤ کرنے کی تعلیم اور تنبیہ کتنی ضروری چیز ہے۔ محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اخلاقی تعلیم نے اس ضرورت کو پُورا کیا ہے اور قرآن مجید میں جابجا اس کی اہمیت کی تاکید آئی ہے۔ چنانچہ سُورۂ نحل میں حکم کی صُورت میں ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ	اللہ انصاف اور (لوگوں کے ساتھ) احسان
الْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِى الْقُرْبٰى	کرنے کا اور قرابت والوں کو دینے کا
(النحل: ۹۰)	حکم دیتا ہے۔

انصاف تو کسی کی تکلیف و آرام اور رنج و راحت کی پروا نہیں کرتا۔ وُہ ہر ایک کو اس کا واجبی حق دے دیتا ہے لیکن احسان میں اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اس لیے خداوند تعالےٰ نے عدل کے ساتھ اس کا ذکر کیا۔ پھر احسان کی ایک خاص اور متداول صُورت یعنی قرابت داروں کی مالی امداد کا ذکر کیا۔ لیکن احسان مالی امداد ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ احسان کے اور بھی مختلف طریقے ہیں۔ اور عام لوگوں کے علاوہ باپ، ماں، قرابت دار، یتیم، محتاج، قرابت دار پڑوسی، اجنبی پڑوسی، آس پاس کے بیٹھنے والے، مُسافر اور لونڈی غلام اس کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ اس لیے خدا تعالےٰ نے سورۂ نسار کی ایک آیت[1] میں ان لوگوں کے ساتھ خصوصیت کے ساتھ احسان کرنے کا حکم دیا ہے اور باپ ماں کے ساتھ احسان کرنے کی متعدد آیتوں[2] میں تاکید کی ہے۔

بہرحال یہ احسان تو ہر شخص کے فرائض میں داخل ہے۔ لیکن جس کی مالی وسعت کا دائرہ جتنا بڑا ہے اسی کے مطابق اس پر فرض ہے کہ وُہ اپنے احسان کے دائرہ کو وسیع کرے اور ہر شخص کو اپنے جاہ و مال سے فائدہ پہنچائے۔ یہی وجہ ہے کہ قارون کی قوم نے اس سے یہ اخلاقی مطالبہ کیا:

---

[1] النسار ۳۶۔ [2] البقرہ: ۸۳، الانعام: ۱۵۱، بنی اسرائیل: ۲۳۔۲۶۔

وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ (القصص : ۷۷)

اور جس طرح سے اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی (اوروں کے ساتھ) احسان کر۔

احسان کی ایک اہم صورت یہ ہے کہ کسی کو مصیبت سے نجات دلائی جائے۔ خدا تعالےٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو قید خانہ سے نجات دلائی تھی۔ اس کو وہ اس کا بڑا احسان سمجھتے ہیں:

وَقَدْ اَحْسَنَ بِيْٓ اِذْ اَخْرَجَنِيْ مِنَ السِّجْنِ (یوسف : ۱۰۰)

اور (اس کے سوا) اس نے مجھ پر (اور بھی بڑے بڑے) احسان کیے ہیں کہ (بے کسی کی سفارش کے) مجھ کو قید سے نکالا۔

غرض مالی امداد دینا یا کسی کو مصیبت سے نجات دلانا احسان کی اہم صورتیں ہیں۔ اُن کے علاوہ اور بھی سینکڑوں شریفانہ اور فیاضانہ افعال ہیں جن کو خدا نے احسان کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ مثلاً عورتوں کو قانونی حیلے نکال نکال کر دق کرنا برا کام تھا جس سے روکا گیا اور فرمایا گیا کہ اگر کسی عورت کو اپنی زوجیت میں رکھنا پسند نہ ہو تو خوبی کے ساتھ اس کو الگ کر دو۔ فرمایا:

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ (البقرۃ : ۲۲۹)

طلاق (جس کے بعد رجوع بھی ہو سکتا ہے) تو دو ہی طلاقیں ہیں جو ا دو دفعہ (کر کے دی جائیں) پھر (دو طلاقوں کے بعد یا تو) دستور کے مطابق (زوجیت میں) رکھنا ہے یا حُسن سلوک کے ساتھ رخصت کر دینا۔

اسی طرح اگر تم پر کسی کا کچھ واجب ہو تو اس کو بھی خوبی کے ساتھ ادا کر دو اور اس کی ادائگی میں لیت ولعل اور حجت حوالہ نہ کیا کرو۔ فرمایا:

فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَیْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ (البقرۃ: ۱۷۸)

پھر جس (قاتل) کو اس کے بھائی (طالب قصاص) سے کوئی جز (قصاص) معاف کر دیا جائے تو (جان کے بدلے خون بہا اور وارثِ مقتول کی طرف سے اس کا) مطالبہ دستور (شرع) کے مطابق اور (قاتل کی طرف سے) وارثِ مقتول کو خوش معاملگی کے ساتھ (خونبہا) کا ادا کر دینا۔

قصور واروں کے قصور کو معاف کرنا اور اُن کے مقابلہ میں غصہ کو پی جانا بھی احسان ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اس احسان کو یہ درجہ دیا ہے کہ جو اس صفت سے متصف ہوں وُہ بھی خدا کے محبوب بندوں میں ہوں گے:

وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۝ (اٰلِ عمران: ۱۳۴)

اور اللہ ان محسنوں (یا نیکی کرنے والوں) کو پیار کرتا ہے۔

احسان کے لیے قرآن کا ایک اور لفظ فضل ہے۔ اگر کوئی منکوحہ سے خلوت کیے بغیر اس کو طلاق دے دے تو شوہر پر نصف مہر[1] واجب ہوتا ہے۔ یہ تو قانون ہوا۔ مگر اخلاقی حکم یہ ہے کہ یا تو عورت اس نصف کو بھی معاف کر دے اور کچھ نہ لے تو یہ عورت کا حُسنِ خُلق ہے

---

[1] یعنی جس حالت میں کہ مہر مقرر ہو چکا ہو ورنہ صرف چند کپڑے لازم آتے ہیں۔

اور یا شوہر پورا ادا کردے اور آدھا کاٹے نہیں تو یہ مرد کا حسن خُلق ہے ۔ اس کے بعد ارشاد ہے :

وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ط — اور آپس میں فضل کو مت بھولو ۔[1]

اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ○ — بیشک اللہ تمہارے کاموں کو دیکھ رہا ہے ۔

(البقرۃ : ۲۳۷)

کسی غریب یا کسی عزیز و قریب سے کوئی ایسی حرکت ہو جائے جس سے ناراضی پیدا ہو جائے تو بھی احسان والوں کا فرض یہی ہے کہ وہ معاف کریں اور اپنے احسان سے باز نہ آئیں[2] ۔ فرمایا :

وَلَا يَأْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ — اور تم میں جو احسان اور کشائش والے
مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا — ہیں وہ قرابت داروں ، غریبوں اور
اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَ — خدا کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو
الْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ — نہ دینے کی قسم نہ کھالیں ۔ ان کو چاہیے
وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ط — کہ معاف کریں اور درگزریں ۔

(النور : ۲۲)

احسان کے اسی وسیع معنی میں اسلام نے ایک اور جامع لفظ " معروف " کا استعمال کیا ہے یعنی ہر وہ چیز جس کی خوبی عقلاً و شرعاً معلوم ہو معروف میں داخل ہے ۔ قرآن کا حکم ہے وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ[3] (اور نیکی کرنے کو کہہ) اور اس کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

---

[1] سعید سے روایت ہے " آپس میں فضل کو مت بھولو " یعنی احسان کو مت بھولو ۔ ابن جریر طبری ج ۲ ص ۳۲۱ مصر ۔

[2] کشاف زمخشری تفسیر آیت مذکورہ ۔ بعضوں نے یہاں " فضل " سے فضیلت دینی اور کسی نے فضل مالی مراد لیا ہے ۔

[3] الاعراف : ۱۹۹ ۔

كلّ معروف صدقة — ہر نیکی ثواب کا کام ہے۔

اور یہ ایک ایسا صدقہ ہے جس کے لیے غریب و امیر کی تخصیص نہیں بلکہ ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اسی لیے آپ نے فرمایا کہ" ہر مسلمان پر صدقہ فرض ہے" صحابہ نے عرض کیا کہ" اگر اس کے پاس مال نہ ہو تو کیا کرے" فرمایا" کمائے اور خود فائدہ اٹھائے اور صدقہ کرے" صحابہ نے عرض کیا کہ" اگر اس کو کمانے کی قدرت نہ ہو یا وہ نہ کمائے" فرمایا" غریب حاجتمند کی اعانت کرے" صحابہ نے کہا کہ اگر وُہ ایسا نہ کرے تو؟ فرمایا" نیکی کے کرنے کا حکم دے" صحابہ نے کہا کہ" اگر وُہ ایسا نہ کر سکے" ارشاد ہوا کہ" بُرائی سے باز رہے کیونکہ یہ اس کے لیے صدقہ ہے" اسی معنی کے لحاظ سے حدیث میں آیا ہے کہ" آدمی اپنے اہل وعیال پر جو کچھ صرف کرتا ہے وُہ صدقہ ہے۔ کسی سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملنا بھی اسی میں داخل ہے"[1]

اسی معنی میں قرآن مجید نے ایک اور لفظ" بِرّ" کا استعمال کیا ہے اور اس وسیع دائرے میں کافر ومسلم سب کو شامل کر لیا ہے:

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَ لَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ (الممتحنة: ۸)	جو لوگ تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑے اور انہوں نے تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ان کے ساتھ احسان کرنے اور منصفانہ برتاؤ کرنے سے تو خدا تم کو منع کرتا نہیں (کیونکہ) اللہ منصفانہ برتاؤ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب کل معروف صدقۃ مع فتح الباری۔

صحابہ میں کچھ ایسے لوگ تھے جو نامسلموں پر صدقہ کرنا ثواب کا کام نہیں سمجھتے تھے۔ اس پر یہ حکم آیا کہ ہدایت بخشنا تمہارا نہیں میرا کام ہے۔ تم کو بلا امتیاز ہر ایک مسلم اور غیر مسلم کے ساتھ نیکی کرنی اور اپنی نیت ٹھیک رکھنی چاہیے۔ تم کو اپنی نیت کا ثواب ملے گا۔[1] ارشاد ہوا:

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِىْ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ۗ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ۗ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝ (البقرۃ: ۲۷۲)	تیرا ذمہ نہیں ان کو راہ پر لے آنا لیکن اللہ راہ پر لے آتا ہے جس کو چاہے۔ اور تم جو دو گے خیرات سو اپنے واسطے اور تم نہیں دیا کرتے لیکن اللہ کی خوشی چاہ کر۔ اور جو دو گے خیرات وُہ تم کو پُوری مل جائے گی اور تمہارا حق مارا نہ جائے گا۔

گویا یہ احسان کی ایک خاص صُورت ہے مگر اس کی وسعت میں ساری دنیا سمائی ہے۔

نیکی کا بدلہ نیکی سے دینا اسلام کا وُہ اصول ہے جس پر ثواب و عذاب کا دارو مدار ہے۔ جو نیک کام کریں گے ان کو خدا کے ہاں سے نیک ہی جزا ملے گی۔ ارشاد ہوا:

هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ۝ (الرحمٰن: ۶۰)	بھلائی کا بدلہ کیا ہے، مگر بھلائی۔

گویہ آیتِ پاک اپنے سیاق کے لحاظ سے آخرت میں نیک کاموں کے نیک بدلہ ملنے سے متعلق ہے مگر لفظوں کے لحاظ سے اس اصُول کی وسعت دُنیا اور آخرت دونوں کو شامل ہے۔

دُنیا کی سب سے بڑی ضرورت قرض کے بوجھ کو ہلکا کرنا ہے۔ دُنیا میں اسلام ہی ایک ایسا

---

[1] ابن جریر و ابن کثیر بحوالہ نسائی تفسیر آیت مذکورہ۔

مذہب ہے جس نے اس بوجھ کو ہلکا کیا ہے۔ قرضداروں پر احسان کرنا، ضرورت مندوں کو قرض دینا، تنگ دست مقروضوں کو مہلت دینا، جو قرض ادا کرنے سے بالکل مجبور ہوں اُن کا قرض معاف کر دینا ثواب کا کام بتایا ہے۔

عرب میں سود خواری نے لوگوں کو اس قدر بے رحم اور سنگ دل بنا دیا تھا کہ جو لوگ قرض نہیں ادا کر سکتے تھے وُہ غلاموں کی طرح فروخت کر دیئے جاتے تھے۔ اور جو قیمت ملتی تھی اس سے ان کا قرض ادا کیا جاتا تھا۔ آج اس تمدن کے زمانہ میں قرض کی زنجیر مقروضوں کے لیے اتنی ہی بھاری ہے۔ بلکہ سرمایہ داری کے موجودہ نظام نے اِس کو اور زیادہ بھاری بنا دیا ہے۔ قرآن پاک کی ایک ہی آیت اس سارے نظام کو تہ و بالا کرتی ہے:

وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ (البقرۃ: ۲۸۰)	اور اگر (کوئی) تنگ دست (تمہارا مقروض) ہو تو فراخی تک کی مہلت (دو) اور اگر سمجھو تو تمہارے حق میں یہ زیادہ بہتر ہے کہ اس کو (اصل قرضہ بھی) بخش دو۔

اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایک حدیث میں خود خداوند تعالیٰ کی زبان سے یہ بیان فرما کر کہ "قیامت کے دن میں خود تین آدمیوں کا فریق ہوں گا جن میں ایک وُہ شخص ہے جس نے آزاد شخص کو فروخت کیا اور اس کی قیمت کھائی"[1] اس کو اور بھی مؤکد کر دیا۔ اور قرض کے معاملہ میں تنگ دستوں پر احسان کرنے کی متعدد صورتیں بتائیں یعنی مہلت دینا، قرض کا معاف کرنا اور انسانیت کے ساتھ تقاضا کرنا۔ اور اس کو ایک ایسا ثواب کا کام بتایا کہ اگر ایک شخص اس کے سوا نیکی کا اور کوئی کام نہ کرے تب بھی صرف یہی ایک کام اس کی مغفرت کا ذریعہ ہو سکتا

---

[1] بخاری کتاب البیوع باب اثم من باع حرا مع فتح الباری۔

ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ ایک شخص جو نیکی کا کام نہیں کرتا تھا لوگوں کو قرض دیتا تھا اور جب اس کو کوئی مقروض تنگ دست نظر آتا تھا تو اپنے ملازموں سے کہتا تھا کہ اس سے درگذر کرو شاید خدا ہم سے بھی درگذر کرے۔ چنانچہ خدا نے اس کے صلہ میں اس سے درگذر کیا۔ دوسری حدیث میں ہے کہ تم سے پہلے ایک شخص تھا جس سے موت کے بعد فرشتوں نے سوال کیا کہ تم نے نیکی کا کوئی کام کیا ہے؟ اس نے کہا "کوئی نہیں"۔ فرشتوں نے کہا "ذرا یاد کرو"۔ اس نے کہا کہ میں لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا۔ اگر مقروض فراخ دست ہوتا تھا تو قرض کے لینے میں میں آسانی کرتا تھا اور اگر تنگ دست ہوتا تھا تو اس کو مہلت دیتا تھا یا یہ کہ فراخ دست مقروض کو مہلت دیتا تھا اور تنگ دست کا قرض چھوڑ دیتا تھا[۱]۔

اس قسم کی بہت سی روایتیں ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ جس شخص کو یہ پسند ہو کہ خدا قیامت کی تکلیف سے اس کو نجات دے وُہ تنگ دست کو مہلت دے یا اس کا قرض معاف کر دے[۲]۔ یہی روایت مسند ابن حنبل میں ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے کہ جو شخص اپنے قرضدار کو مہلت دے گا یا اس کا قرض معاف کر دے گا تو قیامت کے دن خدا کے عرش کے سایہ میں ہو گا[۳]۔

غرض یہ ہے کہ اسلام نے دُوسروں کے ساتھ بھلائی اور احسان کرنے کو کسی خاص معنی میں محدود نہیں کیا ہے بلکہ اس کو نیکی کی ہر راہ میں وسیع کر دیا ہے۔ زندگی تو زندگی موت میں بھی اس نے اس اصول کے دائرہ کو تنگ نہیں کیا ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "اللہ تعالےٰ نے ہر شے پر احسان کرنا فرض کیا ہے۔ تو اگر تمہیں کسی کو (کسی شرعی حکم کے سبب سے)

---

[۱] بخاری کتاب البیوع باب من انظر معسرا و باب من انظر موسرا و صحیح مسلم باب فضل انظار المعسر [۲] مسلم کتاب البیوع باب فضل انظار المعسر [۳] مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۳۰۸۔

جب ان سے مارنا بھی پڑے تو اس کو بھی اچھائی کے ساتھ کرو۔ کسی جانور کو ذبح کرنا چاہو تو بھی خوبی کے ساتھ کرو، چھُرے کو خوب تیز کر لیا کرو اور اپنے ذبیحہ کو راحت دو۔[1]

پھر یہ اصول کہ جو میرے ساتھ احسان کرے اسی کے ساتھ احسان کرنا چاہیے محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی اخلاقی تعلیم کے خلاف ہے۔ ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے آکر پوچھا کہ "یا رسُول اللہ! میں کسی شخص کے پاس سے گزرتا ہوں تو وُہ میری مہمانی نہیں کرتا تو کیا جب اس کا گزر مجھ پر ہو تو میں بھی اس کی کج خلقی کا بدلہ یہی دوں"؟ فرمایا "نہیں تم اس کی مہمانی کرو"۔[2]

ایک موقع پر ارشاد ہوا "ایسے نہ بنو کہ خود تمہاری گرہ کی عقل نہ ہو صرف دُوسروں کی دیکھا دیکھی کام کرو۔ کہتے ہو کہ اگر لوگ احسان کریں گے تو ہم بھی احسان کریں گے اور اگر وہ ظلم کریں تو ہم بھی کریں گے۔ بلکہ اپنے آپ کو مطمئن کر لو کہ اگر دُوسرے احسان کریں تو تم احسان کرو ہی گے اور اگر وُہ بُرائی بھی کریں تو تم ظلم نہ کرو"۔[3]

لوگ احسان کو غلطی سے دولت و تموّل یا اور دُوسری بڑی بڑی باتوں کے ساتھ خاص کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ غریب کیا احسان کا کام کر سکتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ احسان اور نیکی کا کام کرنے کے لیے دولت کی نہیں دِل کی ضرورت ہے اور اس کی وسعت بہت دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ حضرت براء بن عازبؓ صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک بدوی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمتِ مبارک میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ "یا رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم مجھے کوئی ایسی بات بتایئے جس کے کرنے سے بہشت نصیب ہو"۔ ارشاد ہوا "تمہاری تقریر گو مختصر ہے لیکن تمہارا سوال بہت بڑا ہے۔ تم جانوں کو آزاد کرو اور گردنوں

---

[1] صحیح مسلم کتاب الصید والذبائح۔ [2] جامع ترمذی باب ما جاء فی الاحسان والعفو۔ [3] جامع ترمذی باب ماجاء فی الاحسان والعفو۔

کو چھڑاؤ۔" اس نے کہا "یا رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا یہ دونوں باتیں ایک ہی نہیں"؟ فرمایا "نہیں اکیلے اگر کسی کو آزاد کرتے ہو تو یہ جان کا آزاد کرنا ہے اور دُوسرے کے ساتھ شریک ہو کر کسی کی آزادی کی قیمت میں مالی مدد دینا گردن چھڑانا ہے۔ اور لگاتار دیتے رہو اور ظالم رشتہ دار کے ساتھ نیکی کرو۔ اگر تم یہ بھی نہ کر سکو تو بھوکے کو کھلاؤ اور پیاسے کو پلاؤ۔ اور نیکی کے کام کرنے کو کہو اور بُرائی کے کام سے باز رکھو۔ اور اگر یہ بھی نہ کر سکو تو اپنے آپ کو بھلائی کے سوا اور باتوں سے روکو۔"[1]

ایک دفعہ حضرت ابو ذرؓ نے پوچھا کہ "یا رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایمان کے ساتھ کوئی عمل بتائیے"؟ فرمایا "جو روزی خدا نے دی اس میں سے دُوسروں کو دے۔" عرض کی "اے خدا کے رسُولؐ اگر وُہ خود مفلس ہو۔" فرمایا "اپنی زبان سے نیک کام کرے۔" عرض کی "اگر اس کی زبان معذور ہو۔" فرمایا "مغلوب کی مدد کرے۔" عرض کی "اگر وُہ ضعیف ہو مدد کی قوّت نہ ہو" فرمایا "جس کو کوئی کام کرنا نہ آتا ہو اس کا کام کر دے۔" عرض کی "اگر وُہ خود ایسا ہی ناکارہ ہو" فرمایا "اپنی ایذا رسانی سے لوگوں کو بچائے رکھے۔"[2]

---

[1] مستدرک حاکم ج ۲ کتاب المکاتب۔ [2] مستدرک حاکم کتاب الایمان ج ۱ صفحہ ۶۳۔

عفو و درگذر

عفو و درگذر اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی صفت ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو دنیا ایک لمحہ کے لیے بھی آباد نہ رہے اور دم کے دم میں یہ گناہوں سے بھری ہوئی کائنات کی بستی سُونی پڑ جائے۔ اللہ تعالیٰ کے خاص ناموں میں سے عَفُوٌّ (درگذر کرنے والا) غَافِرٌ، غَفُوْرٌ اور غَفَّارٌ (معاف کرنے والا) ہیں۔ اس کی شان یہ ہے:

وَهُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَیَعْفُوْا عَنِ السَّیِّاٰتِ (الشوریٰ: ۲۵)

اور وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور برائیوں کو معاف کرتا ہے۔

وہ چاہے تو انسانوں کے گناہوں کے سبب سے ان کو ایک دم ہلاک کر دے یا اُن کو معاف کر دے۔ فرمایا:

اَوْ یُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا وَیَعْفُ عَنْ كَثِیْرٍ ○ (الشوریٰ: ۳۴)

(اگر خدا چاہے تو گنہگاروں کو اُن کے کرتوت کے سبب تباہ کر دے اور بہتوں کو معاف کر دے۔

وہ اپنے شرمندہ بندوں کو اپنی غفاری کی شان کا یقین تاکید پر تاکید کر کے یوں دلاتا ہے:

وَ اِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ○ (طٰهٰ : ۸۲)

اور اس میں شبہ نہیں کہ میں البتہ اس کی بڑی بخشایش کرتا ہوں جو توبہ کرے اور یقین لائے اور نیک کام کرے، پھر راہ پر رہے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے دو جگہ اپنے کو غافرٌ (بخشنے والا) پانچ دفعہ غفّارٌ (بڑی بخشایش کرنے والا) اور اتنے ہی دفعہ عفُوٌّ (معاف کرنے والا) اور ستر سے زیادہ آیتوں میں غفُورٌ (بخشنے والا) کہا ہے۔ جس سے اندازہ ہوگا کہ اس کے عفو و درگذر کا سمندر کس زور و شور سے جوش مار رہا ہے۔ خدا نے اپنی ساری صفتوں میں سے اپنی اسی صفت کی تجلّی کا پرتو اپنے بندوں میں پیدا کرنے کی بے پردہ دعوت دی ہے۔ فرماتا ہے:

اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ○ (النسآء : ۱۴۹)

یا کسی برائی کو معاف کرو تو بیشک ہے اللہ معاف کرنے والا قدرت والا۔

انسان اگر اپنے کسی قصوردار کو معاف کرتا ہے تو اُس کی قدرت بہر حال کامل نہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ جس کی قدرت کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں وُہ معاف فرماتا ہے تو لاچار انسان کو اپنے قصورواروں کو معاف کرنا کتنا زیبا اور سزاوار ہے۔ تو جس طرح قدرت والا ہمارے قصوروں کو معاف فرماتا ہے اسی طرح ہم کو چاہیے کہ ہم بھی اپنے قصورواروں کو معاف کریں۔[1]

اس آیت سے یہ اشارہ بھی نکل سکتا ہے کہ اگر ہم اپنے قصورواروں کو معاف کریں گے

---

[1] تفسیر ابن جریر طبری و بحر محیط ابن حیان۔

تو اللہ تعالےٰ ہمارے قصوروں کو بھی معاف کرے گا۔ ایک دوسری آیت میں اس اشارہ کی پوری تصریح ہے۔ فرمایا:

وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ○ (النور: ۲۲)	اور چاہیے کہ وُہ معاف کردیں اور درگذر کریں۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ خدا تم کو معاف کرے اور اللہ معاف کرنے والا مہر والا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے لوگوں کو عفو و درگذر کی تعلیم اس ترغیب کے ساتھ دی ہے کہ تم دوسروں کو معاف کرو تو خدا تمہیں معاف کرے گا۔ اور جب اللہ غفور و رحیم ہے تو تم پر بھی اس کے اس ابرِ کرم کے کچھ چھینٹے پڑنے چاہئیں۔ چنانچہ جن مومنوں کے لیے خدا نے جزائے خیر کا وعدہ فرمایا ہے اُن کی ایک صفت یہ بتائی ہے:

وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ ○ (الشوریٰ: ۳۷)	اور جب غصہ آئے تو وُہ معاف کرتے ہیں۔

سکون کی حالت میں معاف کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا غصہ کی حالت میں جب انسان کو اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا۔ لیکن اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایمانِ کامل کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ جن میں یہ جوہر ہوتا ہے وُہ اس حالت میں بھی اپنے آپ کو قابو میں رکھتے ہیں اور قصور والوں کو معاف کردیتے ہیں۔

یہ تو کسی ذاتی غیظ و غضب کی حالت ہوئی لیکن اس سے بڑھ کر وُہ موقع ہے جہاں مذہبی اختلاف درمیان میں ہے کہ ان احمقوں کو اچھی بات بتائی جاتی ہے اور وُہ نہیں مانتے۔ ان کے دعویٰ کی کمزوری ثابت کی جاتی ہے مگر وُہ اپنی بات پر اڑے ہیں اور حق کا جواب لایعنی

گفتگو سے اور برا بھلا کہہ دیتے ہیں۔ ایسے موقع پر ارشاد ہوتا ہے:

وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَسْمَعُوْا ۚ وَتَرٰهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ ○ خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ○ (الاعراف: ۱۹۸-۱۹۹)	اور اگر تم ان کو راہِ راست کی طرف بلاؤ تو (تمہاری ایک) نہ سنیں اور (اے پیغمبر) وہ تم کو ایسے دکھائی دیتے ہیں کہ (گویا) وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں حالانکہ وہ دیکھتے نہیں۔ (اے پیغمبر) درگذر کا شیوہ) اختیار کرو اور (لوگوں سے) نیک کام (کرنے) کو کہو اور جاہلوں سے کنارہ کش رہو۔

کیوں کہ ایسے موقع پر دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو تبلیغ و دعوت کا کام بند کر دیا جائے یا تبلیغ و دعوت کے سلسلہ میں ان ناگواریوں کو برداشت کیا جائے۔ خدا نے اسی دوسری صورت کے اختیار کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ ان ناگواریوں کو برداشت کرو اور نیکی کا حکم دیتے رہو۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس سلسلہ میں برائی کا جواب بھلائی کے ساتھ دو:

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۭ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ○ (المؤمنون: ۹۶)	(اگر کوئی تمہارے ساتھ بدی کرے تو) بدی کا دفعیہ ایسے برتاؤ سے کرو جو بہت ہی اچھا ہو۔ جو کچھ وہ تمہاری نسبت کہا کرتے ہیں وہ ہم کو خوب معلوم ہے۔

مذہبی جماعت کے لیے اس سے بھی زیادہ اشتعال انگیز موقع وہ ہوتا ہے جب کچھ لوگ

ان لوگوں کو بھی اُن سے الگ کرنا چاہتے ہیں جو ان کی جماعت میں شامل ہو چکے ہیں۔ لیکن خدا نے اس موقع پر بھی مسلمانوں کو عفو و درگذر کا حکم دیا ہے:

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَٰبِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّنۢ بَعْدِ إِيمَٰنِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّنۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۖ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِۦٓ

(مسلمانو!) اکثر اہل کتاب باوجودیکہ اُن پر حق ظاہر ہو چکا ہے (پھر بھی) اپنے دلی حسد کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان لائے پیچھے پھر تم کو کافر بنا دیں۔ تو معاف کرو، اور درگذر کرو، یہاں تک کہ خدا اپنا حکم صادر فرمائے۔

(البقرۃ:۱۰۹)

اسی طرح مشرک بھی جو قیامت پر یقین نہیں رکھتے تھے اگر غصہ دلانے والی کوئی بات کریں تو ان نادانوں کو معاف کر دینا چاہیے کیونکہ وہ اگر نہیں تو تم تو قیامت کی جزا و سزا کے قائل ہو۔ اس لیے سمجھنا چاہیے کہ اگر وہ تمہارے ساتھ بُرائی کرتے ہیں تو آج نہیں تو کل اس کا بدلہ اُن کو مل جائے گا۔ فرمایا:

قُل لِّلَّذِينَ ءَامَنُوا يَغْفِرُوا لِلَّذِينَ لَا يَرْجُونَ أَيَّامَ اللَّهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًۢا بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ۝ مَنْ عَمِلَ صَٰلِحًا فَلِنَفْسِهِۦ ۖ وَمَنْ أَسَآءَ فَعَلَيْهَا

ایمان والوں سے کہہ دے کہ اُن کو جو اللہ کے جزا و سزا کے واقعات پر یقین نہیں رکھتے معاف کر دیا کریں تاکہ لوگوں کو اُن کے کاموں کا بدلہ ملے۔ جس نے اچھا کیا اس نے اپنے بھلے

ثُمَّ اِلٰی رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ○ کے لیے کیا اور جس نے برا کیا اس نے اپنا برا کیا۔ پھر تم اپنے پروردگار کے پاس لوٹائے جاؤ گے۔

(الجاثیۃ : ۱۴-۱۵)

اس آیت کے شانِ نزول میں لکھا ہے[1] کہ کسی منافق یا کافر نے کسی مسلمان سے کوئی بدتمیزی کی بات کہی تھی۔ اس پر بعض مسلمانوں کو طیش آیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اُتاری اور مسلمانوں کو عفوو درگذر[2] کی نصیحت فرمائی۔

---

[1] تفسیر کبیر امام رازی زیرِ آیت بالا۔

[2] اس قسم کی آیتوں کے متعلق جن میں کفار سے عفوو درگزر کی نصیحت ہے عام مفسروں کا نظریہ یہ ہے کہ وُہ جہاد سے پہلے کی بات ہے۔ جہاد نے کفار کے حق میں عفوو درگذر کے ہر حکم کو منسوخ کر دیا ہے لیکن مفسروں میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو جہاد کے حکم اور عفوو درگذر کی نصیحت کے درمیان کوئی منافات نہیں سمجھتے اور اس لیے ایک سے دوسرے کو منسوخ نہیں جانتے۔ امام رازی نے اپنی تفسیر میں کئی موقعوں پر اس کی تصریح کی ہے۔ لکھتے ہیں:

"اس آیت وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِیْنَ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ جاہلوں کی بداخلاقی پر صبر کریں اور اُن کی بیہودہ باتوں اور کمینہ حرکتوں کا جواب اسی قسم کی باتوں اور حرکتوں سے نہ دیا جائے۔ اور اس میں قتال سے باز رہنے کی کوئی ہدایت نہیں کیونکہ جاہلوں سے اعراض برتنے اور مشرکوں سے قتال میں کوئی تضاد نہیں۔ اور جب دونوں باتیں ایک ساتھ ہو سکتی ہیں تو نسخ ماننے کی ضرورت نہیں۔ مگر ظاہر پرست مفسرین بے ضرورت ناسخ و منسوخ آیتوں کی تعداد بڑھانے کے عاشق ہیں۔" (جلد ۴، صفحہ ۴۹۶)۔

ایک اور آیت اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

"کہا گیا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ منسوخ نہیں کیونکہ نرمی برتنے پر ہر حال میں آمادہ کیا گیا ہے جب تک اس سے دین اور اخلاق میں کوئی نقصان نہ پیدا ہو۔" (ج ۶ ص ۳۰۳)۔

آیت وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"کلبی اور ابوالعالیہ نے کہا ہے کہ اس آیت کو قتال کے حکم نے منسوخ کر دیا۔ لیکن اس نسخ کے ماننے کی ضرورت نہیں۔

حضرت مسطحؓ حضرت ابوبکرؓ کے رشتہ دار تھے اور وہ ان کی کفالت کرتے تھے۔ لیکن جب انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی تہمت میں حصہ لیا تو حضرت ابوبکرؓ نے ان کی مالی امداد بند کر دی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ	اور تم میں سے جو لوگ صاحبِ احسان
وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ	اور کشایش والے ہیں قرابت والوں
وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي	اور محتاجوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت
سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ	کرنے والوں کو (مدد خرچ) نہ دینے

کیونکہ احمقوں سے چشم پوشی کرنا اور ان کا مقابلہ نہ کرنا عقل اور شرع دونوں میں مستحسن ہے۔ اور عزت و آبرو اور پرہیزگاری کی سلامتی کا باعث ہے۔" (ج ۲ صہ ۴۹۷ طبع دار الطباعۃ العامرۃ) مصر۔

آیت يَغْفِرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا (الجاثیہ) کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اکثر مفسروں نے کہا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے کیونکہ کفار پر عفو و کرم کے عموم میں یہ بھی داخل ہو جاتا ہے کہ اُن سے قتال نہ کیا جائے۔ لیکن جب خدا نے اُن سے قتال کا حکم دیا تو عفو و کرم کے حکم کا نسخ ہو گیا۔ لیکن قریب بہ صحت یہ ہے کہ اس آیت کے یہ معنی ہیں کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر کافروں سے جھگڑا نہ کیا جائے اور ان کی تکلیف دہ باتوں اور وحشیانہ حرکتوں سے درگذر کیا جائے۔" (جلد ۷ صفحہ ۴۸۴ طبع مذکور)۔

میرے نزدیک اوپر کی آیت سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو کافروں اور مشرکوں اور دوسرے قصورداروں کے اُن ہی قصوروں کے معاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے جن کے معاف کرنے کا حق بندوں کو ہے۔ اور وہ حقوقِ عباد ہیں یعنی وہ مسلمانوں کا ذاتی قصور کریں تو مسلمان معاف کر دیں۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ اس سے کفر و شرک اور عصیانِ الٰہی کے قصوروں کی معافی لازم آتی ہے جن کے معاف کرنے کا حق بندوں کو سرے سے حاصل نہیں۔ اور قتال و جہاد حقوقِ الٰہی کے مقابلہ میں مشروع ہوا ہے اس لیے جہاد کی آیتیں اس مغفرت اور عفو و درگذر کے اخلاقی احکام میں خلل انداز نہیں۔

درِ منثور میں ابن عساکر سے حضرت ابو مسلم خولانی صحابیؓ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے اپنی ایک کافرہ لونڈی کا قصور یہی آیت پڑھ کر معاف کیا تھا۔ اس سے میرے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ (ج ۶ صہ ۳۵ مصر)۔

اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ یَّغْفِرَ اللّٰہُ لَکُمْ ؕ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○ (النور: ۲۲)

کی قسم نہ کھا بیٹھیں۔ بلکہ (چاہیے کہ ان کے قصور بخش دیں اور درگذر کریں۔ (مسلمانو!) کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہارے قصور معاف کر دے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

اس آیت کے آخری ٹکڑہ سے بھی ظاہر ہے کہ جو دُوسروں کے قصور کو معاف کرے گا اللہ تعالےٰ اس کے قصور سے درگذر فرمائے گا۔

یہ اخلاقی وصف انتہا درجہ کی کشادہ دلی سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے خداوند تعالےٰ نے اس کا ذکر اُن اخلاقی اوصاف کے ساتھ کیا ہے جو کشادہ دِلی سے پیدا ہوتے ہیں اور اس کا صلہ بھی ایسا عطا فرمایا ہے جو انتہا درجہ کی وسعت رکھتا ہے:

وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُہَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ ○ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ○ (آل عمران: ۱۳۳-۱۳۴)

اور اپنے پروردگار کی بخشایش اور اس جنّت کی طرف لپکو جس کا پھیلاؤ (اتنا بڑا ہے) جیسے زمین و آسمان (کا پھیلاؤ۔ سجی سجائی) اُن پرہیزگاروں کے لیے تیار ہے جو خوش حالی اور تنگ دستی (دونوں حالتوں) میں (خدا کے نام پر) خرچ کرتے اور غصّے کو روکتے اور لوگوں (کے قصوروں) سے درگذر کرتے ہیں۔ اور (لوگوں کے ساتھ) نیکی کرنے والوں کو اللہ دوست رکھتا ہے۔

اوپر کی آیت میں متّقیوں کے دو وصف ایک ہر حال میں راہِ خدا میں دینا اور دُوسرا لوگوں کو معاف کرنا اور درگذر کرنا، اور اُن کے لیے دو جزائیں، ایک خدا کی مغفرت اور دوسری وسیع جنّت بیان کی گئی ہیں۔ اس سے ادھر خیال جاتا ہے کہ ہر حال میں خدا کی راہ میں دینے کا معاوضہ تو وُہ جنّت ہے جس کی حدّو پایاں آسمان و زمین ہے۔ اور غصّہ کو روکنے اور لوگوں کو معاف کرنے کی جزا یہ ہو گی کہ خُدا کی مغفرت ہمارے شاملِ حال ہو گی اور وُہ احکم الحاکمین ہم کو بھی معاف کریگا۔

عفوو درگذر کی اس اخلاقی تعلیم میں اگر قوّت اور قدرت کا جز شامل نہ ہو تو وُہ سراسر کمزوری اور دنارت پسندی کے مرادف ہو جائے اسی لیے اسلام نے اس اخلاقی تعلیم کے درس میں اس نکتہ کو فراموش نہیں کیا ہے۔ اور موجودہ انجیل کی اس اخلاقی تعلیم سے کہ اگر ایک شخص کسی کے ایک گال پر طمانچہ مارے تو اس کے سامنے دوسرا گال کر دو، جو ذلّت اور پست طبعی پیدا ہوتی ہے اس کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اسلام نے عفوو درگذر کی ایسی معتدل تعلیم دی ہے جس کے ساتھ خودداری کی شان بھی قائم رہتی ہے:

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ○ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ○

(الشوریٰ: ۳۹-۴۰)

اور جو ایسے (غیرت مند) ہیں کہ جب اُن پر (کسی طرف سے) بے جا زیادتی ہوتی ہے تو وہ (واجبی) بدلہ لیتے ہیں۔ اور بُرائی کا بدلہ ہے ویسی ہی برائی۔ اس پر (بھی) جو معاف کر دے اور صلح کر لے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے۔ بیشک وُہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

بُرائی کا بدلہ بُرائی جماعت کا قانون ہے۔ اور عفوو درگذر افراد کا اخلاقی کمال ہے۔ جماعتی

قانون کی قوّت موجود ہوتے ہوئے افراد کا آپس ہیں عفوو درگذر سے کام لینا ایک ملبند اخلاقی مثال ہے جس کی مزدوری کی ذمّہ داری احکم الحاکمین نے اپنے ذمہ لی ہے اور بتا دیا ہے کہ ظلم کرنے والے، خواہ وُہ ہوں جو بے سبب ظلم کر بیٹھیں یا وُہ جو انتقام کے جوش میں آگے بڑھ جائیں، خدا کی محبت سے محروم ہیں۔

اس حق کے حاصل ہو جانے کے بعد عفوو درگذر خود داری کے منافی نہیں ہوتا بلکہ بڑی ہمّت کا کام ہو جاتا ہے کہ قدرت کے باوجود اور اشتعال ہونے پر بھی اپنے نفس کو قابو میں رکھ کر عفو و درگذر کرتا ہے۔ اسی لیے فرمایا:

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ	اور البتہ جو شخص صبر کرے اور (دوسرے
لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝	کی خطا) بخش دے تو بے شک یہ بڑی
(الشوریٰ: ۴۳)	ہمّت کے کام ہیں۔

ایک اور آیت میں اس خصلت کو بڑی خوش قسمتی سے تعبیر فرمایا ہے اور اس کی تاثیر دکھائی ہے کہ اس سے کیونکر دشمنی دوستی کی صُورت میں بدل جاتی ہے:

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا	اور بھلائی اور بُرائی برابر نہیں (اگر کوئی
السَّيِّئَةُ ۭ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ	بُرائی کرے تو اس کا) جواب اچھائی
اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَيْنَكَ وَ	سے دو۔ پھر تو تیرے اور جس کے درمیان
بَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ	دشمنی ہے وُہ ایسا ہو جائے گا گویا دوست
حَمِيْمٌ ۝ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ	ہے نلتے والا۔ اور یہ بات ملتی ہے
صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا ذُوْ	انہی کو جن میں صبر ہے اور یہ بات ملتی ہے
حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ	اس کو جس کی بڑی قیمت ہے۔ اور اگر

مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝
(حٰمٓ السجدۃ: ۳۴-۳۶)

(اس میں) شیطان کے کونچنے سے کوئی کونچ تجھ کو لگ جائے تو اللہ کی پناہ ڈھونڈ۔ بیشک وہی ہے سنتا جانتا۔

آیت کے اخیر ٹکڑے سے واضح ہوتا ہے کہ غصّہ اور اشتعال کے سبب سے عفو و درگذر کے خلاف انسان سے جو حرکت ہوجاتی ہے وُہ شیطانی کام ہے۔ اس سے خُدا کی پناہ مانگنی چاہیے۔ حضرت ابن عباس رضؓ سے اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے کہ انہوں نے کہا:

"خدا نے اس آیت میں ایمان والوں کو غیظ و غضب میں صبر کا اور نادانی و جہالت کے وقت حلم و بُردباری کا اور بُرائی کے مقابلہ میں عفو و درگذر کا حکم دیا ہے۔ جب وُہ ایسا کریں گے تو خدا اُن کو شیطان کے اثر سے محفوظ رکھے گا۔"[1]

ابو مسعودؓ صحابی کہتے ہیں کہ میں ایک دفعہ اپنے غلام کو مار رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی "جان لو، جان لو"۔ مڑ کر دیکھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم تھے۔ فرما رہے تھے کہ "اے ابو مسعود! جتنا قابو تم کو اس غلام پر ہے اس سے زیادہ خدا کو تم پر ہے"۔ ابو مسعودؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی اس نصیحت کا یہ اثر مجھ پر ہوا کہ میں نے پھر کسی غلام کو نہیں مارا۔

ایک شخص نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم سے آکر پوچھا کہ "یا رسُول اللہ میں اپنے خادم کا قصور کتنا معاف کروں؟" آپ پہلے تھوڑی دیر چپ رہے۔ اس نے پھر یہی پوچھا تب آپؐ نے فرمایا "ہر روز ستر دفعہ"[2]۔ اس سے مقصودِ نبویؐ تعداد کی تحدید نہیں بلکہ عفو و درگذر کی کثرت ہے۔

بعض لوگوں کو یہ خیال ہوتا ہے کہ عفو و درگذر سے اُن کے رعب و داب اور وقار میں

---

[1] ابن کثیر تفسیر آیت مذکورہ۔ [2] ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی ادب الخادم میں یہ دونوں حدیثیں ہیں۔

فرق آجائے گا لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ انتقام سے گو فوری جذبہ کی تسکین ہو جاتی ہے اور کمزوروں پر دھاک بیٹھ جاتی ہے مگر اس سے کسی پائیدار شریفانہ عزت کا خیال نہیں پیدا ہوتا۔ یہ چیز عفو و درگذر ہی سے حاصل ہوتی ہے اور اس کا شریفانہ وقار بالآخر سب پر چھا جاتا ہے۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے[1]:

وما زاد اللّٰہ رجلا بعفو الّا عزّا	اور اللہ اس شخص کو جو عفو و درگذر کرتا ہے نہیں بڑھاتا ہے مگر عزت میں۔

[1] ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ما جاء فی التواضع۔

حِلم و بُردباری

حِلم و بُردباری کے معنی یہ ہیں کہ انتقام کی قدرت کے باوجود کسی ناگوار یا اشتعال انگیز بات کو برداشت کر لیا جائے اور قصوروار سے اس کے لیے کوئی تعرّض نہ کیا جائے۔ یہ قدرت سب سے زیادہ خدائے تعالےٰ کو حاصل ہے۔ لیکن اس قدرت کے باوجود وُہ اکثر اپنے بندوں کی برائیوں سے چشم پوشی کرتا ہے اور انتقام نہیں لیتا۔ اور اِسی لیے اس نے اپنے آپ کو حلم کے ساتھ متصف کیا ہے۔ اور جہاں جہاں اپنی اس صفت کا اظہار کیا ہے ساتھ ہی اپنے علم اور اپنی بخشش کا بھی ذکر کر دیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو کہ اس کا یہ حلم اس کے علم کے باوجود صرف اس کی بخشش کا نتیجہ ہے۔ فرمایا:

وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ○ اور اللہ ہے بخشنے والا بردبار۔

(البقرۃ: ۲۲۵/المآئدۃ: ۱۰۱)

اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ ○ بیشک اللہ ہے بخشنے والا بردبار۔

(آلِ عمران: ۱۵۵)

اِنَّہٗ کَانَ حَلِیْمًا غَفُوْرًا ○ بیشک وُہ (اللہ) ہے بخشنے والا بردبار۔

(بنی اسرائیل: ۴۴)

ان سب آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفتِ حلم کے ساتھ اپنی صفتِ مغفرت کا ذکر کر دیا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ اس کی یہ بُردباری نعوذ باللہ کسی ضعف یا عدمِ قدرت کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کی شانِ غفاری کا نتیجہ ہے۔ دُوسری جگہ حلم کے ساتھ اپنی صفتِ علم کو شامل کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ○ اور اللہ ہے جاننے والا بردبار۔

(النسآء: ۱۲)

اِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ○ بیشک ہے اللہ جاننے والا بردبار۔

(الحج: ۵۹)

وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَلِيْمًا ○ اور ہے اللہ جاننے والا بردبار۔

(الاحزاب: ۵۱)

اِن آیتوں سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وُہ انسانوں کی طرح بے جانے بوجھے یا محدود علم کے سبب سے بُردباری نہیں کرتا بلکہ پُورے علم اور ہر چیز اور ہر نتیجہ سے باخبر ہو کر بُردباری فرماتا ہے۔ ایک جگہ اپنی بُردباری کے ساتھ اپنی صفتِ استغنا کا بھی ذکر فرماتا ہے:

وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ○ اور اللہ مستغنی اور تحمّل والا ہے۔

(البقرۃ: ۲۶۳)

یہ صدقہ کے موقع کی آیت ہے اس لیے یہ ظاہر فرمادیا کہ وُہ مُستغنی ہے اور بُردبار ہے۔

انسانوں میں بُردباری اکثر کسی نہ کسی قسم کی کمزوری کا نتیجہ ہوتی ہے۔ مثلاً انتقام کے مقابلہ میں حلم اگر اس بُرائی کرنیوالے کو رام کرنے کے لیے کسی کو زیادہ قرینِ مصلحت معلوم ہوتا ہے تو یہ بھی ایک قسم کی کمزوری ہے کہ اس کو انتقام سے زیادہ حلم نفع بخش معلوم ہوتا ہے۔ لیکن خدا کی ذات

ہر حیثیت سے غنی ہے۔ اس کا حلم کامل استغنا کے ساتھ ہے۔

حلم گو اخلاقی حیثیت سے ہر حالت میں تعریف کے قابل ہے لیکن اس کی ایک حیثیت ایسی ہے کہ اُس سے بعض کم فہموں کے نزدیک حلیم اور بُردبار آدمی کی کمزوری کا راز فاش ہوتا ہے۔ اور اسی لیے اس کے مقابلہ میں اُن میں سرکشی اور بے اعتنائی پیدا ہوتی ہے۔ اللہ تعالےٰ اپنے بندوں کی اس کمزوری سے واقف تھا اس لیے اُس نے اپنے حلم اور دار وگیر دونوں کو پہلو بہ پہلو جگہ دی ہے تاکہ اس سخت گیری کے سبب سے بندوں میں مایوسی اور بُردباری کے سبب سے سرکشی نہ پیدا ہو۔ فرمایا:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝ (البقرۃ: ۲۳۵)	اور جان رکھو کہ اللہ کو معلوم ہے جو تمہارے دلوں میں ہے۔ تو اس سے ڈرتے رہو اور جان رکھو کہ اللہ بخشش والا ہے، تحمل والا۔

یہ آیت عورت کے نکاحِ ثانی کے سلسلہ میں ہے یعنی جب تک اس کی عدّت کے دن پورے نہ ہوں کوئی چھپے چوری بھی اس سے نکاح کا وعدہ نہ لے اور نکاح نہ کرے۔ دِل میں رہے تو کوئی حرج نہیں۔ اس کے بعد ارشاد ہے کہ اللہ کو تمہارے دِل کا ہر بھید معلوم ہے۔ ایسے عالم الغیب سے کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ اس لیے ایک طرف تو اس کی گرفت سے ہمیشہ ڈرتے رہو دُوسری طرف اس کی بخشش اور بردباری بھی عام ہے اس لیے اس سے پُر اُمید بھی رہنا چاہیے۔

نیکی کے کاموں میں مخلصانہ خرچ کرنے کی اللہ تعالیٰ قدر فرماتا ہے اور ایسے لوگوں کے گناہ معاف کرتا ہے۔ اس موقع پر اس کا ارشاد ہے:

اِنۡ تُقۡرِضُوا اللّٰہَ قَرۡضًا حَسَنًا یُّضٰعِفۡہُ لَکُمۡ وَ یَغۡفِرۡ لَکُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ شَکُوۡرٌ حَلِیۡمٌ ۙ (التغابن: ۱۷)	اگر تم اللہ کو قرض دو اچھی طرح قرض دینا تو وہ اس کو دونا کر دے گا اور تمہیں معاف کرے گا۔ اور اللہ ہے قدردان اور تحمل والا۔

اس کی قدردانی تو یہ ہے کہ وہ ایک کے بدلہ دو دے گا۔ اور تحمل یہ ہے کہ دینے والے کے گناہ کو معاف کرے گا۔

اس آیت میں تحمل اور بُردباری کا ایک فلسفیانہ نکتہ بھی چھپا ہے۔ کسی قصوروار کے کسی قصور پر جب ہم کو غصّہ آتا ہے تو اس وقت اس عیب کے سوا اس کے سارے ہنر ہماری آنکھوں سے چھپ جاتے ہیں اور اس کی خوبیاں نظر انداز ہو جاتی ہیں۔ اس لیے ہمارا غصّہ پوری طرح تیز ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ سامنے رہے کہ اس سے ایک غلطی ہوئی ہے یا اس میں ایک عیب ہے مگر اس میں کچھ خوبیاں بھی ہیں۔ تو اس کی ان خوبیوں کی قدر کر کے اس کی غلطی سے درگذر کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے بتایا کہ اس کی مخلصانہ خیرات کی خوبی کی قدر فرما کر وُہ اس کی غلطی سے درگذر کرتا ہے۔

صفتِ حلم سے انبیائے کرام بھی متصف فرمائے گئے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ جن کی بنیادوں پر محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ہاتھوں اسلام کی عمارت تعمیر ہوئی ہے خاص طور سے اس وصف سے سرفراز ہوئے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بت پرست باپ کو ہر طرح سے سمجھایا اور چاہا کہ وُہ کسی طرح عذابِ الٰہی سے بچ جائے۔ انہوں نے اس کا فرباپ کے ہاتھوں طرح طرح کے ظلم سہے اور آخر مجبور ہو کر اس سے علیحدگی پر مجبور ہوئے۔ پھر بھی اُن کی بُردباری اور تحمل کا سررشتہ ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا اور اس وقت تک اس کے حق میں

دعائے خیر کرتے رہے جب تک اُن کو پوری مایوسی نہیں ہو گئی اور اُن کو قطعی طور سے معلوم نہیں ہو گیا کہ وُہ خدا کا دشمن ہے۔ اس واقعہ کے سلسلہ میں ہے:

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ۭ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ○ (التوبة: ۱۱۴)	اور (نہ تھا) ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے مغفرت کی دعا مانگنا مگر ایک وعدہ (کی وجہ) سے جو ابراہیم نے اپنے باپ سے کر لیا تھا۔ پھر ان کو (بھی) جب معلوم ہو گیا کہ یہ خدا کا دشمن ہے تو باپ سے (مطلقاً) دست بردار ہو گئے۔ بیشک ابراہیم البتہ بڑے نرم دِل (اور) بردبار تھے (کہ باپ کے کافر ہونے کے باوجود خدا سے اس کی مغفرت مانگنے کا وعدہ کر لیا تھا)۔

دُوسری آیت میں اس موقع پر جہاں قومِ لوط کی بربادی کی خبر پا کر وُہ اللہ تعالےٰ سے عرض معروض کرتے ہیں اُن کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ○ (هود: ۷۵)	بے شک ابراہیم بردبار، نرم دِل اور رجوع کرنے والے تھے۔

قرآن مجید کی آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حلم عفو و درگذر، رفق و ملاطفت اور صبر وا[illegible] کے مجموعہ کا نام ہے۔ چنانچہ خداوند تعالےٰ نے اپنی توصیف میں حلیم کے ساتھ

اکثر غفور کا اور حضرت ابراہیمؑ کے وصف میں اوّاہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ حلم کے لیے عفو و درگذر اور رفق و ملاطفت لازمی ہیں لیکن ایک اور آیت میں حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام کی نسبت فرماتا ہے:

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِیْمٍ ۝ (الصّٰفّٰت: ۱۰۱)

تو ہم نے اُن کو (ابراہیم کو) ایک بڑے بُردبار لڑکے (اسمٰعیل کے پیدا ہونے) کی خوشخبری دی۔

اس کے بعد جب اُن کی قربانی کا حکم ہوا ہے تو انہوں نے کہا ہے۔

یٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ ۝ (الصّٰفّٰت: ۱۰۲)

اے باپ آپ کو جو حکم ہوا ہے بے تأمّل اس کی تعمیل کیجیے۔ انشاء اللہ آپ مجھ کو بھی صابر ہی پائیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ صبر حلم کا ایک ضروری جز ہے۔ حلم کی صفت خدا کو نہایت محبوب ہے۔ چنانچہ ایک شخص کی نسبت رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ تم میں دو خصلتیں ایسی ہیں جن کو خدا پسند کرتا ہے یعنی حلم اور جلد بازی نہ کرنا[1]۔ یعنی کوئی بات پیش آئے تو بے سوچے سمجھے غصّہ میں کوئی حرکت نہ کر بیٹھنا چاہیئے۔

ایک شخص نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے بار بار یہ درخواست کی کہ مجھے کوئی نصیحت فرمایئے۔ آپ نے ہر بار یہ جواب دیا کہ "غصّہ نہ کرو"۔ اگر غصّہ آبھی جائے تو اس کو ضبط کیا جائے یہی وجہ ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا ہے کہ" پہلوان وُہ نہیں ہے جو لوگوں

---

[1] ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی التانی والعجلۃ۔

کو کشتی میں پچھاڑ دے بلکہ پہلوان وُہ ہے جو غصّہ کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے"[1] ایک اور حدیث میں ہے کہ "جو شخص باوجود قدرت کے غصّہ کو ضبط کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کو قیامت کے دن سب کے سامنے بلا کر انعامِ خاص کا مستحق ٹھہرائے گا"[2]

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں ایک شخص نے آکر عرض کی کہ "یارسُولؐ اللہ! میرے کچھ رشتہ دار ہیں، مَیں اُن کے ساتھ ملتا ہوں[3]، وُہ کاٹتے ہیں میں بھلائی کرتا ہوں وُہ بدی کرتے ہیں۔ وُہ میرے ساتھ جہالت کرتے ہیں میں تحمل کو راہ دیتا ہوں"۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے یہ سُن کر فرمایا کہ "اگر یہ ایسا ہی ہے جیسا تم کہتے ہو تو تم اُن کے منہ میں گرم راکھ بھرتے ہو۔ اور جب تک اس حالت پر قائم رہوگے خدا کی طرف سے تمہاری مدد ہوتی رہے گی"[4]

---

[1] بخاری کتاب الادب باب الحذر من الغضب۔ [2] ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی کثرۃ الغضب
[3] یعنی صلۂ رحم کرتا ہوں۔ [4] صحیح مسلم باب صلۃ الرحم وادب المفرد امام بخاری باب فضل صلۃ الرحم۔

رفق ولطف

رفق ولطف کے معنی یہ ہیں کہ معاملات میں سختی اور سخت گیری کے بجائے نرمی اور سہولت اختیار کی جائے۔ جو بات کی جائے نرمی سے، جو سمجھایا جائے وُہ سہولت سے اور جو مطالبہ کیا جائے وُہ میٹھے طریقہ سے کہ دلوں کو موہ لے اور پتھر کو بھی موم کر دے۔

اللہ تعالٰی نے کئی آیتوں میں اپنے کو "لطیف" فرمایا ہے[1]۔ اور حدیثوں میں اس کا نام

---

[1] راغب اصفہانی "لطیف" کے مختلف معنوں میں سے ایک معنی یہ بتاتے ہیں:

"وُہ اپنے بندوں کی رہنمائی میں نرمی (رفق) فرماتا ہے۔" (لفظ لطف)

امام بیہقیؒ کتاب الاسماء والصفات میں نقل کرتے ہیں:

"خدا کا نام لطیف اس لیے ہے کہ وُہ اپنے بندوں کے ساتھ بھلائی اور آسانی چاہتا ہے اور ان کے لیے صلاح اور نیکی کے اسباب کا فیضان کرتا ہے...... لطیف اس لیے کہ وُہ اپنے بندوں کے ساتھ بھلائی فرماتا ہے۔ ان کے ساتھ اس طرح لطف کرتا ہے جس کا علم بھی ان کو نہیں ہوتا۔ اور اس طرح ان کی مصلحتوں کا سامان فراہم کرتا ہے جس کا گمان بھی ان کو نہیں ہوتا...... ابن الاعرابی کا قول ہے لطیف وُہ ہے جو تمہاری ضرورت کو تم تک ملائمت (رفق) سے پہنچا دیتا ہے۔"

امام غزالیؒ کہتے ہیں:

"اس صفت کا مستحق وہی ہے جو نازک اور باریک مصلحتوں کو جانتا ہے۔ پھر ان کو نرمی کے طریق سے، سختی سے نہیں، اُن تک پہنچاتا ہے جس کے حق میں وُہ مفید ہیں۔ جب عمل میں نرمی اور ادراک میں لطافت ہو تو لطیف کے معنی پورے ہوتے ہیں اور اس کمال کا تصور خدا ہی کے لیے ہے۔ (روح المعانی، تفسیر سورہ شوریٰ)

رفیقؐ آیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وُہ اپنے ہر قسم کے بندوں کے ساتھ ان کی خبر گیری اور رزق کا سامان پہنچانے میں رفق و لطف فرماتا ہے اور اپنے اس تلطف میں وُہ اُن کی اطاعت اور عدمِ اطاعت کی پروا نہیں کرتا۔ اللہ تعالےٰ نے حضرت یوسفؑ کو بے سان گمان جس طرح امارت کے رتبہ تک پہنچایا اور اُن کے خاندان کو جن غیر متوقع ذریعوں سے مصر لے آیا اور دُشمن بھائیوں کو جس طرح اُن کے سامنے نادم و شرمندہ کر کے اُن کے آگے سرنگوں کر دیا، اس کو یاد کر کے وُہ فرماتے ہیں:

اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ○ (یوسف: ۱۰۰)	بے شک میرا رب لطف کرنے والا ہے جس بات کا چاہے۔ بیشک وہی علم والا حکمت والا ہے۔

حضرت یوسفؑ کو جو مشکلیں پیش آئیں اور پھر وہی مشکلیں جس طرح اُن کی کامیابی کا ذریعہ بنیں اُن کی حکمت کو خدا ہی جانتا تھا اور اسی کو اس کی خبر تھی۔

ایک دُوسری آیت میں اللہ تعالےٰ اپنے بندوں کے ساتھ اپنے رفق و تلطف کا اظہار اس طرح فرماتا ہے:

اَللّٰهُ لَطِیْفٌۢ بِعِبَادِهٖ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الْقَوِیُّ الْعَزِیْزُ ○ (الشوریٰ: ۱۹)	اللہ اپنے بندوں پر لطف فرماتا ہے جس کو چاہتا ہے روزی دیتا ہے۔ اور وہی قوت والا غالب ہے۔

اس آیت کے اُوپر قیامت کے تعلق سے مومنوں اور کافروں کا ذکر ہے اور نیچے بھی ان دونوں قسموں کا تذکرہ ہے۔ بیچ میں یہ آیت ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لطف الٰہی

ؐ صحیح مسلم کتاب البر والصلۃ باب فضل الرفق۔

کافر و مومن دونوں کے ساتھ ہے کہ دونوں کو یکساں وُہ رزق پہنچاتا ہے[1]۔ اور اسی لیے قیامت کو راز رکھنا بھی اس کے الطافِ بے کراں کا ایک نتیجہ ہے۔

ملتِ حنیف کے پیشوا حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ و السلام اپنے کافر باپ کے حق میں جب دعائے مغفرت کے طالب ہوئے تو بارگاہِ الٰہی میں گو یہ دعا مستجاب[2] نہ ہوئی مگر ابراہیم خلیل کی نرم دلی اور دردمندی کی مدح فرمائی گئی۔ ارشاد ہوا:

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ ○ بیشک ابراہیم نرم دِل، بُردبار تھے۔

(التوبۃ: ۱۱۴)

اسی طرح جب وُہ قومِ لوط کی گنہگار قوم کی سفارش کے لیے کھڑے ہوئے تو یہ درخواست بھی گو قبول نہ ہوئی مگر حضرت ابراہیمؑ کی مدح و توصیف فرمائی گئی کہ

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ○ بیشک ابراہیم بُردبار، نرم دِل، حق کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔

(ھود: ۷۵)

اَوَّاہ کے معنی میں مفسروں کا اختلاف ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ جو بہت دعائیں مانگتا ہو، دُوسرا اس کے معنی نرم دِل بتاتا ہے، اور تیسرا دردمند کہتا ہے۔ لیکن ہوسکتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ پر یہ تینوں باتیں پُوری اترتی ہوں۔ وُہ ہر شخص کی دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیتے تھے۔ وُہ دردمند تھے اور دردمندی کی راہ سے ایسا کرتے تھے۔ یا دِل کے نرم تھے اس لیے جلد پسیج جاتے تھے۔ اور یہ اس لیے ایسا تھا کہ ملتِ حنیف کا داعی ہر ایک کو اپنے سے ملانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اسی لیے حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام فرعون جیسے سنگدل اور ظالم بادشاہ کے دربار میں

---

[1] تفسیر رُوح المعانی میں مقاتل کا یہی قول ہے۔ صاحب رُوح المعانی اور امام فخر الدین رازی بھی عموم کو واضح جانتے ہیں۔

[2] حضرت ابراہیمؑ نے اپنے باپ کی حالت پر اطلاع پاکر اس کے بعد ان سے اپنی علیحدگی ظاہر کردی۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب حق کی تبلیغ کو بھیجے جاتے ہیں تو اُن کو تبلیغ کے یہ آداب سکھلائے جاتے ہیں:

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ○

سو تم دونوں اس سے نرم بات کہنا شاید وُہ نصیحت پائے یا خدا سے ڈرے۔

(طٰہٰ: ۴۴)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ نرمی اور نرم خوئی تبلیغ کی کامیابی کی پہلی شرط ہے۔ اور اسی لیے دینِ حنیف کے مبلّغِ اعظم اور توحید کے داعیٔ اکبر محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو رحمتِ الٰہی نے خاص طور سے اس کا حصّہ وافر عنایت فرمایا تھا۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کو خطاب کر کے ارشاد ہوتا ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ

تو اللہ کی رحمت کے سبب سے تم اُن کے لیے نرم دل ہوئے۔ اور اگر تم مزاج کے اکھڑ اور دل کے سخت ہوتے تو یہ لوگ تمہارے پاس سے تتر بتر ہو گئے ہوتے۔

(آل عمران: ۱۵۹)

اس لیے ایک پیغمبر کے لیے یہ وصف نہایت اہم ہے تاکہ لوگوں کو اس کی تعلیم و دعوت کی طرف میلان ہو اور وُہ اس کے حلقۂ اطاعت سے باہر نہ ہونے پائیں۔ اور اسی لیے رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ پاک میں یہ وصف سب سے نمایاں طور پر ودیعت کیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اُس کو خاص اپنی رحمت کا نتیجہ قرار دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ حلم و بُردباری، عفو و درگذر، چشم پوشی اور خوش خُلقی غرض اُن تمام اخلاق

کے عطر کا نام جن میں شانِ جمالی پائی جاتی ہے یہی رفق و تلطف اور نرم دلی و نرم خوئی ہے۔ جس طرح حُسنِ فطرت زینت و آرایش سے دوبالا ہو جاتا ہے اسی طرح رفق و نرمی کی خو سے انسان کا اخلاقی حُسن دوچند ہو جاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایک دفعہ حضرت عائشہ رض کو یہ حقیقت ان لفظوں میں سمجھائی۔ فرمایا:

ان الرفق لا یکون فی شیٔ	نرمی جس چیز میں ہو اس کو زینت
الّا زانہ ولا ینزع من شیٔ	دیتی ہے اور جس چیز سے الگ کر لی
الّا شانہ[1]	جاتی ہے اس کو بدنما بنا دیتی ہے۔

"جس چیز" کا لفظ کتنا عام ہے اس سے معلوم ہوا کہ ہر چیز میں نرمی کام کو بناتی اور سختی بگاڑتی ہے الّا یہ کہ شریعت اور قانون یا جماعت کی مصلحت سختی کا تقاضا کرتی ہو۔

حضرت عائشہ رض ہی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ "خدا نرم خو (رفیق) ہے اور نرم خوئی کو پسند کرتا ہے۔ اور نرم خوئی پر جو کچھ دیتا ہے وہ سختی پر اس کے علاوہ کسی اور چیز پر نہیں دیتا[2]۔" جریر بن عبد اللہ صحابی کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا کہ "جو نرمی سے محروم رہا وہ بھلائی سے محروم رہا[3]۔" اور فرمایا کہ "تین خصلتیں جس شخص میں ہوں گی خدا اپنے سایہ کو اس پر پھیلائے گا اور اس کو جنت میں داخل کرے گا یعنی کمزور کے ساتھ نرمی کرنا، باپ ماں پر مہربانی کرنا اور غلام پر احسان کرنا[4]۔"

اسی اخلاقی وصف کی تعلیم آپ نے دوسرے الفاظ میں یوں دی:

الا اخبرکم بمن یحرم علی	کیا میں تم لوگوں کو بتاؤں کہ کون شخص
النار و تحرم علیہ النار علیٰ	آگ پر حرام ہے اور کس پر آگ حرام

---

[1] و [2] و [3] صحیح مسلم کتاب البر والصلہ باب فی فضل الرفق۔ [4] ترمذی ابواب الزہد۔

كُلّ قريب هيّن سهل[1] ہے۔ ہر اُس شخص پر جو لوگوں سے قریب ہو، نرم ہو اور آسان ہو۔

ایک بار یہودیوں کی ایک جماعت رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کہا کہ "السّام علیکم" یعنی تم کو موت آئے۔ حضرت عائشہؓ سمجھ گئیں اور انہوں نے جواب میں کہا "وَعلیکم السّام وَاللعنۃ" یعنی تم کو موت آئے اور تم پر لعنت ہو۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے سنا تو فرمایا کہ "عائشہ ٹھہر جاؤ۔ خدا تمام کاموں میں نرمی کو پسند کرتا ہے" بولیں "یا رسُولَ اللہ! انہوں نے جو کچھ کہا کیا آپ نے نہیں سنا؟" فرمایا میں نے بھی تو کہدیا کہ علیکم یعنی تم پر"[2]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے جواب میں یہ خوبی ہے کہ بات وہی ہوئی مگر اس میں سختی کا نشان نہیں۔ اور پھر اس طرح سے ہے کہ مخاطب ذرا سوچے تو خود بخود اس کا دل شرمندہ ہو۔

شریعت کا قانون اور جماعت کی مصلحت جب سختی کا مطالبہ کرتی ہے اُس کا موقع وُہ ہے جب کوئی شخص حدودِ الٰہی میں سے کسی حد کو توڑ ڈالے اور جماعت کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو۔ چنانچہ کفّار اور منافقین جب سمجھانے سے نہ سمجھیں اور اپنی ضد پر اڑے رہیں بلکہ مسلمانوں کو آزار پہنچانے کے درپے ہوں تو اُن کے شر کو روکنے اور اُن کی سازشوں کے قلع و قمع کرنے کے لیے اُن پر پوری سختی کی جاسکتی ہے۔ فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِىُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ؕ اے پیغمبر! کافروں اور دغابازوں سے جہاد کرو اور ان پر سختی رکھو۔

(التحریم: ۹)

---

[1] ترمذی ابواب الزہد [2] بخاری کتاب الادب، باب الرفق فی الامر کلہ۔

دُوسری جگہ فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا	اے مسلمانو! اپنے نزدیک کے
الَّذِينَ يَلُونَكُم مِّنَ الْكُفَّارِ	کافروں سے لڑتے جاؤ اور چاہیے
وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً	وُہ تم میں کڑا پن پائیں۔

(التوبۃ: ۱۲۳)

اسی طرح شریعت کے گنہگاروں کو جب سزا دی جائے تو مسلمانوں کو چاہیے کہ اس کے اجرا میں نرمی نہ برتیں۔ مسلمان بدکار مردوں اور بدکار عورتوں کی سزا کے متعلق فرمایا:

وَلَا تَأْخُذْكُم بِهِمَا رَأْفَةٌ	اور اللہ کے حکم چلانے میں تم کو ان دونوں
فِي دِينِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ	پر ترس نہ آئے اگر تم اللہ اور پچھلے دن
بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ	پر یقین رکھتے ہو۔

(النور: ۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکارمِ اخلاق کا جو بیان حضرت عائشہؓ سے مروی ہے اس میں بھی نرمی اور سختی کے مواقع میں یہی امتیاز کی حد قائم کی گئی ہے۔ اُم المومنینؓ فرماتی ہیں کہ "رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے ذاتی معاملہ میں کبھی کسی سے بدلہ نہیں لیا البتہ جب احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کی جاتی تو آپ اس کو سزا دیتے تھے[1]"۔ امام بخاری نے ایک خاص باب میں اس قسم کی متعدد حدیثیں نقل کی ہیں جن میں آپ نے مسلمانوں بلکہ ازواجِ مطہرات تک پر کسی کسی بات میں سختی برتی ہے[2]۔ حافظ ابن حجرؒ اس باب کی شرح میں لکھتے ہیں:

---

[1] بخاری کتاب الادب باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم یسّروا ولا تعسّروا۔ [2] باب ما یجوز من الغضب والشدۃ لامر اللہ تعالٰی۔

"گویا امام بخاری اس باب میں یہ اشارہ کرتے ہیں کہ جس حدیث میں یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تکلیفوں پر صبر کرتے تھے وُہ آپ کے ذاتی حق سے متعلق ہے۔ لیکن خدا کے حق میں آپ اس سختی سے کام لیتے تھے جس کا خدا نے حکم دیا تھا۔" (فتح الباری جلد ۱۰ صہ ۴۲۹ مصر)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ سے فرمایا کرتے تھے کہ "آسانی کرو سختی نہ کرو"[1]۔ شارحینِ حدیث نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ نوافل و مباحات میں سختی نہ برتی جائے اور شریعت نے جس حد تک گنجایش اور وسعت رکھی ہو اس میں تنگی نہ کی جائے۔ ایک صحابی سے ایک دفعہ روزہ میں ایک شرعی غلطی ہو گئی۔ انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ مجھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے چلو۔ ان سب نے معاملہ کی اہمیت کے ڈر سے ساتھ چلنے سے انکار کیا تو انہوں نے اکیلے ہی خدمتِ نبوی میں حاضر ہو کر حقیقتِ حال عرض کی۔ ارشاد ہوا کہ "ایک غلام کی گردن آزاد کرو۔" وُہ اپنی گردن پر ہاتھ رکھ کر بولے کہ "یا رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس گردن کے سوا میری کوئی ملکیت نہیں۔" فرمایا "لگاتار دو مہینے روزے رکھو۔" گزارش کی کہ "یا رسُولَ اللہ! روزہ ہی میں تو یہ حرکت ہوئی پھر روزہ رکھوں۔" فرمایا "ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ۔" عرض پرداز ہوئے کہ "قسم ہے اُس ذات کی جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے کہ ہم نے بھوک میں رات گزاری ہے۔" فرمایا کہ صدقہ کے فلاں محصّل کے پاس جاؤ اور اس سے اتنے چھوہارے لے لو اس سے ساٹھ مسکینوں کو کھلا کر جو بچ رہے وُہ خود کھاؤ۔ وُہ صحابی ہنسی خوشی اپنی قوم میں آئے اور اپنی روداد بیان کر کے بولے کہ "میں نے تمہارے پاس تنگی اور بری رائے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کشادگی اور اچھی رائے پائی۔"[2]

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب یسّروا ولا تعسّروا۔ [2] سنن ابی داود باب فی الظہار۔

تواضع وخاکساری

کبریائی اللہ تعالیٰ کی صفتِ خاص ہے جس میں کوئی اس کا شریک نہیں:

وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۠ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ (الجاثیۃ: ۳۷)	اور اُسی کو بڑائی ہے آسمانوں میں اور زمین میں اور وہی زبردست ہے حکمت والا۔

اس لیے بندوں کی شان نہیں کہ وُہ کبریائی کریں۔ اُن کی بندگی کی شان اس میں ہے کہ وہ تواضع وخاکساری اختیار کریں اور عاجزی وفروتنی برتیں۔

تواضع وخاکساری کے بہت سے مظہر ہیں۔ قرآن مجید نے اُن میں سے نمایاں مظاہر کو لے کر بعض موقعوں پر اُن کا حکم دیا ہے اور دوسرے موقعوں پر اُن کو اپنے خاص بندوں کا وصف بتایا ہے۔ مثلاً رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے کفار سے درگذر کا، پھر مومنوں کے ساتھ پُرمحبت تواضع کا حکم دیا ہے:

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ (الحجر: ۸۸)	اور اپنا بازو مومنوں کے لیے جھکا دے۔

دُوسری جگہ فرمایا:

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ○	اور اپنا بازو جھکا رکھ اُن کے واسطے جو تیرے ساتھ ہوئے ہیں ایمان والے ۔

(الشعرآء: ۲۱۵)

اولاد کو ماں باپ کے سامنے اسی پُر محبّت عاجزی اور فروتنی کے ساتھ پیش آنا چاہیے:

وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ	اور ماں باپ کے لیے عاجزی کا بازو مہر و محبت سے جھکا دے ۔

(بنی اسرائیل: ۲۴)

"خفض جناح" یعنی بازو جھکا دینا تواضع و خاکساری سے استعارہ ہے۔ جناح پرندہ کے بازو کو کہتے ہیں ۔ پرندہ جب زمین پر اترنے لگتا ہے یا تھک کر بیٹھنا چاہتا ہے تو اپنے بازوؤں کو جھکا دیتا ہے ۔ اس سے یہ استعارہ[1] کیا گیا کہ انسان بھی خاکساری اور فروتنی سے اپنے بازوؤں کو نیچے کر لیتا ہے اور تکبّر اور ترفّع کی بلندی کے بجائے تواضع کی پستی کی طرف اترتا ہے۔

اللہ تعالےٰ نے اپنے خاص بندوں کا یہ وصف بتایا ہے :

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ○ (الفرقان: ۶۳)	اور رحمت والے (خدا) کے (خاص) بندے تو وُہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلیں اور جب جاہل اُن سے (جہالت کی) باتیں کرنے لگیں تو ان کو سلام کریں (اور الگ ہو جائیں)۔

قرآن کی بلاغت یہ ہے کہ بندوں کو خاکساری کی تعلیم دینی تھی تو اُن کو رحمت والے

---

[1] المثل السائر باب نوع و تفسیر کبیر رازی تفسیر آیت جناح الذل ج ۵ ص ۴۲، دار الطباعۃ العامرہ ۔

خدا کے بندے کہہ کر نصیحت فرمائی گئی کہ خدا جب رحمت اور مہر و کرم والا ہے تو اس کے بندوں میں خلقِ خدا کے ساتھ تواضع اور ملنساری ظاہر ہو:

حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو یہ اخلاقی نصیحت کی:

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَ	اور لوگوں سے بے رخی نہ کر اور زمین
لَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۖ إِنَّ	پر اترا کر نہ چل (کیونکہ) اللہ کسی اترانے
اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ۝	والے شیخی خورے کو پسند نہیں کرتا۔
وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ وَاغْضُضْ	اور اپنی رفتار میں میانہ روی (اختیار)
مِن صَوْتِكَ ۚ إِنَّ أَنكَرَ الْأَصْوَاتِ	کر اور (کسی سے بات کرے) تو ہولے
لَصَوْتُ الْحَمِيرِ ۝	سے بول (کیونکہ) بُری سے بُری آواز
(لقمان: ۱۸-۱۹)	گدھوں کی آواز ہے۔

اس آیت میں خاکساری اور تواضع کے مختلف مظاہر بتائے ہیں۔ بات کرنے میں لوگوں سے بے رخی نہ کی جائے، زمین پر اکڑ کر نہ چلا جائے، چال ڈھال میں غرور کا شائبہ نہ ہو اور نہ آواز میں غرور کے مارے سختی اور کرختگی ہو۔

لیکن یہ خیال میں رہے کہ تواضع و خاکساری اور دنارت و پستی میں بڑا فرق ہے۔ تواضع و خاکساری کا منشا یہ ہے کہ انسان میں کبر و غرور پیدا نہ ہو اور ہر شخص دوسرے کی عزت کرے۔ اور دنارت و پستی کا مطلب یہ ہے کہ بعض ذلیل اغراض کے لیے انسان اپنی خود داری کو کھودے۔ چنانچہ ایسے موقع پر جہاں خاکسارانہ روش سے انسان کا ضعف ظاہر ہو وہاں اسلام نے عارضی اور نمائشی طور پر خود دارانہ کبر و غرور کا حکم دیا ہے۔ صحابہ جب عمرہ کیلئے آئے تو چونکہ مدینہ کے وبائی بخار نے اُن کو کمزور کر رکھا تھا اس لیے کفار نے طنز کیا کہ محمدؐ اور ان کے اصحاب ضعف کی وجہ

سے خانۂ کعبہ کا طواف نہیں کر سکتے۔ اس پر آپ نے صحابہ کو حکم دیا کہ طواف کے تین چکر اکڑ کر کریں تاکہ مشرکوں پر اُن کی طاقت کا اظہار ہو[1]۔

قوّت کے اظہار کا اصلی موقع جہاد میں پیش آتا ہے اور اس موقع پر اسلام نے خاکساری کے بجائے کبر و غرور کو پسند کیا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ بعض غرور کو خدا ناپسند اور بعض کو پسند کرتا ہے۔ جنگ و صدقہ کے موقع پر اترانا خدا کو پسند ہے اور ظلم و فخر پر اترانا ناپسند[2]۔

بہر حال اسلام میں خاکساری ایک شریفانہ خُلق ہے اور ضعف، ذلّت، بیچارگی اور بے سروسامانی سے مختلف ہے۔ ضعف و ذلّت سے انسان پست رتبہ ہو جاتا ہے لیکن خاکساری اس کو بلند رتبہ بنا دیتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ "جو شخص خدا کے لیے خاکساری کرتا ہے خدا اس کو بلند کر دیتا ہے[3]۔" ایک اور حدیث میں فرمایا کہ "جو شخص عمدہ کپڑے پہننے کی استطاعت رکھتا ہے لیکن وُہ خاکساری سے اُس کو نہیں پہنتا تو خدا اس کو قیامت کے دن سب کے سامنے بلائے گا اور اس کو اختیار دے گا کہ ایمان کا جو حلّہ پسند کرے اس کو پہن لے[4]۔"

غرض یہ ہے کہ تواضع کا حکم صرف اس لیے ہے کہ کوئی شخص اپنی قوّت اور دولت کا بے جا استعمال نہ کرنے پائے جس سے غریبوں اور کم استطاعت لوگوں کا دل دکھے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ اللہ تعالےٰ نے مجھ پر یہ وحی بھیجی ہے کہ خاکساری اختیار کرو تاکہ کوئی کسی پر ظلم نہ کرے اور کوئی کسی کے مقابل میں فخر نہ کرے[5]۔ اس سے معلوم ہوا کہ تواضع کا مقصد معاشرتی زندگی میں خوشگوار لطافت پیدا کرنا ہے اور یہی لطافت ہے جو ایک خاکسار شخص کی چال ڈھال اور بات چیت تک سے ظاہر ہونی چاہیئے۔

---

[1] مسلم کتاب الحج باب استحباب الرمل فی الطواف و صحیح بخاری عمرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ [2] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الخیلاء فی الحرب۔
[3] ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ما جاء فی التواضع۔ [4] ترمذی ابواب الزہد۔ [5] ابوداؤد کتاب الادب باب فی المواخاۃ۔

خوش کلامی

خوش کلامی سے مقصد یہ ہے کہ باہم ایک انسان دُوسرے انسان سے باتیں کرنے میں ایک دُوسرے کے ادب واحترام اور لطف ومحبّت کا پہلو ملحوظ رکھے تاکہ آپس میں خوشگوار تعلقات پیدا ہوں اور باہم مروّت اور محبّت بڑھے۔ سلام کرنا، شکریہ ادا کرنا، حال پوچھنا، ایک دُوسرے کو نیک دعائیں دینا، اچھی باتیں کرنا، اچھی باتیں سمجھانا اسی ایک صفت کی مختلف جزئیات ہیں۔ خدا تعالےٰ نے توراۃ میں بنی اسرائیل کو لوگوں کے ساتھ خوش کلامی کا جو حکم دیا تھا اس کو قرآنِ پاک میں بھی دہرا دیا ہے:

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا — اور کہیو لوگوں سے اچھی بات۔

(البقرۃ: ۸۳)

اس اچھی بات کہنے میں لوگوں کے فائدہ اور کام کی باتوں کا کہنا، نصیحت کرنا، اچھی باتوں کی تعلیم اور تلقین کرنا بھی داخل ہے۔ ایک اور آیت میں یہی حکم دُوسرے لفظوں میں اس طرح دیا گیا ہے کہ یہ وصف اللّٰہ تعالیٰ کے خاص بندوں کی پہچان بن جاتا ہے۔ ارشاد ہے:

وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ — اور۔ (اے پیغمبر!) میرے بندوں سے
هِیَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ — کہہ دے کہ وُہ بات کہیں جو سب سے

بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ○
(بنی اسرآئیل : ۵۳)

اچھی ہو۔ بیشک شیطان جھگڑا ڈلواتا ہے آپس میں۔ بیشک شیطان انسان کا کھلا دُشمن ہے۔

آیت کے پچھلے حِصّہ میں دعوٰی کی دلیل بھی دے دی گئی ہے کہ خوش گوئی اور خوش کلامی آپس میں میل ملاپ پیدا کرتی ہے۔ اور بد گوئی و بد کلامی پھوٹ پیدا کرتی ہے جو شیطان کا کام ہے۔ وُہ اس کے ذریعہ سے لوگوں میں غصّہ، نفرت، حسد اور نفاق کے بیج بوتا ہے۔ اس لیے اللہ کے بندوں کو چاہیے کہ نیک بات بولیں، نیک بات کہیں، اچھے لہجہ میں کہیں، اور نرمی سے کہیں، کہ آپس میں میل ملاپ اور مہر و محبّت پیدا ہو۔ اسی لیے "تنابز بالالقاب" یعنی ایک دُوسرے کو بُرے لفظوں اور نفرت اور تحقیر کے خطابوں سے پکارنے کی ممانعت آئی ہے۔ کسی کو کافر یا منافق اور تحقیر و کراہت کے دُوسرے القاب سے مخاطب کرنا گویا اس میں اُس اچھی بات کے خلاف جو آپ اُس کو سمجھانا چاہتے ہیں پہلے ہی سے نفرت اور ضد کا جذبہ پیدا کر دینا ہے۔ فرمایا :

وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ
(الحجرات : ۱۱)

اور نہ تم آپس میں ایک دُوسرے کو طعن دو اور نہ چڑ کا نام لے کر پکارو۔ ایمان کے بعد گنہگاری بُرا نام ہے۔

اسی لیے، بُرائیوں کے تذکروں اور بدگوئیوں کو اللہ تعالےٰ ناپسند فرماتا ہے۔ ارشاد ہے :

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ

اللہ کو بُری بات کا پکارنا خوش نہیں آتا مگر جس پر ظلم ہوا ہو (اس کو حق ہے

مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ   کہ ظالم کے ظلموں کو بیان کرے)۔

(النساء: ۱۴۸)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ "مسلمان نہ طعنہ دیتا ہے، نہ لعنت بھیجتا ہے، نہ بدزبانی اور فحش کلامی کرتا ہے[1]"۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک مسلمان کی شان اس قسم کی غیر مہذبانہ باتوں سے بہت اُونچی ہونی چاہیے۔ اس کی زبان سے حق و صداقت، بہبودی اور خیر خواہی اور نیکی اور بھلائی کے سوا کوئی اور بات نہ نکلے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ "جو اللہ اور روزِ جزا پر یقین رکھتا ہے اس کو چاہیئے کہ وُہ اچھی بات بولے ورنہ چپ رہے[2]"۔ اس حدیثِ پاک میں اشارہ ہے کہ اللہ اور روزِ جزا پر یقین رکھنے کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ کلمۂ خیر کے سوا کچھ اور زبان سے نہ نکلے کیونکہ اللہ اور قیامت پر ایمان رکھنا یہ بتاتا ہے کہ جو کرے گا وُہ بھرے گا۔ اگر تمہیں بھی کوئی بُرا کہے تو ہو سکے تو چپ رہو کہ اس کی جزا آج نہیں تو کل اس کو مل رہے گی۔ ایک دفعہ آپ نے بار بار دوزخ کا ذکر فرمایا اور روئے انور پر اس کی تکلیفوں کے تصور سے اثر ظاہر ہوا۔ پھر ارشاد فرمایا "دوزخ سے بچو اگرچہ چھوہارے کے ایک ٹکڑے کی خیرات سے ہو اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کوئی اچھی بات سے[3]"۔

ایک دفعہ آپ نے جنّت کا ذکر فرمایا اور اس کی خوبی اور وسعت کو بیان کیا۔ ایک بدوی صحابی مجلس میں حاضر تھے۔ بے تابانہ بولے کہ "یا رسُول اللہ یہ جنت کس کو ملے گی"؟ فرمایا "جس نے خوش کلامی کی، بھوکوں کو کھلایا، اکثر روزے رکھے اور اس وقت نماز پڑھی جب دُنیا سوتی ہو[4]"۔

---

[1] ترمذی باب کتاب البر والصلۃ باب ما جاء فی اللعنۃ [2] صحیح مسلم کتاب الایمان [3] صحیح بخاری باب طیب الکلام [4] ترمذی باب ما جاء فی قول المعروف۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا "اچھی بات صدقہ ہے"[1]۔ یعنی جس طرح صدقہ دے کر کسی غریب کی حاجت روائی اور دلجوئی کی جاتی ہے اسی طرح زبان کی مٹھاس سے اس کے زخموں پر پھاہا رکھا جا سکتا ہے اور سچی سعی و سفارش سے اس کو مدد پہنچائی جا سکتی ہے۔

ایک صحابی نے پوچھا کہ "یا رسول اللہ! نجات کیوں کر ملے؟" فرمایا "اپنی زبان پر قابو رکھو اور تمہارے گھر میں تمہاری گنجایش ہو اور اپنے گناہوں پر رویا کرو"[2]۔ ایک دفعہ ایک صحابی نے پوچھا "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو مجھ پر سب سے زیادہ کس چیز کا ڈر ہے؟" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبانِ مبارک کو پکڑ کر فرمایا "اس کا ڈر ہے"[3]۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الصلح۔ [2] و [3] ترمذی باب حفظ اللسان۔

ایثار

یہ درحقیقت فیاضی کا سب سے بڑا اور آخری درجہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دُوسروں کی ضرورتوں کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھا جائے۔ خود بھوکا رہے اور دُوسروں کو کھلائے، خود تکلیف اُٹھائے اور دُوسروں کو آرام پہنچائے۔

صحابہ کرام میں انصار کا سب سے بڑا اخلاقی وصف یہی تھا کہ مکّہ کے مہاجر جب بے خانماں ہو کر اور اپنا سب کچھ مکّہ میں چھوڑ کر مدینہ آئے تو انصار نے اُن کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اُن کو اپنے گھر دیئے، باغ دیئے، کھیت دیئے، اپنی محنتوں میں اُن کو شریک[1] کیا اور خود ہر طرح کی تکلیفیں اُٹھا کر اُن کو آرام پہنچایا۔ پھر جب بنی نضیر کی زمین مسلمانوں کے ہاتھ آئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے دو انصاریوں کے سوا باقی ساری زمین مہاجروں کو دے دی تو انصار نے ہنسی خوشی اس فیصلہ کو تسلیم کر لیا۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا بہت پسند آئی اور اُن کی مدح وستائش[2] کی:

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَ الْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ	اور ان کے واسطے جنہوں نے ان (مہاجروں کی آمد) سے پہلے اس مقام (مدینہ) میں

---

[1] صحیح بخاری ج اوّل مناقب انصار [2] تفسیر آیت ذیل ابن جریر طبری۔

مَنْ هَاجَرَ اِلَیْهِمْ وَلَا یَجِدُوْنَ فِیْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ کَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ؕ وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝

(الحشر: ۹)

اور ایمان میں جگہ پکڑی اور محبت رکھتے ہیں اس سے جو اپنا گھر چھوڑ کر ان کے پاس چلا آیا اور ان (مہاجروں) کو دیئے جانے سے دل میں کوئی مطلب نہیں رکھتے اور اپنے اوپر تنگی ہی کیوں نہ ہو (ان مہاجر بھائیوں کو) اپنے سے مقدّم رکھتے ہیں۔ اور جو شخص اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ رکھا جائے تو ایسے ہی لوگ فلاح پائیں گے۔

بحرین جب فتح ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے انصار کو بلا کر فرمایا کہ میں اس کو انصار کی جاگیروں میں تقسیم کر دینا چاہتا ہوں۔ ان ایثار کے پیکروں نے عرض کی "جب تک ہمارے مہاجر بھائیوں کو بھی آتنا ہی نہ ملے ہم کو یہ منظور نہیں"۔ فرمایا "اگر یہ منظور نہیں تو صبر کرو۔ میرے بعد تم کو یہ تکلیف پہنچے گی کہ لوگ لے لیں گے اور تم کو نہیں پوچھیں گے۔"[1]

ایک دفعہ ایک مسلمان خاتون نے اپنے ہاتھ سے ایک چادر بُن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں پیش کی۔ آپ نے ضرورت مند ہو کر اس کے اس تحفہ کو قبول کر لیا۔ اسی وقت ایک غریب مسلمان نے عرض کی "یا رسُول اللہ! یہ مجھے عنایت ہو"۔ آپ نے اسی وقت اتار کر اُن کے حوالہ کر دی۔ صحابہ نے اُن کو ملامت کی کہ تم جانتے تھے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو اس کی حاجت تھی اور آپ کسی کا سوال رد نہیں فرماتے تم نے کیوں مانگ لی۔ بولے "ہاں میں

---

[1] صحیح بخاری اول باب مناقب انصار۔

نے تو برکت کے لیے لی ہے کہ یہی چادر میرا کفن بنے۔[1]

ایک دفعہ ایک بھوکا آدمی رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں آیا۔ کاشانۂ نبویؐ میں اس وقت پانی کے سوا کچھ نہ تھا اس لیے آپ نے فرمایا جو شخص آج کی رات اس کو اپنا مہمان بنائے گا خدائے تعالیٰ اس پر رحم فرمائے گا۔ یہ سعادت ایک انصاری کو حاصل ہوئی اور وہ اس کو اپنے گھر لے گئے اور بیوی سے پوچھا کہ گھر میں کچھ ہے؟ بولیں "صرف بچوں کا کھانا"۔ بولے "بچّوں کو سلا دو اور چراغ کو بجھا دو۔ ہم دونوں رات بھر بھوکے رہیں گے البتہ مہمان پر ظاہر کریں گے کہ کھا رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ صبح کو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا" خدا تعالیٰ تمہارے اس حُسنِ سلوک سے بہت[2] خوش ہوا"۔

بعض رُوایتوں میں ہے کہ اوپر کی آیت میں انصار کے جس ایثار کی تعریف کی گئی ہے اس کا اشارہ اسی واقعہ کی طرف[3] ہے۔ لیکن قرآنِ پاک کا سیاق و سباق عموم کو چاہتا ہے جس میں یہ واقعہ اور اسی قسم کے دُوسرے واقعے بھی شامل ہوں گے۔

---

[1] صحیح بخاری باب حسن الخلق والسخا۔ و باب من استعد الکفن۔ [2] صحیح مسلم کتاب الاشربہ باب اکرام الضیف وفضل ایثارہ۔ و صحیح بخاری تفسیر سورۂ حشر [3] صحیح مسلم کتاب الاشربہ باب اکرام الضیف وفضل ایثارہ۔

اعتدال اور میانہ روی

یہ اسلامی اخلاق کا وُہ باب ہے جس میں وُہ منفرد ہے۔ اسلام کی خاص خوبی یہ ہے کہ اس کا راستہ اکثر مسئلوں میں افراط و تفریط کے بیچ سے نکلا ہے۔ قرآن پاک نے مُسلمانوں کو اُمَّۃً وَّسَطًا (بیچ کی امت) کا خطاب جن وجوہ سے دیا ہے اُن میں ایک یہ بھی ہے کہ ان کا مذہب افراط و تفریط کے درمیان ہے۔[1] اِس لیے اُس نے اکثر معاملوں میں اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم دی ہے۔ انتہا یہ ہے کہ عبادات میں بھی اس اصول کو وُہ نہیں بھولا ہے:

دعا یا نماز میں ہماری آواز کتنی ہو، ارشاد ہے:

وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا	اور تو نہ پکار اپنی دعا (یا نماز) میں اور نہ چُپکے پڑھ اور ڈھونڈ لے اس کے بیچ میں راہ۔
(بنی اسرآئیل: ۱۱۰)	

یعنی نہ چلا کر دعا کی جائے یا نماز پڑھی جائے کہ نمایش ہو جائے یا مخالف اس کو سُن کر بُرا بھلا کہے۔ اور نہ بالکل چُپکے چُپکے کہ ساتھ والے بھی نہ سُن سکیں بلکہ دونوں کے بیچ کی راہ اختیار کی جائے۔

---

[1] تفسیر کبیر فخر رازی تفسیر آیت مذکور (بقرہ: ۱۴۳)

ہماری چال ڈھال کیسی ہو اس کی نسبت حضرت لقمان کے نصائح میں ہے:

وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ (لقمان: ۱۹) اور چل بیچ کی چال۔

یعنی اتنی تیز نہ ہو کہ چال میں متانت اور وقار باقی نہ رہے اور نہ اتنی دھیرے ہو کہ ریاکار زاہدوں کی نمائشی[1] چال بن جائے۔

سخاوت اور فیاضی سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ سارے مذہبوں نے اس کی تاکید پر تاکید کی ہے اور جو جس قدر زیادہ لٹا سکے اسی قدر وہ تعریف کے قابل سمجھا گیا ہے۔ لیکن اسلام نے اس راہ میں بھی بے اعتدالی سے پرہیز کیا ہے اور اس کو اچھا نہیں سمجھا ہے کہ دوسروں کو دے کر تم خود اتنے محتاج بن جاؤ کہ بھیک مانگنے کی نوبت آجائے اور محتاجوں میں ایک نئے محتاج کا اور اضافہ ہو جائے۔ فرمایا:

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً إِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ○ (بنی اسرائیل: ۲۹)	اور نہ تو اپنا ہاتھ اپنی گردن میں باندھ لے اور نہ اس کو بالکل کھول دے کہ تو بیٹھ جائے ملامت کا نشانہ بن کر تھکا ہارا۔

مسلمانوں کی اخلاقی خصوصیتوں کے سلسلہ میں کہا:

وَالَّذِيْنَ إِذَآ أَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ○ (الفرقان: ۶۷)	اور جو خرچ کریں تو فضول خرچی نہ کریں اور نہ بہت تنگی کریں اور رہو اس کے درمیان اعتدال سے۔

---

[1] دیکھو ابن جریر طبری و روح المعانی۔

یعنی نہ اسراف ہو نہ بخل ہو۔ درمیان کی چال ہو۔

صحیح بخاری میں ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

اکلفوا من الاعمال ما تطیقون	اتنا ہی عمل کا التزام کرو جتنا تم کرسکو۔

"عمل" کا لفظ گو یہاں عام ہے مگر شارحین کے نزدیک اس سے مراد نماز روزہ وغیرہ عبادتیں ہیں[1]۔ مقصُود یہ ہے کہ فرائض کے بعد نوافل کا اتنا ہی بوجھ اُٹھاؤ جس کو تم آسانی سے اُٹھا سکو اور آخر دم تک نباہ سکو۔ دُوسری اور حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم صرف عبادات تک محدود نہیں بلکہ وُہ زندگی کے ہر شعبہ تک وسیع ہے۔ مسند بزار میں حضرت حذیفہؓ صحابی کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا[2]:

ما احسن القصد فی الغنیٰ ما	دولت مندی میں درمیانگی کتنی اچھی ہے۔
احسن القصد فی الفقر ما	محتاجی میں درمیانگی کتنی اچھی ہے۔ عبادت
احسن القصد فی العبادۃ	میں درمیانگی کتنی اچھی ہے۔

غرض یہ ہے کہ نہ اتنا دولتمند ہو کہ انسان قارونِ وقت بن کر حق سے غافل ہو جائے نہ اتنا محتاج ہو کہ پریشان خاطر ہو کر حق سے محروم رہ جائے۔ لوگ دولت مند ہو کر اس قدر شان وشکوہ، عزّوجاہ اور عیش وتنعّم کی زندگی بسر کرنے لگتے ہیں کہ اعتدال سے خارج ہو جاتے ہیں۔ اور بعض لوگ محتاج ہو کر اس قدر دُنی اور متبذل ہو جاتے ہیں کہ صبر اور خودداری اور تمام شریفانہ اوصاف کھو دیتے ہیں۔ یہ بھی بے اعتدالی ہے۔ ان دونوں حالتوں میں اسلام کی معتدل تعلیم یہ ہے کہ دولتمندی کی حالت میں نہ حد سے زیادہ بلند ہونا چاہیے نہ محتاجی کی حالت میں اپنی حیثیت سے گرجانا چاہیے۔

---

[1] فتح الباری جلد ۱۱ صفحہ ۲۵۶ [2] بروایت کنز العمال جلد ثانی صفحہ ۷ حیدر آباد دکن۔

عبادت سے بڑھ کر اسلام میں کوئی نیکی کا کام نہیں۔ اسلام نے اس میں بھی اعتدال کو ملحوظ رکھا ہے۔ نہ اتنی زیادہ ہو کہ آدمی دوسرے دھندوں کے لائق نہ رہے اور نہ اتنی کم ہو کہ حق سے غفلت ہو جائے۔ حضرت عثمان بن مظعونؓ کا واقعہ سیرت میں کئی دفعہ گزر چکا ہے کہ انہوں نے جب راتیں نمازوں اور دن روزوں میں بسر کرنا شروع کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو منع کیا اور اعتدال کی تاکید کی اور فرمایا کہ تمہارے ذمہ اور بھی حق ہیں۔

خودداری یا عزّتِ نفس

یہ وُہ اخلاقی وصف ہے جس سے انسان اپنی عزّت، اپنی شان، اپنے مرتبہ اور اپنی حیثیت کی حفاظت کرتا ہے۔ زندگی میں اس کے موقعے کثرت سے پیش آتے ہیں۔ اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے ملنے جلنے، کھانے پینے، اوڑھنے پہننے غرض مُعاشرتی زندگی کے تمام حالات میں انسان کو اپنی حیثیت اور عزّت کے محفوظ رکھنے کے لیے اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس میں یہ وصف نہ ہوگا اس میں نہ نظر کی بلندی ہوگی، نہ خیال کی رفعت، نہ اخلاق کی اُونچائی، نہ لوگوں کی نگاہوں میں اس کی عزّت ہوگی، نہ اس کی باتوں کا لحاظ کیا جائے گا اور نہ اس کی طرف لوگ متوجہ ہوں گے اور نہ اس کو کسی مجلس میں وقار حاصل ہوگا۔

یہ عزّت و وقار سب سے پہلے اُس بلند و برتر ذاتِ الٰہی میں ہے جو ساری عزّتوں کا مرکز ہے۔ چنانچہ قرآنِ پاک میں بہتّر موقعوں پر اللہ تعالیٰ کا نام عَزِیزٌ لیا گیا ہے۔ عزیز کے معنی ہیں عزّت والا[1]

---

[1] عزّة کا لفظ قرآن میں شدّت، غلبہ، عزّ و شرف اور نخوت (حمیّت) کئی معنوں میں آیا ہے۔ اس لیے ہر جگہ اس کے وُہ معنی لیے جائیں گے جو سیاق و سباق کے مناسب ہوں۔ اس کا اصل مفہوم جو اس کے سب معنوں میں مشترک ہے یہ ہے: کسی کا ایسی حالت و منزلت میں ہونا کہ اس کو کوئی دبا نہ سکے۔ (دیکھو لسان العرب و مفردات راغب اصفہانی و ابن جریر طبری آیات عزت و سورۂ بقرہ و نساء، و صٓ و منافقون)۔

اور غالب کہیں کہیں عَزِیزٌ کے ساتھ قَوِیٌّ (قوت والا) یا مُقْتَدِرٌ (اقتدار والا) بھی کہا گیا ہے۔

اس لیے اصلی عزت اُسی کی ہے اور وہی سچی عزت ہے جو اُس کے وسیلہ سے حاصل ہو۔ اسلام جب کمزور تھا تو منافق لوگ اِدھر مسلمانوں کی دوستی کا دم بھرتے تھے اور اُدھر کافروں کی ظاہری شان و شوکت اور جاہ و عزت کے سبب سے اُن کی دوستی کے بھی طلبگار تھے تو اللہ تعالٰی نے اُن کے خیال کے دھوکے کو اس حقیقت کی روشنی میں کھول دیا:

اَیَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ	کیا یہ اُن کے پاس عزت چاہتے ہیں
فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا ○	تو قطعی بات تو یہ ہے کہ عزت ساری
(النسآء: ۱۳۹)	خدا کے واسطے ہے۔

فرمایا اگر عزت کی تلاش ہے تو وہ خدا کے پاس ہے:

مَنْ كَانَ یُرِیْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ	جو عزت چاہے تو عزت تو ساری
الْعِزَّةُ جَمِیْعًا ؕ	اللہ کی ہے۔
(الفاطر: ۱۰)	
تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ	(اے خدا!) تو جس کو چاہے عزت
تَشَآءُ ؕ (آل عمران: ۲۶)	دے اور جس کو چاہے ذلت دے۔

ایک دفعہ ایک غزوہ میں منافقوں کے سردار نے یہ کہا کہ مدینہ لوٹ کر مدینہ کے معززان ذلیل لوگوں یعنی مسلمانوں کو یا (نعوذ باللہ) محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو نکال دیں گے۔ اللہ تعالٰی نے اس کے جواب میں فرمایا:

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ	اور عزت تو اللہ کے لیے ہے اور اس

وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (المنافقون: ۸) — کے رسُول کے لیے اور ایمان والوں کے لیے لیکن منافق نہیں جانتے۔

اس آیتِ پاک نے مسلمانوں کو ایمان کی وُہ عزّت بخشی ہے جو کبھی چھینی نہ جائے گی. اس لیے ہر مسلمان کا سر ہر باطل کے سامنے اُونچا رہنا چاہیے اور اس کو اپنی دینی خود داری کو ہر وقت محسوس کرنا چاہیے۔ اور اسی لیے اس کو بہترین اخلاق کا نمونہ بن کر دنیا کے سامنے آنا چاہیے۔ تعلیمِ محمدؐی کے اثر سے صحابہ کے دل اس صحیح خود داری کے احساس سے ہمیشہ معمور رہتے تھے۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضرت عمرؓ نے جب کفّار کے ساتھ صلح کی شرائط پر جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے منظور فرما لیا تھا اعتراض کرنے کی جرأت کی تو یہی جذبہ اُن کے اندر کام کر رہا تھا۔ حضرت عُمرؓ نے کہا "یا رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کیا ہم حق پر اور یہ کافر باطل پر نہیں ہیں؟" ارشاد ہوا "بیشک ایسا ہی ہے۔" عرض کی "تو پھر ہم یہ مذہبی ذلّت کیوں برداشت کریں[1]" ارشاد ہوا "میں خدا کا رسُول ہوں اور اس کے حکم کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔" حضرت عمرؓ کی محدود نظر جہاں تک کام کر رہی تھی رسُولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلّم کی نظر اس کے بہت آگے تھی۔ اور واقعہ نے فیصلہ کیا کہ خدا کا حکم بڑی مصلحت پر مبنی تھا۔

غزوۂ خندق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے انصار کے سر سے جنگ کو ٹالنے کے لیے قبیلۂ غطفان کو اس شرط پر واپس کرنا چاہا کہ ان کو مدینہ کی پیداوار (کھجور) کا تہائی حصّہ ہر سال دیا جایا کرے گا۔ لیکن جب انصار کے سرداروں کو بُلا کر آپ نے مشورہ کیا تو انہوں نے عرض کی:

"یا رسُولَ اللہ جب ہم بتوں کی پوجا کرتے تھے اور خدا سے بے خبر تھے تب تو اُن

---

[1] صحیح بخاری باب الشروط فی الجہاد۔

کو ہم سے لینے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اور اب جب کہ خدا نے ہم کو اسلام کی عزت بخشی ہے اور اس کے اور حضورؐ کے بدولت ہم عزت پا چکے ہیں ہم ان کو یوں اپنا مال دینا منظور کریں گے؟ خدا کی قسم ہمیں اس معاہدہ کی ضرورت نہیں[1]۔"

صحابۂ کرام جب خلافت کے زمانہ میں قیصر و کسریٰ کے مقابلہ میں صف آرا تھے اُن کی اسلامی خودداری کا یہ عالم تھا کہ معمولی سے معمولی مسلمان قیصر و کسریٰ کے درباروں میں بے دھڑک چلا جاتا تھا اور دلیری و آزادی سے سوال و جواب کرتا تھا۔ مسلمان جب تک مسلمان رہے یہی خیال ان کی ہر قسم کی حوصلہ مندیوں اور اولوالعزمیوں کا باعث تھا۔ اور ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد آج بھی ہر مسلمان بحیثیت مسلمان کے اپنی مذہبی عزت اور خودداری کا احساس رکھتا ہے۔ اور یقین رکھتا ہے کہ بحیثیت مسلمان کے اس کا پایہ بہت بلند ہے اور ہر وقت اس کے کان میں یہ آواز آتی رہتی ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (آل عمران: ۱۱۰)	تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی ہدایت) کے لیے ظہور میں لائی گئی۔

ایک شخص نے حضرت امام حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے عرض کی لوگ کہتے ہیں کہ آپ میں غرور ہے۔ فرمایا "غرور نہیں۔ خودداری (عزت) ہے۔ یہ (اسلام) وہ عزت ہے جس کے ساتھ ذلت نہیں اور وہ دولت ہے جس کے ساتھ مفلسی نہیں۔" پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ[2] ۔ ایک مسلمان صالحہ بی بی کے کپڑے پرانے تھے تو بولیں "کیا میں مسلمان نہیں، یہ وہ عزت ہے جس کے ہوتے ذلت نہیں اور وہ دولت ہے جس کے ساتھ افلاس نہیں۔"

---

[1] سیرۃ ابن ہشام و تاریخ طبری ذکر واقعہ احزاب۔ [2] المنافقون: ۸۔

شیخ ابو حفص سہروردی کہتے ہیں کہ "خودداری (عزّت) غرور سے الگ چیز ہے کیونکہ خودداری اپنی ذات کی حیثیت کو جاننے اور اس کی عزت کرنے کا نام ہے کہ وُہ فانی باتوں کی پستی میں نہ پڑ جائے۔ اور غرور اپنی ذات کی اصلی حیثیت کو فراموش کر جانے اور اس کو اس کی جگہ سے اُوپر لے جانے کو کہتے ہیں[1]۔"

یہ خودداری عین شرافت ہے۔ جس میں یہ خودداری نہیں لوگوں کی آنکھوں میں اس کا وقار نہیں۔ اس وقار اور خودداری کے لیے اگر ہاتھ میں قدرت نہ ہو یا مصلحت نہ ہو تو بہت سی باتوں سے اعراض اور درگذر کرنا پڑتا ہے۔ قرآن میں سچے مسلمانوں کے وصف کے سلسلہ میں ہے:

وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا۝ (الفرقان:۷۲)

اور جب وُہ ہو نکلیں بے ہودہ باتوں کی طرف سے تو گزر جائیں شریفانہ۔

یعنی اس شریفانہ انداز، رکھ رکھاؤ اور خودداری کی شان سے گزر جائیں کہ نہ وُہ آپ اُدھر متوجہ ہوں اور نہ اُن شریروں کو اُنہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی ہمت پڑے۔

اس اخلاقی خودداری اور شریفانہ رکھ رکھاؤ کی حفاظت کی خاطر قدم قدم پر اپنی ایک ایک بات پر نظر رکھنی پڑتی ہے۔ چال ڈھال، بول چال، لباس ہر چیز سے شرافت کا اظہار ہو لیکن اس احتیاط کے ساتھ ہو کہ اوچھا پن یا تنگ ظرفی یا غرور و نمایش کی بو تک نہ آئے یعنی اس میں اپنی بڑائی اور دُوسروں کی تحقیر کا جز شامل نہ ہو۔ یہی چیز ہے جس سے خودداری، غرور اور نمایش میں فرق و امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جس شخص کے دل میں ذرّہ بھر بھی غرور ہو گا وہ جنت میں داخل نہ ہو گا۔" اس پر ایک

---

[1] یہ اقوال امام رازی اور صاحب روح المعانی نے سورہ منافقوں کی آیت وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ کی تفسیر میں لکھے ہیں۔

شخص نے کہا کہ "مجھے اچھا کپڑا اور اچھا جوتا بہت پسند ہے۔" مطلب یہ کہ یہ تو غرور میں داخل نہیں۔ ارشاد ہوا کہ "خدا تو خود ہی جمال کو پسند کرتا ہے۔ غرور یہ ہے کہ حق کا انکار کیا جائے اور لوگوں کی تحقیر کی جائے۔"[۱]

اسلام میں صاف ستھرے رہنے کا جو حکم ہے طہارت اور پاکیزگی کے علاوہ اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ مسلمان دوسروں کی نظر سے گرنے نہ پائے کیونکہ گندہ آدمی سے ہر ایک کو نفرت ہوتی ہے۔ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا جس کے سر کے بال الجھے ہوئے تھے تو فرمایا "کیا اس کے پاس بال کے ہموار کرنے کا سامان نہ تھا؟" ایک شخص کے کپڑے میلے دیکھے تو فرمایا "کیا کپڑے دھونے کے لیے اس کو پانی میسر نہ تھا؟" ایک شخص آپؐ کی خدمت میں نہایت کم حیثیت کپڑے پہن کر آیا۔ فرمایا "تمہارے پاس کچھ مال ہے؟" اس نے کہا "اونٹ بکری، گھوڑے، غلام، سب کچھ ہیں۔" ارشاد ہوا کہ "جب خدا نے تم کو مال دیا ہے تو خدا کے فضل و احسان کا اثر تمہارے جسم سے بھی ظاہر ہونا چاہیے۔"[۲]

خودداری کا سب سے بڑا مظہر وقار یعنی سنجیدگی اور متانت ہے۔ اسی لیے اسلام نے ہر حالت میں وقار کے قائم رکھنے کی ہدایت کی ہے۔ نماز سے زیادہ اور کون سی عبادت ضروری ہو سکتی ہے لیکن اس کے متعلق بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اذا سمعتم الاقامة فامشوا	جب تم اقامت سنو تو نماز کے لیے
الی الصلاة وعلیکم بالسکینة	سکون اور وقار کے ساتھ چلو۔ جلدی
والوقار ولا تسرعوا[۳]	نہ کرو۔

---

[۱] ترمذی ابواب البر والصلة باب ما جاء فی الکبر [۲] ابوداؤد کتاب اللباس باب فی غسل الثوب وفی الخلقان۔

[۳] بخاری کتاب الصلوٰۃ باب لا یسعی الی الصلاة ولیأتها بالسکینة والوقار۔

لوگوں کا یہ حال ہے کہ جب تکبیر سنتے یا رُکوع میں جاتے ہوئے امام کو دیکھتے ہیں تو بے تحاشا بھاگتے ہیں کہ رکعت نہ چلی جائے۔ مگر یہ چیز متانت کے خلاف ہے اور اسی لیے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس سے منع فرمایا۔ آہستہ چلنا، نگاہ کا جھکائے رکھنا، آواز کا پست کرنا اور اِدھر اُدھر نہ دیکھنا اس وقار میں داخل ہے۔

وقار ایک نہایت جامع لفظ ہے اور اس میں بہت سی چیزیں شامل ہیں۔ ابوداؤد نے کتاب الادب باب الوقار میں یہ حدیث نقل کی ہے:

الھدی الصالح والسمت الصّالح	نیک طور طریق، نیک انداز اور
والاقتصاد جزء من خمسة و	میانہ روی، نبوّت کے پچیس اجزا میں
عشرین جزء من النبوّة	سے ایک جزء ہے۔

کیونکہ ان ہی اخلاقی خوبیوں کے ذریعہ سے کسی شخص کو وقار حاصل ہوتا ہے۔ اور وہ خود بھی ان خوبیوں کے بدولت اپنے اندر اخلاقی احساس کو بیدار کر کے خود دار بنتا ہے۔

صحیح بخاری میں ایک اور لفظ دَلّ کا ہے۔ اور ان تمام الفاظ کے معنی یہ ہیں کہ انسان رفتار، گفتار، شکل وصورت، وضع ولباس اور اپنی عام روش میں باوقار رہے اور نیک مسلمانوں کا طور وطریقہ اختیار کرے۔ اسلام نے خصائل فطرت یعنی ناخن اور مونچھ کے ترشوانے اور ختنہ کرانے کا جو حکم دیا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ اس سے انسان باوقار شکل میں نظر آتا ہے۔ سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے یہ روش اختیار کی تو خدا سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ ارشاد ہوا "وقار"۔ بولے "خداوندا میرے وقار کو اور بڑھا۔"[1]

فقر وفاقہ کی حالت یا حرص وطمع کے موقع پر انسان سے جو خودداری ظاہر ہوتی ہے اس

---

[1] ادب المفرد باب الختان للکبیر۔

کا نام شریعت کی اصطلاح میں تعفف اور استعفاف ہے اور شریعت میں وُہ ایک قابل ستائش اخلاقی وصف ہے۔ اور اسی وصف کے ساتھ متصّف ہونے کی بنا پر خداوندِ تعالیٰ نے اصحابِ صفہّ کی خاص طور پر تعریف کی ہے:

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ط (البقرۃ : ۲۷۳)	(خیرات تو) اُن حاجتمندوں کا حق ہے جو اللہ کی راہ میں گھرے بیٹھے ہیں، ملک میں کسی طرف کو جا نہیں سکتے۔ بے خبر اُن کی خود داری (کی وجہ) سے اُن کو غنی سمجھتا ہے۔ تو (اُن کو دیکھے تو) اُن کی صوُرت سے اُن کو (صاف) پہچان جائے (کہ محتاج ہیں) وُہ لپٹ کر لوگوں سے نہیں مانگتے۔

اس آیت میں فقر و فاقہ کی حالت میں خود داری کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا گیا ہے اس کا اندازہ اس آیت کے بعض فقروں کی تفسیر سے ہو سکتا ہے۔ صاحبِ کشافؒ نے لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا کی تفسیر میں لکھا ہے کہ "وُہ سوال تو کرتے ہیں، لیکن لجاجت و اصرار کے ساتھ نہیں کرتے بلکہ نرمی کے ساتھ کرتے ہیں"۔ لیکن امام رازیؒ نے لکھا ہے کہ یہ صحیح نہیں کیونکہ جب خدا نے خود ہی بیان کر دیا ہے کہ اُن کی خود داری کی وجہ سے جو لوگ اُن کے حال سے ناواقف ہیں اُن کو دولت مند سمجھتے ہیں تو پھر سوال کرنے کے کیا معنی؟ اصحابِ صفہّ صاحبِ احتیاج ہونے کے باوجود اس لیے سوال نہیں کرتے تھے کہ وُہ اپنے آپ کو سخت تکلیفوں میں مبتلا کر کے سوال سے باز رہنے کی طاقت رکھتے تھے۔ جو شخص زبان سے خاموش رہتا ہے لیکن اپنی حاجت

سے فقر و فاقہ کا اظہار کرتا ہے تو اس کی یہی خاموشی لجاجت و اصرار کا سوال ہے۔ کیونکہ حاجت کی علامتوں کا ظہور حاجت پر دلالت کرتا ہے اور خاموشی اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ اس کے پاس حاجت کے پورا کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ اس لیے جب انسان کسی کی یہ حالت دیکھتا ہے تو اس کے دل میں رحم کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ اس کو کچھ دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس لیے یہ حالت خود لجاجت و اصرار کا سوال ہے۔ پس جب خدا یہ کہتا ہے کہ اصحاب صفّہ لوگوں سے لجاجت واصرار کے ساتھ سوال نہیں کرتے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ زبان سے تو سوال ہی نہیں کرتے لیکن اس کے ساتھ اپنے پھٹے حال کا بھی اظہار نہیں ہونے دیتے جو لجاجت کے ساتھ سوال کرنے کا قائم مقام ہے۔ بلکہ لوگوں کے سامنے نہایت اچھی حالت میں نمایاں ہوتے ہیں اور اپنے فقر و فاقہ سے خدا کے سوا کسی کو واقف نہیں ہونے دیتے[1]۔

سوال کی سب سے مبتذل صورت گداگری ہے اور اسلام نے گداگری کی نہایت شدت سے ممانعت کی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ "جو شخص ہمیشہ بھیک مانگتا رہتا ہے وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت کا ایک ٹکڑا بھی نہ ہوگا۔" یہ اُس کی اس حالت کی تمثیل ہوگی کہ دنیا میں اس نے اپنی خودداری کو قائم نہیں رکھا اور اپنی عزّت و آبرو گنوا دی تھی۔ چند انصار نے جو بہت ہی غریب تھے، رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ مانگا۔ آپ نے دے دیا۔ پھر سوال کیا اور آپ نے پھر دیا۔ لیکن جب سب مال ختم ہوچکا تو فرمایا کہ "میرے پاس جو کچھ ہوگا میں تم سے بچا کر اس کو جمع نہ کروں گا۔ جو شخص خدا سے خودداری کی خواہش کرتا ہے خدا اس کو خوددار بناتا ہے اور جو شخص خدا سے بے نیازی کی آرزو کرتا ہے خدا اس کو بے نیاز کرتا ہے اور جو شخص صبر کرنا چاہتا ہے خدا اس کو صبر دیتا ہے۔ خدا نے صبر

---

[1] تفسیر کبیر جلد ثانی ص ۵۲۶ و ۵۲۷۔

سے بڑا عطیہ کسی کو نہیں دیا۔"

فقر و فاقہ کی حالت میں عام آدمیوں سے اعانت کی درخواست کرتے پھرنا بھی خود داری کے منافی ہے۔ اسلام نے اس کی بھی ممانعت کی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "جو شخص محتاج ہو کر اپنی احتیاج کو انسانوں کے سامنے پیش کرتا ہے اس کی احتیاج دور نہیں ہوتی۔ لیکن جو شخص اس کو خدا کے سامنے پیش کرتا ہے ممکن ہے کہ خدا اس کو بے نیاز کر دے خواہ مرگِ ناگہانی کے ذریعہ سے، خواہ فوری مال کے ذریعہ سے۔"

روز مرہ کے معمولی کاموں میں لوگ ایک دوسرے سے اعانت کی درخواست کرنا بُرا نہیں جانتے لیکن کمال خود داری یہ ہے کہ اس قسم کی باتوں میں بھی احتیاط قائم رہے۔ مثلاً اگر ایک شخص کسی سے کہے کہ ٹوپی اٹھا دو، میز پر کتاب رکھ دو تو گو بظاہر یہ سوال خود داری کے منافی نہیں معلوم ہوتا لیکن اگر وہ ناگواری یا سختی سے اس کا انکار کر دے تو یقیناً اس شخص کی خود داری کو صدمہ پہنچے گا۔ اسی لیے کمالِ خود داری یہ ہے کہ اس قسم کی درخواستوں سے بھی احتراز کیا جائے۔ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ لوگوں سے چند باتوں پر بیعت لی جن میں ایک بات یہ تھی:

لاتسئلوا الناس شیئاً۔ تم کسی سے کوئی چیز نہ مانگنا۔

ان میں سے بعض صحابہ نے اس شدت سے اس کی پابندی کی کہ زمین پر اُن کا کوڑا گر جاتا تھا تو بھی کسی سے اس کے اٹھانے کی درخواست نہیں کرتے تھے۔

ایک دفعہ ایک محتاج آدمی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرنے کی اجازت طلب کی۔ آپ نے پہلے تو اس کی اجازت ہی نہیں دی پھر فرمایا کہ "اگر تم کو سوال ہی کرنا ہے[1] تو

---

[1] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ باب کراہیۃ المسألۃ و باب فی الاستعفاف میں یہ کل حدیثیں ہیں۔

صالحین سے سوال کرو"۔ صالحین کی تخصیص غالبًا اسی لیے کی گئی ہے کہ یہ لوگ باعزت طریقہ پر سوال پورا کریں گے ورنہ رفق وملاطفت کے ساتھ اس کو رد کردیں گے۔

ان تمام تصریحات سے واضح ہے کہ ایک مسلمان کے لیے اسلام اور ایمان کی نعمت وُہ عزت اور وُہ دولت ہے جس کے مقابلہ میں ساری نعمتیں اور دولتیں ہیچ ہیں۔ جو مُسلمان ہے وُہ خدا کے سوا کِسی کی پروا نہیں کرتا، وُہ کِسی کے سامنے نہیں جُھکتا، وُہ کِسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا، اور بحیثیت مسلمان کے وُہ اپنا پایہ ساری دُنیا سے بلند سمجھتا ہے اور یہ یقین رکھتا ہے کہ عزّت صرف خدا کے لیے ہے اور اس کی عطا سے رسُول کے لیے ہے اور اس کے واسطے سے مسلمانوں کے لیے ہے۔ اس خودداری کو قائم رکھنا اسلام کی عزّت کو قائم رکھنا ہے۔ اور اسی فیضِ تعلیم کا یہ اثر ہے کہ آج بھی ہماری زبان پر یہ فقرہ چڑھا ہے کہ جب ہم کِسی مسلمان کو عار دلانا چاہتے ہیں تو یہ کہہ کر اس کی اسلامی خودداری کو بیدار کرتے ہیں کہ "مسلمان ہو کر ایسا کرتے ہو"۔ گویا مسلمان ہونا ایک ایسی عزّت ہے جس کے برقرار رکھنے کے لیے اس کو ہر قسم کی بُرائی سے پاک اور ہر دنارت اور پستی کے کام سے بلند ہونا چاہیے۔

اس باب کا خاتمہ ہم ایک خاص واقعہ پر کرنا چاہتے ہیں، جس سے اسلامی خودداری کی حقیقت ظاہر ہو گی کہ وُہ تزک واحتشام، تکلّف وتصنّع اور جاہ وحشم کی نمایش کا نام نہیں بلکہ یہ ہے کہ نفس کے تواضع اور دِل کی خاکساری کے ساتھ اسلام کی عزّت اور حق کا فخر اس کو اتنا اونچا کردے کہ اگر وہ غریب ومفلس اور کمزور بھی ہو تو وہ ہر ظاہری قوّت کے سامنے بے نیاز اور باطل طاقت کے مقابلہ میں سربلند رہے۔ اور اگر وہ صاحبِ امارت وحکومت ہو تو اپنے رعب ودبدبہ کے لیے ظاہری نمایشی چیزوں کے بجائے حق کی طاقت کو کافی سمجھے۔ بیت المقدس کی فتح کے موقع پر حضرت عمرؓ رومیوں سے بیت المقدس کی کنجی لینے کو شام

جا رہے تھے۔ جب شہر کے قریب پہنچے تو سپہ سالارِ اسلام حضرت ابو عبیدہؓ کچھ مسلمانوں کو لے کر استقبال کو نکلے۔ جب یہ جلوس ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں کچھ پانی تھا تو حضرت عمرؓ ناقہ سے اتر آئے۔ پاؤں سے چرمی موزے نکال کر اپنے کندھے پر ڈال لیے اور ناقہ کی مہار پکڑ کر پانی میں گھسے۔ اور اسی شان سے اسلام کا فرمانروا رومیوں کے مقدّس شہر میں داخل ہونے کے لیے بڑھا۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے عرض کی یا امیر المومنین آپ یہ کیا کر رہے ہیں کہ موزے اُتار کر آپ نے کندھے پر ڈال لیے ہیں، اونٹنی کی نکیل آپ کے ہاتھ میں ہے اور آپ اپنے ہاتھ سے پکڑ کر اُس کو پانی میں لے چل رہے ہیں یہ وُہ موقع ہے کہ سارا شہر آپ کے دیکھنے کو اُمڈ آیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا اے! ابو عبیدہؓ اگر تمہارے سوا کوئی اور یہ بات کہتا تو میں اس کو سزا دے کر اُمّتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے لیے عبرت بناتا۔ ہم سب سے ذلیل قوم تھے تو اللہ تعالیٰ نے اسلام سے ہماری عزت بڑھائی تو جو عزت خدا نے ہم کو دی ہے اس کو چھوڑ کر کسی اور چیز کے ذریعہ سے ہم عزت چاہیں گے تو خدا ہمیں ذلیل کرے گا۔[1]

---

[1] مستدرک حاکم جلد اوّل صہ ۶۲ کتاب الایمان علی شرط الصحیحین۔

شجاعت اور بہادری

قَدِیْرٌ (قدرت والا) قَادِرٌ، مُقْتَدِرٌ، قَوِیٌّ، جَبَّارٌ (جس کو کوئی پچھاڑ نہ سکے)، قَاہِرٌ (جو ہر کسی کو دبا دے) غَالِبٌ اور عَزِیْزٌ اللہ تعالیٰ کے کمال اوصاف ہیں۔ جب کسی بندہ میں ان اوصاف کا کچھ پرتو پڑتا ہے تو اس میں اخلاقی و جسمانی شجاعت پیدا ہو جاتی ہے۔

تمام مذاہب میں اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے اپنے پیروؤں میں شجاعت و بہادری کے جوہر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسلام سے پہلے دنیا کی عام حالت پر نظر کر کے لوگوں میں یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ چونکہ ہر قسم کا ظلم و ستم اور خوں ریزی اسی قوّت کا نتیجہ ہے اس لیے یہ مٹانے کے قابل ہے۔ لیکن محمّد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیم نے یہ نکتہ سوجھایا کہ قوّت بذاتہٖ کوئی بُری چیز نہیں بلکہ اس کے استعمال کا موقع بُرا ہوتا ہے۔ اس لیے تعلیمِ محمدیؐ نے بہادری و شجاعت کو سراہا اور اس کے موقعوں کی تعیین کی کہ اس کو حق کی مدد اور باطل کو مٹانے کے لیے کام میں لانا چاہیے۔ کیوں کہ اگر نیکوں میں یہ قوّت نہ ہو تو وہ ظلم و ستم کی روک تھام اور باطل قوتوں کا بہادرانہ مقابلہ نہ کر سکیں اور نہ اسلام کا مقدس فریضۂ جہاد کامیاب ہو سکے۔

اُن مسلمانوں کی جو سختیوں اور مصیبتوں کا بہادرانہ مقابلہ کریں اور لڑائیوں میں دادِ مردانگی دیں اللہ تعالیٰ تعریف فرماتا ہے:

وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَ	اور جو سختی اور تکلیف اور لڑائی کے
الضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ	وقت ثابت قدم رہیں۔ وہی لوگ
الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ	ہیں جو سچے ہوتے اور وہی متقی ہیں۔
هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ○ (البقرۃ: ۱۷۷)	

اس سے معلوم ہوا کہ جنگ آ پڑے تو اس میں ثابت قدمی اور بہادری وُہ صفت ہے جو اپنے موصوف کو راست باز اور متقی بننے میں مدد دیتی ہے۔ کیونکہ ہر وُہ شخص جو کسی جماعت اور ملّت کا فرد ہو وہ زبان سے کہے یا نہ کہے اس کا یہ فرض سمجھا جاتا ہے کہ وُہ اس کی حفاظت میں اپنی جان تک کی بازی لگا دے۔ اور جب وُہ ایسا کر گزرتا ہے تو وُہ اللہ تعالےٰ اور ملّت کی نظر میں راست باز اور سچّا ٹھہرتا ہے اور جو جذبہ اس کو اس فرض پر آمادہ کرتا ہے وہی اتقا کا منشا ہے۔ ایک اور موقع پر مسلمانوں کو اس بہادری کی کھلی تعلیم ملتی ہے ؛

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمُ	اے ایمان والو جب تم کافروں سے
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ	میدانِ جنگ میں مقابل ہو تو اُن کو
الْاَدْبَارَ ○	پیٹھ مت دو۔

(الانفال: ۱۵)

یعنی جب غنیم سے مقابلہ آن پڑے تو ایمان والوں کا فرض ہے کہ وہ اس مقابلہ میں پیٹھ پھیر کر بزدلی نہ دکھائیں بلکہ شجاعت اور بہادری کے ساتھ میدان میں قدم جمائے ڈٹے رہیں۔ اس موقع پر اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں کو " ایمان والے " کہہ کر خطاب کیا ہے۔ اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ یہی " ایمان " مسلمانوں کی شجاعت اور بہادری کی روح ہے کیوں کہ خدا فرماتا ہے کہ جو مسلمان نامرد اس دن بزدلی سے دشمن کو پیٹھ دکھائے گا وہ خدا تعالیٰ کے غضب کا

مستحق ہوگا۔

وَمَنْ يُّوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ	اور جو اُن کو اُس دن پیٹھ دے گا،
اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَيِّزًا	مگر یہ کہ لڑائی کا کوئی پیچ کرتا ہو یا کسی
اِلٰى فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ	(مسلمان) دستہ سے جا ملتا ہو، تو وہ
مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَ	اللہ کا غضب لے پھرا، اور اس کا ٹھکانا
بِئْسَ الْمَصِيْرُ ○	دوزخ ہے اور وُہ کتنا برا ٹھکانا ہے۔

(الانفال: ۱۶)

یہ تو سلبی تعلیم تھی یعنی یہ کہ کسی مسلمان کو میدان جنگ میں پیٹھ نہیں دکھانی چاہیے۔ اس کے بعد ہی اللہ تعالیٰ ان کو اس کے لیے ایجابی حکم دیتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا	اے ایمان والو! جب تم کسی دستہ
لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا	سے مقابل ہو تو ثابت قدم رہو۔

(الانفال: ۴۵)

یعنی اپنی جگہ پر جم کر مقابلہ کرو۔ کوئی تم میں سے سوائے اس کے کہ لڑائی کی مصلحت ہو، اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔

مسلمانوں کی تعریف میں فرمایا کہ وُہ کافروں کی قوّت کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے:

اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ (الفتح: ۲۹) وُہ کافروں پر زور آور ہیں۔

اَشِدَّآءُ کا ترجمہ اس آیت میں زور آور، زور مند اور قوی دست کیا جا سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر مسلمان کو حق کے اور خصوصاً اپنے دین کے مخالفوں کے مقابلہ میں طاقتور اور قوی دست ہونا ضروری ہے۔ ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ	اور اُن کے لیے تم سے جو ہو سکے یعنی
مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ	زور و قوّت اور گھوڑے باندھنا تیار
تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ	رکھو کہ اس سے اللہ کے دشمنوں اور اپنے
عَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ	دشمنوں کو اور دُوسروں کو جنہیں تم
لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ؕ	نہیں جانتے اللہ جانتا ہے، مرعوب کرو۔

(الانفال: ۶۰)

اس "قوّت" کے لفظ کی تفسیر اُس زمانہ کے سامان جنگ و قتال سے کی گئی ہے مثلاً قلعوں کی تعمیر اور تیر اندازی۔ مگر یہ تخصیص صرف زمانہ کے اعتبار سے ہے ورنہ معنیً مفسّرین نے اس کو عام رکھا ہے اور ہر قسم کے اسلحہ اور سامان کو اس میں داخل کیا ہے[1]۔ غرض اس آیت میں اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں کو سپاہیانہ جوہر پیدا کرنے اور جنگی سامان و اسلحہ تیّار رکھنے اور اُن کے استعمال کے طریقوں کو جاننے کی ہدایت فرمائی ہے تاکہ حق کے دشمن اُن کی تیاری سے مرعوب اور خوف زدہ رہیں اور اُن سے معاہدہ کرکے توڑنے کی ہمّت نہ کرسکیں۔

برخلاف اس کے بزدلی اور کمزوری کی بُرائی کی گئی ہے۔ بدر کے موقع پر کچھ مسلمان جنگ کے نام سے جو اسلام کی تاریخ میں سب سے پہلی دفعہ کی جارہی تھی متوحش ہو رہے تھے۔ اس پر وحیِ الٰہی نے ان کا ذکر مذمّت کے ساتھ کیا:

كَاَنَّمَا يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَ	گویا کہ وُہ موت کی طرف ہانکے جا
هُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝	رہے ہیں اور وُہ دیکھ رہے ہیں۔

(الانفال: ۶)

---

[1] تفسیر طبری آیتِ مذکور۔

سورۂ احزاب میں منافقوں کی دلی کمزوری کا یہ نقشہ کھینچا ہے :

فَإِذَا جَآءَ الْخَوْفُ رَأَيْتَهُمْ	جب ڈر کا وقت آئے تو ان کو تو
يَنظُرُونَ إِلَيْكَ تَدُورُ أَعْيُنُهُمْ	دیکھے کہ تیری طرف ٹکر ٹکر دیکھتے ہیں
كَالَّذِي يُغْشَىٰ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۖ	اُن کی آنکھیں گردش کھاتی ہیں جیسے
(الاحزاب: ۱۹)	کسی پر موت کی غشی آجائے۔

سورۂ محمدؐ میں اُن کی دِل کی کمزوری کی یہ کیفیت بیان کی گئی ہے :

فَإِذَا أُنزِلَتْ سُورَةٌ مُّحْكَمَةٌ	جب اُتری کوئی ثابت سورت اور
وَذُكِرَ فِيهَا الْقِتَالُ ۙ رَأَيْتَ	مذکور ہو اس میں لڑائی تو تو اُن کو جن
الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ	کے دلوں میں روگ ہے دیکھے گا کہ
يَنظُرُونَ إِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ	تکتے ہیں تیری طرف جیسے ٹکٹکی لگائے
عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۖ فَأَوْلَىٰ لَهُمْ ○	وہ جس پر موت کی بیہوشی ہے۔ سو خرابی
(محمد: ۲۰)	ہو ان کی۔

ایک اور آیت میں یہ نقشہ اس طرح کھینچا گیا :

وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ ۖ	اور جب تو انہیں دیکھے تو اُن کے
وَإِن يَقُولُوا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ۖ	بدن اچھے معلوم ہوں۔ اور اگر بولیں
كَأَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ۖ يَحْسَبُونَ	تو ان کی بات تو سنے۔ جیسے ٹیک
كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ۚ	سے کھڑی کی ہوئی لکڑیاں ہیں۔ جو کوئی
(المنافقون: ۴)	چیخے سمجھیں ہم ہی پر کوئی آفت آئی۔

اس آیت نے یہ بتایا کہ بہادری اور شجاعت بدن کی فربہی اور موٹائی سے نہیں بلکہ

دل کی طاقت سے ہے جس سے منافق محروم ہیں۔ دیکھنے میں تو اُن کے بدن بڑے سجیلے اور گٹھے ہوئے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں مگر دِل کی کمزوری کا یہ حال ہے کہ اگر ذرا کوئی چیخ دے تو گھبرا اٹھیں۔ ان کی حالت ایسی ہے جیسے کوئی لٹھوں کو ٹیک لگا کر کھڑا کر دے۔ دیکھنے میں تو یہ بڑے لمبے تڑنگے اور موٹے تازے ہیں مگر چونکہ اُن کی جڑیں مضبوط نہیں اس لیے ذرا ٹھیلنے سے دھڑ سے زمین پر آ رہتے ہیں۔

اسلام اپنے پیرؤں میں شجاعت و بہادری کا جوہر پیدا کرنا چاہتا ہے گو اس میں مادی و جسمانی شجاعت سے یکسر اعراض و تغافل نہیں ہے لیکن اس نے اپنی شجاعت و بہادری کی بنیاد اس پر کھڑی نہیں کی ہے۔ اسی لیے اوپر کی آیت میں دیکھئے کہ منافقین کے جسمانی طول و عرض اور موٹائی کا مضحکہ اڑایا ہے کہ چونکہ ان کا یہ دکھاوے کا قالب ایمان اور یقین کی روح سے خالی ہے اس لیے اُن میں شجاعت اور بہادری نہیں۔ اسی بنا پر وہ اپنے پیرؤں میں شجاعت اور بہادری کا جو جوہر پیدا کرنا چاہتا ہے اس کی بنیاد چند مضبوط عقائد پر رکھی ہے جو صحیح ایمان اور غیر متزلزل یقین کے لازمی نتیجے ہیں:۔

۱۔ جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ اُس کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے تعداد کی قلت و کثرت کوئی چیز نہیں صرف فضلِ الٰہی اور نصرتِ خداوندی چاہیے۔

۲۔ ہر آدمی کی موت کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ جب وُہ آجائے تو وہ کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکتی اور جب تک نہ آئے اس کو کوئی مار نہیں سکتا۔

۳۔ خدا کی راہ میں مارا جانا زندگی کا بہترین مصرف ہے۔ اس خون کے پانی سے گناہ کا سارا دفتر دھل جاتا ہے اور جو اس غزا میں مارا نہیں گیا وہ بھی بڑے بڑے ثوابوں کا مستحق ہے۔

تعداد کی قلّت وکثرت

تعداد کی قلّت وکثرت پر جدوجہد کی کامیابی وناکامی کا انحصار سراسر فریب ہے۔ کامیابی وناکامی تعداد کی کمیّت پر نہیں بلکہ جدوجہد کرنے والوں کی ایمانی واخلاقی کیفیت پر منحصر ہے۔ تعداد گو کتنی ہی چھوٹی ہو اگر اس میں ایمان ویقین کی قوت موجود ہے تو بفضلِ خدا وہ بڑی سے بڑی تعداد پر غلبہ پاسکتی ہے۔ اس فلسفہ کو حضرت طالوت کے چھوٹے سے لشکر کے سلسلہ میں قرآن نے ان مختصر لفظوں میں سمجھایا ہے:

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ	کتنی بار چھوٹا دستہ خدا کے حکم سے بڑی فوج پر غالب آگیا ہے۔

(البقرة: ۲۴۹)

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل کو آمادۂ جہاد کرتے ہیں تو دل کے کمزور کہتے ہیں کہ ہم تو اُن سے نہیں لڑیں گے اِنَّ فِيهَا قَوْمًا جَبَّارِينَ[1] "اس میں تو ایک زبردست قوم بستی ہے۔" اس وقت اُن کی اُمّت کے دو مسلمان ان کو سمجھاتے ہیں:

فَإِذَا دَخَلْتُمُوهُ فَإِنَّكُمْ غَالِبُونَ ۚ وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوا إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ○	تو جب تم شہر کے پھاٹک میں گھس جاؤ گے تو تم ہی غالب ہو۔ اور اللہ پر بھروسہ کرو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔

(المآئدة: ۲۳)

بدر اور اُحد کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے اس راز کو بار بار ظاہر فرمایا ہے۔

ارشاد ہوا:

---

[1] المائدہ: ۲۲۔

وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَّلَوْ كَثُرَتْ ۙ وَ اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ○	اور تم کو تمہارا جتھا کچھ کام نہ آئے گا اگرچہ تعداد میں بہت ہو اور اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے۔

(الانفال: ۱۹)

فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ○ اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ○	تو جب ارادہ پکا ہو چکا تو اللہ پر بھروسہ کر۔ بیشک اللہ توکّل کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔ اگر اللہ تمہاری مدد کرے گا تو کوئی تم پر غالب نہ ہوگا۔ اور اگر وہ تم کو چھوڑ دے گا تو اس کے بعد کون تمہاری مدد کرے گا۔ اور مومنوں کو چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسہ کریں۔

(آل عمران: ۱۵۹-۱۶۰)

فتح و شکست حکمِ الٰہی پر موقوف ہے اور مدد اسی طرف سے آتی ہے:

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○	اور مدد نہیں ہے مگر اللہ ہی کی طرف سے، بیشک اللہ غالب، حکمت والا ہے۔

(الانفال: ۱۰)

تعداد کی قلّت کی تلافی ایمان کی قوّت سے ہوتی ہے۔ یہ راز اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں کو صرف ایک نظریہ کی حیثیّت سے نہیں بتایا بلکہ اُس کو قاعدہ بنا کر ہمیشہ کے لیے خوشخبری سنا دی فرمایا کہ ایک پکّا مسلمان اپنے دس گُنے کے مقابل ہے۔ ثابت قدم دس مسلمان سو پر اور بیس ایسے مسلمان دو سو کی فوج پر بھاری ہوں گے:

يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ	اے پیغمبر! مومنوں کو لڑائی کا شوق
عَلَى الْقِتَالِ ؕ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ	دلا۔ اگر تم مسلمانوں میں سے بیس صابر
عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا	(ثابت قدم) ہوں تو وہ دو سو پر
مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ	غالب ہوں۔ اور اگر تم میں سے سو
مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ	ہوں تو ہزار کافروں پر غالب ہوں
كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا	کیونکہ وہ سمجھ نہیں رکھتے۔
يَفْقَهُوْنَ ○ (الانفال: ۶۵)	

ثابت قدم مسلمانوں کے غالب آنے اور کافروں کے شکست کھا جانے کی وجہ بھی بتا دی کہ مسلمانوں کے دل میں خدا پر صبر و توکّل کی قوّت ہے اور کافروں کے دل ایمان کے اس فہم و بصیرت سے محروم ہیں۔

اس کے بعد اس آزمائش کی سختی میں تھوڑی نرمی کر دی گئی۔ پھر بھی یہ نرمی وُہ ہوئی جو آج بھی مردانگی و بہادری کی کسوٹی ہے یعنی یہ کہ ایک مسلمان اپنے سے دو چند کا مقابلہ کرے اور اس کے قدم نہ ڈگمگائیں:

فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ	تو اگر تم سے سو صابر (ثابت) رہیں
يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ	تو دو سو پر غالب ہوں۔ اور اگر تم
مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ	سے ہزار ہوں تو دو ہزار پر بحکم خدا
بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ○	غالب ہوں۔ اور اللہ صابروں کے
(الانفال: ۶۶)	ساتھ ہے۔

اس تعلیم کے نشہ کی تیزی اور تندی دیکھو کہ آج بھی یہ یقین بحمداللہ مسلمانوں میں پیدا ہے

کہ ایک مسلمان لڑائی میں دو کافروں پر بھاری ہے۔ اور وہ اپنے اس یقین و ایمان کی بدولت اپنے سے دونی تعداد کی پروا نہیں کرتا اور خدا کی مدد پر ہمیشہ بھروسہ رکھتا ہے۔ اس کا اثر یہ ہے کہ کافروں کے دلوں میں اُن کا وہ رُعب بیٹھا ہے جس کا وعدہ ساڑھے تیرہ سو برس پہلے سے ہے کہ

سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ (آل عمران: ۱۵۱)	ہم کافروں کے دلوں میں (تمہارا) رعب ڈال دیں گے۔
سَأُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ (الانفال: ۱۲)	میں کافروں کے دلوں میں (تمہارا) رعب ڈال دوں گا۔

خدا نے یہ وعدہ پورا بھی کیا۔ چنانچہ یہود جن کو اپنے قلعوں اور لڑائی کے سامانوں پر بڑا گھمنڈ تھا مسلمانوں سے ایسے مرعوب ہوئے کہ بے لڑے بھڑے ہتھیار ڈال دینے پر مجبور ہوئے:

وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ (الاحزاب: ۲۶)	اور ان کے دلوں میں اللہ نے رعب ڈال دیا۔
وَقَذَفَ فِي قُلُوبِهِمُ الرُّعْبَ (الحشر: ۲)	اور ان کے دلوں میں اللہ نے رعب ڈال دیا۔

اور جب تک مسلمانوں میں ایمان کی یہ قوت باقی ہے خدا کا وعدہ پورا ہوتا رہے گا۔

موت کا وقت مقرر ہے

انسان کی کمزوری کی اصل وجہ موت کا ڈر ہے۔ اس زہر کا تریاق اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر آدمی کی موت کا ایک وقت مقرر ہے جو نہ ٹالے

ٹل سکتا ہے اور نہ ملائے آسکتا ہے اس لیے کسی خطرہ کے مقام سے بھاگنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

وحیِ محمدیؐ نے مسلمانوں کو اس عقیدہ کی بار بار تلقین کی ہے یہاں تک کہ یہ چیز مسلمانوں کی رگ رگ میں سرایت کر گئی ہے۔ غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کے پاؤں اُکھڑ گئے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہہ فرمائی اور اس عقیدہ کو یاد دلایا:

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ (آل عمران: ۱۴۵)	اور کسی جان کے بس میں نہیں کہ اللہ کے حکم کے سوا وہ مر سکے۔ لکھا ہوا وقت مقرر ہے۔

جب اللہ کا حکم ہوگا تب ہی کوئی مر سکتا ہے۔ پھر موت سے خوف کیوں ہو اور اس سے بُزدلی کیوں چھائے۔ جنگِ احزاب میں جب منافقوں کو گھبراہٹ ہوئی تو خدا نے فرمایا:

قُلْ لَّنْ يَّنْفَعَكُمُ الْفِرَارُ اِنْ فَرَرْتُمْ مِّنَ الْمَوْتِ اَوِ الْقَتْلِ (الاحزاب: ۱۶)	(اے پیغمبر ان سے) کہہ کہ اگر تم موت سے یا مارے جانے سے بھاگے بھی تو یہ بھاگنا تم کو کام نہ آئے گا۔

یہ خیال کرنا کہ اگر ہم اس لڑائی میں شریک نہ ہوتے تو مارے نہ جاتے سراپا غلط ہے۔ جن کی قسمت میں یہاں موت لکھی تھی وہ خود آکر اپنے اپنے مقام پر مارے جاتے۔ فرمایا:

قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ (آل عمران: ۱۵۴)	(اے پیغمبر ان سے) کہدے کہ اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے تو بھی جن کا مارا جانا لکھا جا چکا تھا وُہ آپ نکل کے اپنے پڑاؤ پر آجاتے۔

یہ سمجھنا کہ چونکہ لڑائی میں شریک ہوئے اس لیے مارے گئے یوں بھی غلط ہے کہ مارنا

اور جلانا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس کو چاہے موت دے اور جس کو چاہے جیتا رکھے۔ مسلمانوں سے کہا گیا کہ تم کافروں جیسا عقیدہ نہ رکھو جو یہ کہتے ہیں:

لَوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَ مَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِىْ قُلُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ ؕ	اگر یہ (مرنے یا مارے جانے والے) ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ مارے جاتے۔ (اور یہ خیال اس لیے ان کے دل میں آتا ہے) تاکہ اللہ ان کے اس خیال کو اُن کی دلی حسرت بنائے۔
(آل عمران: ۱۵۶)	اور (واقعہ تو یہ ہے کہ) اللہ جلاتا اور مارتا ہے۔

کچھ کمزور لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر یہ مقتول لڑائی میں نہ جاتا تو مارا نہ جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر ان کی یہ بات سچ ہے تو وہ اپنی موت ٹال سکتے ہوں تو ٹال لیں:

قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○	اگر تم سچے ہو تو اپنی جانوں سے موت ہٹا تو لو۔
(آل عمران: ۱۶۸)	

جو مسلمان ذرا دل کے کمزور تھے ان کے خطرہ کا ذکر کرکے اُن کی تشفی کی گئی:

فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ	پھر جب اُن کو لڑائی کا حکم ہوا تو ناگہاں ان میں سے ایک گروہ لوگوں سے ایسے ڈرنے لگے جیسے خدا سے ڈر ہو یا اس سے بھی بڑھ کر۔ اور کہنے لگے کہ

كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَا
أَخَّرْتَنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ ۗ
قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ
وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقَىٰ
وَلَا تُظْلَمُونَ فَتِيلًا ۝ أَيْنَمَا
تَكُونُوا يُدْرِككُّمُ الْمَوْتُ
وَلَوْ كُنتُمْ فِي بُرُوجٍ مُّشَيَّدَةٍ ۗ
(النسآء: ۷۷-۷۸)

کہ اے ہمارے پروردگار تو نے کیوں
فرض کی ہم پر لڑائی کیوں نہ ہم کو تھوڑے
دن اور مہلت دی۔ (اے پیغمبر) جواب
دے کہ دنیا کا فائدہ تھوڑا ہے اور
آخرت پرہیزگار کے لیے بہتر ہے۔ اور
تمہارا حق ذرا بھی دبایا نہ جائے گا۔
جہاں تم ہوگے موت تم کو پالے گی
اگرچہ تم مضبوط قلعوں میں ہو۔

غرض کہیں بھی تم جا کر رہو موت سے چھٹکارا نہیں۔ پھر میدانِ جنگ سے تم کیوں گھبراؤ۔ بلکہ اُن مجاہدوں کی طرح بنو جن کا ایمان جہاد کا نام سُن کر اور تازہ ہو جاتا ہے:

الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ
النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ
فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَانًا ۖ
وَّقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ
الْوَكِيلُ ۝
(آلِ عمران: ۱۷۳)

وہ جن سے لوگوں نے کہا کہ تم سے
لڑنے کے لیے لوگوں نے بڑا سامان
کیا ہے سو تم اُن سے خوف کرو تو
اس نے اُن کے ایمان کو اور بڑھا دیا
اور بول اُٹھے کہ ہم کو خدا کافی ہے اور
وہ کیسا اچھا کارساز ہے۔

شہادت اور غزا کا رتبہ

میدانِ جہاد میں شرکت سے جو دوسری چیز باز رکھ سکتی تھی وہ دُنیا کے عیش و آرام کا خیال ہے۔ اسلام کی تعلیم نے اس خیال کا بھی قلع قمع کر دیا ہے۔

اس کی تعلیم ہے کہ مجاہدوں کی جان و مال اللہ تعالٰے کے ہاتھ اس کی خوشی و رضا اور جنّت کے بدلہ میں بکا ہوا ہے اور وہاں اُن کے لیے وُہ کچھ مہیا ہے جس کے سامنے یہاں کا بڑے سے بڑا عیش و آرام بھی ہیچ ہے:

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ ؕ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ ۟ (التوبۃ: ۱۱۱)	اللہ نے مسلمانوں سے اُن کی جانوں کو اور مالوں کو اس قیمت پر خرید لیا ہے کہ اُن کے لیے جنّت ہے۔ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں پھر مارتے ہیں اور مارے جاتے ہیں۔

اس سے پہلے سورۃ نسار میں اہلِ ایمان کو جو آخرت کے لیے دُنیا کا سودا کر چکے ہیں، اعلان ہے:

فَلْیُقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یَشْرُوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا بِالْاٰخِرَۃِ ؕ وَمَنْ یُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیُقْتَلْ اَوْ یَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِیْہِ اَجْرًا عَظِیْمًا ۝ (النسآء: ۷۴)	تو جو دُنیا کی زندگی آخرت کے بدلہ بیچتے ہیں وُہ اللہ کی راہ میں لڑیں۔ اور جو اللہ کی راہ میں لڑے پھر مارا جائے یا وہ غالب ہو تو ہم اس کو بڑی مزدوری دیں گے۔

ان کے گناہ کے سارے دفتر دھل جائیں گے:

فَالَّذِیْنَ ھَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَ اُوْذُوْا فِیْ	تو جو لوگ اپنے وطن سے چھُوٹے اور اپنے گھروں سے نکالے گئے

سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ (اٰل عمرٰن : ۱۹۵)	اور میری راہ میں ستائے گئے اور لڑے اور مارے گئے۔ آتاروں گا اُن سے ان کی برائیاں اور داخل کروں گا اُن کو جنّت میں۔

شہیدوں نے اس راہ میں اپنی جو سب سے بڑی دولت نثار کی وُہ ان کی زندگی تھی۔ وُہ اُن کو ازسرِنو اسی وقت دے دی جاتے گی۔ اس عقیدہ کی تعلیم نے اس خیال باطل کا کہ شہید مرجاتے ہیں ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا۔ اور کہہ دیا گیا کہ ان کو مردہ نہ خیال کرو وُہ خدا کے پاس زندہ ہیں :

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ○ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (اٰل عمرٰن : ۱۶۹-۱۷۰)	اور جو خدا کی راہ میں مارے گئے اُن کو مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے ربّ پاس روزی پاتے ہیں۔ خدا نے اُن کو اپنی مہربانی سے جو دیا اس سے خوش ہیں۔

اُن کی اس زندگی کو گو اس دنیا کے لوگ جان نہیں سکتے پھر بھی اُن کو زبان سے بھی مردہ نہیں کہنا چاہیے :

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ○	اور جو خدا کی راہ میں مارے جائیں اُن کو مردہ نہ کہو بلکہ زندہ ہیں لیکن تم کو اس کی خبر نہیں۔

(البقرۃ : ۱۵۴)

ہرگز نمیرد آنکہ دِلش زندہ شد بعشق   ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما۔

لیکن جہاد کے یہ اوصاف اور انعامات ان ہی کے لیے ہیں جو فی سبیل اللہ خدا کی راہ میں صرف خدا کی خوشنودی کے لیے لڑتے ہوں۔ اس تعلیم نے مجاہدین کی غرض و غایت کو اتنا اونچا کر دیا ہے کہ وُہ ذاتی خود غرضیوں اور نفسیاتی غیظ و غضب اور بہادری کی نیک نامی وغیرہ کے پست جذبات سے بالکل پاک کر دی گئی ہے۔ اگر کوئی مال کے لیے کسی کو قتل کرے تو یہ کافروں کی سی جاہلانہ بات ہوگی۔ فرمایا:

تَبْتَغُوْنَ عَرَضَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ز	چاہتے ہو دنیا کی زندگی کا مال سو
فَعِنْدَ اللّٰهِ مَغَانِمُ كَثِیْرَةٌ ط	اللہ کے پاس بڑا مالِ غنیمت ہے۔ تم
كَذٰلِكَ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلُ فَمَنَّ	(اسلام سے) پہلے ایسے ہی تھے تو
اللّٰهُ عَلَیْكُمْ فَتَبَیَّنُوْا ط	خدا نے تم پر فضل کیا (یعنی اسلام بخشا)
(النسآء: ۹۴)	تو اب تحقیق کر لیا کرو۔

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ ایک شخص مالِ غنیمت کے لیے لڑتا ہے، ایک شخص شہرت کے لیے لڑتا ہے، ایک شخص اس لیے لڑتا ہے کہ خدا کی راہ میں اس کی پامردی کی نمائش ہو، ایک شخص بہادری دکھانے کے لیے لڑتا ہے، ایک شخص حمیت سے لڑتا ہے، ایک شخص نمایش کے لیے لڑتا ہے، ایک شخص غصہ و انتقام کے لیے لڑتا ہے۔ تو آپؐ نے اُن سب کا مشترک جواب یہ دیا:

من قاتل لتکون کلمة اللہ ھی	جو شخص اللہ کی بات سب سے بالا کرنے
العلیا فھو فی سبیل اللہ[1]	کے لیے لڑے اسی کا جہاد خدا کی راہ میں ہے۔

---

[1] صحیح مسلم و صحیح بخاری کتاب الجہاد باب من قاتل لتکون کلمة اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ۔

ایک حدیث میں ہے کہ "ایک شخص سے قیامت کے دن اُس کے اعمال کے متعلق سوال کیا جائے گا تو وہ کہے گا کہ اے خدا میں نے تیری راہ میں جہاد کیا اور شہید ہوا۔ خدا کہے گا کہ "تم جھوٹ کہتے ہو" تم اس لیے لڑے کہ بہادر کہے جاؤ[1] سو تم اپنا اجر پا چکے اور دنیا میں تم کو بہادر کہا جا چکا"۔ غرض جس شجاعت کا مقصودِ اصلی ریا و نمائش ہو اس کو اسلام نے مذموم قرار دیا ہے۔ لیکن اگر جہاد میں اعلائے کلمۃ اللہ کے ساتھ ضمناً فخر کا بھی اظہار ہو جائے تو اسلام نے اس کو برا نہیں کہا ہے[2] کیونکہ اس فخر کا منشا بھی کلمۂ حق کی بلندی کا اظہار ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جہاد کے میدان میں کبر و تبختر کے شجاعانہ پہلوؤں کو پسند کیا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ "بعض ناز و تبختر کو خدا ناپسند اور بعض کو پسند کرتا ہے۔ خدا جس ناز و تبختر کو پسند کرتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک شخص لڑائی کے وقت اترائے[3]" کیونکہ اس سے دشمنوں پر رعب و داب قائم ہوتا ہے اور دوستوں میں مستعدی و سرگرمی پیدا ہوتی ہے۔ ایک صحابی نے ایک کافر پر حملہ کیا اور شجاعانہ فخر و غرور کے لہجہ میں کہا "لو میں ابن اکوع ہوں"۔ حافظ ابن حجر اس فقرے کی شرح میں لکھتے ہیں:

"یہ فقرہ اس فخر سے الگ ہے جس کی ممانعت کی گئی ہے کیوں کہ حالت کا اقتضاء یہی تھا۔ اور وہ اس ناز و تبختر سے قریب ہے جو لڑائی میں جائز ہے اور دوسرے موقعوں پر جائز نہیں[4]"۔

غزوۂ حنین میں جب مشرکین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گھیر لیا تو آپ نے خود عزم و ثبات کے عربی لہجہ میں فرمایا:

---

[1] صحیح مسلم کتاب الجہاد باب من قاتل للریاء والسمعۃ استحق النار و جامع ترمذی [2] فتح الباری جلد ۶، صفحہ ۲۲ شرح حدیث مذکور۔ [3] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الخیلاء فی الحرب [4] فتح الباری جلد ۶ صفحہ ۱۱۴۔

انا النبی لا کذب	میں پیغمبر ہوں، جھوٹ نہیں، میں
انا ابن عبد المطلب	عبد المطلب کا بیٹا ہوں۔

یعنی میں سچا پیغمبر ہوں اس لیے میدان سے نہ بھاگوں گا نہ ہٹوں گا۔ چنانچہ اس وقت غنیم کے تیروں کی بارش سے گو اور لوگ ہٹ گئے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں فرمائی[1]۔

صحابہ کہتے ہیں کہ ہم میں سب سے بہادر وُہ سمجھا جاتا تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھڑا ہوتا تھا[2]۔ وُہ یہ بھی کہتے تھے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہایت بہادر تھے۔ ایک بار اہلِ مدینہ کے دلوں میں کسی طرف سے حملہ کا خوف پیدا ہوا تو سب سے پہلے جو اُدھر بڑھا وُہ خود سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام تھے۔ آپؐ تنہا گھوڑے پر سوار ہو کر مدینہ کا چکر لگا آئے اور واپس آکر فرمایا "خوف کی کوئی بات نہیں[3]"۔ ایک موقع پر جب بدوؤں نے آپ کو عطیہ کے لیے گھیر لیا تو آپؐ نے فرمایا کہ "تم لوگ مجھ کو بخیل، جھوٹا اور بزدل نہ پاؤ گے[4]"۔ بزدلی اسلام میں ایسا سخت اخلاقی عیب ہے جس سے پناہ مانگنی چاہیے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعاؤں میں جن چیزوں سے پناہ مانگی ہے اُن میں بُزدلی بھی ہے۔ چنانچہ روایت میں ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیچارگی (عجز) کاہلی (کسل) بزدلی اور بڑھاپے سے کہ یہ بھی بیچارگی کی ایک قسم ہے، پناہ مانگتے تھے۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپؐ ہر نماز کے بعد ان چیزوں سے پناہ مانگتے تھے[5]۔ ایک روایت میں ہے کہ

---

[1] صحیح بخاری غزوۂ حنین و کتاب الجہاد باب بغلۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔ [2] صحیح مسلم باب غزوہ حنین۔ [3] صحیح بخاری کتاب الجہاد کتاب الحمائل و تعلیق السیف بالعنق [4] بخاری کتاب الجہاد باب الشجاعۃ فی الحرب والجبن [5] بخاری کتاب الجہاد باب ما یتعوذ من الجبن۔

انسان میں سب سے بڑی بداخلاقی گھبرا دینے والا بُخل اور دل ہلا دینے والی بُزدلی ہے[1]۔

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ صحابیؓ نے خط لکھ کر بھیجا تھا۔ اس کا ایک فقرہ یہ تھا کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے کہ "جب دشمن سے مقابلہ آپڑے تو ثابت قدم رہو[2]"۔ اسی خط میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا وُہ بلیغ فقرہ بھی ہے جو ساڑھے تیرہ سو برس سے مسلمانوں کے بچّہ بچّہ کی زبان پر ہے :

واعلموا انّ الجنّۃ تحت ظلال السّیوف[3]	یقین کرو کہ بہشت تلواروں کی چھاؤں میں ہے۔

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الجرأۃ والجبن [2] صحیح بخاری کتاب الجہاد باب الصبر عند القتال [3] صحیح بخاری باب الجنۃ تحت بارقۃ السیوف و باب ما کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا لم یقاتل اول النہار اخر القتال۔

استقامت

"استقامت" کے لفظی معنی "سیدھا رہنے" یا "سیدھا چلے چلنے" کے ہیں۔ اور اس سے مقصود یہ ہے کہ جس بات کو حق سمجھا جائے اس پر قائم رہا جائے۔ مشکلیں پیش آئیں، مخالفتیں ہوں، ستایا جائے، ہر خطرہ کو برداشت کیا جائے مگر حق سے منہ نہ پھیرا جائے اور اس راستہ پر ثابت قدمی کے ساتھ چلا جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس اعلان کا حکم ہوتا ہے کہ

اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ	تمہارا معبود ایک ہی ہے سو اس کی
فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ	طرف سیدھے رہو اور اس سے گناہ
(حٰمٓ السجدۃ ۶)	بخشواؤ۔

یعنی ہماری عبادتیں اُسی ایک کے لیے ہوں اور ہماری توجہات کا وہی ایک مرکز ہو۔ اس سے کسی حال میں ادھر ادھر نہ ہوا جائے سیدھے اسی کی طرف چلے چلو۔ ایک اور آیت میں بارگاہِ الٰہی سے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے ساتھیوں کو حکم ہوتا ہے کہ اسی راہ پر سیدھے چلے چلو، نہ راہ سے بھکو، نہ حکم ماننے سے سرکشی ہو:

فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ	تو (اے پیغمبر!) تو سیدھا چلا چل جیسا

تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۭ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝
(ھود : ۱۱۲)

تجھ کو حکم ہوا اور جس نے توبہ کی تیرے ساتھ اور حد سے نہ بڑھو کہ وُہ (اللہ) تمہارے کاموں کو دیکھتا ہے۔

عرب کا گرم ریگستان دینِ حق کی مخالفت میں غیظ و غضب کا بھڑکتا ہوا تنور بن گیا ہے۔ ذرہ ذرہ کی زبان سے رسُولِ حق علیہ السلام کی دشمنی کی آواز نکل رہی ہے اور عرب کی وسیع سرزمین مسلمانوں پر دم بدم تنگ ہوتی جاتی ہے۔ اس موقع پر رسُولِ اسلام علیہ السلام اور آپؐ کے ساتھ مسلمانوں کو اعلانِ حق اور حق پر استقامت کی تاکید پہ تاکید ہو رہی ہے ارشاد ہوتا ہے اسی دینِ حق کی طرف سب کو بلاتے رہو اور ثابت قدمی دکھاؤ اور مخالفوں کی کسی خواہش کی پیروی نہ کرو:

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ
(الشوریٰ : ۱۵)

پس اسی کی طرف بلا۔ اور قائم رہ جیسا کہ تجھے فرما دیا۔ اور اُن کی خواہشوں کے پیچھے نہ چل۔

ایسے ثابت قدموں کو جنہوں نے اللہ کو اپنا پروردگار مان کر ہر خوف و خطرہ کو اپنے دل سے نکال دیا ہے یہ خوشخبری سنائی جا رہی ہے کہ کامیابی تمہارے ہی لیے ہے۔ وہ دن آئے گا جب نہ تمہیں کسی کا ڈر ہوگا اور نہ کسی چیز کا غم ہوگا:

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝
(احقاف : ۱۳)

بے شک جنہوں نے کہا ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر وہ (اس پر) جمے رہے تو نہ ڈر ہے ان کو اور نہ وہ غم کھائیں گے۔

اُس دن جس دن ہیبت سے سب کے دل لرزتے ہوں گے ان کو جن کو استقامت اور ثابت قدمی کا اطمینان یہاں حاصل تھا وہاں تسکین و تسلی کا اطمینان بھی حاصل ہوگا۔ ایسے ثابت قدموں کے کانوں میں ان کی استقامت کی مزدوری میں فرشتوں کی بشارت سنائی دے گی:

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ	بے شک جنہوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار
اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ	اللہ ہے پھر جمے رہے اُن پر فرشتے
الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا	اُترتے ہیں کہ خوف اور غم نہ کھاؤ اور
تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ	اس بہشت کی خوشی سنو جس کا تم سے
الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝	وعدہ تھا۔

(حٰمٓ السجدۃ: ۳۰)

ان ہی آیتوں کی شرح میں اس حدیث کو سمجھئے کہ ایک صحابی دریافت کرتے ہیں کہ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کوئی ایسی بات بتائیے کہ میں اُس سے چمٹ جاؤں" ارشاد ہوا "کہو کہ میرا پروردگار اللہ ہے پھر اس پر جم جاؤ۔"[1] صحابہ نے ان نصیحتوں پر جس استقامت کے ساتھ عمل کیا، اور اپنی ایمانی اور اخلاقی بہادری کے جو کارنامے پیش کیے ساڑھے تیرہ سو برس گزر گئے مگر ان پر تاریخ کی زبان سے برابر احسنت اور آفرین کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔ خود اللہ تعالٰی نے غزوۂ احزاب کے سلسلہ میں ان کی استقامت کا ایک نقشہ کھینچا ہے۔ فرمایا:

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ	جب کفار کی متحدہ فوجیں تمہارے اوپر
اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ	سے اور تمہارے نیچے سے آئیں اور جب

[1] ترمذی باب ما جاء فی حفظ اللسان۔

الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ	ڈگنے لگیں آنکھیں اور دل گلے کو آنے
الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ	لگے اور تم اللہ سے طرح طرح کے گمان
الظُّنُوْنَا ○ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ	کرتے تھے وہاں ایمان والے جانچے
الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا	گئے اور خوب جھڑ جھڑائے گئے۔
شَدِيْدًا ○ (الاحزاب: ۱۰-۱۱)	

اس کے بعد اس موقع پر منافقوں نے جو کمزوری دکھائی اس کی تفصیل ہے۔ اس کے بعد ہے:

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ	اور جب ایمان والوں نے کفار کی
قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ	ان متحدہ فوجوں کو دیکھا تو بولے کہ
رَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ؗ	یہ وہی ہے جس کا وعدہ ہم کو دیا تھا
وَمَا زَادَهُمْ اِلَّا اِيْمَانًا وَّ	اللہ اور اس کے رسول نے۔ اور اللہ
تَسْلِيْمًا ○	اور اس کے رسول نے سچ کہا اور اس
(الاحزاب: ۲۲)	نے ان کو یقین اور اطاعت میں اور
	بڑھا دیا۔

اس کے بعد جن مسلمانوں نے اس قسم کے خطروں میں اپنی کامل استقامت اور ثبات کا وعدہ کیا تھا اور اس کو پورا کر دکھایا ان کی تعریف فرمائی جاتی ہے:

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا	ایمان والوں میں بعض وہ مرد ہیں جنہوں
مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ	نے خدا سے جس چیز کا عہد کیا اس کو
مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ	سچ کر دکھایا۔ تو ان میں کوئی تو اپنا کام

يَّنۡتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوۡا تَبۡدِيۡلًا ۝ (الاحزاب: ۲۳)

پورا کر چکا اور کوئی ان میں وقت کی راہ دیکھ رہا ہے اور انہوں نے ذرا بھی تغیر تبدل نہیں کیا۔

یعنی بعض تو خدا کی راہ میں جان دے کر اپنا فرض انجام دے چکے اور بعض ابھی زندہ ہیں اور اُس دن کی راہ تک رہے ہیں جب وُہ اپنی استقامت کا امتحان دیں گے۔ اور ان تمام خطروں کے باوجود نہ تو منافقوں کی طرح انہوں نے اپنے دین و ایمان کو بدلا اور نہ خدا سے جو عہد کر چکے تھے اس کو توڑا۔

حق کی راہ میں مشکلات کا پیش آنا اور اس میں مردانِ خدا کی استقامت کی آزمائش اللہ تعالیٰ کا وُہ اصُول ہے جو ہمیشہ سے قائم ہے اور قائم رہے گا۔ اور جب تک اس میں کوئی شخص یا کوئی قوم پوری نہیں اترتی کامیابی کا منہ نہیں دیکھتی۔ فرمایا:

اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّةَ وَلَمَّا يَاۡتِكُمۡ مَّثَلُ الَّذِيۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِكُمۡ ؕ مَسَّتۡهُمُ الۡبَاۡسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلۡزِلُوۡا حَتّٰى يَقُوۡلَ الرَّسُوۡلُ وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا مَعَهٗ مَتٰى نَصۡرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصۡرَ اللّٰهِ قَرِيۡبٌ ۝ (البقرۃ: ۲۱۴)

کیا تم کو خیال ہے کہ جنت میں چلے جاؤ گے اور ابھی تم پر تم سے پہلوں کے احوال نہیں آئے۔ اُن کو سختی اور تکلیف پہنچتی رہی اور جھڑ جھڑائے گئے یہاں تک کہ رسُول اور جو اس کے ساتھ ایمان لائے کہنے لگے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔ سُن رکھو اللہ کی مدد نزدیک ہے۔

پہلوں کی استقامت کا جو امتحان لیا گیا اس کے دو واقعے قرآن نے بیان کیے ہیں۔

ایک طالوت کے مختصر سے لشکر کا ہے کہ اس نے تعداد کی کمی اور پیاس کے باوجود غنیم کے بہت بڑے لشکر کا مقابلہ کیا اور آخر کامیاب ہوا۔ اور اس عالم میں اس کی زبان پر یہ دعا جاری تھی:

رَبَّنَآ اَفۡرِغۡ عَلَيۡنَا صَبۡرًا وَّ ثَبِّتۡ اَقۡدَامَنَا وَانۡصُرۡنَا عَلَى الۡقَوۡمِ الۡكٰفِرِيۡنَ ○ (البقرۃ: ۲۵۰)	اے ہمارے پروردگار ہم میں ڈال دے پوری مضبوطی اور جما ہمارے پاؤں اور اس کافر قوم کے مقابلہ میں ہماری مدد کر۔

اور دوسرا واقعہ اصحاب الاُخدود کا ہے۔ احادیث و سیر[1] میں ہے کہ یمن میں حضرت عیسٰی علیہ السّلام کی اُمت کے کچھ مخلص اور پکے مسلمان تھے۔ یہودیوں نے اُن کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں اور آخر اُن کو گڑھا کھود کر آگ میں جھونک دیا مگر وُہ دینِ حق سے برگشتہ نہ ہوئے:

قُتِلَ اَصۡحٰبُ الۡاُخۡدُوۡدِ ○ النَّارِ ذَاتِ الۡوَقُوۡدِ ○ اِذۡ هُمۡ عَلَيۡهَا قُعُوۡدٌ ○ وَّهُمۡ عَلٰى مَا يَفۡعَلُوۡنَ بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ شُهُوۡدٌ ○ وَمَا نَقَمُوۡا مِنۡهُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ يُّؤۡمِنُوۡا بِاللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَمِيۡدِ ○ (البروج: ۴-۸)	مارے جائیو کھائیاں کھودنے والے آگ بھری ایندھن سے جب وہ اس (گڑھے کے منہ) پر بیٹھے تھے، اور جو کچھ وُہ ایمان والوں کے ساتھ کر رہے تھے، دیکھ رہے تھے۔ اور وہ ان سے بدلہ نہیں لیتے تھے مگر اسی کا کہ یہ زبردست خوبیوں والے خدا پر ایمان لے آئے تھے۔

اگلوں کی استقامت کے ان احوال میں سے جن کو محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کے سامنے نمونہ کے طور پر پیش کیا وُہ واقعہ ہے کہ جس کو امام بخاری نے صحیح میں نقل

---

[1] صحیح مسلم و سیرت ابن ہشام قصہ اصحاب الاُخدود۔

کیاہے۔ خباب بن ارتؓ صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی مصیبتوں کا حال عرض کیا اور درخواست کی کہ ہمارے لیے دعا کیجیے۔ چونکہ یہ بھی ایک قسم کی بے تابی کا اظہار تھا اس لیے آپؐ نے فرمایا کہ ”تم سے پہلے لوگوں میں ایسا مرد بھی ہوا ہے جس کو زمین میں گاڑ دیا جاتا تھا اور آرہ سے اس کو چیر کر دو کر دیا جاتا تھا مگر یہ اس کو دینِ حق سے روگرداں نہیں کرتا تھا۔ اور لوہے کی کنگھیوں سے اس کا گوشت ہڈی سے نوچ کر تار تار کر دیا جاتا تھا مگر یہ بھی اس کو اس کے دین سے ہٹاتا نہ تھا“[1]

رسولِ اسلام علیہ السلام کی ان تعلیمات اور تلقینات کا جو اثر آپ کے ساتھیوں پر ہوا وہ اہلِ تاریخ سے چھپا نہیں۔ ان ہی خباب بن ارتؓ کا جو اس روایت کے راوی ہیں یہ واقعہ ہے کہ اسلام کے جرم میں اُن کو طرح طرح کی تکلیفیں دی جاتی تھیں۔ آخر ایک دن زمین پر کوئلے جلا کر اس پر ان کو چت لٹا دیا گیا اور ایک شخص اُن کی چھاتی پر پاؤں رکھے رہا کہ کروٹ نہ بدلنے پائیں یہاں تک کہ کوئلے پیٹھ کے نیچے پڑے پڑے ٹھنڈے ہو گئے[2]۔ حضرت خبابؓ نے مدتوں کے بعد حضرت عمرؓ کو اپنی پیٹھ کھول کر دکھائی تو تائے ہوئے سونے کی طرح سنگ دل قریش کے ظلم وستم کا یہ سکّہ اُن کی پیٹھ پر چمک رہا تھا۔

حضرت بلالؓ گرم جلتی بالو پر لٹائے جاتے، پتھر کی بھاری چٹان اُن کے سینہ پر رکھی جاتی، گلے میں رسی باندھ کر زمین پر گھسیٹے جاتے اور کہا جاتا کہ اسلام سے باز آؤ۔ اُس وقت بھی ان کی زبان سے اَحَد اَحَد (ایک خُدا ایک خُدا) ہی نکلتا تھا۔ حضرت خبیبؓ سولی پر لٹکائے جاتے ہیں مگر خدا کی راہ میں جان کی یہ قربانی ان کو اتنی پسند آتی ہے کہ دوگانۂ شکر ادا کرتے ہیں۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ فقرہ جس کو آپؐ نے اپنے چچا ابو طالب کے جواب

---

[1] صحیح بخاری باب علامات النبوۃ فی الاسلام۔ [2] ابن سعد جلد ۳ تذکرۂ خبابؓ۔

میں کہا تھا۔ اس کی تاثیر اس وقت تک کم نہ ہوگی جب تک آسمان میں سورج اور چاند کی روشنی قائم ہے۔ فرمایا "چچا جان! اگر یہ کافر میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور بائیں ہاتھ میں چاند بھی دے دیں تب بھی میں اس دینِ حق سے باز نہ آؤں گا۔"

خود مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کا خطاب ہے کہ فرض کرو کہ اگر یہ رسول اس راہ میں مر جائے یا مارا جائے تو کیا تم اس راستہ سے جس پر تم چل رہے ہو الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ نہیں حق کسی کی موت و حیات سے وابستہ نہیں۔ اس کا ساتھ تم اس لیے دیتے ہو کہ وہ حق ہے:

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ	اور محمدؐ تو ایک رسول ہے۔ اس سے
خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ	پہلے بہت سے رسول ہو چکے۔ پھر
اَفَاِئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ	کیا اگر وہ مر گیا یا مارا گیا تو تم الٹے
عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ	پاؤں پھر جاؤ گے۔ اور جو الٹے پاؤں
عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ	پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا۔
شَيْئًا	

(آل عمران: ۱۴۴)

پھر اگلی امتوں کا حال سنا کر تسلی دی جاتی اور صبر و ثبات اور استقامت کی تعلیم دی جاتی ہے:

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ	اور کتنے پیغمبر ہیں کہ ان کے ساتھ
رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا	ہو کر بہت سے خدا والے لوگ لڑے
لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	تو پھر ان کو خدا کی راہ میں کچھ دکھ پڑا
وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا	تو ہمت نہیں ہارے اور نہ کمزور ہوئے

وَاللّٰہُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ ○ وَمَا کَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِیْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ ○

(آل عمران: ۱۴۶-۱۴۷)

اور نہ دب گئے۔ اور اللہ ثابت قدم رہنے والوں کو پیار کرتا ہے۔ اور نہ تھا ان کا کہنا مگر یہی کہا اے ہمارے پروردگار! ہمارے گناہ اور ہم سے اپنے کام میں جو زیادتی ہوئی اس کو بخش دے اور ہمارے قدم جمائے رکھ اور ہم کو کافر قوم پر مدد دے۔

سچے اور مخلص مسلمانوں کی استقامت اور ثباتِ قدم کی یہی کیفیت ہونی چاہیے۔ اس ایمانی استقامت ہی کے برابر ایک اور چیز استقامتِ عمل ہے جس کا نام مداومت ہے۔ یعنی جس خوبی اور بھلائی کے کام کو اختیار کیا جائے اس پر مرتے دم تک مداومت رہے۔ اس کو ہمیشہ اور ہر حال میں کیا جائے ایسا نہ ہو کہ کبھی کیجیے اور کبھی نہ کیجیے کہ اس سے طبیعت کی کمزوری اور اس کام سے دل کا بے لگاؤ ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ نماز پڑھنا انسان کے سب اچھے کاموں میں سب سے اچھا کام ہے مگر اللہ تعالیٰ نے تعریف ان مسلمانوں کی کی ہے جو اس پر مداومت رکھتے ہیں۔ فرمایا:

اِلَّا الْمُصَلِّیْنَ ○ الَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ○

(المعارج: ۲۲-۲۳)

لیکن وہ نمازی جو اپنی نماز پر مداومت رکھتے ہیں (یعنی ہمیشہ پڑھا کرتے ہیں)۔

اخلاق کی یکسانی اخلاق کا بڑا جوہر ہے اور اس کی مشق مداومت عمل سے ہوتی ہے

اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار اس کی تلقین فرمائی ہے۔ اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے کسی نے پوچھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کون سا عملِ نیک سب سے زیادہ محبوب تھا؟ فرمایا "وہ نیکی جس پر مداومت کی جائے[1]۔" خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "خدا کے نزدیک سب سے بہتر عمل وہ ہے جس کو ہمیشہ کیا جائے اگرچہ وہ تھوڑا ہو[2]۔"

---

[1] و [2] صحیح بخاری باب القصد ومداومۃ العمل۔

حق گوئی

یہ اخلاقی وصف بھی درحقیقت شجاعت ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ جس طرح میدانِ جنگ میں دونوں طرف کی مسلح فوجیں ایک دوسرے کے مقابل میں ہاتھ پاؤں سے شجاعت اور بہادری کا اظہار کرتی ہیں بعینہٖ اسی طرح جب حق و باطل کے درمیان باہم معرکہ آرائی ہوتی ہے تو دل اور زبان کی مشترکہ قوت سے حق کی حمایت میں جو آواز بلند کی جاتی ہے اسی کا نام حق گوئی ہے۔

حق گوئی کا اظہار اس وقت سب سے زیادہ قابلِ ستائش سمجھا جاتا ہے جب مادی طاقت کے لحاظ سے حق کمزور اور باطل طاقتور ہو۔ اور اسلام نے اسی قابلِ ستائش حق گوئی کی تعلیم دی ہے۔ اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ ○ إِنَّا كَفَيْنَاكَ الْمُسْتَهْزِئِينَ ○ الَّذِينَ يَجْعَلُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ (الحجر: ۹۴-۹۶)	پس تم کو جو حکم دیا گیا ہے اس کو کھول کر سنا دو اور مشرکین کی مطلق پروا نہ کرو۔ ہم تم کو تمہاری ہنسی اڑانے والوں کے مقابلہ میں جو خدا کے ساتھ دوسرے معبود قرار دیتے ہیں، کافی ہیں

یعنی اب مخفی طور پر دعوتِ توحید کا زمانہ گزر گیا اور علانیہ اس کی دعوت دینے کا وقت

آ گیا۔ اس لیے کھلم کھلا خدا کے اس حکم کو بیان کرو اور مشرکین اس کی ہنسی اڑائیں تو اُن کے تمسخر اور استہزاء کی مطلق پروا نہ کرو بلکہ اُن کی قوّت و طاقت کی بھی پروا نہ کرو۔ سب کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ بس ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ انسان کو جو چیز حق گوئی سے باز رکھتی ہے وُہ خوف ہے جس کی مختلف قسمیں ہیں۔ ایک خوف تو لعنت ملامت کا ہے جس کو اس آیت میں بے اثر کیا گیا ہے۔ اور ایک دُوسری آیت میں اس کو مسلمانوں کا ایک معیاری اخلاقی وصف قرار دیا گیا ہے:

وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ (المآئدۃ: ۵۴) — اور یہ لوگ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔

یعنی اہلِ ایمان حق کے اظہار میں لوگوں کے لعن وطعن کی پروا نہیں کرتے۔

لعنت ملامت کے ساتھ جان و مال اور بہت سی دوسری چیزوں کا خوف بھی انسان کو حق گوئی سے باز رکھ سکتا ہے۔ لیکن اسلام نے حق گوئی کے مقابل میں ہر قسم کے خوف کو بے اثر کر دیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک بار رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا "کسی کو جب کوئی حق بات معلوم ہو تو اس کے کہنے سے چاہیے کہ انسانوں کا خوف مانع نہ ہو۔" ایک بار آپؐ نے فرمایا کہ کوئی شخص اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھے۔ صحابہ نے کہا "یا رسُولؐ اللہ ہم میں کوئی شخص اپنے آپ کو کیوں کر حقیر سمجھ سکتا ہے؟" فرمایا "اس طرح کہ اس کو خدا کے بارے میں ایک بات کے کہنے کی ضرورت ہو اور وہ نہ کہے" ایسے شخص سے خدا قیامت کے دن کہے گا کہ تم کو میرے متعلق فلاں فلاں بات کے کہنے سے کس چیز نے روکا؟ وُہ کہے گا کہ انسانوں کا خوف۔ ارشاد ہو گا کہ تم کو سب سے زیادہ میرا

خوف کرنا چاہیے تھا۔"

انسانوں کے مختلف گروہوں میں سب سے زیادہ ہیبت ناک شخصیت ظلم پیشہ بادشاہوں کی ہوتی ہے اس لیے ان کے سامنے حق گوئی کو آپ نے سب سے بڑا جہاد قرار دیا اور فرمایا:

افضل الجهاد كلمة عدل عند سلطان جابر	بہترین جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے انصاف کی بات کا کہنا ہے۔

دُوسری روایت میں کلمۂ حق کا لفظ ہے۔

اسلام میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے جو مدارج قرار دیے گئے ہیں اُن میں دُوسرا درجہ اسی حق گوئی کا ہے۔ چنانچہ ایک بار مروان نے عید کے دن منبر نکالا اور نماز سے پہلے خطبہ دینا شروع کیا۔ اس پر ایک شخص نے کہا کہ مروان تم نے سُنّت کی مخالفت کی۔ آج تم نے منبر نکالا حالانکہ آج منبر نہیں نکالا جاتا تھا۔ نماز سے پہلے خطبہ دیا حالانکہ نماز سے پہلے خطبہ نہیں دیا جاتا تھا۔ اس پر ابو سعید خدریؓ نے فرمایا کہ "اس نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد میں نے سنا ہے کہ تم میں جو شخص بُرائی دیکھے اور اُس کو ہاتھ سے مٹانے کی طاقت رکھتا ہو تو ہاتھ سے مٹا دے ورنہ زبان سے۔ اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے لیکن یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔"[1]

صحابہ میں حضرت ابو ذر غفاریؓ کا مرتبہ حق گوئی میں بدرجۂ کمال تھا۔ یہ وہی تھے جنہوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد کفارِ قریش کے بھرے مجمع میں حرم میں جا کر توحید کا نعرہ بلند کیا اور اُس وقت تک خاموش نہ ہوئے جب تک مار کھاتے کھاتے بیدم نہ ہو گئے۔ لیکن اس پر بھی اُن کا نشہ نہیں اترا اور دُوسرے دن پھر جا کر اعلانِ حق کیا اور وہی سزا پائی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] سنن ابن ماجہ باب الامر بالمعروف والنہی عن المنکر میں یہ تمام حدیثیں مذکور ہیں۔

نے اُن کی مدح میں فرمایا کہ "آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر ابوذرؓ سے زیادہ حق گو کوئی نہیں"۔[1] چنانچہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں وُہ جب شام میں تھے تو وہاں کے مسلمانوں میں سرمایہ داری کی جو غیر اسلامی شان پیدا ہو رہی تھی اِس پر انہوں نے بے محابا دارو گیر کی اور اس میں امیر معاویہؓ کی پروا انہوں نے ذرا بھی نہیں کی۔

حضرت ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ ایک لمبا خطبہ دیا جس میں فرمایا "ہشیار رہنا کہ کسی کی ہیبت تم کو اس حق بات کے کہنے سے باز نہ رکھے جو تم کو معلوم ہے۔" یہ سُن کر حضرت ابو سعیدؓ روئے اور فرمایا کہ افسوس ہم نے ایسی باتیں دیکھیں اور ہیبت میں آ گئے۔[2]

---

[1] جامع ترمذی مناقب حضرت ابی ذرؓ۔

[2] ترغیب و ترہیب منذری۔ باب الترہیب من الغضب بحوالہ ترمذی۔

استغنا

استغنا کے معنی بے نیازی کے ہیں۔ اور ہر چیز سے بے نیازی ایک ایسا وصف ہے جو صرف خداوند تعالیٰ ہی کو حاصل ہے:

وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِينَ ○	اور جو (مقدور رکھتے ہوئے نعمت کی) ناشکری کرے (اور حج کو نہ جائے)
(آل عمران: ۹۷)	تو اللہ دنیا جہان سے بے نیاز ہے۔

اور اس بے نیازی میں خدا کا کوئی شریک نہیں ہے۔ وہی ایک بے نیاز ہے اور ساری دنیا اس کی محتاج ہے،

وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَأَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ	اور اللہ بے نیاز ہے اور تم ہی محتاج
(محمد: ۳۸)	ہو۔

انسان کی بے نیازی یہ ہے کہ اُس ذاتِ بے نیاز کے سوا دوسروں سے بے نیاز ہو۔ اور یہی چیز اسلامی بے نیازی کے سبق کو بے نیازی کے دوسرے اسباق سے ممتاز کرتی ہے اسلام کے آئین اخلاق میں اس استغنا اور بے نیازی کی تعلیم دو اصولوں پر قائم ہے۔ اول یہ کہ جو کچھ ملتا ہے اُس کا دینے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے اس لیے اُس کے سوا کسی اور کے

آگے ہاتھ نہ پھیلایا جائے۔ قرآن مجید کی وہ سورت جس کو ہم ہر نماز میں اور نماز کی ہر رکعت میں دُہراتے ہیں، اس کی ایک درمیانی آیت یہ ہے:

اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ (اے خدا) ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔

(الفاتحۃ: ۴)

خدا نے جابجا اپنے کو بندہ کا اصلی کارساز اور کارفرما بتا کر ان کے مضطرب دلوں کو تسکین دی ہے۔ فرمایا:

وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ۝ اور کیسا اچھا کارساز ہے۔

(آل عمران: ۱۷۳)

وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝ اور اللہ کارساز بس ہے۔

(النساء: ۸۱)

اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ۝ میرے سوا کسی کو کارساز نہ بناؤ۔

(بنی اسرائیل: ۲)

وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ۝ اور تیرا رب کارساز بس ہے۔

(بنی اسرائیل: ۶۵)

ایک آیت میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے پوچھتا ہے اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ[1] (کیا اللہ اپنے بندوں کو بس نہیں) اس لیے کسی شاہ، امیر اور دولت مند کے دروازہ کو جھانکنے کی ضرورت نہیں۔

دُوسرا اصول جس پر اسلامی استغنا کی بنیاد ہے وہ قناعت ہے۔ یعنی یہ کہ کم سے کم

---

[1] الزمر: ۳۶-

جو ملا ہے اُس پر طمانیت حاصل کی جائے اور زیادہ کی حرص اور لالچ نہ کیا جائے :

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ط (النسآء: ۳۲)	اور جس چیز میں اللہ نے ایک کو دوسرے پر بڑائی دی اس کی ہوس مت کرو۔
وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ (طٰہٰ: ۱۳۱)	اور اپنی آنکھیں نہ پسار اس کی طرف جو ہم نے ان میں سے طرح طرح کے لوگوں کو سامان دیا ہے۔

بعض لوگ باوجود دولت مند ہونے کے نہایت حریص ہوتے ہیں۔ مال و دولت سے اُن کی نیّت نہیں بھرتی اور اس کو ہر جائز و ناجائز طریقے سے حاصل کرتے ہیں اس لیے وُہ باوجود دولت مند ہونے کے محتاج ہوتے ہیں۔ لیکن ایک شخص بہت زیادہ دولت مند نہیں ہوتا تاہم خدا نے جو کچھ اُس کو دیا ہے اس پر قانع رہتا ہے اور اس سے زیادہ کی حرص نہیں کرتا اس لیے وُہ باوجود مال کی کمی کے مستغنی اور بے نیاز ہے۔ اس بنا پر استغنا و بے نیازی کا تعلّق دولت کی کمی اور بیشی سے نہیں ہے بلکہ روح اور قلب سے ہے۔ اور اسی نکتہ کو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے :

لیس الغنیٰ عن کثرۃ العروض ولٰکنّ الغنیٰ غنی النفس (بخاری، کتاب الرقاق، باب الغنیٰ غنی النفس)	دولت مندی مال واسباب کی کثرت کا نام نہیں ہے بلکہ اصلی دولت مندی دل کی بے نیازی ہے۔

اسی حدیث کا ترجمہ شیخ سعدیؒ نے ان لفظوں میں ادا کیا ہے، تونگری بدل است نہ بہ مال۔

ایک اور حدیث میں اس نکتہ کو آپؐ نے اور بھی زیادہ واضح طور پر بیان فرمایا حضرت ابوذرؓ فرماتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ "ابوذر! تمہارے خیال میں مال کی کثرت کا نام بے نیازی ہے؟" میں نے کہا "ہاں"۔ فرمایا "تو تمہارے خیال میں مال کی قلت کا نام محتاجی ہے؟" میں نے کہا "ہاں"۔ فرمایا "بے نیازی دل کی بے نیازی ہے اور محتاجی دل کی محتاجی ہے"[1]۔ اس بنا پر بے نیازی درحقیقت رضا و تسلیم سے پیدا ہوتی ہے مال و دولت سے پیدا نہیں ہوتی۔ یعنی خدا انسان کو جو کچھ دے دے اگر وہ اُس پر دل سے راضی ہوجائے تو اسی کا نام بے نیازی ہے یا کم از کم اس سے بے نیازی کا جوہر نفس میں پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت ابوہریرہؓ کو یہی تعلیم دی اور اُن سے فرمایا کہ جو کچھ تمہاری قسمت میں ہے اگر تم اس پر راضی ہوجاؤ تو تم سب سے زیادہ بے نیاز ہوجاؤ گے[2]۔ ایک بار چند انصاریوں نے آپؐ سے مال کا سوال کیا اور آپ نے اُن کا سوال پورا کیا۔ لیکن وُہ اس پر راضی نہیں ہوئے اور پھر سوال کیا۔ آپؐ نے پھر اُن کا سوال پورا کیا۔ جب دیتے دیتے تمام مال ختم ہوچکا تو فرمایا کہ میرے پاس جو کچھ مال ہوگا میں تم سے بچا کر جمع نہ کروں گا۔ جو شخص خودداری چاہتا ہے خدا اُس کو خوددار بناتا ہے اور جو شخص بے نیازی حاصل کرنا چاہتا ہے خدا اس کو بے نیاز کر دیتا ہے[3]۔ اسی طرح ایک بار حضرت حکیم بن حزامؓ نے آپؐ سے بار بار مال کا سوال کیا اور آپؐ نے ہر بار اُن کا سوال پورا کیا لیکن اخیر میں فرمایا کہ "اے حکیم یہ مال نہایت مرغوب چیز ہے۔ جو شخص اُس کو کھلے دِل سے لیتا ہے خدا اس میں برکت دیتا ہے اور جو شخص اس کو حرص کے ساتھ لیتا

---

[1] فتح الباری جلد ۱۱ صفحہ ۲۳۲ بحوالہ صحیح ابن حبان و موارد الظمآن الی زوائد ابن حبان للہیثمی قلمی نسخہ دار المصنفین باب الغنی غنی النفس [2] فتح الباری جلد ۱۱ صفحہ ۲۲۴ [3] ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ باب فی الاستعفاف۔

ہے اس میں برکت نہیں ہوتی اور اس شخص کے مثل ہوتا ہے جو کھاتا ہے لیکن اس کا پیٹ نہیں بھرتا۔ اُن پر اس تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ انہوں نے اس کے بعد کسی کا عطیہ نہیں قبول کیا[1]۔

فضالہ بن عبیدؓ سے روایت ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا خوشخبری ہو اس کو جس کو اسلام کی ہدایت ملی اور اُس کی روزی ضرورت کے مطابق ہے اور اللہ نے اُس کو اس پر قانع بنا دیا ہے[2]۔ حضرت سہل بن سعدؓ کہتے ہیں کہ جبریل امین نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو بتایا کہ مومن کا شرف رات کی نماز اور مومن کی عزت انسانوں سے بے نیاز ہو جانا ہے[3]۔

---

[1] ترمذی کتاب الزہد [2] زوائد صحیح ابن حبان قلمی نسخہ دارالمصنفین باب فی القناعہ [3] مستدرک حاکم ۴ صفحہ ۳۲۵ کتاب الرقاق

رذائل

رذائل کے معنی

رذائل (یعنی بُری خصلتیں) وہ اخلاقِ ذمیمہ ہیں جن کو خدا تعالےٰ ناپسند فرماتا ہے، جن سے بچنے کا حکم اس نے اپنے بندوں کو دیا ہے، جن کے کرنے والے اس کے حضور میں گنہگار ٹھہرتے ہیں، جن کی بُرائی کو ہر عقلمند جانتا اور مانتا ہے اور جن کے بدولت انسانی افراد اور جماعتوں کو روحانی اور مادّی نقصانات پہنچتے ہیں اور ان کی معاشرت تباہ ہوجاتی ہے۔ بلکہ جب وُہ کسی قوم میں عام ہوجاتے ہیں تو پوری قوم کی تباہی و بربادی کا سبب بن جاتے ہیں یعنی اس کی دینی و دنیاوی ترقّیوں کی راہیں مسدود اور سعادت اور اقبال کا دروازہ اس پر بند ہوجاتا ہے۔

رذائل کے قرآنی نام

اس قسم کے رذائل کے متعدّد اوصافی نام قرآنِ پاک میں آئے ہیں۔ مثلاً اکثر ان کو مُنکَر (ناشناسا) اور فَحشَآء (بے حیائی) اور کبھی فَاحِشَۃٌ (فحش) سَیِّئَۃٌ (بُرا) سُوْٓءَ (بُرائی) مَکرُوہ (ناپسندیدہ) خَطَأ (ناصواب یا بھول) اِثْمُ (گناہ) عُدْوَانَ (زیادتی) وغیرہ کہا گیا ہے۔ ان ہی لفظوں سے اندازہ ہوگا کہ رذائل سے متصف

ہونا کتنا گھناؤنا اور نفرت کے قابل ہے اور یہ کہ وُہ ایسے کام ہیں جو عقل اور شرع دونوں کی نگاہوں میں بدنما ہیں۔ فرمایا:

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ۝	اور اپنے بچوں کو مفلسی کے ڈر سے مت مار ڈالو۔ ہم ہیں ان کو اور تم کو روزی پہنچاتے۔ بے شبہ ان کا مار ڈالنا بڑی چوک ہے۔ اور زنا کے پاس مت جاؤ بے شبہ یہ بے حیائی اور بُری راہ ہے ....
....	
وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ۝ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ۝ (بنی اسرآءیل: ۳۱-۳۲ و ۳۷-۳۸)	اور زمین میں اترا کر نہ چل کہ تو نہ تو زمین کو پھاڑ ڈالے گا اور نہ لمبائی میں پہاڑ کو پہنچ جائے گا۔ ان میں سے جو بُری بات ہے وُہ تیرے پروردگار کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔

رذائل کے لیے قرآن پاک کا سب سے عام لفظ مُنکَر ہے۔ چنانچہ سورہ مائدہ میں جن بُرائیوں کی روک ٹوک نہ کرنے پر بنی اسرائیل کو ملامت کی گئی ہے ان کو ایک ہی لفظ مُنکَر سے ادا کیا گیا ہے:

كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝ (المآئدۃ: ۷۹)	وُہ ایک دوسرے کو اس منکر سے جو کرتے تھے روکتے نہ تھے۔ کیا بُرا کام ہے جو وُہ کرتے تھے۔

ایک بدکار قوم کی بُرائیاں گنائی جارہی ہیں۔ اس سلسلہ میں ہے:

وَتَاْتُوْنَ فِیْ نَادِیْكُمُ الْمُنْكَرَ ط (العنکبوت: ۲۹) — اور تم اپنی مجلس میں منکر کے مرتکب ہوتے ہو۔

اچھے لوگوں کی صفت یہ ہے:

وَیَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران: ۱۱۴) (التوبۃ: ۷۱) — اور منکر سے منع کرتے ہیں۔

وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (التوبۃ: ۱۱۲) — اور منکر سے منع کرنے والے۔

اور کہیں فحشا اور مُنکر کا لفظ ساتھ ساتھ آیا ہے:

فَاِنَّهٗ یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ط (النور: ۲۱) — وُہ فحشا اور منکر کرنے کو کہتا ہے۔

نماز کی خوبی یہ ہے کہ

تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ط (العنکبوت: ۴۵) — وُہ فحشا، اور منکر سے باز رکھتی ہے۔

فحشا، منکر اور بغی

کہیں آیت میں تین لفظ جمع ہیں۔ فحشار منکر اور بغی:

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰى وَیَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْیِ ج — (مسلمانو!) اللہ انصاف اور احسان کرنے کا اور قرابت والوں کو دینے کا حکم دیتا ہے اور فحشا، اور منکر اور

يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ○ بغی سے منع فرماتا ہے۔ تم لوگوں کو نصیحتیں کرتا ہے تاکہ تم خیال رکھو۔

(النحل: ۹۰)

یہ آیت ہر قسم کے فضائل اور رذائل کو محیط ہے۔ حضرت عثمان بن مظعونؓ کا بیان ہے کہ میں پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شرم وحیا سے اسلام لایا تھا۔ اسلام نے میرے دل میں جگہ نہیں پکڑی تھی لیکن جب یہ آیت نازل ہوئی تو ایمان نے میرے دل میں جگہ پکڑی[1] حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے کہ قرآن مجید میں خیر و شر کی سب سے زیادہ جامع آیت[2] یہی ہے۔

قتادہؒ کہتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں جن اخلاقِ حسنہ پر عمل کیا جاتا تھا اور وہ پسند کیے جاتے تھے۔ اُن میں کوئی خُلق ایسا نہیں ہے جس کا خدا نے اس آیت میں حکم نہ دیا ہو اور کوئی بد اخلاقی ایسی نہیں ہے جس کی اس آیت میں ممانعت نہ کی ہو[3]۔

اس آیت میں منہیات کے سلسلہ میں تین لفظ آئے ہیں فحشاء اور منکر اور بغی ان میں سے ہر لفظ کی تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے۔

فحشاء کے معنی

ان میں پہلا لفظ فحشاء ہے، جس کی دُوسری صُورت فَاحِشَۃ کی ہے۔ یہ لفظ فحش سے نکلا ہے جس کے اصلی معنی حد سے آگے بڑھ جانے کے ہیں[4]۔ اور اس کے دُوسرے لازمی معنی قبح یعنی بُرائی کے ہیں۔ کیونکہ جس چیز کی جو حد خالقِ فطرت نے مقرر کر دی ہے اُس سے آگے بڑھنا قبح یعنی بُرائی ہے یا یہ کہ جو بُرائی حد سے زیادہ ہو جائے

---

[1] مسند احمد بن حنبل عن ابن عباسؓ۔ [2] مستدرک حاکم ج ۲ ص ۳۵۶ و ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکور۔ [3] ابن جریر طبری تفسیر آیت مذکور۔ [4] الصحاح للجوہری لفظ فحش ولسان العرب لفظ فاحش زیر "فحش"۔

وہی فحشاء کہلاتی ہے۔ قرآن پاک نے گناہ کے معنی میں حدود الٰہی سے تعدّی اور تجاوز کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ مثال سے یوں سمجھیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی قوّتِ شہوانی کی تسکین کے لیے کچھ حدیں مقرر فرمادیں۔ اب جو ان حدوں سے آگے بڑھتا ہے وُہ تعدّیٔ حدود اور فحشاء اور فاحشہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ فرمایا:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ (المؤمنون: ۵-۷)	اور جو اپنی شرمگاہوں کی نگہبانی کرتے ہیں لیکن اپنی بیویوں پر یا اپنے ہاتھ کی مملوکہ پر تو انہیں ملامت نہیں کی جائے گی۔ پھر جو کوئی اس کے سوا کو ڈھونڈے تو وہی حد سے بڑھنے والے ہیں۔

اسی لیے زنا کا نام ہی فاحشہ رکھا گیا ہے اور اس کے معنی ہی امر قبیح کے ہوگئے ہیں۔ قرآن نے کہا ہے:

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۝ (بنی اسرآءیل: ۳۲)	اور زنا کے نزدیک نہ جاؤ کیونکہ یہ "فاحشہ" (یعنی قبیح بات) اور بُری راہ ہے۔

اور وسعت کے ساتھ اس کا اطلاق ہر فحش گوئی اور فحش کاری پر ہوتا ہے جس کی ہر نوع سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ کو باز رہنے کی تاکید کی ہے۔

منکر کے معنی

دُوسرا لفظ مُنکَر ہے۔ اس کے لغوی معنی ناشناسا کے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جو کام لوگوں میں عام طور سے پسند کیا جاتا ہے اور جس کا کرنے والا لوگوں میں ممدوح ہوتا ہے وہ تو جانا پہچانا کام ہے، اسی لیے اس کو مَعْرُوف (آشنا سا) کہتے ہیں۔ اور جو کام ہر طبقہ میں ناپسند کیا جاتا ہے اور اس کا کرنے والا سب کی نگاہ سے گر جاتا ہے وہ مُنکَر (ناآشنا سا) ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے کچھ ناآشنا سا مہمان آ جاتے ہیں تو وہ کہتے ہیں، قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ[1] یعنی لوگ اَن جانے اور اَن پہچانے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السّلام کے سامنے جب اُن کے بھائی آئے تو انہوں نے تو پہچان لیا مگر وہ لوگ اُن کو پہچان نہ سکے۔ اس موقع پر قرآن میں ہے فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ[2] یعنی یوسفؑ نے تو اُن کو پہچان لیا مگر وہ ان کو پہچان نہ سکے۔

ناگواری کی حالت میں انسان کا چہرہ ہر شخص کو نظر آتا ہے کہ وہ کس طرح بگڑ جاتا ہے اور اس کے طور و انداز سے بداہۃً ناگواری ظاہر ہونے لگتی ہے۔ یہ کیفیت بھی مُنکَر ہے۔ فرمایا:

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ۭ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۭ	اور جب ان (کافروں) کو ہماری کھلی ہوئی آیتیں سنائی جائیں تو کافروں کے چہروں میں تو مُنکَر (بگڑی ہوئی شکل) پہچانے گا۔ نزدیک ہوتے ہیں کہ وہ ان پر جو ہماری آیتیں سناتے ہیں حملہ کر بیٹھیں۔
(الحج: ۷۲)	

اس آیت میں ناخوشگواری کے اثر سے چہرہ میں جو بدنمائی پیدا ہوتی ہے اس کو

---

[1] الذاریات: ۲۵۔ [2] یوسف: ۵۸۔

مُنکَر کہا گیا ہے۔ ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ منکر وُہ کام ہیں جن کو ہر شخص فطرۃً اور بداہتہً ناپسند کرتا ہے اور اُن کی بُرائی ایسی کھلی ہوتی ہے کہ اُس پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی اور یہی سبب ہے کہ ہر مذہب و ملّت اور ہر اچھے تمدّن و تہذیب میں وُہ یکساں بُرے سمجھے جاتے ہیں۔

بغی کے معنی

تیسرا لفظ بغی ہے جس کے لفظی معنی کسی پر زیادتی یا دست درازی کرنا ہیں:

خَصۡمٰنِ بَغٰی بَعۡضُنَا عَلٰی بَعۡضٍ (ص: ۲۲)	ہم دو جھگڑنے والے ہیں ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے۔

خدا فرماتا ہے کہ اگر لوگوں کو بے انتہا دولت دے دی جائے تو وہ ایک دوسرے پر زیادتی کرنے لگیں:

وَلَوۡ بَسَطَ اللّٰہُ الرِّزۡقَ لِعِبَادِہٖ لَبَغَوۡا فِی الۡاَرۡضِ (الشوریٰ: ۲۷)	اور اگر اللہ اپنے بندوں کے لیے روزی پھیلا دے تو وہ زمین میں زیادتی کریں۔

اسی سورہ میں ہے:

اِنَّمَا السَّبِیۡلُ عَلَی الَّذِیۡنَ یَظۡلِمُوۡنَ النَّاسَ وَیَبۡغُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ ؕ (الشوریٰ: ۴۲)	راہ ان ہی پر ہے جو لوگوں پر ظلم اور زمین میں زیادتی کرتے ہیں۔

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ بغی کے معنی دُوسروں پر زیادتی اور تعدّی کے ہیں۔

اخلاقِ ذمیمہ بُرے کیوں ہیں

اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ رذائل تین یعنی فحشآء، مُنکر اور بغی میں منحصر ہیں۔ صفاتِ ذمیمہ فحشاء یعنی حد درجہ قبیح اور بے حیائی کے کام ہیں اور ایسی باتیں ہیں جن کو سارے انسان فطرۃً ناپسند کرتے ہیں اور اُن کے جائز کر دینے سے دُوسروں کے حقوق پر تعدی لازم آتی ہے۔

سورۃ اعراف کی ایک آیت ہے:

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ (الاعراف: ۳۳)	اے پیغمبر! کہہ دے کہ میرے پروردگار نے بُرائی کے سارے کاموں (فواحش) کو جو کھلے ہوں یا چھپے اور گناہ کو اور ناحق زیادتی کو منع کیا ہے۔

اس آیت میں بھی رذائل کو تین لفظوں میں منحصر کیا ہے۔ ایک فواحش یعنی بُرائی اور بے حیائی کے سارے کام جو کھلے ہوں یا چھپے۔ دُوسرے گناہ کے کام۔ اور تیسرے ناحق زیادتی۔ اُن اخلاقِ ذمیمہ کی جن کو ہر مذہب اور ہر انسانی معاشرت نے یکساں بُرا کہا ہے اگر تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وُہ درحقیقت بُرائی اور بے حیائی کے کام ہیں اور دین و شرافت کی نگاہ میں گناہ اور ناپسندیدہ ہیں۔ اور اگر اُن کو جائز ٹھہرایا جائے تو افراد کے باہمی حقوق سے امان اُٹھ جائے اور کسی کی جان و مال اور عزت و آبرو سلامت نہ رہے۔[1]

---

[1] منطقی اصطلاح میں فحشآء، مُنکر اور بغی میں مانعۃ الخلو ہے یعنی کسی بداخلاقی میں ان تینوں کا اجتماع تو ہو سکتا ہے مگر کوئی بداخلاقی ان تینوں میں سے کسی ایک سے خالی نہیں رہ سکتی یعنی ہر بداخلاقی میں تینوں کا یا تینوں میں سے ایک کا پایا جانا ضروری ہے۔

رذائل کی ترتیب

ان رذائل کی ترتیب دو نظریوں کے مطابق دی جا سکتی ہے۔ ایک یہ کہ کسی بُرائی کے اثر کا دائرہ کتنا وسیع ہے اور دُوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ناپسندیدگی اور عدمِ رضا سے کس کو کتنا لگاؤ ہے۔ اُوپر کی آیت میں ترتیب کے ساتھ رذائل کو تین بڑے عنوانوں میں گویا تقسیم کر دیا گیا ہے، سب سے پہلے فَحْشَآء پھر مُنکر پھر بغی۔

فَحْشَآء میں جس بُرائی کی طرف اشارہ ہے وہ اساسًا ایک فرد کی ذات تک محدود رہتی ہے جیسے ننگے رہنا، بدکاری میں مبتلا ہونا وغیرہ۔ مُنکر سے پُوری جماعت کی معاشرتی زندگی متاثر ہوتی ہے جیسے شوہر کا ظلم، باپ کی سنگ دلی، اولاد کی نالائقی۔ اور بغی جماعت سے آگے بڑھ کر پُورے ملک و ملّت کو چھا لیتی ہے جیسے چوری، قتل، ڈاکہ وغیرہ۔

یہ تو ایک نظریہ کے مطابق رذائل کی ترتیب ہوئی۔ دوسرے نظریہ کی رو سے پہلے صفاتِ ذمیمہ ہیں جن سے خدا کی رحمت چھن جاتی ہے، پھر وُہ برائیاں ہیں جو خدا کی محبت سے محروم کر دیتی ہیں اور پھر وُہ ہیں جو رضائے الٰہی سے خالی ہیں۔

جھوٹ

انسان کے سارے اخلاقِ ذمیمہ میں سب سے زیادہ بُری اور مذموم عادت جھوٹ کی ہے یہ جھوٹ خواہ زبان سے بولا جائے یا عمل سے ظاہر کیا جاتے۔ کیونکہ ہمارے تمام اعمال کی بنیاد اس پر ہے کہ وُہ واقعہ کے مطابق ہوں اور جھوٹ ٹھیک اس کی ضد ہے اس لیے یہ بُرائی ہر قسم کی قولی اور عملی بُرائیوں کی جڑ ہے۔ انسان کے دِل کے اندر کی بات سوا خدا کے کوئی دوسرا نہیں جانتا۔ کوئی دوسرا کسی شخص متعلّق اگر کچھ جان سکتا یا باور کر سکتا ہے تو اس کی ایک ہی صورت ہے اور وُہ یہ ہے کہ وہ شخص خود اپنی زبان یا عمل سے اس کو ظاہر کرے۔ اب اگر وُہ اپنی اندرونی صحیح اور واقعہ کے مطابق بات جان بوجھ کر نہیں ظاہر کرتا بلکہ اس کے خلاف ظاہر کر رہا ہے تو ساری دُنیا کو فریب دے رہا ہے۔ ایسے شخص میں دُنیا کی جو بُرائیاں بھی نہ ہوں وُہ کم ہے کیونکہ اس نے تو اسی آئینہ کو توڑ ڈالا ہے جس میں حقیقت کا چہرہ نظر آتا ہے۔

اسی لیے نبی کی پہلی صِفت یہ ہے کہ وہ صادق ہو۔ چنانچہ بعض پیغمبروں کے لیے یہ صِفت کے طور پر بولا گیا ہے۔ فرمایا:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ﴿ اور اس کتاب میں ادریس کا ذکر کر۔

إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا ۝ — وہ بے شک بڑا سچا نبی تھا۔

(مریم: ۵۶)

اسی سے لیے جو کاذب ہے وہ نبی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ پھر اس کے دعویٰ اور پیام پر کسی کو بھروسہ کیونکر ہو گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام نے جب اپنی نبوّت کا دعوای فرعون کے سامنے پیش کیا اور اس نے اس کے ماننے سے انکار کیا تو اس کے ایک درباری نے جو دل میں مسلمان تھا، فرعونیوں کے سامنے حضرت موسیٰؑ کے صدقِ نبوّت پر ان کی عام سچائی ہی سے دلیل پیش کی اور کہا کہ جھوٹا خدا کا نبی نہیں ہو سکتا:

وَإِن يَكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهُ وَإِن يَكُ صَادِقًا يُصِبْكُم بَعْضُ الَّذِي يَعِدُكُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ۝ — اگر یہ جھوٹا ہو گا تو اس کا جھوٹ اسی پر پڑے گا، اور اگر سچا ہو گا تو تم پر پڑے گا کچھ اس وعدہ میں سے جو وہ تم کو دیتا ہے۔ بیشک اللہ اس کو راہ نہیں دکھاتا جو بے باک جھوٹا ہو۔

(المؤمن: ۲۸)

اس میں یہ تلمیح بھی چھپی ہے کہ مدعیِ نبوّت کے برخلاف فرعون اپنے ہر کام کر گزرنے میں بے باک اور جھوٹا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹے انبیاء علیہم السّلام کی راہ سے ہٹے ہوئے ہیں اور کفار کے طور و طریق پر چلتے ہیں۔ رُوم کے قیصر نے بھی اپنے دربار میں ابو سفیان سے جو باتیں پوچھی تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ مکّہ کا مدعی اپنے دعوائے نبوّت سے پہلے کیا جھوٹ بھی بولا کرتا تھا؟ ابو سفیان نے جواب دیا "نہیں"۔ قیصر نے کہا جو بندہ پر جھوٹ نہیں باندھتا وُہ خدا پر جھوٹ

باندھے گا[1]؟ یہ نہیں ہو سکتا۔

قرآن پاک میں نبی کی صداقت کی دلیل میں ایک اور آیت ہے:

تَنَزَّلُ عَلٰی کُلِّ اَفَّاکٍ اَثِیْمٍ ۙ	شیطان اترتے ہیں ہر جھوٹے گنہگار
یُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَکْثَرُهُمْ	پر۔ لا ڈالتے ہیں سُنی بات اور
کٰذِبُوْنَ ؕ (الشعرآء: ۲۲۲-۲۲۳)	بہت اُن میں جھوٹے ہیں۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ جھوٹ انبیائے کرام علیہم السّلام کی سنّت اور روش کے سراسر خلاف ہے اسی لیے جو جھوٹا ہوتا ہے اس کے دل سے خدا کی روشنی (ہدایت) بجھ جاتی ہے۔ ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ هُوَ	بے شک اللہ اس کو راہ نہیں دکھاتا
کٰذِبٌ کَفَّارٌ ۝	جو جھوٹا ہے احسان نہیں مانتا۔

(الزمر: ۳)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ "جھوٹ گناہ (فجور) کی طرف لے جاتا ہے اور گناہ دوزخ میں۔ اور جھوٹ بولتے بولتے آدمی خدا کے ہاں جھوٹا لکھ لیا جاتا ہے[2]"۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم جنّت میں لے جانے والا کام کیا ہے"؟ فرمایا "سچ بولنا۔ جب بندہ سچ بولتا ہے تو نیکی کا کام کرتا ہے۔ اور جو نیکی کا کام کرتا ہے وُہ ایمان سے بھرپور ہوتا ہے۔ اور جو ایمان سے بھرپور ہوا وُہ جنّت

---

[1] صحیح بخاری بدء الوحی۔ [2] صحیح بخاری کتاب الادب باب قولہ تعالیٰ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ جامع ترمذی باب ماجاء فی الصدق والکذب وابوداؤد کتاب الادب باب التشدید فی الکذب۔

میں داخل ہوا۔ اُس نے پھر پوچھا کہ "یا رسولؐ اللہ دوزخ میں لے جانے والا کام کیا ہے؟" فرمایا: جھوٹ بولنا۔ جب بندہ جھوٹ بولے گا تو گناہ کے کام کرے گا۔ اور جب گناہ کے کام کرے گا تو کفر کرے گا اور جو کفر کرے گا دوزخ میں جائے گا۔"[1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جھوٹ کی بُرائی کی وسعت اتنی ہے کہ کفر بھی اس میں آجاتا ہے جس سے زیادہ بُری چیز کوئی دوسری نہیں اور جس کے لیے نجات کا ہر دروازہ بند ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ وہ دنیا کے ذرّہ ذرّہ کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس کی رحمت کی چھاؤں میں ساری کائنات آرام کر رہی ہے مگر رحمتِ الٰہی کے اس گھنے سایہ سے وُہ باہر ہے جس کا منہ جھوٹ کی بادِ سموم سے جھلس رہا ہے۔

اسلام کی لغت کا سخت ترین لفظ "لعنت" ہے۔ لعنت کے معنی "اللہ کی رحمت سے دوری اور محرومی" کے ہیں۔ قرآن پاک میں اس کا مستحق شیطان بنایا گیا ہے اور اس کے بعد یہودیوں، کافروں اور منافقوں کو اس کی وعید سنائی گئی ہے۔ لیکن کسی مومن کو کذب کے سوا اس کے کسی فعل کی بنا پر لعنت سے یاد نہیں کیا گیا۔ جھوٹ بولنے اور جھوٹا الزام لگانے کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے کہ جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت کی جائے۔ مباہلہ کے موقع پر یہ فرمایا گیا کہ دونوں فریق خدائے تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا مانگیں کہ جو ہم میں جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت ہو:

ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ○ (آل عمران: ۶۱)	پھر دعا کریں، پھر جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں۔

---

[1] مسند احمد، ج اول صہ ۱۷۶ مصر۔

میاں بیوی کے لعان کی صورت میں جب شوہر بیوی پر بدکاری کا الزام لگائے اور شوہر کے پاس اس کا کوئی گواہ نہ ہو تو اس کو چار دفعہ اپنی سچائی کی قسم کھانے کے بعد پانچویں دفعہ یہ کہنا پڑے گا:

اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ○ (النور: ۷)	اس پر اللہ کی لعنت ہو اگر وہ جھوٹوں میں سے ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ جھوٹ ایسی بُری چیز ہے کہ جو اس کا مرتکب ہوتا ہے وُہ کافروں اور منافقوں کی طرح کی بددعا کا مستحق ہوتا ہے۔

جھوٹ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ جان کر کوئی انجان بن جائے، حق کا علم رکھ کر بھی اُس کے اظہار سے باز رہے۔ اللہ تعالےٰ نے ایسے جھوٹوں پر بھی لعنت فرمائی ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ○ (البقرة: ۱۵۹)	بے شک جو چھپاتے ہیں جو اتارے ہم نے صاف حکم اور راہ کے نشان اس کے بعد کہ ہم نے کتاب میں ان کو انسانوں کے لیے کھول کر کہہ دیا ہے۔ ان پر اللہ لعنت بھیجتا ہے، اور لعنت کرنے والے لعنت کرتے ہیں۔

یہ جھوٹ کی سلبی صورت ہے۔ کیونکہ اس خاموشی اور اخفا سے مقصود یہ ہے کہ لوگ اس حق کو باور نہ کریں اور اس کو جھوٹا سمجھیں۔ اس لیے وہ جھوٹ کے گو قولاً نہیں لیکن عملاً مرتکب ہوتے ہیں اور نفاق کی پرورش کرتے ہیں۔

نفاق اس کو کہتے ہیں کہ دل میں کچھ ہو اور زبان پر کچھ۔ اس لیے جو منافق ہوگا وہ جھوٹا بھی ضرور ہوگا۔ چنانچہ قرآنِ پاک نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔ فرمایا:

وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ○ (المنفقون: ۱)	اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں۔

اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جھوٹ کو منافق کی نشانی قرار دیا ہے۔ فرمایا کہ "منافق کی پہچان تین ہیں۔ جب کہے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے پورا نہ کرے اور جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے[1]"۔ لفظوں میں تو یہ باتیں تین ہیں لیکن حقیقت میں یہ ایک ہی شکل کی تین مختلف تصویریں ہیں۔ جھوٹ باتیں کرنا تو جھوٹ ہے ہی مگر وعدہ کرکے پورا نہ کرنا بھی جھوٹ ہی ہے۔ اور اسی طرح امین بن کر خیانت کرنا بھی عملی جھوٹ ہے۔ کیونکہ جو امین بنتا ہے وہ معنًی اپنی نسبت یہ یقین دلاتا ہے کہ وہ اس میں خیانت نہ کرے گا اور جب اس نے اس کے خلاف کیا تو وہ عملاً جھوٹ بولا۔

جھوٹ اکیلی بُرائی نہیں بلکہ اس کی وجہ سے جھوٹے میں بیسیوں قسم کی دوسری بُرائیاں بھی لازمی طور سے پیدا ہوجاتی ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالےٰ نے کاذب کے ساتھ ساتھ دوسری بُری صفتیں بھی ظاہر کی ہیں جیسے:

اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ○ (الشعرآء: ۲۲۲)	جھوٹ بولنے والا گنہگار۔
كٰذِبٌ كَفَّارٌ ○ (الزمر: ۳)	جھوٹ بولنے والا، احسان کا حق نہ ماننے والا۔
مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ○ (المؤمن: ۲۸)	بے باک جھوٹا۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب، باب قولہ تعالیٰ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ، وما ینہی عن الکذب۔

ان آیتوں نے بتایا کہ جھوٹا گناہوں میں لت پت ہوتا ہے، کیونکہ جھوٹ کی عادت کے سبب سے وہ کسی بُرائی کے کرنے سے جھجکتا نہیں۔ کیونکہ وُہ سمجھتا ہے کہ موقع پر جھوٹ بول کر میں اس کو چھپالوں گا۔ اس لیے وُہ ہر برائی کے کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ جو جھوٹا ہوگا وُہ اپنے کسی محسن کا احسان بھی نہیں ماننے گا کیونکہ جو خود جھوٹا ہے وہ دوسرے کو بھی اس کے عمل اور نیت میں جھوٹا ہی سمجھے گا اور اگر وُہ زبان سے کہے بھی کہ میں مانتا ہوں تو کسی کو اس کی بات پر یقین کاہے کو آنے لگا۔ اسی طرح جو جھوٹ بولتا ہے اس کو کسی بُرے سے بُرے کام کے کرنے میں باک نہیں ہوتا۔ وُہ ہر گناہ پر دلیر اور حد سے بڑھ جاتا ہے۔

جھوٹ کی عام قسم تو یہی ہے کہ زبان سے وُہ کہا جائے جو دل میں نہیں یا جو اس کے اندرونی علم و یقین کے خلاف ہو۔ لیکن یہ کذبِ قولی یعنی زبان کا جھوٹ ہے کذبِ عملی یعنی عمل کا جھوٹ یہ ہے کہ جو کہا جائے وہ نہ کیا جائے:

بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰہَ مَا وَعَدُوْہُ	اس لیے کہ اللہ سے جو وعدہ کیا تھا اس
وَبِمَا کَانُوْا یَکْذِبُوْنَ ○	کے خلاف کیا اور اس لیے کہ جھوٹ
(التوبۃ: ۷۷)	بولتے تھے۔

اس جھوٹ کے سبب سے ان کے دلوں میں نفاق نے جگہ پکڑی۔ قسم کھا کر اور عہد کر کے کسی کام کو طاقت رکھ کر پھر نہ کرنا ایک قسم کا فریب تو ہے ہی مگر جھوٹ بھی ہے اور ایسا جھوٹ جو مہلک ہے:

وَسَیَحْلِفُوْنَ بِاللّٰہِ لَوِاسْتَطَعْنَا	اور وُہ قسم کھائیں گے کہ ہم کو مقدور
لَخَرَجْنَا مَعَکُمْ ۚ یُھْلِکُوْنَ	ہوتا تو ہم تمہارے ساتھ لڑائی میں
اَنْفُسَھُمْ ۚ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ اِنَّھُمْ	چلتے۔ وُہ اپنے آپ کو ہلاکت میں

تَكۡذِبُوۡنَ ○ (التوبة: ۴۲) — ڈالتے ہیں۔ اور اللہ کو معلوم ہے کہ وُہ جھوٹے ہیں۔

سورۂ احزاب میں اللہ تعالےٰ نے اُن صادقین کا ذکر فرمایا ہے جنہوں نے اپنی سچّائی کا عملاً ثبوت دیا۔ اور جو عملاً جھوٹے ٹھہرے اُن کو منافق کا خطاب دیا ہے۔ فرمایا:

لِيَجۡزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيۡنَ بِصِدۡقِهِمۡ وَيُعَذِّبَ الۡمُنٰفِقِيۡنَ اِنۡ شَآءَ اَوۡ يَتُوۡبَ عَلَيۡهِمۡ ؕ (الاحزاب: ۲۴) — تاکہ اللہ سچّوں کو اُن کی سچّائی کے سبب سے اجر دے اور منافقوں کو سزا دے اگر چاہے یا اُن پر رجوع ہو۔ (یعنی مسلمان ہو جائیں تو معاف ہو جائے)۔

انسان کی طرح اس کا عضو عضو بھی جھوٹ کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ فرمایا:

نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ ○ (العلق: ۱۶) — جھوٹی خطاکار پیشانی۔

ہر چند کہ اس کو استعارہ کہئے پھر بھی پیشانی کا جھوٹ کلنک کا ٹیکا ہے جو مٹ نہیں سکتا۔

اسی طرح ریاکاری کرنا اور جو نہیں ہے اپنے کو وُہ دکھانے کی کوشش کرنا بھی عملاً جھوٹ ہے۔

قَالُوۡا لَوۡ نَعۡلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعۡنٰكُمۡ ؕ هُمۡ لِلۡكُفۡرِ يَوۡمَئِذٍ اَقۡرَبُ مِنۡهُمۡ لِلۡاِيۡمَانِ ۚ يَقُوۡلُوۡنَ بِاَفۡوَاهِهِمۡ مَّا لَيۡسَ فِيۡ قُلُوۡبِهِمۡ ؕ — انہوں نے کہا اگر ہم جانیں کہ لڑائی ہوگی تو ہم بھی تمہارے ساتھ چلیں۔ وُہ اس وقت ایمان سے زیادہ کفر سے قریب ہیں۔ وُہ منہ سے وہ کہتے

(آل عمرٰن: ۱۶۷) ہیں جو ان کے دل میں نہیں۔

دِل کے اُن بیماروں کے متعلق جو مسلمانوں اور یہودیوں دونوں کو خوش رکھنا چاہتے تھے اور مسلمانوں کو آکر اپنی صلح پسندی کا جھوٹا یقین دلاتے تھے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ (النساء: ۶۳) یہ وہ ہیں جن کے دِل کا حال اللہ جانتا ہے۔

ایسے ہی وُہ شخص جو اپنے کو وہ دکھانا چاہے جو وہ نہیں ہے یا اپنے میں وہ باور کرانا چاہے جو اس میں نہیں ہے جھوٹا ہے۔ ایک دفعہ ایک عورت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر پوچھا کہ "یا رسول اللہ! میری ایک پڑوسن (سوتن) ہے۔ کیا اگر میں یہ ظاہر کروں کہ مجھے شوہر نے یہ دیا یہ دیا اور واقعہ یہ نہ ہو صرف اس کو جلانا مدِّ نظر ہو تو کیا یہ بھی گناہ ہے؟" فرمایا "جو جتنا نہیں دیا گیا اتنے کا دکھاوا کرنے والا جھوٹ کے دو جامے پہننے والے کی طرح ہے[1]" حدیث کے شارح کہتے ہیں کہ دو جامے یوں کہ جو اس کے پاس نہیں اُس کا ہونا اپنے پاس بتانا جھوٹ کا ایک جامہ ہوا اور جس نے جو نہیں دیا اس کا دینا بتانا اس پر جھوٹ باندھنا ہے یہ جھوٹ کا دوسرا جامہ ہوا۔ اسی طرح جو عالم نہیں وُہ اپنے کو عالم باور کرانے کی کوشش کرے، جو دولت مند نہیں وُہ دولت مندی کا دکھاوا کرے یعنی کسی کے پاس جو چیز نہیں اس کو اپنے پاس دکھانے کی کوشش کرنا درحقیقت دوسروں کو فریب دینے کی کوشش ہے۔ غالباً اسی لیے اس عورت کو جس کے سر کے بال چھوٹے ہوں اس کی ممانعت کی گئی ہے کہ وہ مصنوعی بال لگا کر اپنے بالوں کو لمبا بنائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی زُور فرمایا ہے[2]۔

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب۔ [2] صحیح بخاری باب الوصل فی الشعر۔

جھوٹ کے بہت سے مرتبے ہیں۔ اچھے اچھے لوگوں کا یہ حال ہے کہ وہ بے ضرر جھوٹ کو بُرا نہیں جانتے۔ جیسے اکثر لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ بچوں کو بہلانے کے لیے اُن سے جھوٹے وعدے کر لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ ان وعدوں کو تھوڑی دیر میں بھول جائیں گے۔ اور گو ہوتا بھی اکثر یہی ہے مگر جھوٹ بہرحال جھوٹ ہے۔ اسلام نے اس جھوٹ کی بھی اجازت نہیں دی ہے۔ ایک کم سن صحابی عبداللہ بن عامرؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ میری ماں نے مجھے بلایا اور حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم میرے گھر میں تشریف رکھتے تھے۔ تو ماں نے میرے بلانے کے لیے کہا کہ "یہاں آ تجھے کچھ دوں گی"۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا "تم کہتی ہو مگر تم اس کو کچھ دینا نہیں چاہتی ہو"۔ ماں نے کہا "اس کو کھجور دے دوں گی"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا "ہاں اگر تم اس کو اس وقت کچھ نہ دیتیں تو یہ جھُوٹ بھی تمہارا لکھا جاتا"۔[1]

اس تعلیم کا منشا یہ تو ہے ہی کہ مسلمان کو کسی حال میں بھی اپنے لب کو جھوٹ سے آلودہ نہیں کرنا چاہیے لیکن اس موقع پر سچ بولنے کی تاکید فرمانا اس لیے بھی ہے کہ ماں باپ کے غلط رویّہ سے بچّہ کی تعلیم و تربیت پر بُرا اثر پڑے گا۔ وُہ بچپن میں جو کچھ دیکھے اور سُنے گا اسی سانچے میں ڈھلے گا۔ اس لیے لوگوں کو چاہیے کہ بچّوں سے بھی جھوٹ نہ بولیں۔

بعض لوگوں کی عادت یہ ہوتی ہے کہ جب اُن کو کھانے کے لیے یا کسی اور چیز کے لیے کہا جاتا ہے تو وُہ تصنّع اور بناوٹ سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ مجھے خواہش نہیں حالانکہ ان کے دل میں اس کی خواہش موجود ہوتی ہے تو یہ بھی جھوٹ ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک صحابیہ خاتون حضرت اسماء بنت یزیدؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم سے دریافت کیا کہ

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب التشدید فی الکذب۔

ہم میں سے کوئی کسی چیز کی خواہش رکھے اور پھر کہہ دے کہ مجھے اس کی خواہش نہیں تو کیا یہ بھی جھوٹ شمار ہوگا؟ ارشاد ہوا کہ ہر چھوٹے سے چھوٹا جھوٹ بھی جھوٹ لکھا جاتا ہے[1]۔

اسی طرح وہ جھوٹ ہے جو خوش گپّی کے موقع پر محض لطفِ صحبت کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس سے بھی اگرچہ کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا بلکہ بعض موقعوں پر یہ ایک دلچسپی کی چیز بن جاتا ہے تاہم اسلام نے اس کی بھی اجازت نہیں دی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے کہ "جو شخص لوگوں کے ہنسانے کے لیے جھوٹ بولتا ہے اس پر افسوس! اس پر افسوس[2]!" کیونکہ اس سے آدمی کا وزن ہلکا ہوتا ہے اور اس کی بات بے اعتبار ہوتی ہے اور ہر شخص یہ سمجھنے لگتا ہے کہ اس کا سچ جھوٹ برابر ہے۔

اس صورت کے علاوہ جھوٹ کی جتنی خطرناک صورتیں ہیں اُن کے خطرات کے لحاظ سے اسلام نے ان کے مدارج مقرر کیے ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ ایک شخص ایک شخص کو سچّا اور قابلِ اعتبار سمجھتا ہے اس لیے اس کی ہر بات کا یقین کر لیتا ہے۔ لیکن وہ شخص اس کے علم ویقین سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے اور جھوٹ بول کر اس کو سخت فریب ونقصان میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اسلام نے اس کو سخت خیانت قرار دیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا ہے کہ "یہ ایک بہت بڑی خیانت ہے کہ تم اپنے بھائی سے ایک جھوٹی بات کہو درآں حالیکہ وہ تم کو سچا سمجھتا ہو[3]"

اس سے بھی زیادہ خطرناک جھوٹ وہ ہے جس سے لوگوں کے حقوق اور عزت وآبرو کو نقصان پہنچے اور اُس سے معاشرتی نظام میں خلل واقع ہو۔ یہ جھوٹ عام جھوٹ سے

---

[1] مسند احمد وطبرانی کبیر (مجمع الزوائد ہیثمی ج۸ ص۱۴۰ باب فی ذم الکذب)۔ [2] سنن ابی داؤد کتاب الادب باب التشدید فی الکذب۔ [3] ادب المفرد باب اذا کذب الرجل وہو لک مصدق۔

اس قدر مختلف ہے کہ اسلام نے اس کا نام تک بدل دیا ہے اور اس کو زُور اور اِفکٌ وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا ہے جس کے معنی منحرف ہونے اور الٹ پلٹ دینے کے ہیں۔

جھُوٹ کی یہ صورت اس قدر خطرناک ہے کہ خداوند تعالیٰ نے شرک کے ساتھ ساتھ اس کا ذکر کیا ہے، اور مسلمانوں کو حکم دیا ہے:

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ — بتوں کی گندگی اور جھُوٹی بات کے
وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ○ — کہنے سے بچتے رہو۔

(الحج: ۳۰)

زُور اگرچہ ایک عام لفظ ہے جس میں کذب و بہتان وغیرہ سب شامل ہیں لیکن احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے خاص طور پر جھُوٹی شہادت مراد ہے۔ جامع ترمذی میں ہے کہ آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ "کیا میں تم لوگوں کو سب سے بڑا گناہ بتاؤں"؟ صحابہ نے کہا "ہاں یارسُول اللہ"۔ فرمایا کہ "شرک اور باپ ماں کی نافرمانی"۔ راوی کا بیان ہے کہ آپ ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے کہ دفعۃً اُٹھ بیٹھے اور کہا کہ "جھُوٹی شہادت" یا "جھُوٹی بات" اور برابر یہی کہتے رہے یہاں تک کہ ہم نے کہا کہ کاش آپ خاموش ہو جاتے۔[1]

اس آیتِ پاک اور اس کی اس تشریحی حدیث میں غور کرنے سے یہ نکتہ ملتا ہے کہ شرک کے بعد ہی جو بُرائی اللہ تعالیٰ کے نزدیک ذکر کے قابل تھی وہ یہی جھُوٹ ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ اس کی گندگی کا کیا عالم ہوگا۔

اِفکٌ اس سے بھی زیادہ سخت لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی پر جھُوٹ باندھنا، مشرک خدا پر جھُوٹ باندھا کرتے تھے، ان کو قرآن نے اِفک کہا ہے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ اس

---

[1] ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی حقوق الوالدین۔

کی سرحد کبھی کبھی شرک سے مل جاتی ہے۔ منافقین نے حضرت عائشہؓ پر جو اتہام لگایا تھا اس کو بھی اللہ تعالےٰ نے اسی لفظ افک سے تعبیر کیا ہے۔[1] قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اِفک بڑے خبث طینت کا کام ہے۔ فرمایا:

تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۝ (الشعرآء: ۲۲۲) — اور شیطان (تو) اترا کرتے ہیں ہر جھوٹ باندھنے والے بدکردار پہ

جھوٹ کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ انسان جھوٹ سچ جو کچھ سنے اس کو بلاتحقیق دوسرں سے کہتا پھرے۔ ایسا شخص بے اعتبار سمجھا جاتا ہے اور سوسائٹی میں اس کی بات کی قدر نہیں ہوتی۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

کفٰی بالمرءِ کذبا ان یحدّث بکلّ ما سمع (مقدمہ صحیح مسلم) — آدمی کو یہ جھوٹ بس ہے کہ جو سنے وہ کہتا پھرے۔

ایسے لوگوں کو جو ہر سنی سنائی بات پر یقین کر لیتے ہیں اللہ تعالیٰ نے سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ (جھوٹ کے بڑے سننے والوں) کا خطاب دیا ہے۔ یہودیوں کے ایک گروہ کی نسبت فرمایا:

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ (المآئدة: ۴۲) — جھوٹ کے بڑے سننے والے ہیں۔

---

[1] النور: ۱۱۔

جھوٹی قسمیں کھانا

قسم کھانا حقیقت میں شہادت یعنی گواہی ہے۔ جو شخص کسی بات کو خدا کی قسم کھا کر کہتا ہے وہ اصل میں اپنے بیان کی سچّائی پر خدا کو گواہ بناتا ہے۔ ایسی حالت میں خیال کرنا چاہیے کہ اس معاملہ کی اہمیت کتنی بڑی ہے اور قسم کھانا کتنی غیر معمولی بات ہے۔ لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ جھوٹ بولتے ہیں اور سچّائی سے دور ہیں وہ بات بات پر قسم کھاتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ لوگ اُن کے بیان کو سچّا نہیں سمجھتے اس لیے وہ لوگوں کو فریب دینے کے لیے جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں۔

اوّل تو بے ضرورت نفس قسم کھانا ہی بُرا ہے پھر جھوٹی قسمیں کھانا تو اور بھی بُرا ہے۔ اسی لیے قرآنِ پاک میں اس قسم کی قسم کھانے اور قسم کھانے والوں کی بہت بُرائی آئی ہے۔ یہ جھوٹ کی بد ترین شکل ہے جس میں جھوٹ بولنے والا اپنے ساتھ خدا کو بھی شریک کرتا ہے اسی لیے کسی آئندہ کی بات پر اگر کوئی قسم کھالے تو اس کا پورا کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اور اگر کسی سبب سے پورا نہ کر سکے تو وہ گنہگار ہوتا ہے اور اس پر کفّارہ لازم آتا ہے۔ کفّارہ یہ ہے کہ وُہ کوئی غلام آزاد کرے یا دس مسکینوں کو کھانا کھلائے یا کپڑے پہنائے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو تین روزے رکھے۔ اور اس کی بھی اجازت دی گئی ہے کہ کسی کو قسم

کھانے کے بعد اگر دوسری شکل بہتر معلوم ہو تو وہ اپنی قسم توڑ کر کفارہ ادا کر دے[1]۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ	اللہ تم کو تمہاری بے فائدہ قسموں پر
اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ	نہیں پکڑتا لیکن اس قسم پر پکڑتا ہے
بِمَا عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ فَكَفَّارَتُهٗٓ	جس کو تم نے گرہ باندھا۔ تو اس قسم
اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ مِنْ	کے توڑنے کا کفارہ دس محتاجوں کو
اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ	کھلانا اوسط درجے کا کھانا جو تم اپنے
اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ؕ	گھر والوں کو دیتے ہو یا اُن کو کپڑا
فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ	دینا یا ایک غلام آزاد کرنا تو جس
اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ	کو یہ مقدور نہ ہو تو تین دنوں کا روزہ
اِذَا حَلَفْتُمْ ؕ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ؕ	رکھنا۔ یہ ہے تمہاری قسموں کا اتار جب
(المائدۃ: ۸۹)	تم قسم کھا بیٹھو۔ اور اپنی قسموں کو نگاہ رکھو۔

قسموں کو نگاہ رکھنا یہ ہے کہ جس بات پر نیت کر کے قسم کھائی جائے اگر وہ کوئی خلافِ شرع یا غیر انسب نہ ہو تو اس کی پوری ذمہ داری محسوس کی جائے اور اس کو حتی المقدور پورا کیا جائے۔ اور اگر پوری نہ کی جا سکے تو اس کا کفارہ ادا کیا جائے۔ یہ کفارہ اسی لیے مقرر کیا گیا ہے تاکہ قسم کھا کر اس کے پورا کرنے کی ذمہ داری اور اہمیت کے خیال کو نقصان نہ پہنچے۔

کسی خلافِ شرع بات پر جو قسم کھائی جاتی ہے یا وہ بات جس پر قسم کھائی گئی ہے بعد

---

[1] ابوداؤد کتاب الایمان والنذور۔

کو غیر انسب معلوم ہو تو اس قسم کو توڑ کر کفارہ ادا کر دینا درست ہے۔ خدا نے فرمایا:

قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ أَيْمَانِكُمْ (التحریم: ۲) — خدا نے تم کو اپنی قسموں کا کھول ڈالنا ٹھہرا دیا ہے۔

اور احادیث میں اس کی جزئی تصریحات مذکور ہیں۔

گذشتہ یا موجودہ واقعات پر قسم کھانا جیسا کہ کہا جا چکا حقیقت میں گواہی اور شہادت ہے اور معلوم ہو چکا ہے کہ گواہی اور شہادت میں جھوٹ بولنا کتنا بڑا گناہ ہے۔ اسی لیے ایسا شخص جو بات بات پر قسمیں کھاتا رہتا ہے، حد درجہ بے اعتبار اور ناقابلِ اعتماد سمجھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ایسے شخص پہ اعتبار نہ کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کو انسان کا بڑا عیب بتایا ہے۔ رسولؐ کو حکم ہوتا ہے:

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ○ (القلم: ۱۰) — اور بہت قسمیں کھانے والے ذلیل کا کہا نہ مان۔

سمجھنے کی بات ہے کہ قسم کھانے کا مدعا یہ ہے کہ لوگ اس کا کہنا مانیں اور اس کا اعتبار کریں۔ لیکن اللہ تعالیٰ سرے سے اس طرح کی قسمیں کھانے والے کی بات کے نہ ماننے کی ہدایت اور اس کی بے قدری اور بے اعتباری کا اعلان فرماتا ہے۔

چونکہ اس طرح کی قسمیں کھانے والے جان بوجھ کر جھوٹ بولتے ہیں اسی لیے یہ نفاق کی بڑی نشانی ہے۔ اور قرآن پاک میں اسی حیثیت سے اس کا ذکر بار بار آیا ہے۔ منافقوں کے تذکرہ میں ہے کہ جب اُن پر کوئی افتاد پڑتی ہے تو قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہمارا یہ نشانہ نہ تھا، ہماری نیت نیک تھی۔ خدا فرماتا ہے کہ اللہ کو تمہارے دل کی بات خوب معلوم ہے:

فَكَيْفَ إِذَآ أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ	پھر کیا جب ان کو اپنے ہی کرتوت
بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَآءُوكَ	سے کوئی تکلیف پہنچے پھر تیرے پاس
يَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ إِنْ أَرَدْنَآ إِلَّآ	اللہ کی قسمیں کھاتے آئیں کہ ہماری غرض
إِحْسَانًا وَّتَوْفِيقًا ۝ أُولٰٓئِكَ	بھلائی اور ملاپ کی تھی۔ یہ وُہ ہیں
الَّذِينَ يَعْلَمُ اللّٰهُ مَا فِي قُلُوبِهِمْ	جن کے دلوں کا حال اللہ کو معلوم ہے۔

(النسآء:۶۲-۶۳)

یعنی اللہ جانتا ہے کہ اُن کے دلوں میں کچھ ہے اور زبانوں پر کچھ ہے۔ ایسے لوگ یہ چاہا کرتے ہیں کہ قسمیں کھا کر سچ کو جھُوٹ اور جھُوٹ کو سچ بنا کر متعلق اشخاص کو خوش کر دیں۔ خدا فرماتا ہے کہ اگر ان کے ایمان ہو تو ان کو چاہیے کہ سچائی اختیار کر کے خدا اور رسُول کو خوش کریں :

يَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوكُمْ	تمہارے (مسلمانوں کے) آگے
وَاللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَنْ يُّرْضُوهُ	خدا کی قسمیں کھاتے ہیں تاکہ وہ
إِنْ كَانُوا مُؤْمِنِينَ ۝	تم کو راضی کر لیں۔ اور اللہ اور رسُول
(التوبة:۶۲)	کو راضی کرنا زیادہ ضروری ہے اگر
	وُہ ایمان دار ہیں۔

ایسے منافقوں کا یہ حال ہوتا ہے کہ جب کوئی بری بات منہ سے نکالتے ہیں اور اس پر پوچھ گچھ ہونے لگتی ہے تو فوراً مکر جاتے ہیں :

يَحْلِفُونَ بِاللّٰهِ مَا قَالُوا وَلَقَدْ	خدا کی (جھوٹی) قسمیں کھاتے ہیں کہ
قَالُوا كَلِمَةَ الْكُفْرِ	انہوں نے نہیں کہا حالانکہ انہوں نے

(التوبۃ: ۷۴) بے شک کفر کی بات کہی۔

ایک موقع پر منافقوں نے ایک نامعقول کام کیا۔ خدا نے فرمایا کہ جب تم جا کر اُن سے پوچھو گے تو وہ خدا کی قسم کھا جائیں گے سَیَحْلِفُوْنَ بِاللّٰہِ[1] چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس پر اللہ تعالےٰ نے فرمایا:

یَحْلِفُوْنَ لَکُمْ لِتَرْضَوْا عَنْھُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْھُمْ فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یَرْضٰی عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ ○ (التوبۃ: ۹۶)	تمہارے آگے قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تم اُن سے راضی ہو جاوٴ۔ تو اگر تم ان سے راضی بھی ہو جاوٴ تو اللہ نافرمان لوگوں سے راضی نہیں۔

اس لیے جو لوگ اللہ کی بات دل سے مانتے نہیں اور زبان سے قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ مانتے ہیں وُہ فاسق اور نافرمان ہیں۔

اسی موقع پر کچھ منافقوں نے مُسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے کی نیت سے ایک مسجد الگ کھڑی کر لی تھی۔ خدا نے فرمایا کہ اگر ان سے ان کی اس حرکت کا سبب پوچھو گے تو جھٹ قسم کھا بیٹھیں گے کہ ہماری نیت اچھی تھی۔ فرمایا:

وَلَیَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰی ؕ وَاللّٰہُ یَشْھَدُ اِنَّھُمْ لَکٰذِبُوْنَ ○ (التوبۃ: ۱۰۷)	اور قسمیں کھائیں گے کہ ہم نے تو بھلائی ہی چاہی تھی۔ اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وُہ جھُوٹے ہیں۔

---

[1] التوبہ: ۹۵۔

اہلِ نفاق کی حالت قرآن نے یہ بتاتی ہے:

وَيَحْلِفُونَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ○ (المجادلة: ۱۴)	اور وہ جان بوجھ کر جھوٹی باتوں پر قسمیں کھاتے ہیں۔
اِتَّخَذُوْا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً (المجادلة: ۱۶/المنفقون: ۲)	انہوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنایا ہے۔

یعنی قسمیں کھاکر سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ اور اس کو اپنے بچاؤ کے لیے ڈھال بنایا کرتے ہیں۔

اللہ تعالےٰ نے مسلمانوں کو اپنے رسول کے ذریعہ اس گناہ سے بچنے کی تاکید فرمائی:

وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ○ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ؕ تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ؕ (النحل: ۹۱-۹۲)	اور قسموں کو پکا کرنے کے بعد توڑ مت ڈالو اور تم نے اپنے پر خدا کو ضامن بنایا ہے۔ بیشک اللہ تمہارے کاموں کو جانتا ہے۔ اور اس عورت جیسے نہ بنو جو اپنے کاتے سوت کو محنت کیے پیچھے توڑ کر ٹکڑے کرتی ہے۔ تم اپنی قسموں کو آپس میں پیٹھنے کا بہانہ بناتے ہو کہ ایک فریق دوسرے فریق سے بڑھ چڑھ کر ہو۔

خدا کا نام لے کر کوئی معاہدہ کرنا اور اُس کو توڑ ڈالنا خدا کے مقدس نام کی تحقیر ہے۔

اسی لیے فرمایا کہ جس بات پر کسی نے قسم کھائی اس پر اس نے گویا خدا کو ضامن ٹھہرایا۔ اس لیے قسم کھا کر توڑا نہ کرو اور لوگوں کو دھوکا نہ دیا کرو۔ پھر ایسی قسم کو توڑ ڈالنا ایسا ہی حماقت کا کام ہے جیسا عرب کی ایک بے وقوف عورت کا تھا جو سوت کات کات کر کھول دیتی یا ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتی۔

جب ایک فریق دوسرے فریق سے خدا کا نام لے کر معاہدہ کرتا ہے تو گویا وہ خدا کی ضمانت پر دوسرے کو مامون بناتا ہے۔ اب اگر وہ کوئی قوت پا کر بدعہدی کرتا ہے اور اس فریق سے ٹوٹ کر کسی دوسرے طاقتور سے ملنے کی کوشش کرتا ہے تو بڑی اخلاقی کمزوری ظاہر کرتا ہے۔

اسی طرح جھوٹی قسم کھا کر کسی دوسرے کے مال پر دعویٰ کرنا خدا کے نام پر جھوٹ بولنا ہے اور یہ ایک کے بجائے دو گناہوں کا مجموعہ ہے یعنی غصب اور جھوٹ اور وہ بھی خدا کے پاک اور مقدس نام پر۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَشۡتَرُوۡنَ بِعَہۡدِ اللّٰہِ وَ اَیۡمَانِہِمۡ ثَمَنًا قَلِیۡلًا اُولٰٓئِکَ لَا خَلَاقَ لَہُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ وَ لَا یُکَلِّمُہُمُ اللّٰہُ وَ لَا یَنۡظُرُ اِلَیۡہِمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ وَ لَا یُزَکِّیۡہِمۡ وَ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ۝ (آل عمرٰن: ۷۷)	بے شک جو لوگ خدا کے قرار اور اپنی قسموں پر (دنیا کا) تھوڑا سامان خریدتے ہیں آخرت میں اُن کا کوئی حصہ نہیں۔ نہ اللہ اُن سے بات کرے گا اور نہ اُن کی طرف دیکھے گا قیامت میں اور نہ اُن کو پاک کرے گا۔ اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

شانِ نزول اور آیت کے سیاق کے لحاظ سے یہ یہودیوں کی بددیانتیوں کی تصویر

ہے۔ مگر آیت اپنے حکم کے لحاظ سے بہرحال عام ہے۔ ایک دفعہ حضرت عبد اللہؓ صحابی نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ" جو کوئی جھوٹی قسم کھا کر کسی مسلمان کا مال لینا چاہے گا تو جب وہ خدا کے پاس جائے گا تو خدا اس پر غضب ناک ہوگا" اشعث بن قیسؓ صحابی نے کہا" خدا کی قسم یہ آیت میرے واقعہ میں اتری ہے۔ میرے اور ایک یہودی کے درمیان ایک زمین تھی۔ اس نے میری ملکیت سے انکار کیا۔ میں نے یہ مقدمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تمہارے پاس کوئی ثبوت یا گواہ ہے؟ میں نے کہا نہیں۔ تو آپؐ نے اس یہودی سے فرمایا کہ تم قسم کھاؤ تو میں نے عرض کی یا رسول اللہ! وہ تو اب قسم کھا جائے گا اور میری چیز لے لے گا۔ اس وقت یہ آیت اتری[1]"

ابن جریر کی بعض روایتوں میں ہے کہ یہ آیت اُن سوداگروں کی شان میں ہے جو جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اپنا سامان بیچتے ہیں۔ اس کی تائید اس حدیث سے ہوتی ہے کہ آپ نے تین دفعہ فرمایا" تین آدمی ہیں جن کی طرف خدا قیامت کے دن نہ دیکھے گا، نہ ان کو پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے" صحابی کہتے ہیں میں نے کہا کہ یہ لوگ جو ناکام ہوئے اور ٹوٹے میں پڑے وہ کون ہیں یا رسول اللہ؟ فرمایا" جو اپنا لباس گھٹنوں کے نیچے تک لٹکاتا ہے (کیونکہ یہ غرور کی علامت ہے) اور جو احسان جتاتا ہے اور جو جھوٹی قسمیں کھا کر اپنا مال بیچتا ہے[2]" بہرحال جیسا کہ معلوم ہے کہ شانِ نزول سے مراد وہ واقعہ ہے جس پر کوئی آیت پوری طرح صادق آجائے اس لیے ان تمام

---

[1] ابوداؤد کتاب الایمان والنذور و ابن جریر۔ [2] مسلم و ابوداؤد و ترمذی و نسائی و ابن ماجہ۔

واقعات پر آیت کا حکم یکساں جاری ہوگا۔

صحیح مسلم میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "جو کسی مسلمان کے حق کو جھوٹی قسم کھا کر لینا چاہے گا تو خدا اس پر دوزخ کی آگ کو واجب کرے گا" صحابہ نے پوچھا "یا رسول اللہؐ! کیا اگرچہ کوئی معمولی سی چیز ہو؟" فرمایا "درخت (اراک) کی ڈالی ہی کیوں نہ ہو[1]" حضرت انسؓ صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا "بڑے بڑے گناہ یہ ہیں۔ خدا کا شریک ٹھہرانا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا، کسی بے گناہ کی جان لینا اور جھوٹی قسم کھانا[2]" ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا "جس شخص سے قسم کھلوائی جائے اور وہ جھوٹ قسم کھا جائے تو وہ اپنا چہرہ لے کر دوزخ میں ٹھکانا پائے گا[3]" چہرہ کی خصوصیت شاید اس لیے ہے کہ اس نے انسانی عزّت و آبرو کے خلاف کام کیا اور بڑی ڈھیٹائی دکھائی جس کا اثر چہرہ پر نمایاں ہوتا ہے۔

عموماً تاجر اور سوداگر چیزوں کی قیمت اور مال کی اصل حقیقت بتانے میں جھوٹ کے مرتکب ہوتے ہیں اور جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں۔ اس لیے خاص طور سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اُن کو اس سے بچنے کی ہدایت کی ہے۔ فرمایا "جھوٹی قسم مال بکوا دیتی ہے لیکن نفع (کی برکت) کو گھٹا دیتی ہے[4]" روحانی حیثیت سے جو برکت گھٹتی ہے وہ تو ہے ہی لیکن ظاہری حیثیت سے بھی ایسے شخص کی تجارت کو آخر میں چل کر اس کی عام بے اعتباری کی وجہ سے جو نقصان پہنچتا ہے وہ بھی ظاہر ہے۔ چنانچہ اس کی تشریح ایک دوسری روایت میں ہے۔ حضرت قتادہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ "تجارت میں بہت قسمیں کھانے

---

[1] صحیح مسلم کتاب الایمان باب وعید من اقتطع حق مسلم بیمین۔

[2] سنن نسائی باب فی ذکر الکبائر۔ [3] سنن ابی داؤد کتاب الایمان [4] صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد و ترمذی و نسائی، منذری باب ترغیب التجار فی الصدق۔

سے پرہیز کرو کیونکہ اس طرح پہلے کامیابی ہوتی ہے پھر بے برکتی ہوجاتی ہے"۔ کیسے بلیغ فقرے ہیں۔ فانہ ینفق ثم یمحق[1]۔

جھوٹی قسموں کے علاوہ عام طور سے بے باکی کے ساتھ قسمیں کھانا بھی اسلامی شرافت کے خلاف ہے۔ قرآنِ پاک کی آیت اوپر گزر چکی ہے کہ بے سبب قسمیں کھانا ذلّت وخواری کا سبب ہے۔ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ[2]۔ حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قسمیں کھانا قسم پوری نہ کرنے کے گناہ کا سبب ہے یا ندامت اور شرمساری کا موجب ہے[3]"۔

---

[1] مسلم ونسائی وابن ماجہ [2] القلم: ۱۰ [3] ابن ماجہ وصحیح ابن حبان منذری ۲ باب ترغیب التجار فی الصدق۔

وعدہ خلافی

وعدہ کر کے اُس کے خلاف کرنا بہت بڑی بُرائی ہے اور یہ بھی حقیقت میں جھوٹ کی ایک قسم ہے۔ کسی قوم اور اس کے افراد کی عزت کا مدار بہت کچھ اس پر ہے کہ وہ اپنے وعدوں کے کتنے سچے اور اپنی بات کے کیسے پکے ہیں۔ جب کوئی شخص کوئی وعدہ کر لیتا ہے تو اپنے اوپر ایک ذمّہ داری اوڑھ لیتا ہے۔ فرمایا :

اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا ○ بے شک وعدہ کی بازپرس ہوگی۔

(بنی اسرائیل : ۳۴)

اور جس کی بازپرس خدا فرمائے اس کی اہمیت کتنی بڑی ہوگی۔

قرآن پاک میں منافقوں کے سلسلہ میں ہے کہ اُن کی بدعہدی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دل میں نفاق پیدا ہو گیا۔ فرمایا :

فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ○

پس اس کا اثر اُن کے دل میں خدا نے نفاق رکھا اُس دن تک جب وُہ اس سے ملیں گے اس لیے کہ انہوں نے خدا سے وعدہ کر کے خلاف کیا

(التوبۃ: ۷۷) اور اس لیے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔

صحیحین میں ہے کہ "منافق کی نشانی تین ہیں۔ جب بولے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے خلاف کرے اور جب امانت دار بنایا جائے تو خیانت کرے۔" صحیح مسلم میں اس کے بعد ہے "اگرچہ وہ نماز پڑھتا ہو، روزے رکھتا ہو اور سمجھتا ہو کہ وہ مسلمان ہے۔" صحیحین کی ایک اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یہ چار باتیں جس میں ہوں وہ پکا منافق ہے اور جس میں ان میں سے کوئی ایک ہو اس میں منافق کی ایک نشانی ہے جب تک اس کو چھوڑ نہ دے۔ جب امانت دار بنایا جائے خیانت کرے، جب بولے جھوٹ بولے، جب معاہدہ کرے خلاف کرے، جب جھگڑے گالی بکے۔[1]

ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ "مجھ سے تین باتوں کا ذمہ لو تو میں تمہارے لیے جنت کا ذمہ لیتا ہوں۔ جب بولو تو سچ بولو اور جب وعدہ کرو تو پورا کرو اور جب امین بنو تو خیانت نہ کرو۔"[2]

---

[1] ترغیب و ترہیب منذری باب الترغیب فی الصدق [2] احمد، حاکم، ابویعلی، بیہقی، منذری باب انجاز الوعد۔

خیانت اور بددیانتی

ایک کا جو حق دوسرے کے ذمّہ واجب ہو اس کے ادا کرنے میں ایمان داری نہ برتنا خیانت اور بد دیانتی ہے۔ اگر ایک کی چیز دوسرے کے پاس امانت ہو اور وہ اُس میں بے جا تصرّف کرتا یا مانگنے پر واپس نہ کرتا ہو تو یہ کھلی ہوئی خیانت ہے۔ یا کسی کی کوئی چھپی ہوئی بات کسی دوسرے کو معلوم ہو یا کسی نے دُوسرے پر بھروسہ کر کے کوئی اپنا بھید اس کو بتایا ہو تو اس کا کسی اور پر ظاہر کرنا بھی خیانت ہے۔ اسی طرح جو کام کسی کے سپرد ہو اس کو وہ دیانت داری کے ساتھ انجام نہ دے تو یہ بھی خیانت ہی کہلائے گا۔ علیٰ ہذا عام مسلمانوں، ائمۂ وقت اور اپنے متفقہ قومی و ملّی مصالح کے خلاف قدم اٹھانا بھی ملّت سے بد دیانتی ہے۔ دوست ہو کر دوستی نہ نباہنا بھی خیانت ہے، بیوی میاں کی وفاداری نہ کرے تو یہ بھی خیانت ہے، دل میں کچھ رکھنا اور زبان سے کچھ کہنا اور عمل سے کچھ اور ثابت کرنا بھی خیانت ہے۔ اسلام کی اخلاقی شریعت میں یہ ساری خیانتیں یکساں ممنوع ہیں۔ فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ○ (الانفال:۲۷)	اے ایمان والو! اللہ اور رسُول کی خیانت نہ کرو اور نہ آپس کی امانتوں میں جان کر بد دیانتی کرو۔

اللہ اور رسول کے ساتھ خیانت یہ ہے کہ اقرار کر کے پورا نہ کیا جائے، ایمان داری سے اُن کے حکموں کی تعمیل نہ کی جائے، دین و ملّت کے مصالح کے ساتھ غدّاری کی جائے اور اللہ و رسُول اور مسلمانوں کے دشمنوں کو چھپے چوری امداد پہنچائی جائے یا مسلمانوں کے چھپے راز اُن کو بتائے جائیں۔ اسی طرح آپس کی امانتوں میں خیانت یہ ہے کہ جو چیز جس کے پاس امانت ہو اس میں وہ ناجائز تصرّف کرے اور کسی کا جو راز کسی کو معلوم ہو اس کو دوسروں پر ظاہر کر دے۔

یہ حدیث کئی دفعہ اوپر آچکی ہے کہ منافق کی تین علامتوں میں سے ایک یہ ہے کہ جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے تو وہ اُس میں خیانت کرے[1]۔ ابن مسعودؓ سے موقوفاً روایت ہے کہ انہوں نے کہا کہ خدا کی راہ میں مارا جانا ہر گناہ کا کفارہ ہے لیکن امانت کا۔ قیامت کے دن بندہ کو لایا جائے گا اگرچہ وہ خدا کی راہ میں شہید ہی ہوا ہو اور کہا جائے گا کہ تم امانت لاؤ اور ادا کرو۔ وہ کہے گا "خداوندا! اب کیسے لاؤں دنیا تو ختم ہو چکی"۔ کہا جائے گا "اس کو دوزخ کے طبقہ ہاویہ میں لے جاؤ وہاں امانت کی چیز مثال بن کر اصل صورت میں سامنے آئے گی تو وہ اس کو دیکھ کر پہچان لے گا اور اس کے پیچھے گرے گا یہاں تک کہ اُس کو پکڑ لے گا اور اُس کو اپنے کندھوں پر لاد کر لے چلے گا۔ جب دوزخ سے نکلنا چاہے گا تو وہ بوجھ اُس کے کندھے سے گر پڑے گا اور وہ پھر اس کے پیچھے ہمیشہ ہمیشہ گرتا چلا جائے گا۔" پھر انہوں نے فرمایا "نماز امانت ہے، وضو امانت ہے، تول بھی امانت ہے ناپ بھی امانت ہے" اور بہت سی چیزیں گنا کر فرمایا "اور ان سب سے زیادہ سخت معاملہ امانت کی چیزوں کا ہے"۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے یہ حدیث حضرت براءؓ بن عازب

---

[1] صحیحین وغیرہ۔

صحابی کو سنائی۔ انہوں نے تصدیق کی اور فرمایا کیا تم نے قرآن کی یہ آیت نہیں سنی، اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا[1] یعنی "بے شک اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کو ادا کر دیا کرو"[2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سب سے بہتر زمانہ میرا زمانہ ہے، پھر جو اس کے بعد آئے گا، پھر جو اس کے بعد آئے گا۔ پھر ایسا زمانہ آئے گا کہ لوگ بن بلائے گواہی دیں گے، خیانت کریں گے، امانت داری نہیں کریں گے اور نذر مانیں گے تو پوری[3] نہ کریں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جن بری باتوں سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے اُن میں سے ایک خیانت بھی ہے۔ فرمایا کرتے تھے کہ الٰہی! مجھے خیانت سے بچائے رکھنا کہ یہ بہت بُرا اندرونی ساتھی ہے۔[4]

خیانت کے ایک معنی یہ ہیں کہ کسی جماعت میں شامل ہو کر خود اسی جماعت کو جڑ سے اکھاڑنے کی فکر میں لگے رہنا۔ چنانچہ منافقین جو دل میں کچھ رکھتے تھے اور زبان سے کچھ کہتے تھے، وہ ہمیشہ اسلام کے خلاف چھپی سازشوں میں لگے رہتے تھے۔ مگر اُن کی یہ چال کارگر نہیں ہوتی تھی اور ہمیشہ اُن کا بھید کھل جاتا تھا۔ فرمایا:

وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰی خَآئِنَۃٍ	اور ہمیشہ تو خبر پاتا رہتا ہے اُن کی
مِّنْھُمْ (المائدۃ: ۱۳)	ایک خیانت کی۔

یعنی اُن کی کسی نہ کسی خیانت کی خبر رسُول کو ملتی ہی رہتی تھی۔

---

[1] النساء: ۵۸ [2] مسند احمد بیہقی منذری باب الترغیب فی انجاز الوعد [3] صحیح بخاری و صحیح مسلم، منذری باب مذکور [4] ابوداؤد و نسائی، ابن ماجہ منذری باب مذکور۔

جس پر کسی امر میں بھروسہ کیا جائے اس کا اس بھروسہ کو پورا نہ کرنا بھی خیانت ہے۔ حضرت یوسفؑ نے اپنے اوپر الزام کی پوری چھان بین عزیز سے کرائی۔ اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ میں نے یہ سب اس لیے کیا:

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّىْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِىْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ○ (یوسف: ۵۲)	تاکہ عزیز کو یہ معلوم ہو جائے کہ میں نے چوری چھپے اس سے خیانت نہیں کی۔ اور بے شک اللہ خیانت کرنے والوں کے فریب کو نہیں چلاتا۔

حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویوں نے اپنے مقدس شوہروں سے بیوفائی کی ان کی بے وفائی یہ تھی کہ وہ توقع کے خلاف اپنے شوہروں پر ایمان نہیں لائیں اور کافروں کا ساتھ دیتی رہیں۔ خدا نے فرمایا:

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صٰلِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا (التحریم: ۱۰)	خدا نے کافروں کے لیے نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کی مثال بیان کی۔ یہ دونوں عورتیں ہمارے دو نیک بندوں کے گھر میں تھیں تو ان دونوں نے اپنے شوہروں سے خیانت کی۔ تو یہ دونوں (پیغمبر ہو کر بھی) اپنی بیویوں کو خدا سے ذرا نہ بچا سکے۔

یہ دل کی خیانت تھی۔

مگر خیانت صرف دل ہی سے نہیں ہوتی ہے بلکہ ایک ایک عضو سے ہو سکتی ہے

یہاں تک کہ چشم و ابرو کے اشاروں سے ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر یہ یقین ہو کہ ایک ذات ہے جو چوری چھپی کی حرکت سے ہر وقت باخبر رہتی ہے تو پھر انسان کو کسی قسم کی خیانت کاری کی جرأت نہ ہو۔ اسلام اسی یقین کو پیدا کر کے خیانتوں کا خاتمہ کرتا ہے۔ فرمایا:

يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ ○	اللہ جانتا ہے آنکھوں کی خیانت کاری کو اور جو چھپا ہے سینوں میں۔

(المؤمن: ۱۹)

پھر اس سے چھپ کر کیوں کر کوئی کام کر سکتا ہے۔

غدّاری اور دغا بازی

غدّاری اور دغا بازی کے معنی یہ ہیں کہ کسی کو زبان دے کر اطمینان دلایا جائے اور پھر موقع پا کر اس کے خلاف کیا جائے۔ قرآنِ پاک نے اس کو بھی خیانت کہا ہے۔ عربی میں اس کو عام طور سے غدر بھی کہتے ہیں۔ اسلام نے اس کی شدید بُرائی کی ہے۔ کفار میں سے جو بار بار امن اور صلح کے وعدے کر کے بدل جاتے تھے اور بار بار بدعہدی کرتے تھے اُن کے ذکر میں فرمایا ہے:

اَلَّذِیْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ	جن سے تونے معاہدہ کیا پھر وہ اپنا
یَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِیْ كُلِّ	عہد ہر بار توڑ دیتے ہیں اور وہ تقویٰ
مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا یَتَّقُوْنَ ○ فَاِمَّا	(خدا کا لحاظ) نہیں رکھتے۔ سو اگر ان
تَثْقَفَنَّهُمْ فِی الْحَرْبِ فَشَرِّدْ	کو تو کبھی لڑائی میں پاوے تو ان کو
بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ	ایسی سزا دے کہ اُن کے پچھلے دیکھ کر
یَذَّكَّرُوْنَ ○ وَاِمَّا تَخَافَنَّ	بھاگیں شاید وہ عبرت پکڑیں اگر تجھ
مِنْ قَوْمٍ خِیَانَةً فَانْۢبِذْ	کو کسی قوم کی دغا کا ڈر ہو تو ان کو
اِلَیْهِمْ عَلٰی سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا	تو برابر کا جواب دے۔ اللہ کو دغاباز
یُحِبُّ الْخَآئِنِیْنَ ○ (الانفال: ۵۶-۵۸)	خوش نہیں آتے۔

اس آیت میں گو اُن کافروں کا ذکر ہے جو ہر دفعہ عہد کر کے بدعہدی اور دغا بازی کرتے تھے مگر دو باتیں اس میں عمومیت کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ بدعہدی سراسر تقویٰ کے خلاف ہے۔ دوسری یہ کہ یہ غدّاری، دغا بازی اور بدعہدی اللہ تعالیٰ کی محبت سے محروم کر دیتی ہے اور اس کی ناخوشی کی موجب ہے۔ بدر کے قیدیوں کو فدیہ اور وعدہ لے کر چھوڑ دینے کی اجازت جہاں دی گئی ہے وہیں یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ اگر یہ خیانت اور دغا کریں تو اللہ ان سے سمجھ لے گا۔ پھر ان کو دوبارہ تمہارے قابو میں لے آئے گا۔ فرمایا:

وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

(الانفال: ۷۱)

اور اگر وہ تیرے ساتھ خیانت (دغا) کرنا چاہیں تو وہ اس سے پہلے خدا سے بھی خیانت (دغا) کر چکے ہیں تو خدا نے اُن پر قابو دے دیا۔ اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

خدا سے دغا کرنے کی صورت یہی ہے کہ اس کے ساتھ کفر کیا جائے۔ تو خدا تو سب کا حال جانتا ہے اور ہر مصلحت اس کو معلوم ہے اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ اس نے اُن کے چھوڑنے کی اجازت دی تو وہ بھی علم اور مصلحت سے دی ہے۔

حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا "قیامت کے دن ہر غدّار کا ایک جھنڈا ہوگا"[۱]۔ یعنی اس سے اس کی بدعہدی اور غدّاری کی تشہیر ہوگی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم اپنی فوج کے افسروں کو جو نصیحتیں فرماتے تھے اُن میں سے ایک یہ بھی ہوتی تھی کہ "بدعہدی نہ کرنا"[۲]۔ یعنی دشمنوں سے معاہدہ کر کے پھر غدّاری نہ کی جائے۔ ظالم بادشاہوں، حاکموں، افسروں اور سپہ سالاروں

---

[۱] و [۲] صحیح مسلم کتاب الجہاد والسیر۔

کا ایک چلتا ہوا حیلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ امن وامان کا وعدہ کر کے کسی کو اپنے پاس بلاتے ہیں اور جب وُہ اُن کے قابو میں آجاتا ہے تو اُس کو سزا دیتے یا مروا دیتے ہیں۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ "جس نے کسی کو جان کا امن دیا اور پھر مروا ڈالا تو میں اُس سے الگ ہوں اگرچہ مقتول کافر ہی کیوں نہ ہو۔"[1] خدا فرماتا ہے:

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ط (المائدۃ:۱) — اے ایمان والو! اپنی گرہوں (قول و قرار) کو پورا کرو۔

عقود کی تعمیم میں وُہ تمام شرطیں، وعدے اور معاہدے داخل ہیں جو کوئی اپنے خدا سے یا بندہ سے یا کوئی جماعت کسی دوسری جماعت سے کرے یہاں تک کہ مسلمان اپنے دشمنوں سے بھی جو معاہدہ کریں اس کا حرف بحرف پورا کرنا ضروری ہے۔ ایک دفعہ امیر معاویہؓ نے رومیوں سے مدتِ متعینہ کے لیے کوئی معاہدہ کیا۔ اس کے ختم ہونے کا زمانہ قریب آیا تو امیرِ موصوف اپنی فوجیں لے کر اُن کی سرحد کے پاس پہنچ گئے کہ ادھر مدت ختم ہو اور ادھر وہ حملہ کر دیں۔ یہ دیکھ کر عمرو بن عنبسہؓ نامی ایک صحابی سوار ہو کر نکلے اور چلّائے "اللہ اکبر! اللہ اکبر! بدعہدی نہیں۔" امیر معاویہؓ نے بلا کر پوچھا کیا بات ہے؟ فرمایا "میں نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ جب کسی قوم سے معاہدہ کیا جائے تو اس کی کوئی گرہ نہ باندھی جائے نہ کھولی جائے (یعنی نہ اس میں سے کچھ کم کیا جائے نہ زیادہ کیا جائے) اور یا اس کو پہلے سے خبر دے کر معاہدہ کو یک قلم رد کر دیا جائے۔" یہ سُن کر امیر معاویہؓ واپس چلے آئے۔[2]

---

[1] سنن ابن ماجہ و صحیح ابن حبان، منذری باب الترغیب فی انجاز الوعد [2] سنن ابی داؤد باب الوفاء بالعہد۔

غور کی بات یہ ہے کہ امیر معاویہؓ نے معاہدہ کے لفظوں کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہی تھی لیکن ان کا یہ فعل معاہدہ کی رُوح اور معنی کے خلاف تھا۔ رسُولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے تربیت یافتوں نے اس کو بھی بدعہدی سمجھا اور امیرِ لشکر کو اس سے بھی روک دیا۔

بُہتان

بُہتان یہ ہے کہ جان بوجھ کر کسی بے گناہ کو مجرم ٹھہرایا جائے یا اُس کی طرف کوئی ناکردہ گناہ یا برائی منسوب کی جائے۔ یہ بھی ایک طرح کا جھوٹ ہے بلکہ قرآن نے اس کو بھی خیانت کہا ہے۔

بعض بہتان ایسے ہوتے ہیں جن کا سرے سے وجود ہی نہیں ہوتا لیکن شرارت کی راہ سے کسی بے گناہ کے سر اس لیے تھوپا جاتا ہے کہ اُس کی بدنامی ہو۔ قرآن نے اس کا نام اِفک رکھا ہے۔ یہ دونوں باتیں جھوٹ ہونے کے علاوہ حد درجہ شرافت کے خلاف ہیں اور اسی لیے جو لوگ جان بوجھ کر یا بے جانے بوجھے اس بہتان باندھنے میں شریک ہو جاتے ہیں وہ بھی گنہگار اور خیانت کار ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں طعمہ نام مدینہ کے ایک منافق نے ایک صحابی کے گھر میں چوری کی۔ مسلمانوں کو اس پر شبہ ہوا تو اس نے ایک مسلمان کا نام لے دیا۔ وہ تلوار کھینچ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا۔ اس منافق کے گھر والوں نے اس کا ساتھ دیا اور اس کو بری ٹھہرایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے

موافق فیصلہ کرنا چاہا تو وحی الٰہی نے دفعۃً حقیقت کا پردہ چاک کر دیا[1]۔ دوسری روایت یہ کی جاتی ہے کہ طعمہ کو ایک یہودی نے اپنی زرہ امانت رکھنے کو دی۔ اس نے خیانت کی اور واقعہ سے انکار کر دیا اور زرہ دوسرے کے گھر میں پھینک دی۔ لوگوں نے اس کو پکڑا۔ آخر معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم تک پہنچا۔ آپؐ نے ظاہر حال پر فیصلہ کرنا چاہا اس وقت یہ وحی آئی[2]۔ بہرحال واقعہ جو کچھ ہو امرِ مشترک یہ ہے کہ گنہگار کو بے گناہ اور بے گناہ کو گناہگار ٹھہرانے کے متعلق یہ آیتیں ہیں:

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الْكِتٰبَ	ہم نے تیری طرف (اے پیغمبر!) یہ
بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَیْنَ النَّاسِ	سچی کتاب آتاری ہے کہ تو لوگوں کے
بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ؕ وَلَا تَكُنْ	درمیان اس کے ذریعہ جو خدا نے
لِّلْخَآئِنِیْنَ خَصِیْمًا ۙ وَّاسْتَغْفِرِ	تجھ کو سوجھایا انصاف کر اور
اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا	خیانت کاروں کی طرف سے نہ
رَّحِیْمًا ۚ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ	جھگڑ۔ اور اللہ سے قصور معاف کرا۔
الَّذِیْنَ یَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ؕ	بیشک اللہ بخشنے والا رحم والا ہے۔
اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ مَنْ كَانَ	اور ان کی طرف سے نہ جھگڑ جو اپنے
خَوَّانًا اَثِیْمًا ۙ یَّسْتَخْفُوْنَ مِنَ	جی میں دغا رکھتے ہیں۔ بیشک اللہ
النَّاسِ وَلَا یَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ	خیانت کار گنہگار کو دوست نہیں رکھتا۔
وَهُوَ مَعَهُمْ اِذْ یُبَیِّتُوْنَ مَا لَا	وہ لوگوں سے چھپنا چاہتے ہیں اور
یَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ	خدا سے نہیں چھپنا چاہتے اور وہ ان

---

[1] جامع ترمذی تفسیر سورۂ نساء۔ [2] تفسیر طبری سورۂ نساء آیت اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْكَ الْكِتَابَ۔

بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ○	کے ساتھ ہی ہے جب رات کو وہ
	سازش کرتے ہیں جو خدا کو پسند نہیں۔
(النساء: ۱۰۵-۱۰۸)	اور اللہ اُن کے کاموں کو گھیرے ہے۔

آگے چل کر ہے :

وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓـئَةً اَوْ	اور جو کوئی خطا یا گناہ کرے پھر وہ
اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓـئًا	اس کی تہمت کسی بے گناہ پر دھرے
فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا	اس نے طوفان اور کھلا گناہ (اپنے
مُّبِيْنًا ○ (النساء: ۱۱۲)	سر) لادا۔

ان آیتوں میں خیانت کارانہ تہمت تراشی کی برائی کس خوبی سے ظاہر کی گئی ہے۔ سب سے پہلے تو رسُول کو انصاف کی تاکید ہے، پھر یہ حکم ہے کہ خیانت کاروں کی حمایت اور اُن کی طرف سے کوئی وکالت نہ کرے، پھر فرمایا جو ایسے خائن ہیں وہ بڑے گنہگار ہیں اور خدا کی محبت سے محروم ہیں۔ یہ لوگ دنیا کی شرم کے مارے انسانوں سے چھپنے کے لیے اپنا گناہ دوسرے کے سر ڈالتے ہیں اور خدا سے نہیں شرماتے جو ہر جگہ اُن کے ساتھ ہے اور اُن کے ہر کام کو دیکھ رہا ہے۔ اس سے کوئی حقیقت چھپائے کیسے چھپ سکتی ہے۔ اگر یہی یقین کسی کو ہو جائے تو وہ کسی پر تہمت اور بہتان باندھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد یہ سرزنش اُس کو سنائی گئی کہ جس نے مجرم ہو کر اپنا جرم دوسرے کے سر تھوپا اس نے بہتان باندھا اور گناہ کا بوجھ اپنے سر پر لادا۔

پہلے عرب میں دستور تھا کہ جو عورت کئی کئی مردوں سے ملتی تھی وہ ان میں سے کسی ایک کی طرف بچّہ کو منسوب کر دیتی تھی یا مجہول بچّہ کو اپنا کہہ کر شوہر کی طرف نسبت دیتی تھی۔

خدا نے اس کو بہتان کہا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ جو عورت مسلمان ہونے آئے اس سے یہ بیعت لی جائے کہ وہ آئندہ اس جرم سے باز رہے گی :

وَلَا يَأْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ
(الممتحنة : ۱۲)

اور یہ کہ وہ بہتان نہ باندھیں گی اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے بیچ میں۔

کسی مسلمان کو معمولی تکلیف پہنچانا بھی بُری بات ہے پھر بِن کیے اس پر جھوٹا الزام رکھ کر اس کو دلی تکلیف پہنچانا کتنی بُری بات ہے۔ خدا نے فرمایا :

وَالَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوْا فَقَدِ احْتَمَلُوْا بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا۝ (الاحزاب : ۵۸)

اور جو مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو بن کیے (تہمت لگا کر) تکلیف پہنچاتے ہیں، انہوں نے بہتان اور کھلا گناہ (اپنے سر) لادا۔

شریف بیویوں پر بہتان باندھنا چونکہ اُن کی عزت پر حرف رکھنا ہے اس لیے دنیا ہی میں اس کی سزا یہ مقرر کی گئی کہ جو اس بہتان کا مرتکب ہو اور شرعی گواہی پیش نہ کر سکے اس کو کوڑے مارے جائیں :

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۝ اِلَّا

اور جو لوگ شریف بی بیوں کو عیب لگاتے ہیں پھر نہ لائے چار گواہ تو اُن کو اسی کوڑے مارو اور ان کی گواہی کبھی نہ مانو۔ اور وُہ فاسق ہیں مگر جنہوں نے توبہ کی۔

اَلَّذِيْنَ تَابُوْا (النور: ۴-۵)

اس بہتان کی بُرائی کا اندازہ اس سے کرنا چاہیے کہ بہتان باندھنے والا خدا تعالےٰ کے حضور میں فاسق ٹھہرایا گیا اور اس کی گواہی ہمیشہ کے لیے بے اعتبار ہو گئی۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا "جو کوئی اپنے غلام پر تہمت لگائے گا حالانکہ وہ بے گناہ ہو یعنی اُس نے وہ جرم نہیں کیا تھا تو اللہ تعالےٰ قیامت کے دن اس مالک کی پیٹھ پر کوڑے مارے گا۔[1]" یہ گویا قذف یعنی تہمت بیجا کی مثالی سزا ہو گی۔ ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا کہ "جس میں جو بُرائی نہیں اس کی نسبت اس کی طرف کرنا بہتان ہے[2]۔" یعنی اُس سے بچنا چاہیے۔

---

[1] و [2] سنن ابی داوٗد کتاب الادب۔

چغلخوری

چغل خور کا کام یہ ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان جھوٹی سچی باتیں بیان کر کے ایک کو دُوسرے کے خلاف بھڑکائے اور اپنا رسُوخ جتائے۔ اور چونکہ ایسے لوگ چل پھر کر ایک کی ایسی بات دُوسرے کو پہنچاتے ہیں جس سے دُوسرے کو پہلے پر غصّہ آئے اور اُس سے نفرت پیدا ہو اسی لیے قرآن نے ان لوگوں کے اوصاف میں جن کی بات نہیں ماننی چاہیے یہ لفظ کہے ہیں:

مَشَّآءٍۭ بِنَمِيمٍ ۝ (القلم: ۱۱) جو چغلی کھاتا پھرتا ہے۔

اسی لیے اللہ تعالےٰ نے یہ اصول مقرر فرمادیا کہ جب کوئی شخص کوئی خبر لے کر آئے تو پہلے یہ دیکھ لیا جائے کہ اس خبر کا لانے والا کیسا ہے؟ اگر وہ سچا مومن نہیں تو اُس کی بات ہی نہ مانی جائے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی بات مان کر جلدی میں کوئی ایسی حرکت کر بیٹھی جائے جس پر پیچھے افسوس ہو۔ فرمایا:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِن جَآءَكُمۡ	اے ایمان والو! اگر کوئی گنہگار تمہارے
فَاسِقُۢ بِنَبَإٖ فَتَبَيَّنُوٓاْ أَن تُصِيبُواْ	پاس کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کرلو
قَوۡمَۢا بِجَهَٰلَةٖ فَتُصۡبِحُواْ عَلَىٰ مَا	کہیں کسی قوم پر نادانی سے جا نہ پڑو

فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ ○ (الحجرات: ۶) پھر اپنے کیے پر پچھتانے لگو۔

اس آیت میں غور کے قابل خاص نکتہ یہ ہے کہ جھوٹی خبریں پھیلانے والے کو خدا نے فاسق کا خطاب دیا ہے۔ اور چونکہ اس بداخلاقی کا مقصد زیادہ تر دو شخصوں بالخصوص عزیزو اقارب اور دوست واحباب میں نااتفاقی پیدا کرانا ہوتا ہے اسی بنا پر حدیث میں آیا ہے کہ ایک دفعہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ میں تمہیں بتاؤں کہ سب سے بُرے لوگ کون ہیں۔ پھر خود ہی فرمایا:

المشآءون بالنمیمة المفسدون بین الاحبّة۔ (مسند احمد عن اسمآء بنت یزید)

جو چغلیاں کھاتے پھرتے ہیں اور دوستوں کے آپس کے تعلقات خراب کرتے ہیں۔

صحیحین میں ہے کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم ایک قبرستان کے پاس سے گزرے تو فرمایا کہ ان میں سے ایک پر اس لیے عذاب ہو رہا ہے کہ وہ چغلی کھاتا پھرتا تھا۔[1]

صحیح مسلم میں ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

الا انبّئکم ما العضة هی النمیمة القالة بین النّاس[2]

کیا میں تم کو بتاؤں کہ عضہ کیا ہے، وہ چغلخوری ہے جو لوگوں کے درمیان بیان کی جاتی ہے۔

لغت میں عضہ کے معنی تفریق اور سحر کے ہیں۔ اس لیے اگر اس حدیث میں تفریق کے معنی لیے جائیں تو اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ دو شخصوں میں علیحدگی کرنا چغلخوری

---

[1] صحیح بخاری کتاب الطہارۃ باب من الکبائر ان لا یستتر عن بولہ و صحیح مسلم کتاب الطہارۃ باب الدلیل علی نجاسۃ البول۔

[2] مسلم کتاب البر والصلۃ باب تحریم النمیمۃ۔

کی حقیقت میں داخل ہے۔ لیکن اگر سحر کے معنی لیے جائیں تو اس صورت میں بھی سحر اور چغلخوری میں مشابہت و مناسبت ہے۔ کیونکہ سحر سے بھی دو شخصوں بالخصوص میاں بی بی میں علیحدگی کرائی جاتی ہے چنانچہ خود قرآن مجید میں ہے:

فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ ط (البقرۃ: ۱۰۲)	اس پر بھی ان (ہاروت ماروت) سے ایسی باتیں سیکھتے ہیں جن کی وجہ سے میاں بیوی میں جدائی ڈال دیں۔

عام طور پر مفسرین اس تفریق کا ذریعہ اس سحر کو قرار دیتے ہیں جو لوگ ہاروت ماروت سے سیکھتے تھے۔ لیکن بعض علما کے نزدیک یہ مقصد چغلخوری سے حاصل کیا جاتا تھا۔

عام طور پر یہ مقصد اس طرح حاصل کیا جاتا ہے کہ ایک کی بات دوسرے تک پہنچائی جاتی ہے۔ مثلاً یہ کہ فلاں شخص تمہاری نسبت یہ کہتا تھا۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کو یہ ہدایت کی تھی:

لا یبلغنی احد من اصحابی عن احد شیئاً فانی احب ان اخرج الیکم وانا سلیم الصدر[1]	میرے اصحاب میں سے کوئی مجھ تک کسی کی بات نہ پہنچائے کیونکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ تمہارے پاس آؤں تو میرا دل صاف ہو۔

لیکن اس قسم کی باتیں عام طور پر وہ ہوتی ہیں جو معیوب اور ناپسندیدہ سمجھی جاتی ہیں۔ بعض اوقات تو خود وہ شخص اس کو معیوب سمجھتا ہے جو دوسرے تک اس کو پہنچاتا ہے، بعض حالتوں میں جس شخص تک وہ بات پہنچائی گئی ہے اس کو ناگوار گزرتی ہے، بعض موقعوں پر

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی رفع الحدیث۔

دوسرے لوگ اس کو بُرا سمجھتے ہیں۔ غرض کسی نہ کسی طرح یہ بات ناپسندیدہ خیال کی جاتی ہے۔ اور جو لوگ اس بداخلاقی میں مبتلا ہوتے ہیں وُہ اس قسم کی ناپسندیدہ باتوں کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں تاکہ اُن کو پھیلا کر فتنہ و فساد کی آگ بھڑکائیں۔ اِسی بنا پر اہلِ عرب چغلخوروں کو ہیزم بردار کہتے ہیں یعنی جس طرح لکڑیاں بیچنے والے لکڑیاں چُن چُن کر لاتے ہیں۔ اور ایندھن کے لیے گھوم گھوم کر بازاروں میں فروخت کرتے ہیں اسی طرح یہ لوگ اس قسم کی باتوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر پھیلاتے ہیں اور آتشِ فتنہ و فساد کے لیے ایندھن بہم پہنچاتے ہیں۔

قرآن مجید میں ابولہب کی بی بی کو بعض مفسّرین کی رائے کے مطابق حَمَّالَةَ الْحَطَبِ[1] یعنی ہیزم بردار کا خطاب اسی لیے دیا گیا ہے کہ وُہ لوگوں کی چغلیاں کھاتی پھرتی تھی۔

ان میں بعض لوگ استراقِ سمع کرتے ہیں یعنی چھُپ چھُپ کر لوگوں کی باتیں سنتے ہیں اور پھر اُن کو دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کو لغت میں قتّات کہتے ہیں اور اُن کی نسبت رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے:

لا یدخل الجنّۃ قتّاتٌ[2] جنّت میں چغلخور داخل نہ ہوگا۔

اس قسم کی باتیں خوب نمک مرچ لگا کر نہایت چرب زبانی کے ساتھ بیان کی جاتی ہیں تاکہ اُن کا اثر بڑھ جائے۔ اِسی لیے عربی زبان میں چغلخوری کو "وشایہ" کہتے ہیں جس کے معنی نقش و نگار کے ہیں۔ اور اِدھر کی اُدھر لگانے کے لیے چغلخوروں کو دوڑ دھوپ بھی کرنی پڑتی ہے اسی مناسبت سے چغلخوری کو "سعایہ" بھی کہتے ہیں، جس کے معنی دوڑ دھوپ کرنے کے ہیں۔

---

[1] اللھب: ۴۔ [2] ابوداوٗد کتاب الادب باب فی القتّات۔

یہ کام اگرچہ زیادہ تر زبان سے لیا جاتا ہے لیکن وہ صرف زبان ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ تحریر و کتابت اور رمز و اشارت سے بھی چغلخوری کی جا سکتی ہے۔ وُہ صرف اقوال ہی تک محدود نہیں بلکہ اعمال بھی اس میں داخل ہیں یعنی دُوسرے شخص سے صرف یہی نہیں کہا جا سکتا کہ "فلاں شخص یہ کہتا تھا" بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ "فلاں شخص یہ کام کرتا تھا"

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ "محض زبان سے ایک کی بات دوسرے تک پہنچانا" چغلی کی مکمل تعریف نہیں ہے بلکہ اس کی جامع تعریف یہ ہے کہ ایک شخص کی ایسی بات یا کام کو دُوسرے تک پہنچانا جس سے دُوسرا پہلے سے بدگمان ہو جائے۔

اس بنا پر چغلخوری سے محفوظ رہنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ ایک شخص لوگوں کے جو حالات دیکھے یا سُنے اُن کو بغیر جائز ضرورت کے ظاہر نہ کرے۔ اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "ترک مالا یعنی" کی جو ہدایت مسلمانوں کو کی ہے اس پر عمل کرنے سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔

چغلخوری ایک فتنہ پردازی ہے جس کے نتائج بعض حالتوں میں نہایت خطرناک صورت میں ظاہر ہوتے ہیں اور قتل و خوں ریزی تک کی نوبت پہنچ جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ وہ متعدد گناہوں کا مجموعہ ہے اور اس میں غیبت، بہتان، تجسس، کذب و فریب، نفاق غرض مختلف بداخلاقیوں کے عناصر شامل ہوتے ہیں۔ اس لیے وُہ ان نتائج اور ان عناصر کے لحاظ سے گناہِ کبیرہ ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ تمدن و معاشرت کا ایک جزو ہو گئی ہے۔ اگر امراء کے درباروں میں تملّق و خوشامد کے لیے چغلخوری کی جاتی ہے تو عام صحبتوں میں اس سے تفریحِ خاطر اور لطفِ صحبت کا کام لیا جاتا ہے۔ اس لیے یہ اخلاقی مرض اس کثرت سے پھیل گیا ہے کہ وہ ایک معمولی چیز بن گیا ہے اور اُس کو لوگ گناہِ کبیرہ نہیں سمجھتے! اسی

نکتہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے کسی باغ سے نکلے تو دو مُردوں کی آواز سنی جن پر اُن کی قبروں میں عذاب ہو رہا تھا۔ فرمایا "اُن پر عذاب ہو رہا ہے لیکن یہ عذاب کسی بڑے گناہ پر نہیں ہوتا حالانکہ وہ بڑے گناہ کے کام ہیں۔ ان میں ایک تو پیشاب آڑ میں نہیں کرتا تھا اور دُوسرا لوگوں کی چغلیاں کھاتا پھرتا تھا"[1]

اس حدیث شریف کی شرح میں محدثین نے بڑی بڑی موشگافیاں کی ہیں یہاں تک کہ بعض محدثین نے لکھا ہے کہ پہلے تو آپ نے یہ فرما دیا کہ یہ کوئی بڑا گناہ نہیں پھر جب وحی کے ذریعہ سے آپ کو معلوم ہوا کہ یہ گناہ کبیرہ ہے تو اس کو منسوخ کر دیا اور فرمایا کہ وہ بڑے گناہ کا کام ہے۔ محدثین نے اس قسم کی اور بھی بہت سی نکتہ آفرینیاں کی ہیں حالانکہ حدیث کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ یہ دونوں بداخلاقیاں اس قدر عام ہو گئی ہیں کہ اُن کو لوگ معمولی چیز سمجھنے لگے ہیں حالانکہ وہ معمولی چیز نہیں بلکہ کبائر و موبقات میں داخل ہیں۔

قرآن مجید میں بھی اس کی نظیر موجود ہے۔ چنانچہ افکِ عائشہؓ کے عام چرچے کے متعلق ارشادِ الٰہی ہے:

اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُوْلُوْنَ	جب تم لگے اپنی زبانوں سے اس
بِاَفْوَاهِكُمْ مَّا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ	کی نقل در نقل کرنے اور اپنے منہ
عِلْمٌ وَّتَحْسَبُوْنَهٗ هَيِّنًا ۖ وَّ	سے ایسی باتیں کہنے جس کی تم کو مطلق
هُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيْمٌ ۝	خبر نہیں اور تم نے اس کو ایسی ہلکی
(النور: ۱۵)	(سی) بات سمجھا حالانکہ وُہ اللہ کے

---

[1] بخاری کتاب الادب باب النمیمۃ من الکبائر۔

نزدیک بڑی (سخت بات) ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو باتیں کسی کی تشہیر و تفضیح سے تعلق رکھتی ہیں عام دلچسپی کی وجہ سے وُہ معمولی خیال کی جاتی ہیں حالانکہ وُہ معمولی نہیں ہوتیں۔

کشفِ عورت اور کشفِ عیوب میں جو مناسبت ہے وُہ بھی اس حدیث سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ بداخلاقی زیادہ تر نہایت دُنی الطبع، پست حوصلہ، مبتذل اور ناقابلِ اعتبار اشخاص میں پائی جاتی ہے۔ بغض و انتقام لینے یا کسی ذی وجاہت شخص کے یہاں رسوخ حاصل کرنے یا سوسائٹی میں شریک ہونے کے لیے اور کوئی ذریعہ نہیں پاتے تو چغلخوری سے کام لیتے ہیں۔ اس لیے اُن کے شر و فساد سے بچنے کا طریقہ صرف یہ ہے کہ اُن کی بات ناقابلِ اعتبار قرار دی جائے اور ان کا کہنا نہ مانا جائے اور قرآنِ مجید نے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو اسی طریقہ کے اختیار کرنے کا حکم دیا ہے:

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ۙ هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِيمٍ ۙ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ۙ	اور تو ایسے کا کہنا مان جو بہت قسمیں کھاتا ہے، آبرو باختہ ہے (لوگوں پر) آوازے کسا کرتا ہے، چغلیاں لگاتا پھرتا ہے۔ اچھے کاموں سے (لوگوں کو) روکتا رہتا ہے، حد سے آگے بڑھ گیا ہے، بدکار ہے۔
(القلم: ۱۰-۱۲)	

غیبت اور بدگوئی

شریعت کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی عزّت و آبرو محفوظ رہے اور اُن کے باہمی تعلقات خوشگوار رہیں۔ اس بنا پر جن بداخلاقیوں سے مسلمانوں کی عزّت و آبرو کو صدمہ پہنچتا ہے اور اُن کے تعلقات میں ناگواری پیدا ہوتی ہے شریعت نے اُن کی ممانعت کی ہے اور اللہ تعالےٰ نے قرآن مجید میں مجموعی طور پر اُن کو ایک جگہ بیان کر دیا ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ	مسلمانو! مرد مردوں پر نہ ہنسیں
قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤى اَنْ یَّكُوْنُوْا	عجب نہیں کہ (جن پر ہنستے ہیں) وہ
خَیْرًا مِّنْهُمْ وَ لَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ	(خدا کے نزدیک) ان سے بہتر ہوں
عَسٰۤى اَنْ یَّكُنَّ خَیْرًا مِّنْهُنَّ ۚ	اور نہ عورتیں عورتوں پر ہنسیں عجب
وَ لَا تَلْمِزُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ لَا	نہیں کہ (جن پر ہنستی ہیں) وہ اُن سے
تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ بِئْسَ	بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دُوسرے
الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ ۚ	کو طعنے نہ دو اور نہ ایک دُوسرے
وَ مَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓىٕكَ هُمُ	کو نام دھرو۔ ایمان لائے پیچھے
الظّٰلِمُوْنَ ○ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ	بدتہذیبی کا نام ہی بُرا ہے اور جو

اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ	(ان حرکات سے) باز نہ آئیں تو وہی
اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا	(خدا کے نزدیک) ظالم ہیں۔ مسلمانو!
تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ	(لوگوں کی نسبت) بہت شک کرنے
بَعْضًا ؕ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ	سے بچتے رہو کیونکہ بعض شک داخل
لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ؕ	گناہ ہیں۔ اور ایک دوسرے کی ٹٹول
وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ	میں نہ رہا کرو اور تم میں سے ایک کو
رَّحِيْمٌ ○	ایک پیٹھ پیچھے برا نہ کہے۔ بھلا تم میں
	سے کوئی (اس بات کو) گوارا کرے گا
	کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت
	کھائے تو تم کو گھن آئے۔ اور اللہ سے
	تقوٰی کرو۔ بیشک اللہ رجوع ہونے
(الحجرات: ۱۱-۱۲)	والا اور رحم کرنے والا ہے۔

ان تمام اخلاقی احکام سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے قول و عمل سے مسلمانوں کے عیوب کی پردہ دری نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن ان طریقوں میں سب سے زیادہ جس طریقہ سے مسلمانوں کے عیوب کی پردہ دری ہوتی ہے وہ غیبت ہے۔ امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ تعریض، تصریح، رمز و اشارت، تحریر و کتابت اور محاکات و نقالی ہر طریقہ سے دوسروں کے عیوب بیان کیے جا سکتے ہیں اور ایک شخص کے نسب، اخلاق، دین و دنیا، جسم، کپڑے لتے، غرض ہر چیز میں عیب نکالا جا سکتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالٰی نے نہایت پُرزور طریقہ سے اس کی ممانعت کی ہے اور اس کو خود اپنے بھائی کے مردار گوشت سے تشبیہ دی ہے

جس میں بلاغت کے بہت سے نکتے ہیں :-

۱- انسان کا گوشت محض اس کی عزت و حرمت کی وجہ سے حرام ہے۔ اس لیے جو چیز اُس کی عزّت و حرمت کو نقصان پہنچاتی ہے وہ بھی اس کے گوشت کی طرح حرام ہے۔

۲- لڑائی جھگڑے میں جب باہم مقابلہ ہوتا ہے تو بعض لوگ شدّتِ غضب میں اپنے حریف کا گوشت نوچ لیتے ہیں۔ اگرچہ یہ بھی ایک بُرا فعل ہے تاہم اس میں ایک قسم کی شجاعت پائی جاتی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص حریف کے مرجانے کے بعد اس کا گوشت نوچ لے تو مکروہ ہونے کے ساتھ یہ ایک بزدلانہ فعل بھی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص رُودررُو کسی کو بُرا کہے تو گو یہ ایک ناپسندیدہ چیز ہے تاہم اس میں بزدلی نہیں پائی جاتی۔ لیکن ایک شخص کی پیٹھ پیچھے اس کی بُرائی کرنا نہایت بزدلانہ کام ہے اور بعینہ ایسا ہے جیسے کوئی اپنے حریف کے مقتول ہونے کے بعد اس کا گوشت نوچ کھائے۔

۳- لوگ شدّتِ محبّت سے بھائی کی مُردہ لاش کا دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے اس لیے جو شخص اپنے مُردہ بھائی کا گوشت نوچ کھاتا ہے اِس سے اُس کی سخت قساوت و سنگدلی اور بُغض و عداوت کا اظہار ہوتا ہے اور یہ اُس لطف و محبّت کے منافی ہے جس کو اسلام مسلمانوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔

۴- مُردار گوشت کا کھانا سخت اضطرار کی حالت میں جائز ہے اور اس وقت بھی اگر کسی کو انسان کے بجائے بکری کا مُردار گوشت مل جائے تو وُہ انسان کا گوشت کھانا پسند نہ کرے گا۔ اس لیے غیبت اُس وقت تک جائز نہیں ہوسکتی جب تک کوئی شرعی، معاشرتی، اخلاقی یا سیاسی ضرورت انسان کو مجبور نہ کرے۔ اور اس حالت میں بھی جہاں تک ممکن ہو علانیہ غیبت سے احتراز کرنا چاہیے اور صرف رمزو اشارہ سے

کام لینا چاہیے۔ اسی قرآنی تشبیہ کے مطابق رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد حدیثوں میں نہایت بلیغ طریقہ پر غیبت کی بُرائی بیان کی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ شبِ معراج میں میرا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جن کے ناخن تانبے کے تھے اور وُہ اُن سے اپنے چہروں اور سینوں کو نوچ رہے تھے۔ میں نے جبرئیلؑ سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ بولے یہ وُہ لوگ ہیں جو لوگوں کا گوشت کھاتے تھے اور اُن کی عزت و آبرو لیتے تھے[1]۔

اعمال اور اعمال کی جزاو سزا میں مناسبت ہوتی ہے۔ یہ لوگ چونکہ لوگوں کا گوشت نوچ کھاتے تھے یعنی اُن کی غیبت کرتے تھے اس لیے عالمِ برزخ میں اُن کی سزا یہ مقرر کی گئی کہ خود اپنا گوشت نوچتے رہیں۔

ایک بار سخت بدبو پھیلی تو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے کہا کہ جانتے ہو یہ کیا ہے؟ یہ اُن لوگوں کی بدبو ہے جو مسلمانوں کی غیبت کرتے ہیں[2]۔

اس حدیث میں بھی اعمال اور جزاو سزا کی مناسبت ظاہر ہے۔ مُردار گوشت اکثر بدبودار ہوتا ہے اور یہ لوگ بھی گوشت کھاتے تھے اس لیے یہ بدبو اسی مُردار خوری کا نتیجہ تھی۔

اس حدیث میں ایک نکتہ اور بھی ہے اور وُہ یہ کہ غیبت کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ دوسرے کے عیوب کی تشہیر و تفضیح کی جائے۔ اس لیے جس طرح غیبت کرنے والے لوگوں کے عیوب کو عام طور پر پھیلاتے ہیں اسی طرح اُن کے اس عمل کی نجاست و گندگی کی بو بھی دنیا میں پھیل کر لوگوں کو اُن سے متنفر کرتی ہے۔ اسی نکتہ کو آپ نے دُوسری حدیث میں بلا تشبیہ و تمثیل کے نہایت واضح طور پر بیان کیا اور فرمایا " اے وُہ لوگو جو زبان سے تو ایمان لائے ہو

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی الغیبۃ۔ [2] ادب المفرد باب الغیبۃ۔

لیکن ایمان تمہارے دلوں کے اندر جاگزیں نہیں ہوا ہے، نہ مسلمانوں کی غیبت کرو، نہ ان کے عیوب کی تلاش میں رہو۔ کیونکہ جو شخص ان کے عیوب کی تلاش میں رہے گا خداوند تعالیٰ بھی اس کے عیب کی تلاش کرے گا۔ اور خدا جس کے عیب کی تلاش کرے گا خود اس کے گھر ہی کے اندر اس کو رسوا کر دے گا۔"[1]

لغت کی رو سے غیبت کسی شخص کی غیر موجودگی میں اس کی برائی کے بیان کو کہتے ہیں۔ مگر مذہبی تعلیم میں شخص کی غیر موجودگی غیبت کے لیے کوئی ضروری قید نہیں۔ اسی طرح یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر کسی شخص کی واقعی برائیاں ظاہر کی جائیں تو یہ غیبت نہیں لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد سے ان دونوں باتوں کی تردید ہوتی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ غیبت کس کو کہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا "تمہارا اپنے بھائی کی اس چیز کا ذکر کرنا جس کو وہ ناپسند کرے"۔ کہا گیا کہ اگر میرے بھائی میں وہ عیب موجود ہو جس کو میں بیان کرتا ہوں تو فرمایا "اگر وہ عیب اس میں موجود ہے تو تم نے اس کی غیبت کی اور اگر نہیں ہے تو تم نے اس پر بہتان لگایا"۔[2]

اس سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کی عدم موجودگی میں اس کی برائی بیان کرنا غیبت کی تعریف کا کوئی ضروری جز نہیں بلکہ اگر کسی شخص کے سامنے اس کی برائی بیان کی جائے تو یہ بھی غیبت ہو گی۔ لیکن اس لفظ کے اشتقاق کی مناسبت سے اہلِ لغت کے نزدیک غیبت صرف اس بدگوئی کا نام ہے جو کسی کے پیٹھ پیچھے یعنی اس کی عدم موجودگی میں کی جائے۔ باقی کسی کے سامنے اس کے عیوب کا بیان کرنا تو یہ غیبت نہیں ہے بلکہ سب و شتم میں داخل ہے۔

اسی طرح غیبت صرف زبان تک محدود نہیں ہے بلکہ ہاتھ پاؤں اور آنکھ کے ذریعہ سے

---

[1] و [2] ابو داؤد کتاب الادب باب فی الغیبۃ۔

بھی غیبت کی جا سکتی ہے۔ کسی شخص کی نقل کرنا، مثلاً ایک شخص لنگڑا ہے تو اس کے اس عیب کے نمایاں کرنے کے لیے لنگڑا کر چلنا بھی غیبت ہے۔ ایک بار حضرت عائشہؓ نے ایک شخص کی نقل کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر اپنی سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا[1]۔

اسی طرح چشم و ابرو کے اشارے سے کسی کے عیب کی پردہ دری کرنا بھی غیبت ہے۔ اور قرآن مجید نے متعدد آیتوں میں غیبت کے ان ہی مخفی طریقوں کی برائی بیان کی ہے:

هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيمٍ ○ (القلم: ۱۱)	(لوگوں پر) آوازے کسا کرتا ہے (اُدھر کی اِدھر، اِدھر کی اُدھر) چغلیاں لگاتا پھرتا ہے۔
وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ○ (الھمزۃ: ۱)	ہر شخص جو (لوگوں کی) عیب چینی کرتا اور ان پر) آوازے کستا ہے۔ اس کی (بھی بڑی) تباہی ہے۔

ان آیتوں میں غیبت کے جن مخفی اور دل خراش طریقوں کی مذمت کی گئی ہے اُن کی توضیح ترجمہ سے نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے لیے اہلِ لغت کی تصریحات پیشِ نظر رکھنی چاہئیں جو حسبِ ذیل ہیں:

(۱) ھمز سامنے اور لمز پیٹھ پیچھے برائی کرنا۔

(۲) ھمز خاص طور پر لوگوں کے نسب کی برائی کرنا۔

(۳) ھمز ہاتھ کے اشارے سے اور لمز زبان سے غیبت کرنا۔

(۴) ھمز زبان سے اور لمز آنکھ کے اشارے سے غیبت کرنا۔

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی الغیبۃ۔

(۵) ھمز برے الفاظ سے ہم نشینوں کی دل آزاری کرنا۔

(۶) ھمز آنکھ، ہاتھ، سر اور ابرو کے اشارے سے ہم نشینوں کی بُرائی بیان کرنا۔

اس تشریح سے معلوم ہوگا کہ غیبت کا دائرہ کہاں تک وسیع ہے۔

کسی کی بُرائی بیان نہ کرنا اخلاقاً بڑی اچھی چیز ہے۔ لیکن خود اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کی واقعی بُرائی بیان کی جائے تاکہ اُن کو تنبیہ اور ندامت و شرمندگی ہو۔ اگر بُروں کی بُرائی بیان کرنے کو یک قلم بند کر دیا جائے تو اُن کی بُرائی کی روک تھام کی کوئی صورت نہ ہو سکے گی۔ اسلام کی نگاہ سے یہ نکتہ چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔ قرآنِ پاک میں کافروں، مشرکوں اور منافقوں کی علانیہ برائیاں کی گئی ہیں مگر کہیں کسی کا نام نہیں لیا گیا ہے بلکہ ہمیشہ عموم کے ساتھ پردہ میں یا صیغۂ مجہول کے ساتھ یا وصف کے ساتھ یوں کہا گیا ہے کہ جو جھوٹ بولتے ہیں یا کفر کرتے ہیں اُن کا حال یہ ہے۔ اس طریقۂ تعبیر میں یہ فائدہ ہے کہ بُروں کی بُرائی کا اظہار بھی ہوتا ہے اور کسی خاص شخص کو ناگواری کا حق بھی نہیں پہنچتا۔ اور جن بڑے بڑے کفار کے نام لیے گئے ہیں وہ اس لیے کہ اُن کی یہ بُرائیاں عالم آشکارا تھیں۔

لیکن معاملات میں ایسے مواقع بھی آتے ہیں جہاں تخصیص کی ضرورت پیش آتی ہے۔ قرآنِ پاک کی آیتوں اور حدیثوں سے ان موقعوں کی تعیین بھی معلوم ہوتی ہے۔ قرآنِ پاک کا چھٹا پارہ اس آیت سے شروع ہوتا ہے:

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ۝	اللہ کو بدگوئی پسند نہیں آتی لیکن جس پر ظلم ہوا ہو۔ اور اللہ سنتا اور جانتا ہے۔

(النسآء: ۱۴۸)

مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کو یہ پسند نہیں کہ کوئی کسی کی برائی کو پکار کر کہتا پھرے لیکن مظلوم کو حق ہے کہ وہ اپنے ظلم کی داستان کو لوگوں سے بیان کرے اور ظالم کے ظالمانہ کاموں کو آشکارا کرے۔ اللہ تعالیٰ سنتا اور جانتا ہے ظالم کو اس کے برے اعمال کی سزا دے گا۔

حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں باریابی کی اجازت طلب کی۔ آپؐ نے اس کو دیکھا تو فرمایا کہ یہ اپنے خاندان میں کس قدر برا شخص ہے۔ لیکن جب وہ پاس آیا تو اس سے نہایت لطف و کرم کے ساتھ گفتگو کی[1]۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص کے شر و فساد سے لوگوں کو آگاہ کرنے اور بچانے کے لیے اس کے احوالِ واقعی کا اظہار جائز ہے۔ غرض جس اظہار میں دوسروں کے ساتھ خیر خواہی کا جذبہ شامل ہو یا اس کے بغیر کوئی شرعی یا اخلاقی یا تمدّنی مقصد حاصل نہ ہو سکتا ہو اس کو یا تو غیبت ہی نہیں کہہ سکتے یا کہہ سکتے ہیں تو شریعت اس کو جائز رکھتی ہے۔ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں ان مقاصد کو چھ صورتوں میں محدود کر دیا ہے:۔

(۱) حاکم کے مظالم کی بارگاہِ سلطانی میں فریاد کرنا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے

لصاحب الحق مقالاً۔[2]

(۲) مذہبی اور اخلاقی برائیوں کا انسداد کرنا یعنی بغرضِ احتساب۔ (چنانچہ اسی بنا پر کفّار اور منافقوں کی برائیاں قرآن نے طشت از بام کی ہیں)

(۳) فتوٰی طلب کرنا۔ اسی بنا پر حضرت ہند بنت عتبہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حضرت ابوسفیانؓ کے بخل کی شکایت کی (اور آپ نے سن کر اس کا

---

[1] بخاری کتاب الادب باب مایجوز من اغتیاب اہل الفساد والریب [2] صحیح بخاری ومسلم بروایت ابوہریرہؓ۔

مناسب جواب دیا)۔

(۴) ایک شخص کے شر و فساد سے لوگوں کا بچانا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اسی غرض سے ایک شخص کو "بئس ابن العشیرہ" "قبیلہ کا بُرا آدمی" کہا تھا۔

(۵) ایک شخص کا کسی ایسے لقب سے مشہور ہو جانا جس سے گو اُس کا عیب ظاہر ہو مگر غایت شہرت کی وجہ سے خود اس شخص کو بھی اس سے چڑ نہ ہو مثلاً اَعمش یا اعرج کیونکہ یہ اس کی ایک امتیازی علامت قرار پا گیا ہے اور یہ اُس کو ناگوار بھی نہیں ہوتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے خود ایک صحابی کو ذوالیدین (دو ہاتھوں والے) کے لقب سے پکارا تھا۔

(۶) علانیہ فسق و فجور کرنے والے کی بُرائی بیان کرنا (تاکہ اس کو تنبّہ اور دُوسروں کو عبرت ہو) مثلاً مخنّث کو مخنّث کہنا۔

دو رُخا پن

اگر دو شخصوں میں اختلاف ہو تو ایک شخص خلوص و صداقت کے ساتھ دونوں سے تعلقات رکھ سکتا ہے لیکن اس قسم کے تعلقات میں دوُرخا پن نہیں پایا جانا چاہیے یعنی دونوں کا دوست بن کر ایک کی بات دُوسرے تک پہنچا کر دونوں کے تعلقات کو اور زیادہ خراب کرنا نہیں چاہیے۔ بلکہ یہ بداخلاقی چغلخوری سے بھی زیادہ سخت ہے کیوں کہ چغلخور صرف ایک کی بات دُوسرے تک پہنچاتا ہے اور دو رُخا آدمی دونوں کی بات ایک دُوسرے تک پہنچاتا ہے۔

دو رُخے پن کے لیے صرف ایک کی بات دُوسرے تک پہنچانا ضروری نہیں ہے بلکہ اگر ایک شخص سامنے ایک کی تعریف کرے اور اس کے پاس سے نکلے تو اس کی ہجو کرنے لگے تو بھی وہ دو رُخا کہلائے گا۔ نفاق میں جو خصوصیات پائی جاتی ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ اسی لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کو بھی نفاق سمجھتے تھے۔ ایک بار حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے کہا گیا کہ "ہم لوگ امرا اور حکّام کے پاس جاتے ہیں تو کچھ کہتے ہیں اور جب اُن کے یہاں سے نکلتے ہیں تو کچھ کہتے ہیں۔" بولے "ہم لوگ عہدِ رسالت میں اس کا شمار نفاق میں کرتے تھے۔"[1]

اور قرآنِ مجید میں بھی نفاق کی یہ خاص علامت بیان کی گئی ہے:

---

[1] صحیح بخاری باب ماقیل فی ذی الوجہین۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ○	اور جب اُن لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لاچکے تو کہتے ہیں ہم ابھی تو ایمان لاچکے ہیں۔ اور جب تنہائی میں اپنے شیطانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو صرف مسلمانوں کو بناتے ہیں۔
(البقرۃ : ۱۴)	

معاشرتی اور دنیوی حیثیت سے اس قسم کے اخلاقی منافقوں کو اُردو میں دو رُخا اور عربی میں ذوالوجہین کہتے ہیں اور احادیث میں اس قسم کے لوگوں کے لیے وعید شدید آئی ہے۔ مثلاً فرمایا "قیامت کے دن خدا کے نزدیک تم سب سے بُرا دو رُخے کو پاؤ گے جو کچھ لوگوں کے پاس جاتا ہے تو اس کا رُخ اور ہوتا ہے اور دوسروں کے پاس جاتا ہے تو اور۔"[1]

ایک اور حدیث میں فرمایا :

"دنیا میں جس کے دو رُخ ہوں گے قیامت کے دن اس کے منہ میں آگ کی دو زبانیں ہوں گی۔"[2] یہ گویا اس کی عادتِ ذمیمہ کی تمثیل ہو گی کہ وہ لوگوں سے دو رنگ کی باتیں کیا کرتا تھا۔

---

[1] بخاری کتاب الادب باب ماقیل فی ذی الوجہین وصحیح مسلم و مالک۔ [2] ابوداؤد کتاب الادب باب فی ذی الوجہین۔

بدگمانی

بدگمانی ایک قسم کا جھوٹا وہم ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے شخص کو ہر ایک کے کام میں بدنیتی ہی بدنیتی معلوم ہوتی ہے اور کسی کے کام میں اس کو حسنِ نیّت نظر نہیں آتا۔ دُوسرے کی طرف اَن ہوئی باتیں منسُوب کرنے لگتا ہے۔ دُوسرے کو بھی اس کا خیال ہوتا ہے اور وُہ بھی اُس سے کتراتے لگتا ہے۔ اِس سے آپس میں نفرت اور دشمنی پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس سے باز رہنے کی تاکید فرمائی ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ (الحجرات: ۱۲)	اے ایمان والو! بہت بدگمانی سے بچا کرو۔ بے شک بعض بدگمانی گناہ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے جب بدگمانی سے بچنے کی تاکید کی تو اس کے ساتھ ہی ساتھ بغض وحسد اور دُوسرے کے معاملات کے تجسّس و تلاش کی بھی ممانعت فرمائی کیونکہ وُہ بدگمانی کے اسباب یا لازمی نتیجے ہیں۔ فرمایا:

"تم بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے۔ تم دُوسروں کے ٹوہ میں نہ رہا کرو اور نہ ایک دُوسرے پر بڑھنے کی بیجا ہوس کرو اور نہ آپس میں حسد

رکھو اور نہ بغض رکھو اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو۔ اور اے اللہ کے بندو! جیسا اللہ نے فرمایا ہے آپس میں بھائی بھائی ہو جاؤ۔[1]

یہ بھی مناسب ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی ایسا کام کر رہا ہو یا کسی ایسی حالت میں ہو جس سے دوسرے کو بدگمانی کا موقع ہو تو وہ اس بدگمانی کو دور کر دے تاکہ دوسرا فتنہ میں نہ پڑے۔ اس کی مثال خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمائی ہے۔ ایک دفعہ آپؐ اعتکاف میں بیٹھے تھے۔ رات کو ازواج مطہراتؓ میں سے کوئی آپؐ سے ملنے آئیں آپؐ ان کو واپس پہنچانے چلے کہ اتفاقاً راستہ میں دو انصاری آپڑے۔ وہ آپؐ کو کسی عورت کے ساتھ دیکھ کر اپنے آنے کو بے موقع سمجھے اور واپس پھرنے لگے۔ آپؐ نے فوراً آواز دی اور فرمایا یہ میری بیوی فلاں ہیں۔ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اگر مجھے کسی کے ساتھ بدگمانی بھی کرنی ہوتی تو آپؐ کے ساتھ کرتا؟ ارشاد ہوا "شیطان انسان کے اندر خون کی طرح دوڑ جاتا ہے۔"[2]

---

[1] صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد و ترمذی و مالک، باب تحریم الظن۔

[2] صحیح مسلم۔ باب بیان انہ یستحب لمن رؤی خالیا بامرأۃ وکانت زوجۃ او محرما لہ ان یقول: ھذہ فلانۃ لیرفع ظن السوء۔

مدّاحی اور خوشامد

مدّاحی اور خوشامد اخلاق کی پستی، دنائت اور ذلّت کی علامت ہے اور ساتھ ہی جھُوٹ کی بھی ایک صورت ہے۔ اور یہ اس کے لیئے بھی تباہی کا سامان ہے جس کی مدّاحی اور خوشامد کی جاتی ہے۔ خوشامد اور مدّاحی کرنے والا تین گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ ایسی تعریفیں کرتا ہے جو واقع کے مطابق نہیں ہوتیں۔ یہ جھُوٹ ہے۔ دُوسرا یہ کہ وہ منہ سے جو تعریفیں کرتا ہے اس کو اپنے دل میں خود درست نہیں سمجھتا۔ نفاق ہے۔ تیسرا یہ کہ دنیاوی فائدوں کے لیے اربابِ قدر و جاہ کی خوشامدانہ تعریف کر کے ان کی اور لوگوں کی نظروں میں اپنے کو ذلیل و رسوا کرتا ہے جس سے اس کی دنائت اور ذلّت ظاہر ہوتی ہے۔

بیجا تعریفوں سے ممدوح میں بھی دو برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایک غرور اور دوسری اپنی نسبت غلط فہمی۔ تعریفیں سُن کر وہ خوش ہوتا ہے اور پھر اپنے اس مفروضہ کمال یا مبالغہ آمیز بیان پر مغرور ہو کر دُوسرے کو آنکھ نہیں لگاتا ہے اور پے در پے تعریفیں سُن کر اس کو یقین آ جاتا ہے کہ وہ واقعی ایسا ہی ہے اور توقع رکھتا ہے کہ ہر شخص اس کو ایسا ہی سمجھے۔ بادشاہوں، امیروں، دولت مندوں اور بڑے لوگوں میں اس کے بدولت جو مضحکہ انگیز برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور جس طرح وہ برخود غلط ہو جاتے ہیں اس کی نظیر تاریخ کے ہر دور میں مل سکتی ہے۔

قرآنِ پاک نے یہودیوں اور منافقوں کے ایک گروہ کا یہ نقشہ کھینچا ہے[1] اور ان کے انجام کی یہ خبران کو دی ہے:

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ	جو اپنے کارنامہ پر اتراتے ہیں اور جو انہوں
بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا	نے نہیں کیا اس پر تعریف کیے جانے
بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ	کو پسند کرتے ہیں تو ان کو ہرگز
بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ	نہ سمجھنا کہ وہ سزا سے بچ جائیں گے
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○	اور ان کے لیے دردناک سزا ہے۔

(آل عمران: ۱۸۸)

ان آیتوں کا شانِ نزول گو خاص ہے مگر اپنے اثر کے لحاظ سے عام ہے[2]۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ اپنے کیے ہوئے کاموں پر اترانا اور بن کیے کاموں پر اپنی تعریف چاہنا اتنی بُری بات ہے کہ بن تو یہ اس کی سزا سے بچنا مشکل ہے مگر یہ کہ مغفرتِ الٰہی دستگیری فرمائے اور قرآنِ پاک کے اس اصول کے مطابق کہ جو کام گناہ ہیں ان کے کرنے پر اعانت اور تعاون کرنے والے بھی گنہگار ہوتے ہیں وہ لوگ بھی جو ایسی مداحی اور خوشامد کا ننگ گوارا کرتے ہیں اس گناہ میں کسی نہ کسی درجہ میں شریک ہیں جس کی تفصیل بہت سی حدیثوں سے معلوم ہوتی ہے۔ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایک شخص کو دوسرے کی مبالغہ آمیز تعریف کرتے ہوئے سُنا تو فرمایا تم نے اس کو برباد کر دیا[3]۔ ایک اور موقع پر ایک صاحب نے کسی کی حد سے زیادہ تعریف کی تو فرمایا تم نے اپنے ساتھی کی گردن ماردی۔ اگر تم کو کسی

---

[1] صحیح بخاری تفسیر آل عمران [2] فتح القدیر شوکانی [3] صحیح بخاری باب کراہیۃ التمادح۔

کی تعریف ہی کرنی ہو تو یوں کہو کہ میں یہ گمان کرتا ہوں بشرطیکہ اس کے علم میں وُہ واقعی ایسا ہو اور قطعیت کے ساتھ غیب پر حکم نہ لگایا جائے۔[1]

مقصود یہ ہے کہ اگر کسی کی حد سے زیادہ تعریف کی جائے گی تو وُہ اس کو سُن کر مغرور ہو جائے گا۔ اس کے بعد اس کا سارا کیا دھرا برباد ہو جائے گا۔ اسی طرح کسی کی نسبت قطعیت کے ساتھ اس لیے بھی حکم نہیں لگانا چاہیئے کہ کسی کو دُوسرے کا اندرونی حال اور غیب کی خبر نہیں معلوم۔

ایک اور بات یہ ہے کہ ایسی تعریفیں جو لوگوں کے منہ پر کی جاتی ہیں اُن کو سُن کر اُن کے نفس موٹے ہو جاتے ہیں اور ان کی اپنے عیب و ہنر پر نظر ڈالنے والی آنکھوں کی روشنی زائل ہو جاتی ہے۔ ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت عثمانؓ کے منہ پر ان کی تعریفیں کیں تو حضرت مقدادؓ صحابی نے اس کے منہ میں خاک جھونک دی اور فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مداحی کرنے والوں سے ملو تو اُن کے منہ میں خاک جھونک دو۔[2] ادب المفرد میں ہے کہ ایک دفعہ آپؐ مسجد میں تشریف لے گئے تو دیکھا کہ ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے۔ آپؐ نے کسی سے پوچھا کہ یہ کون ہے تو اس نے اس کی بڑی تعریفیں شروع کیں۔ آپؐ نے فرمایا "اس کو سُنا کر مت کہو کہ اس کو برباد ہی کر دو۔[3]"

---

[1] صحیح بخاری و مسلم و ابوداؤد باب کراہیۃ التمادح [2] صحیح مسلم و ابوداؤد باب مذکور [3] صحیح مسلم و ابوداؤد و بخش فی وجوہ المداحین

بُخل

بُخل بھی اساسی بداخلاقیوں میں سے ہے یعنی ایسی بداخلاقی جو بہت سی بداخلاقیوں کی جڑ ہے۔خیانت، بددیانتی، بے مروّتی۔بعض دفعہ بے رحمی، بدسلوکی، اور دنائت بھی اسی سے پیدا ہوتی ہے۔حرص، طمع، لالچ، تنگ نظری، کم ہمتی، پست طبعی اور بہت سی بُرائیاں اسی ایک جڑ کی مختلف شاخیں ہیں۔اسلام آیا تو جھوٹ کے بعد سب سے پہلے اسی جڑ پر اس نے کلہاڑی ماری اور بھوکوں کو کھلانا، ننگوں کو پہنانا، محتاجوں کو دینا، یتیموں کی خبر گیری اور مقروضوں کی امداد مسلمانوں کا ضروری فرض قرار دیا۔ان ہی فرائض کے مجموعہ کا نام زکوٰۃ اور اُس کے مصارف ہیں جو نماز کے بعد اسلام کا دوسرا فرض ہے۔آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت خدیجہؓ کے سامنے جبرائیلؑ کی آمد کا حال سنایا تو حضرت خدیجہؓ نے آپ کو آپ کی نبوّت کا یقین جن دلیلوں کی بنا پر دلایا وہ یہ ہیں۔

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ قرابت والوں کا حق اور مقروضوں کا قرض ادا کرتے ہیں، غریبوں کو سرمایہ دیتے ہیں، مہمانوں کو کھلاتے ہیں، اور حق کے مصیبت زدوں کی مدد کرتے ہیں[1]۔"

---

[1] صحیح بخاری۔باب بدء الوحی۔

غور کیجیے کہ نبوت کی ان تمام ابتدائی صفتوں کے اندر جو چیز خاص اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ نبی "بخیل" نہیں ہوتا ورنہ فیاضی کے یہ اوصاف نبوت کی خصوصیات قرار نہ پاتے۔

بخالت ان بیماریوں میں سے ہے جو درحقیقت اعمال کی جزا و سزا پر دلی اعتقاد نہ رکھنے کا نتیجہ ہیں کیونکہ جو اعمال کی پاداش کا یقین نہیں رکھتا وہ اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت دوسرے کے حوالے کرنے پر آسانی سے تیار نہیں ہو سکتا۔ سورۂ مدثر آغاز نبوت کی سورتوں میں سے ہے۔ اس میں دوزخیوں کے سوال وجواب کا ایک مکالمہ ہے ان سے جب پوچھا جائے گا کہ تم دوزخ میں کیوں ڈالے گئے تو کہیں گے ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے، مخالفوں کے ساتھ مل کر ہم دینِ حق پر اعتراض کیا کرتے تھے اور یہ سب اس لیے تھا کہ ہم اپنے عمل کی جزا و سزا کے دن پر یقین نہیں رکھتے تھے:

مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ۝ قَالُوا	تم کو دوزخ میں کیا چیز لے گئی۔ کہیں گے
لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ۝ وَ	ہم نمازیوں میں سے نہ تھے۔ اور مسکین کو
لَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ۝	کھلاتے نہ تھے۔ اور بحث کرنے والوں
وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ۝	کے ساتھ ہو کر ہم بھی بحث کیا کرتے تھے
وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ۝	اور روزِ جزا کو جھٹلاتے تھے۔

(المدثر: ۴۳ - ۴۶)

اس سے ظاہر ہوگا کہ بخل کی برائی دوزخ تک پہنچا کر رہتی ہے۔ اور وہ عمل کی جزا و سزا پر یقین نہ رکھنے کا لازمی نتیجہ ہے کیونکہ جیسا کہ کہا گیا جو مذہبی جزا و سزا کا قائل نہیں وہ اخلاص سے دوسروں کے ساتھ فیاضی بھی نہیں کر سکتا۔ یہی نکتہ سورۂ ماعون میں جو مکہ کی پرانی سورتوں میں سے ہے دہرایا گیا ہے۔ فرمایا:

اَرَءَيۡتَ الَّذِيۡ يُكَذِّبُ بِالدِّيۡنِ ؕ	کیا تو نے اُس شخص کو دیکھا جو جزا کے
فَذٰلِكَ الَّذِيۡ يَدُعُّ الۡيَتِيۡمَ ۙ	دن کو جھٹلاتا ہے۔ پس یہی وہ ہے جو
وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الۡمِسۡكِيۡنِ ؕ	بن باپ کے بچّہ کو دھکّا دیتا ہے۔ اور
(الماعون: ۱-۳)	فقیر کو کھانا دینے پر آمادہ نہیں کرتا ہے۔

یہی سبب ہے کہ اعمال کی جزا کا یقین کئے بغیر اگر کوئی فیّاضی کرے بھی تو وہ قبول نہیں۔ کیونکہ یہ فیّاضی اس اخلاص اور نیک نیّتی کی بنا پر نہیں ہوسکتی جو قبولیّت کی سب سے پہلی شرط ہے بخیل آدمی اگر کسی کو کچھ دیتا بھی ہے تو وہ اس کا معاوضہ اسی دنیا میں پانے کا متوقع رہتا ہے اور جہاں کہیں اس کو اپنی یہ توقع پوری ہوتی معلوم نہیں ہوتی وہ ایک دھیلا بھی خرچ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس کے دل میں یہ یقین نہیں کہ ہمارے ہر نیک عمل کی جزا خدا کے پاس ہے اور وہ کبھی ضائع نہیں جاسکتی۔

ایک اور مکّی سورہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک ایسے شخص کا تذکرہ کیا ہے جس کی روزی زیادہ نہیں اور اس لیے اس کو اپنے خدا سے گلہ رہتا ہے کہ اس نے مجھے ذلیل کیا ہے۔ خدا تعالےٰ فرماتا ہے:

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ ۙ	یہ خیال صحیح نہیں بلکہ بات یہ ہے
وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ	کہ تم بن باپ کے بچّہ کی توقیر نہیں کرتے
الْمِسْكِيْنِ ۙ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ	اور فقیر کے کھانے پر ایک دوسرے
اَكْلًا لَّمًّا ۙ وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ	کو رغبت نہیں دلاتے۔ اور مردہ کے
حُبًّا جَمًّا ؕ	متروکہ مال کو کھا جاتے ہو اور مال و دولت
(الفجر: ۱۷-۲۰)	سے بڑی محبت رکھتے ہو۔

ان آیتوں میں باتیں کئی بیان کی گئی ہیں، مگر یہ سب کی سب بُخل کی مختلف صورتوں کی تشریح ہیں۔ سورۂ ہمزہ میں اُس بخیل کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو دولت کی تھیلیوں کو گویا اپنی حیاتِ جاوید کی اکسیر جانتا ہے اور سمجھتا ہے کہ ان کے بدولت وہ ہمیشہ کی زندگی پائے گا اور یہ چیز اس سے کبھی علیحدہ نہ ہوگی۔ حالانکہ یہ کتنا خیالِ خام ہے۔ فرمایا:

الَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝ یَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخْلَدَهٗ ۝ كَلَّا لَیُنْۢبَذَنَّ فِی الْحُطَمَةِ ۝ (الھمزة: ۲-۴)

جس نے اکٹھا کیا مال کو اور گنتا کیا اس کو سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ ہرگز یوں نہیں وہ بالضرور دوزخ میں ڈالا جائے گا۔

اسی طرح مال و دولت کو سینت سینت کر رکھنے اور کارِ خیر میں خرچ نہ کرنے والے کو اس دوزخ کی دھمکی دی گئی ہے جو کھال تک کھینچ لے:

كَلَّا ؕ اِنَّهَا لَظٰى ۝ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ۝ تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى ۝ وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ۝ (المعارج: ۱۵-۱۸)

ہرگز نہیں وہ تپتی آگ ہے۔ کھینچ لینے والی کھال۔ پکارے گی اس کو جس نے حق سے پیٹھ دی اور پھر گیا۔ اور اکٹھا کیا اور سینتا۔

بخیل اس نکتہ کو بھول جاتا ہے کہ مال و دولت مقصود بالذات چیز نہیں، بلکہ وہ صرف چیزوں کے حصول کا ذریعہ ہے۔ سونے چاندی کی اینٹیں خود بخود روٹی کپڑا اور مکان کی چہار دیواری نہیں بن سکتیں اس لیے ان کو سمیٹ کر رکھنے سے کچھ حاصل نہیں۔ ان کو ضروری اور اعلیٰ مقصودوں کے حصول میں خرچ کرنا ہی ان کا صحیح مصرف ہے اور یہی اعلیٰ مقصود ہیں جن کو خدا نے اپنی راہ کہا ہے۔ جو اس راہ میں خرچ نہیں کرتا وہ اپنے لیے درہم و دینار

نہیں جمع کرتا اپنے سینہ اور پیشانی کے داغ کا سامان اکٹھا کرتا ہے۔ فرمایا:

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ ۝

(التوبۃ: ۳۴-۳۵)

اور جو لوگ سونے اور چاندی کو گاڑ کر رکھتے ہیں اور خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو ان کو دردناک سزا کی خوشخبری سنا دے جس دن اس کو دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا پھر اس سے ان کی پیشانیاں کروٹیں اور پیٹھیں داغی جائیں گی (اور کہا جائے گا کہ) یہ ہے وہ جس کو تم نے اپنے لیے گاڑ کر رکھا تھا تو جس کو گاڑ کر رکھا کرتے تھے اس کا مزہ چکھو۔

یہ بخیل اس حقیقت سے بھی ناآشنا ہیں کہ یہ سونا چاندی فرد کی نہیں جماعت کی دولت ہے۔ اس کو چلتا پھرتا رہنا چاہیئے۔ اس کو ایک جگہ روک کر رکھنا اللہ تعالیٰ کی مصلحت کے خلاف اور اس جماعت کے لیے مضر ہے جس کے رکن وہ خود ہیں:

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَا اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۭ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ

(آل عمران: ۱۸۰)

اور جو لوگ اس مال کو جو خدا نے اپنی مہربانی سے ان کو دیا ہے روکے رکھتے ہیں وہ اس کو اپنے حق میں بہتر نہ سمجھیں۔ بلکہ وہ ان کے حق میں بدتر ہے جس مال کا وہ بخل کرتے ہیں اس کا طوق بنا کر ان کے گلے میں قیامت کے دن پہنایا جائے گا۔

یعنی جس دولت کو انھوں نے بخالت کے مارے دنیا میں اپنے گلے کا ہار بنا رکھا تھا۔ وہ قیامت کے عالمِ مثال میں واقعی ان کے گلے کا ہار بن کر نظر آئے گا۔ حدیث میں ہے کہ یہ مال زہریلے سانپ کی صورت میں گلے میں پڑا ہوا نظر آئے گا[1]

جو بخیل ہوتا ہے اس کو خلقِ خدا اور خدا کے کاموں سے قطعاً محبت نہیں ہوتی۔ اس کی محبت کا مرکز صرف دولت ہوتی ہے اور اسی کو زندگی کا مقصود جانتا ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسے لوگ میری محبت کی دولت سے محروم رہیں گے:

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِۨ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ؕ	اور اللہ کسی اترانے والے شیخی باز سے محبت نہیں کرتا۔ جو آپ بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی بخل کی ترغیب دیتے ہیں۔
(الحدید: ۲۳-۲۴)	

اور جس سے خدا محبت نہ کرے اس سے کون محبت کر سکتا ہے۔ اسی لیے ایسے شخص سے اور تو اور خود اس کے بال بچے اور عزیز و اقربا بھی محبت نہیں کرتے۔ اور ایسے لوگوں کو جیسا کہ خدا نے فرمایا ہے اکثر دیکھا بھی گیا ہے کہ ان کو اپنے مال و دولت پر بڑا گھمنڈ ہوتا ہے اور اپنے سوا دوسروں کو ذلیل سمجھتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا اور اس کے بندوں کی نگاہوں میں بھی ذلیل و خوار ہوتے ہیں۔

قرآن پاک میں بخل کی سب سے بڑی تمثال کا نام قارون بتایا گیا ہے جس کا قصہ سورۂ قصص میں ہے۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ان ہی کی قوم کا ایک آدمی تھا۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ۔

اتنا مالدار تھا کہ تمدّن کے اس ابتدائی دور میں جب ایک تالے کی ایک ہی کنجی بنتی تھی اور وہ بھی خدا جانے کتنی بھاری اور بھدّی ہوتی ہوگی، خزانے تو الگ رہے خزانوں کی کنجیوں کے گچھوں کو کئی آدمی مل کر بھی مشکل سے اُٹھا سکتے تھے، تو بجائے اس کے کہ وہ اللہ تعالےٰ کا شکر گذار ہوتا کہ اس نے اپنے فضل وکرم سے اس کو اتنا مالدار بنایا، کہتا کہ یہ مال و دولت تو میری محنت اور میرے ہُنر کا نتیجہ ہے۔ اس کو یہ خبر نہ تھی کہ دنیا میں اس سے پہلے اس سے بھی بڑے بڑے دولت مند گزُر چکے ہیں جن کا انجام بڑا دردناک ہوا ہے۔ چنانچہ اس قارون اور اس کی دولت کا بھی انجام یہ ہوا کہ وہ زمین میں دھنس کر رہ گئی۔ خدا نے فرمایا:

اَوَلَمْ يَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَهْلَكَ	کیا وہ نہ جانا کہ اللہ اس سے پہلے قوموں
مِنْ قَبْلِهٖ مِنَ الْقُرُوْنِ مَنْ هُوَ	میں سے اس سے زیادہ طاقتور اور اس
اَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَّاَكْثَرُ جَمْعًا ؕ	سے زیادہ دولت مند کو تباہ کر چکا ہے۔

(القصص : ۷۸)

زمانہ محمدیؐ کے قارون ابولہب کو بھی یہی بشارت سنائی گئی اور صاف کہہ دیا گیا:

مَاۤ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا	ابولہب کو اس کا مال اور جو کچھ اس
كَسَبَ ؕ	نے کمایا کوئی فائدہ نہ پہنچا سکا۔

(اللھب : ۲)

محض کسی شخص یا کسی قوم کے چند افراد کے پاس دولت کا ہونا اس شخص یا قوم کی بھلائی کا سبب نہیں ہوسکتا جب تک وہ دولت جماعت یا جماعت کے افراد کی ضرورتوں میں خرچ نہ کی جائے۔ بخیل آدمی چاہتا ہے کہ یہ کُل کی کُل تنہا اسی کی ضرورت میں کام آئے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دولت کا اتنا حصہ بے کار ہو جاتا ہے اور اس کا ضرر پوری جماعت کو پہنچتا

ہے۔ جس کا وہ بھی ایک فرد ہے:

هَآنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ	ہاں! تم کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو بلایا
لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ	جا رہا ہے۔ تو تم میں کوئی بخل کرتا
مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ يَّبْخَلْ	ہے۔ اور جو کوئی بخل کرتا ہے سو اپنے
فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ وَ	ہی سے بخل کرتا ہے۔ اور اللہ بے نیاز
اللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ	ہے اور تم ہی محتاج ہو۔

(محمد: ۳۸)

یعنی اُس کے بخل کے بُرے نتیجے اسی کو بھگتنے پڑیں گے۔

بخیل آدمی دنیا میں بھی طرح طرح کی مصیبتوں اور مشکلوں میں گرفتار رہتا ہے کہ سب کچھ پاس ہونے کے باوجود بھی اس کو نہ اچھا کھانا میسر آتا ہے، نہ اچھا پہننا، نہ قرینہ کا گھر، نہ عزت نہ آبرو۔ ہر شخص اس کو ذلیل و خوار جانتا ہے۔ ہر ایک اس کے نام سے نفرت کرتا ہے فقراً اس کے لیے بددعا کرتے ہیں یہاں تک کہ بیوی بچے جن کے لیے وہ سب کچھ کرتا ہے وہ بھی اس سے خوش نہیں رہتے۔ ہر ایک اس کی دولت کا خواہاں رہتا ہے اور چاہتا ہے کہ کسی طرح اس خزانہ کا یہ سانپ راستہ سے ہٹ جائے تو اس پر قبضہ کرے۔ چور اس کے درپے، ڈاکو اس کے لاگو، زہر وہ پاتا ہے، حملے اس پر ہوتے ہیں مگر ان تمام مصیبتوں کو وہ سہتا ہے اور اپنی زندگی بھر اس میں سے کچھ خرچ نہیں ہونے دیتا لیکن اِدھر اس کی آنکھ بند ہوئی اور اُدھر اس کے وارثوں نے اللّے تللّے میں اس کو اڑا دیا۔ بلکہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ جس اولاد کے لیے وہ خود ساری عمر تکلیف اٹھا کر دولت جمع کرتا ہے وہ اس مالِ مُفت کو دم کے دم میں اڑا دیتی ہے اور ہزاروں بُری عادتوں میں مبتلا اور آخر

میں مفلس و قلاش ہو جاتی ہے۔

خدا اپنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی فرماتا ہے:

وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۙ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۙ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۭ وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗٓ اِذَا تَرَدّٰى ۭ (اللیل: ۸-۱۱)	اور لیکن جس نے دینے سے بخل کیا اور (خدا کی یا نیکی کی باتوں کی) پروانہ کی اور اچھی بات کو جھٹلایا۔ تو ہم اس کو سخت کام کے لیے آسان بنائیں گے اور جب وہ گرے گا تو اس کا مال اس کے کام نہ آئے گا۔

وہ سخت کام جس کو خدا اس کے لئے بطور سزا کے آسان کر دیتا ہے وہ بُری عادت و خصلت اور بُرے کردار ہیں جن میں وہ ہمیشہ مبتلا رہتا ہے اور اُن کو صرف اس لئے کہ کسی طرح اس کا مال خرچ نہ ہونے پائے بڑی آسانی سے کر گزرتا ہے۔ بھوکا وہ رہتا ہے، ننگا وہ رہتا ہے، میلا وہ رہتا ہے، مصیبتیں وہ جھیلتا ہے، راتوں کو آرام سے سو نہیں سکتا، دنیا کی کسی چیز سے دل بھر کر لطف نہیں اٹھا سکتا، عزیز و اقارب، دوست و احباب سے اُس کو مسرت نہیں ہوتی، وہ سب سے نالاں اور اس سے سب نالاں رہتے ہیں۔ پھر جب وہ کسی افتاد یا موت یا دوزخ کے گڑھے میں گرتا ہے یا گرے گا تو اس کی یہ عزیز اور محبوب دولت اس کے کچھ کام نہ آتی ہے نہ آئے گی۔ اس وقت افسوس آئے گا تو اللہ تعالیٰ پہلے ہی ہشیار کر دیتا ہے:

وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ	اور ہم نے تم کو جو روزی دی ہے اس میں سے اس سے پہلے کہ تم میں سے کسی کو موت آئے (خدا کی راہ میں) خرچ کرو (ایسا نہ ہو کہ موت

أَخَّرْتَنِيْٓ إِلٰٓى أَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَأَصَّدَّقَ وَأَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ (المنفقون: ١٠)

آنے لگے، تو کہے کہ میرے پروردگار تو نے مجھے تھوڑی دیر اور کہیں مہلت نہ دی کہ میں خیرات کرتا اور نیکوکاروں میں سے ہو جاتا۔

اللہ تعالیٰ جواب دیتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا، یہ وقت ٹالے ٹل نہیں سکتا، اس کے لیے سامان پہلے سے چاہیے تھا۔

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جب وہ غریب ہوتے ہیں تو بڑی بڑی دعائیں کرتے ہیں، خوب خوب وعدہ کرتے ہیں کہ اگر خدا نے ہمیں اپنے فضل و کرم سے دولت دی تو ہم یہ کریں گے وہ کریں گے۔ مگر جب اللہ تعالیٰ ان کو دولت دے دیتا ہے تو وہ سارے وعدے بھول جاتے ہیں اور نیکی کے ہر راستہ سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے ان لفظوں میں کھینچا ہے:

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝ (التوبة: ۷۵-۷۶)

اور ان میں کوئی ایسا ہے جس نے خدا سے عہد کیا کہ اگر خدا نے ہم کو اپنے فضل سے دیا تو ہم ضرور خیرات کریں گے۔ اور نیکوکاروں میں سے ہوں گے پھر جب خدا نے ان کو اپنے فضل سے دیا تو اس میں بخالت کرنے لگے اور ٹل کر پھر گئے۔

خدا فرماتا ہے کہ اس بخل کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے دل میں نفاق نے گھر کر لیا:

فَأَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِىْ قُلُوْبِهِمْ (التوبة: ۷۷)

تو اللہ نے ان کے دلوں میں اس کا نتیجہ نفاق رکھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ بخل کی شدت ایمان کو بھی برباد کر دیتی ہے۔ شاید اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "دو خصلتیں سچے مومنوں میں جمع نہیں ہوتیں، بخل اور بد خلقی"[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن برائیوں سے بچنے کی خدا سے دعائیں مانگا کرتے تھے، ان میں سے ایک بخل بھی ہے۔ فرمایا کرتے تھے کہ "خداوندا میں بخل، کسل مندی، کبر سنی، قبر کے عذاب اور زندگی اور موت کی آزمائش سے تیری پناہ مانگتا ہوں"[2]۔

اسلام میں زکوٰۃ کی جو اہمیت ہے وہ ظاہر ہے۔ یہ زکوٰۃ کی فرضیت اور صدقات و تبرات کی ترغیبات شریعتِ محمدیؐ میں اسی لئے ہیں کہ انسانوں کے دل اس بری خصلت کے میل سے ہمیشہ پاک و صاف رہیں۔

یہ بھی پیشِ نظر رہے کہ بخل صرف ظاہری مال و دولت ہی کے حق نہ ادا کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ خدا نے اپنے فضل سے جس کو جو کچھ دیا ہے مثلاً کسی کو علم دیا ہے، کسی کو عقل دی ہے، کسی کو جسمانی قوت دی ہے تو جو لوگ خدا کی ان بخششوں کا حق ادا نہیں کرتے وہ بھی ایک قسم کے بخیل ہیں اور وہ بھی اپنے درجہ کی سزاؤں کے مستحق ہیں۔ جس کو علم ملا ہے اس کو چاہئے کہ اپنے علم کو پھیلائے اور دوسروں کو بتائے جو ایسا نہیں کرتا وہ علم کا بخیل ہے اسی لیے علم کا چھپانا اور جان کر نہ بتانا گناہ ہے:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ	اور کون اس شخص سے زیادہ ظالم ہوگا جو خدا کی شہادت کو جو اس کے پاس ہے چھپائے۔
(البقرۃ: ۱۴۰)	

---

[1] جامع ترمذی۔ [2] صحیح مسلم۔

حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ "اللہ اور رسول کے بعد سب سے بڑا سخی وہ ہے جس نے علم کو سیکھا اور اس کو پھیلایا"[1] اس لیے لامحالہ جس نے علم رکھ کر علم کے فرض کو انجام نہیں دیا، اس کا شمار بخیلوں میں ہوگا۔

یہ کئی دفعہ کہا گیا ہے کہ ایمان کے بعد اسلام نے اعمال کو دو حصّوں میں منقسم کیا ہے۔ اللہ کے حق اور بندے کے حق۔ اللہ کے حقوق کا اجمالی مجموعہ نماز اور بندوں کے حقوق کا مجمل مجموعہ زکوٰۃ یعنی مستحق لوگوں کے ساتھ بخشش ہے۔ دیکھیے کہ ذیل کی آیتوں میں ان ہی دونوں کی عدم بجاآوری کو دوزخ میں جانے کا سبب قرار دیا گیا ہے:

مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ ○ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ ○ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ ○	کیا چیز تم کو دوزخ میں لے گئی؟ کہیں گے کہ ہم نمازیوں میں سے نہ تھے۔ اور نہ محتاجوں کو کھلاتے تھے۔

(المدثر: ۴۲-۴۴)

پہلا گناہ حقوقِ الٰہی کی بجاآوری سے انحراف اور دوسرا بندوں کے حق سے تغافل ہے۔ یہی بات سورۂ ماعون کے آخر میں ہے:

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ ○ الَّذِينَ هُمْ عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ ○ الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ ○ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ ○	پھر خرابی ہے ان نمازیوں کی جو اپنی نماز سے بے پرواہ رہتے ہیں۔ وہ جو دکھاوا کرتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کو مانگے نہیں دیتے۔

(الماعون: ۴-۷)

---

[1] مشکوٰۃ کتاب العلم۔

پہلی بات تو نماز سے غفلت ہے کہ وقت پر نہیں ادا کرتے ہیں اور صرف دکھاوے کے لیے پڑھتے ہیں ۔ یہ حقوقِ الٰہی سے تغافل ہے ۔ اور دوسری آپس میں مانگے کی معمولی معمولی چیزوں میں جیسے نمک ، آگ ، پانی اور ایسی ہی دوسری بے حقیقت چیزوں میں بخل سے کام لینا ہے ۔ یہ بندوں کے حقوق سے غفلت ہے ۔ اس تشریح سے معلوم ہوا ہو گا کہ بخل شریعت کے بہت بڑے حصّہ کے عدم تعمیل کا سبب بنتا ہے اور اس لیے اس کی بُرائی جتنی بھی کی جائے کم ہے ۔

حرص و طمع

حرص و طمع یا لالچ وہ بُرائی ہے جس میں نفس کی دنائت پُوری طرح ظاہر ہوتی ہے خصوصاً وہ حرص و طمع جس میں بخالت کی بھی آمیزش ہو۔ عربی میں اس کو شُحّ کہتے ہیں جس کی بُرائی قرآن میں کئی موقعوں پہ آئی ہے۔ خانگی زندگی کی ناگواری زیادہ تر اسی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ گھر کا مالک زیادہ دینا نہیں چاہتا اور گھر کے لوگ زیادہ مانگتے ہیں۔ شوہروں کو اپنے مال سے محبت ہوتی ہے اس لئے وہ زیادہ خرچ نہیں دیتے اور بیویاں لالچ سے زیادہ کا مطالبہ کرتی ہیں۔ یا ایک شخص کے کئی بیویاں ہوں تو ہر بیوی کو حرص ہوتی ہے کہ شوہر پر میرا حق زیادہ رہے اور شوہر کو اس بیوی کی حرص ہوتی ہے جس کو وہ چاہتا ہے۔ اس سے خانگی معاملوں میں کشمکش پیدا ہوتی ہے اور سارا گھر روحانی تکلیف میں رہتا ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ باہم احسان و ایثار کا سلوک ہو اور ہر ایک دُوسرے کے آرام کو اپنا آرام اور اس کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھے تو پھر وہی گھر جو پہلے غمکدہ تھا عشرت کدہ بن جائے گا۔ میاں بیوی کے ان ہی خانگی اختلافات کے سلسلہ میں قرآن کی تعلیم ہے:

وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ ط	اور طبیعتوں (نفوس) میں حرص دھری ہے
وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ	اور اگر تم احسان کرو اور تقویٰ اختیار

اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرًا ○ کرو تو اللہ کو تمہارے کاموں کی ساری خبر ہے ۔

(النسآء : ۱۲۸)

یعنی میاں بیوی دونوں حرص اور لالچ چھوڑ دیں اور احسان اور تقویٰ کی راہ اختیار کریں تو اللہ تعالیٰ جو ہر ایک کے کاموں سے واقف ہے، سب کو ان کے کاموں کے مطابق جزا دے گا۔

اس کاروباری دنیا میں ہر چیز کا ایک اقتصادی پہلو بھی ہوتا ہے۔ جب تک انسان اپنی حرص و طمع کو روک کر اچھے کاموں میں روپیہ خرچ نہیں کرے گا وہ کامیابی حاصل نہیں کر سکتا خواہ یہ کامیابی دین کی ہو یا دنیا کی۔ فرمایا:

وَاَنۡفِقُوۡا خَیۡرًا لِّاَنۡفُسِکُمۡ ؕ وَمَنۡ یُّوۡقَ شُحَّ نَفۡسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ○ اور خرچ کرو، اپنے لیے بھلائی کرو۔ اور جو اپنے جی کی حرص سے بچایا گیا وہی کامیاب ہیں۔

(التغابن : ۱۶)

ایک اور موقع پر ہے کہ ان مسلمانوں کا وصف یہ ہے کہ وہ دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھتے ہیں:

وَیُؤۡثِرُوۡنَ عَلٰۤی اَنۡفُسِهِمۡ وَلَوۡ کَانَ بِهِمۡ خَصَاصَةٌ ؕ۟ وَمَنۡ یُّوۡقَ شُحَّ نَفۡسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ○ اور اپنے اوپر (اوروں کو) مقدم رکھتے ہیں اگرچہ خود ان کو ضرورت ہو۔ اور جو اپنے جی کی لالچ سے بچایا گیا، وہی کامیاب ہیں۔

(الحشر : ۹)

اسی کا نام ایثار ہے۔ یہ ہر قوم کی دینی و دنیاوی کامیابی کا زینہ ہے اور یہ زینہ اس وقت تک کسی کو مل نہیں سکتا جب تک حرص و طمع کا خاتمہ نہ ہو۔ اسی لیے خدا نے فرمایا جو حرص و آز سے پاک ہوں گے وہی کامیاب ہوں گے۔

لالچی یہی نہیں کہ اپنے مال کو خرچ نہیں کرتا بلکہ دوسرے کے مال پر بھی نگاہ رکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ سب کا سب اسی کو مل جائے۔ اسلام نے ایسی آرزو کی ممانعت کی ہے۔ کیونکہ اس میں دو اور بداخلاقیاں شامل ہیں۔ ایک بخل اور دوسری حسد فرمایا:

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ	اور اس کی ہوس نہ کرو جس میں اللہ نے
بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ لِلرِّجَالِ	ایک کو دوسرے پر بڑائی دی ہے مردوں
نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ وَلِلنِّسَآءِ	کے لیے ان کی کمائی ہے اور عورتوں کے
نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ وَسْــَٔلُوا	لیے ان کی۔ اور اللہ سے مانگو اس
اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ	کے فضل میں سے حصہ۔ بے شک اللہ
بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمًا ○	ہر چیز کو جانتا ہے۔

(النسآء: ۳۲)

مطلب یہ ہے کہ خدا نے کسی چیز میں کسی کو بڑائی بخشی ہے تو کوئی دوسرا اس کی ہوس اس خیال سے نہ کرے کہ اس کو یہ کیسے اور کیوں مل گئی کاش خود اسے ملتی بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ ہی کے سامنے اس کے مطلق فیض و کرم میں سے اپنا حصہ طلب کرنے کے لیے ہاتھ پھیلانا چاہیے۔ اگر اس کی مصلحت کا اقتضا ہوگا تو وہ عنایت کرے گا۔ اس تعلیم پر عمل کرنے سے طبیعت میں قناعت پیدا ہوگی ساتھ ہی دوسرے پر حسد کرنے کا جذبہ جاتا رہے گا۔

اسی لئے فرمایا:

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ○ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ (الحجر: ۸۷-۸۸)	اور بے شک ہم نے تجھ کو دیں سات آیتیں اور قرآن جس کا درجہ بڑا ہے۔ تو اپنی آنکھیں ان چیزوں پر مت پسار جو ہم نے ان میں سے مختلف لوگوں کو فائدہ اٹھانے کو دی ہیں۔

یعنی جس کو قرآن جیسی دولت ملی اس کی نظر میں دنیاوی دولت کیا چیز ہے!

یہی حرص وطمع کا جذبہ ہے جو ایک کو دوسرے کی جان لے لینے اور مال چھین لینے پر ابھارتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ "حرص وطمع سے بچو کہ اسی نے تم سے پہلوں کو برباد کیا، اسی نے ان کو آمادہ کیا کہ انہوں نے خون بہایا اور حرام کو حلال سمجھا"[1] یہ صحیح مسلم کی روایت ہے۔ صحیح ابن حبان اور حاکم میں اس سے زیادہ مفصل ہے۔ فرمایا "حرص سے بچو کیونکہ اسی نے اگلوں کو اس کی دعوت دی کہ انہوں نے ان کے گناہوں کا خون بہایا، اسی نے اگلوں کو دعوت دی کہ انہوں نے رشتہ کے حق کو کاٹا اور اسی نے اگلوں کو دعوت دی کہ حرام کو حلال سمجھا"[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا "حرص سے بچو کیونکہ تم سے پہلی قومیں اسی حرص سے تباہ ہوئیں۔ اسی نے اُن کو کہا تو انہوں نے رشتہ کے حق کو کاٹا، اسی نے کہا تو انہوں نے بخل کیا، اسی نے ان کو فسق وفجور کے لئے کہا تو انہوں نے فسق وفجور کیا"[3] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "انسان میں سب سے بُری بات کڑھانے والی حرص اور گھبرا دینے والی نامردی ہے"[4] حریص آدمی اس لیے ہمیشہ غم میں کڑھتا رہتا ہے کہ یہ نہیں ملا، وہ نہیں ملا، فلاں کے پاس یہ ہے

---

[1] صحیح مسلم باب تحریم الظلم۔ [2] صحیح ابن حبان و مستدرک حاکم [3] ابوداؤد و حاکم [4] صحیح ابن حبان و ابوداؤد کتاب الجہاد باب الجرأۃ والجبن۔

میرے پاس نہیں۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حرص کو ہمیشہ غم اور کڑھن میں رکھنے والی فرمایا۔ نسائی میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "ایمان اور حرص ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے"[1] سبب ظاہر ہے کہ ایمان کامل کا نتیجہ صبر، توکّل اور قناعت ہے اور حرص کا نتیجہ بے اطمینانی، بے صبری اور ہوس ہے۔ ایک دفعہ بُرائی کے لہجہ میں فرمایا کہ "انسان بوڑھا ہوتا ہے مگر اس کی دو چیزیں جوان رہتی ہیں جینے کی خواہش اور مال کی حرص"[2] کئی صحابیوں کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "دو بھیڑیئے جو بکریوں کے جھنڈ میں چھوڑ دیئے جائیں وہ ان کو اتنا برباد نہیں کرتے جتنی مال اور جاہ کی حرص انسان کے دین و ایمان کو برباد کر دیتی ہے"[3]

---

[1] نسائی۔ [2] ترمذی۔ [3] ترمذی و صحیح ابن حبان و طبرانی و ابو یعلی و بزار (منذری ۲ صفحہ ۲۳۸)۔

بے ایمانی

دنیا کی ہر شریعت اور قانون کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ ہر شخص کی چیز اسی کی ملکیت ہے اور وہی اس میں تصرف کا حق رکھتا ہے کسی دُوسرے کو حق نہیں کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر اس کی ملکیت سے فائدہ اٹھائے۔ اسی اصول کی بنا پر ہر شخص کی ملکیتیں محفوظ اور مامون ہیں اور دنیا کے امن کا نظام قائم ہے۔ اب جو کوئی حق کے بغیر چوری سے یا دھوکے سے یا زبردستی سے کسی کی ملکیت پر قبضہ جمانا چاہتا ہے وہ فطرت کے نظام عدل کو درہم برہم کرنا چاہتا ہے۔ اسلام نے اس نظامِ عدل کو اصول کی حیثیت سے ایک ہی مختصر سی آیت میں بیان کر دیا ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (النساء: ۲۹)	اے ایمان والو! آپس میں ایک دُوسرے کے مال کو ناحق طریقہ سے مت کھاؤ۔

اس آیت نے ان تمام طریقوں کا جو ایمانداری کے خلاف ہیں اور جن کی جزئیات کی کوئی حد نہیں ہے چار لفظوں میں خاتمہ کر دیا ہے یعنی خواہ کسی کی چیز کوئی دھوکے اور فریب سے لے یا زور و ظلم سے لے یا غصب کرے یا چوری کرے یا اس میں خیانت کرے، رشوت لے، سود کھائے غرض جس ناجائز طریق سے بھی کوئی دوسرے کا مال لے اس آیت کے عموم اور اطلاق کے اندر وہ داخل ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے ہم (مسلمانوں) پر ہتھیار اُٹھایا اور جس نے ہم (مسلمانوں) کو دھوکا دیا وہ ہم (مسلمانوں) سے نہیں ہے[1]" جان اور مال معاملات میں دو اہم چیزیں ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مختصر سے فقرہ نے دونوں کی حفاظت کی اہمیت بتا دی۔

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بازار سے گذر رہے تھے کہ ایک جگہ غلہ کا ایک ڈھیر پڑا دیکھا آپ نے اس میں ہاتھ ڈالا تو معلوم ہوا کہ اندر بھیگا اور باہر سُوکھا ہے۔ آپ نے غلہ والے سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ عرض کی کہ بارش سے بھیگ گیا ہے۔ فرمایا "تو پھر اس کو اُوپر کیوں نہیں رکھا کہ لوگ دیکھ لیں۔ جو دھوکا دے وہ مجھ سے نہیں ہے[2]" یعنی رسُول سے اس کا تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔

ارشاد ہُوا "جو بے وجہ کسی مسلمان کا مال لینے کے لئے جھُوٹی قسم کھائے گا وہ خدا سے ملے گا تو خدا اس پر غضبناک ہوگا[3]"۔ ایک دفعہ ایک معاملہ میں ایک شخص نے اسی طرح کی قسم کھانا چاہی تو آپ نے فرمایا "اگر اس نے قسم کھالی تاکہ وہ ظلم سے مال لے لے تو خدا سے جب وہ ملے گا تو خدا اس سے منہ پھیر لے گا[4]"۔

کسی کے مال وجائداد پر زبردستی قبضہ کر لینے کو "غصب" کہتے ہیں۔ غصب کر لینا ظالمانہ فعل ہے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کے قصہ میں ایک بادشاہ کا ذکر ہے۔ جو غریب مچھیروں کی کشتیاں زبردستی چھین لیتا تھا۔ حضرت خضرؑ نے فرمایا:

اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ	وہ جو کشتی تھی سو کچھ غریبوں کی تھی جو دریا
يَعْمَلُوْنَ فِى الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ	میں محنت کرتے تھے۔ تو میں نے چاہا

---

[1] صحیح مسلم کتاب الایمان باب من حمل علینا السلاح فلیس منا۔ [2] صحیح مسلم کتاب الایمان باب من غش فلیس منا۔
[3] و [4] صحیح مسلم کتاب الایمان باب من قطع حق مسلم۔

أَعِيبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُم مَّلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا ۝ (الکہف: ۷۹)

کہ اس میں کچھ عیب کردوں اور ان کے پرے ایک بادشاہ تھا جو ہر کشتی کو چھین لیتا تھا۔

یہ ایک ایسی کھلی ہوئی بُرائی تھی کہ اس کا بیان کر دینا ہی کافی تھا۔ اس بُرائی کو بُرائی کہنے کی بھی ضرورت نہ تھی۔

حضرت سعید بن زیدؓ صحابی روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جو کوئی کسی کی ایک بالشت بھر زمین بھی دبائے گا طوقہ اللہ فی سبع ارضین[1] تو اس کو زمین کے ساتوں طبقوں میں سے ہر ایک سے اتنے حصہ کے اٹھانے کو کہا جائے گا" اس حدیث کا یہ مطلب ہے کہ اس کے گلے میں زمین کے یہ ساتوں طبق ہار کی طرح ڈالے جائیں[2] گے۔

بے ایمانی کی سب سے عام قسم وہ ہے جو مقدمہ بازی سے متعلق ہے۔ کتنے لوگ ہیں جو وکیلوں کی قوتِ بیان اور حکام کے ناجائز فیصلوں کے زور سے غیروں کی ملکیت پر زبردستی قبضہ کر لیتے ہیں حالانکہ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ ان کی چیز نہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "فریقین میں سے کوئی ایک زیادہ زبان آور ہوتا ہے اور وہ اپنے دعویٰ کو خوبی سے بیان کرتا ہے اور میں اس کے حق میں فیصلہ دے دیتا ہوں۔ اگر میں نے اس کو کوئی ایسی چیز دلا دی جو اس کی نہیں تو وہ خود نہ لے کیونکہ میں نے اس کو آگ کا ٹکڑا دیا ہے[3]"

بعض ایسے بے ایمان ہوتے ہیں جو یہ دیکھ کر کہ دوسرا فریق گو حق پر ہے مگر اس کے پاس

---

[1] صحیح مسلم باب تحریم الظلم وغصب الارض، یہ عبارت کئی طرح سے ہے۔ فی سبع ارضین من سبع ارضین الی سبع ارضین۔ [2] شرح نووی بر مسلم حدیث مذکور۔ [3] ابوداؤد کتاب الاقضیہ۔

ثبوت کی شہادت یا کوئی تحریری دستاویز نہیں اپنا مقدمہ حاکم کے پاس لے جا کر فریق کے دعوے کو بے ثبوت ٹھہراتے اور اپنے ذمہ سے اس کے واجبی مطالبہ کو ساقط کرا دیتے ہیں:

وَلَا تَأْكُلُوٓا۟ أَمْوَٰلَكُم بَيْنَكُم	اور آپس میں ایک دوسرے کا مال
بِٱلْبَٰطِلِ وَتُدْلُوا۟ بِهَآ إِلَى ٱلْحُكَّامِ	ناجائز طریقہ سے مت کھاؤ اور نہ پہنچاؤ
لِتَأْكُلُوا۟ فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَٰلِ	حاکموں تک اس کا معاملہ تاکہ کھا جاؤ
ٱلنَّاسِ بِٱلْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝	لوگوں کا کچھ مال گناہ سے اور تم
(البقرۃ: ۱۸۸)	جان رہے ہو۔

یعنی تم کو معلوم ہے کہ تمہارا دعویٰ اور تمہارے مطابق حاکم کا فیصلہ غلط ہے۔ اسی طرح کمزوروں کو بے بس سمجھ کر یا اپنے بس میں پا کر ان کا مال خلافِ انصاف نہیں کھانا چاہیے۔ جو ایسا کرتا ہے وہ اپنے پیٹ میں انگارے بھرتا ہے:

إِنَّ ٱلَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَٰلَ	بے شک جو یتیموں کا مال ظلم سے کھا
ٱلْيَتَٰمَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ	جاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ
فِى بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ وَسَيَصْلَوْنَ	کھاتے ہیں۔ اور اب وہ آگ میں بیٹھیں
سَعِيرًا ۝ (النساء: ۱۰)	گے۔

چوری

کسی کی رکھی ہوئی چیز اس کی اجازت کے بغیر چھپا کر لے لینے کی سب سے کمینہ حرکت کا نام چوری ہے۔ اسی لیے اس کی سزا بھی بڑی رکھی گئی ہے یعنی ہاتھ کاٹ ڈالنا:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوٓا	اور جو کوئی چور ہو مرد ہو یا عورت ان
أَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا	کے ہاتھ کاٹ ڈالو، سزا ان کی کمائی
مِّنَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ○	کی تنبیہ اللہ کی طرف سے۔ اور اللہ
(المائدۃ:۳۸)	ہے زور آور حکمت والا۔

چوری کی برائی کی وجہ یہی نہیں ہے کہ چور دوسرے کے مال کو اس کی اجازت کے بغیر چپکے سے اپنے تصرف میں لے آتا ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ ایک شخص اپنی جائز محنت سے کما کر جو حاصل کرتا ہے دوسرا بغیر کسی جائز محنت کے بے وجہ اس پر قبضہ کر کے پہلے کی محنت کو اکارت کر دیتا ہے۔ اگر اس کی روک تھام نہ کی جائے تو کسی کو اپنی محنت کا پھل نہ ملے۔ اس کے علاوہ اس ایک برائی میں کتنی برائیاں شامل ہیں۔

بے وجہ دوسرے کے گھر میں داخل ہونا اور اس کی ملکیت کا جائزہ لینا مرتکب فعل کے خبثِ باطن کو ظاہر کرتا ہے۔ پھر اس کی بدولت ناحق خون بھی بہتا ہے۔ اور بے گناہ جانیں بھی

ضائع جاتی ہیں۔ اور چونکہ چور بڑے بڑے سرمایہ پر کسی جائز محنت کے بغیر قبضہ پالیتا ہے اس لیے وہ اس کو بڑی بے دردی سے ضائع کر دیتا ہے اور خود بھی اُس سے بہت کم فائدہ اٹھاتا ہے۔ بلکہ اس دولت کا بڑا حصّہ اخفائے جُرم کی خاطر برباد کر ڈالتا ہے۔

اہل عرب میں شاید عام افلاس کے سبب سے یہ بیماری اتنی پھیلی تھی کہ اسلام نے اس کے انسداد کے لئے مسلمان ہونے والوں سے اس کی بیعت لینی بھی ضروری سمجھی سورۂ ممتحنہ میں ان چند باتوں کا ذکر ہے جن کا عہد مسلمان ہونے والی بیبیوں سے لیا جاتا تھا، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ "وہ چوری نہ کریں گی"۔[1] فتح مکّہ کے دن جب مکّہ کی خواتین اسلام قبول کرنے آئیں تو آپؐ نے ان سے بھی اس کا عہد لیا۔ اس موقع پر ابوسفیان کی بی بی ہند نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ "یا رسول اللہؐ! ابوسفیان بخیل آدمی ہیں، وہ میرے اور میرے بچّوں کے لیے پورا خرچ نہیں دیتے مگر یہ کہ میں ان کے مال سے کچھ چھپا کر لے لوں"؟ فرمایا "تم ان کے مال سے اتنا لے لیا کرو جو انصاف اور دستور کے مطابق تمہارے اور تمہارے بچوں کے لیے کافی ہو"۔[2] اس روایت سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ اسلام کا جوش مسلمانوں میں ایک اخلاقی انقلاب پیدا کر دیتا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہند کو اتنی صفائی کے ساتھ اپنے گھر کا بھید کھولنے کی حاجت نہ تھی۔ دوسری یہ کہ جس کا نفقہ ہمارے ذمّہ ہے اگر ہم اس کو ادا نہ کریں اور وہ حسب ضرورت ہم سے پوچھے بغیر ہمارے حساب سے کچھ لے لے تو یہ چوری نہیں۔

یہ عہد صرف عورتوں ہی سے نہیں بلکہ مسلمان مردوں سے بھی آپؐ نے لیا ہے۔ حضرت عبادہ بن صامتؓ صحابی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے۔

---

[1] الممتحنہ: ۱۲ [2] صحیح بخاری کتاب النفقات۔

آپؐ نے فرمایا ہم سے عہد کرو کہ تم شرک، چوری اور بدکاری نہ کرو گے۔" پھر آیت پڑھی۔" جو کوئی یہ عہد پورا کرے گا تو اس کی مزدوری خدا کے ذمّہ ہے اور جو ان میں سے کسی ایک کا مرتکب ہوا اور اس کی سزا اس کو دے دی گئی تو اس کے اس گناہ کا کفارہ ہو گیا۔ اور اگر کسی نے ان میں سے کسی ایک کا ارتکاب کیا اور خدا نے اس کو چھپا دیا تو اس کی بخشش خدا کے ہاتھ میں ہے، چاہے معاف کرے چاہے سزا دے [1]۔"

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چور پر لعنت بھیجی۔ فرمایا اللہ تعالیٰ چور پر لعنت کرے کہ ایک معمولی خود یا رسّی چراتا ہے پھر اس کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔

چوری کا گناہ بھی بندہ اسی لیے کرتا ہے کہ وہ خدا کے حاضر و ناظر ہونے پر یقین نہیں رکھتا یا کم از کم یہ کہ فعل کے ارتکاب کے وقت اس کا یقین ماند پڑ جاتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ جب بندے نہیں دیکھتے تو خدا بھی ہم کو نہیں دیکھتا۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جب چور چوری کرتا ہے تو اس میں ایمان نہیں رہتا [2]۔"

حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں فرمایا کہ "تم میں سے ہر ایک کا مال دوسرے پر حرام ہے مگر حق کے ساتھ [3]۔" یعنی جس کا مال ہو اس کی خوشی اور اجازت سے لو یا اس کا کوئی کام کر کے معاوضہ میں حاصل کرو۔ یہی بات قرآن پاک کی اس آیت میں فرمائی گئی:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ ۚ (النساء:۲۹)	اے ایمان والو! تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق سے مت کھاؤ لیکن یہ کہ لین دین ہو آپس کی خوشی سے۔

---

[1] و [2] و [3] صحیح بخاری کتاب الحدود۔

یہ آیت ایک اصولی حیثیت رکھتی ہے جس میں ہر اُس مال کو حرام بتایا گیا ہے جو کسی سے جائز طریق سے حاصل نہ کیا گیا ہو۔

عرب میں قبیلہ مخزوم کی ایک عورت تھی جو لوگوں سے چیزیں عاریت لے کر مکر جاتی تھی۔ یہ مقدمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا تو آپؐ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ یہ بڑے گھرانے کی عورت تھی۔ اچھے اچھے لوگوں نے اس کی سفارش کی تو آپؐ نے فرمایا تم سے پہلے قومیں اس لیے تباہ ہوئیں کہ جب معمولی لوگ قصور کرتے تو ان کو سزائیں دیتیں اور جب کوئی معزز آدمی وہی کام کرتا تو اس کو چھوڑ دیتیں۔ خدا کی قسم اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی یہ کام کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹتا۔[1]

ایک صحابی ایک چادر سرہانے رکھ کر سو رہے تھے۔ ایک چور آیا اور اس نے چالاکی سے ان کے سرہانے سے اس کو کھینچ لیا۔ وہ پکڑ کر لایا گیا تو صحابی موصوف نے آکر سفارش کی کہ "یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ چادر صرف تیس درہم کی تھی۔ کیا تیس درہم کے لیے اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا؟ میں نے یہ چادر اس کے ہاتھ بیچ دی اور قیمت اس کے ذمہ رہی"۔ آپؐ نے فرمایا "مجھ تک معاملہ آنے سے پہلے تم نے یہ کیوں نہیں کر لیا۔"[1]

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں مصروف تھے کہ عین نماز کی حالت میں آپؐ کو جنت اور دوزخ کا نقشہ دکھایا گیا۔ نماز سے فارغ ہو کر آپؐ نے فرمایا کہ میں نے دوزخ میں اس کو بھی دیکھا جو اپنی آنکڑی سے حاجیوں کا سامان چرا لیتا تھا اور اگر مالک ہوشیار ہو جاتا تو کہہ دیتا تھا کہ اتفاق سے اس میں پھنس کر چلا آیا اور اگر وہ بے خبر رہتا تو لے جاتا تھا۔ آپؐ نے فرمایا میں نے اس کو دیکھا کہ وہ دوزخ میں اپنی آنتیں گھسیٹتا پھرتا تھا۔[2]

---

[1] ابوداؤد کتاب الحدود۔ [2] صحیح مسلم باب صلوٰۃ الکسوف۔

ناپ تول میں کمی بیشی

چوری کی عام قسم تو وہی ہے جس کو سرقہ کہتے ہیں اور جس کی پاداش میں چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم شریعت نے دیا ہے اور جس کی بُرائی ہر مذہب اور اخلاقی مسلک نے یکساں کی ہے۔ لیکن اسلام کی تکمیلی تعلیم یہ ہے کہ اس نے نازک سے نازک ناجائز معاملوں کی بھی جن کو عام طور سے چوری نہیں سمجھا جاتا تشریح کی اور ان کی بُرائیوں کی تشہیر کی ہے اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عملی تعلیموں سے ان کی اہمیت کو ظاہر فرمایا اور ان سے بچنے کی تاکید کی ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے اہم چیز ناپ تول کی کمی بیشی ہے جس سے ہر شخص کو ہر وقت کام پڑتا ہے اور جس میں خاص طور سے تاجر اور بیوپاری مبتلا رہتے ہیں اور جس سے سب سے زیادہ غریبوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فطری قوانین میں سے ایک بڑا قانون عدل ہے جس کا منشا یہ ہے کہ جس کی جو چیز ہو وہ اس کو دے دی جائے۔ یہی وہ میزان یعنی ترازو ہے جسے خدا نے دنیا میں قائم کیا ہے اور جس سے تول تول کر ہر شخص کو اس کا حق دینا چاہیئے۔ جو شخص دُوسرے کا جو حق ہے اس کو نہیں دیتا یا دینے میں کمی کرتا ہے وہ اس ترازو سے کام نہیں لیتا ہے۔ فرمایا:

وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ۝ اور آسمان کو اونچا کیا اور ترازو رکھی کہ

أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ ○ وَأَقِيمُوا	مت زیادتی کرو ترازو میں اور انصاف
الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا	کے ساتھ سیدھی ترازو تولو اور مت
الْمِيزَانَ ○ (الرحمٰن: ۸-۹)	گھٹاؤ تول۔

اس ترازو سے انسان کا ہر قول و فعل تلتا ہے اور اسی کی برابری سے عالم کا نظام قائم رہتا ہے۔ ناپ تول میں کمی بیشی کرنا حقیقت میں دوسرے کے حق پر ہاتھ ڈالنا ہے۔ جو کوئی لینے میں تول کو بڑھاتا اور دینے میں گھٹاتا ہے وہ دوسرے کی چیز پر بے ایمانی سے قبضہ کرتا ہے، اور یہ بھی چوری ہی ہے۔ اسی لئے قرآن پاک میں اس سے بچنے کی خاص طور تاکیدیں آئی ہیں حضرت شعیبؑ کی قوم سوداگری کرتی تھی، اسی لیے ان کی دعوت میں ناپ تول میں ایمان داری کی تاکید بار بار کی گئی ہے حضرت شعیبؑ سمجھاتے ہیں:

أَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ	اور پورا بھر دو ناپ اور نہ ہو نقصان
الْمُخْسِرِينَ ○ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ	دینے والے اور تولو سیدھی ترازو سے
الْمُسْتَقِيمِ ○ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ	اور مت گھٹا کر دو لوگوں کو ان کی
أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ	چیزیں۔ اور مت پھرو ملک میں فساد
مُفْسِدِينَ ○ (الشعراء: ۱۸۱-۱۸۳)	پھیلاتے۔

یہی حضرت شعیبؑ مدین والوں کو سمجھا کر کہتے ہیں جو مشرق و مغرب کے تجارتی قافلوں کے رہ گذر میں آباد تھے:

وَلَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ	اور ناپ اور تول میں کمی نہ کرو میں
إِنِّي أَرَاكُمْ بِخَيْرٍ وَإِنِّي أَخَافُ	تم کو آسودگی میں دیکھتا ہوں اور
عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُحِيطٍ ○	ایک گھیر لینے والے دن کی آفت کو

وَيٰقَوْمِ اَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ○

(هود: ۸۴-۸۵)

تم پر ڈرتا ہوں - اور اے میرے لوگو! ناپ اور تول کو انصاف سے پورا کرو اور لوگوں کی چیزیں ان کو گھٹا کر مت دو اور ملک میں فساد پھیلاتے مت پھرو۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ ناپ تول کی بے ایمانی سے خیر و برکت جاتی رہتی ہے یا ظاہری نظر سے دیکھئے تو یوں کہیئے کہ بازار میں ایسے لوگوں کی جو ناپ تول میں کمی بیشی کرتے ہیں ساکھ جاتی رہتی ہے اور یہ بالآخر اُن کے بیوپار کی تباہی کا باعث بن جاتا ہے۔ یہ چاہتے تو یہ ہیں کہ اس بے ایمانی سے کچھ اپنا سرمایہ اور نفع بڑھالیں گے مگر ہوتا یہ ہے کہ ان کی یہ اخلاقی بُرائی ان کی اقتصادی اور معاشی بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی یہی نصیحت پھر سورۃ اعراف میں دہرائی گئی ہے۔

فَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○

تو ناپ اور تول پوری کرو اور مت گھٹا دو لوگوں کو ان کی چیزیں۔ اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد خرابی مت ڈالو۔ یہ تمہارے لیے بھلا ہے اگر تم کو یقین ہو۔

(الاعراف: ۸۵)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ حضرت شعیبؑ کی یہ پُرانی تعلیم پھر زندہ ہوئی اسلام میں جن چیزوں کو حرام ٹھہرایا گیا ہے اس کے بعد ہے:

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ	اور ناپ اور تول کو پورا کرو۔

(الانعام: ۱۵۲)

سورۂ بنی اسرائیل میں جو اخلاقی نصیحتیں فرمائی گئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے:

وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا	اور جب تم ناپو تو ناپ پورا بھر دو
بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ذٰلِكَ	اور سیدھی ترازو سے تولو۔ یہ بہتر ہے
خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ۝	اور اس کا انجام اچھا ہے۔

(بنی اسرائیل: ۳۵)

آیت کا آخیر ٹکڑا بتاتا ہے کہ بے ایمانی کی ناپ تول گو شروع میں کتنا ہی فائدہ پہنچائے مگر آخر کار وہ بیوپار کی تباہی کا باعث ہو کر رہتی ہے۔

خوب غور کر کے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس بداخلاقی کے پیدا ہونے کا اصلی سبب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے دلوں سے یہ یقین گم ہو جاتا ہے کہ اُن کے اس چھپے ہوئے کرتوت کی دیکھنے والی آنکھیں ہر وقت کھلی ہیں اور ایک دن آئے گا جب ان کو خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے ہر کام کا حساب دینا ہوگا۔ سورۂ مطففین میں جہاں اس بداخلاقی کی ممانعت کی گئی ہے اس بیماری کا یہ علاج بھی بتایا گیا ہے۔ فرمایا:

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ	خرابی ہے ان گھٹا کر دینے والوں کی
اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ	جو اوروں سے جب ناپ کر لیں تو
يَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَاِذَا كَالُوْهُمْ	پورا لیں اور جب ان کو ناپ یا تول
اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝ اَلَا	کر دیں تو گھٹا دیں۔ کیا ان کو یہ خیال
يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝	نہیں کہ ایک بڑے بھاری دن

لِيَوۡمٍ عَظِيۡمٍۙ يَّوۡمَ يَقُوۡمُ النَّاسُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَؕ

(المطفّفين : ۵-۶)

کے لیے ان کو اٹھایا جائے گا جس دن سب لوگ دنیا کے مالک کے لیے کھڑے ہوں گے۔

چھپا کر لینا

جو سامان واسباب کئی آدمیوں میں ابھی تک مشترک ہو اور وہ بانٹ کر علیحدہ علیحدہ نہ کیا گیا ہو اس میں سے کوئی چیز دُوسرے ساجھیوں سے چھپا کر لے لینا غلول کہلاتا ہے مگر زیادہ تر مالِ غنیمت میں جو بددیانتی اور چوری کی جائے اُس کو کہتے ہیں۔ غنیمت کا مال کوئی بھی لُوٹے مگر وہ سارے سپاہیوں کا حصّہ ہے۔ جب تک امیر باقاعدہ بانٹ کر ہر ایک کا حصّہ الگ الگ نہ کر دے یا کسی کو خاص طور سے لے لینے کی اجازت نہ دے دے اس میں سے کچھ چھپا کر لے لینا غلول ہے۔ اور یہ ایسی بُرائی ہے جس میں بددیانتی اور چوری دونوں ملی ہُوئی ہیں۔

اس فعل کے مرتکب کو خیال یہ ہوتا ہے کہ جب اس مشترک چیز میں ہر ایک کا حصّہ ہے تو اس میں کسی کا کچھ لے لینا جائز ہونا چاہئے۔ لیکن یہ نکتہ نگاہ سے اوجھل ہو جاتا ہے کہ جب تک وہ تقسیم نہیں ہُوا ہے اس میں ہر ایک کا برابر برابر حصّہ ہے اور ان سب کی اجازت کے بغیر وہ کسی کے لیے حلال نہیں ہو سکتا۔ دُوسری بات یہ ہے کہ جب کوئی اس میں سے کوئی چیز چھپا کر لیتا ہے تو گویا اس کا ضمیر اس کو بتاتا ہے کہ یہ اس کی تنہا ملکیت نہیں اسی لئے وہ دوسروں سے چھپا کر چوری کا ارتکاب کرتا ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ کسی چیز کو چھپا کر لے لینے سے اس کا یہ مقصد بھی ہوتا ہے کہ وہ دوہرا حصّہ پائے کہ ایک تو بے قاعدہ چھپا کر چوری سے لے اور دُوسرا باقاعدہ بانٹ سے

پائے اور یہ صریح بے ایمانی ہے۔

قرآنِ پاک نے تصریح کی ہے کہ سپاہی تو سپاہی امیرِ عسکر بھی یہ حرکت کرے تو وہ بھی گنہگار ٹھہرے گا۔ اور چونکہ انبیاء علیہم السلام بھی امیر ہوتے ہیں اور وہ گناہوں سے مبرّا ہوتے ہیں اس لیے ان کی نسبت تو کسی کو یہ وہم بھی نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ اس کا ارتکاب کریں گے۔ فرمایا:

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَّغُلَّ ۚ (آل عمران: ۱۶۱)

اور کسی نبی کی یہ شان ہی نہیں کہ وہ غنیمت میں سے چھپا کر لے لے۔

پھر فرمایا:

وَمَنْ يَّغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○ (آل عمران: ۱۶۱)

اور جو کوئی غنیمت کا مال چھپا کرے گا تو قیامت کے دن اپنا چھپایا مال لے کر آئے گا۔ پھر ہر کوئی اپنا کمایا پورا پورا پائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

غزوہ خیبر کے مالِ غنیمت میں سے مدعم نام ایک غلام نے ایک شملہ چرایا تھا۔ خیبر سے چل کر جب لوگ وادی القریٰ پہنچے تو ایک ناگہانی تیر اُس غلام کو آ کر ایسا لگا کہ اس کا کام ہی تمام ہو گیا۔ مسلمانوں نے کہا کہ اس کو جنت مبارک ہو۔ یہ سُن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے جس شملہ کو اس نے خیبر میں تقسیم سے پہلے لے لیا تھا وہ اس پر آگ کا شعلہ ہو رہا ہے"۔ لوگوں نے یہ سُنا تو یہ اثر ہوا کہ ایک شخص نے جوتے کا تسمہ لیا تھا اس کو بھی لا کر سامنے ڈال دیا۔ یہ دیکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یہ آگ کا تسمہ ہے"[1] "آگ کا ہے"

---

[1] ابو داؤد کتاب الجہاد، باب فی تعظیم الغلول۔

خیبر میں ایک اور واقعہ یہ گذرا کہ ایک مسلمان نے وفات پائی۔ جب اس کا جنازہ تیار ہوا تو آپؐ سے عرض کیا گیا۔ آپؐ نے فرمایا "تم لوگ اپنے بھائی کے جنازہ کی نماز پڑھ لو" یہ سن کر لوگوں کے چہروں کا رنگ بدل گیا اور سمجھے کہ کوئی بات ہے۔ یہ دیکھ کر آپؐ نے فرمایا "تمہارے بھائی نے مال غنیمت کی ایک چیز چھپا کر لی ہے" صحابہ کہتے ہیں کہ ہم نے اس کے اسباب کی تلاشی لی تو چھوٹے موتیوں کا ایک ہار نکلا جو چند آنوں سے زیادہ کا نہ تھا۔[1]

قاعدہ یہ تھا کہ جب لڑائی ختم ہو چکتی تو حضرت بلالؓ تین بار منادی کرتے سب لوگ اپنا اپنا مال غنیمت لے کر آتے۔ پھر اس میں سے پانچواں حصہ نکالا جاتا اور اس کے بعد بانٹ دیا جاتا۔ اس کے بعد جو لے کر آتا وہ قبول نہ ہوتا اور وہ مجرم قرار پاتا بلکہ کبھی سزا کے طور پر اس کا سارا سامان جلا دیا جاتا۔ ایک دفعہ اسی طرح تقسیم وغیرہ کے بعد ایک شخص بالوں کی ایک لگام لے کر آیا اور عرض کی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہم نے لوٹا تھا، فرمایا "کیا تم نے بلالؓ کی تین دفعہ منادی نہیں سنی تھی؟" اس نے کہا سنی تھی، پوچھا "پھر اس وقت کیوں لے کر نہیں آئے" اس نے معذرت کی۔ فرمایا "تم اس کو قیامت میں لے کر آنا میں نہیں قبول کرتا"[2]

عمال کو ہدایت کی گئی کہ ان کو جو ملے اس کو مسلمانوں کے بیت المال میں لا کر پیش کریں۔ فرمایا "اے لوگو! جو ہمارے کسی کام پر مقرر ہو وہ ایک سوئی بھی چھپا کرے گا تو وہ "غلول" ہے وہ اس کو قیامت کے دن لے کر آئے گا"[3]

---

[1] و [3] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی تعظیم الغلول۔

[2] سنن ابی داؤد کتاب الاقضیہ۔

رشوت

کسی کے مال سے ناجائز طریقے سے فائدہ اٹھانے کی ایک عام صورت رشوت ہے۔ رشوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی اپنی باطل غرض اور ناحق مطالبہ کے پورا کرنے کے لیے کسی ذی اختیار یا کارپرداز شخص کو کچھ دے کر اپنے موافق کر لے[1]۔

پہلے عرب کے کاہن اپنی مفروضہ غیبی طاقت کی بنا پر بعض مقدموں کے فیصلے کرتے تھے۔ اہل غرض ان کو اس کے لیے مزدوری یا رشوت کے طور پر کچھ نذرانہ دیتے تھے اس کو حلوان (مٹھائی) کہتے تھے۔ اسلام آیا تو اوہام کا یہ دفتر ہی اڑ گیا اس پر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کاہن کے حلوان کی خاص طور سے ممانعت فرمائی[2]۔

عرب میں یہودیوں کے مقدمے ان کے احبار اور رئیس فیصل کرتے تھے اور چونکہ دولت اور تمول نے ان میں اونچے نیچے طبقے قائم کر دیئے تھے اس لئے وہ قانون کی ناہمواری کے دل سے خواہشمند رہتے تھے۔ قانون کی زد سے بچنے کے لیے علانیہ رشوت دیتے تھے اور ان کے کاہن اور قاضی علانیہ لیتے تھے اور ایک کا حق دوسرے کو دلا دیتے تھے اور اس ذریعہ سے توراۃ کے احکام پر مصالح و ضرورت کے اقتضا سے پردہ ڈال دیتے تھے[3]۔ چنانچہ توراۃ کے قوانین میں تحریف

---

[1] مجمع البحار علامہ فتنی۔ [2] ترمذی باب ماجاء فی کراہیۃ مہر البغی۔ [3] صحیح بخاری رجم زانی۔

کا ایک بڑا سبب یہی رشوت خوری تھی قرآن مجید کی اس آیت میں اُن کے اسی گناہ کی پردہ دری کی گئی ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلَ	خدا نے کتاب سے جو اُتارا اُس کو جو
اللّٰهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ	چھپاتے ہیں اور اس کے ذریعہ معمولی
بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ مَا	معاوضہ حاصل کرتے ہیں وہ اپنے
يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ	پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں، خدا ان سے
وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ	قیامت کے دن بات نہ کرے گا
وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ	نہ اُن کو پاک صاف کرے گا اور
أَلِيمٌ ○	اُن کے لیے دردناک عذاب ہے۔

(البقرة: ۱۷۴)

"پیٹ میں آگ بھرنا" اس لئے فرمایا کہ یہود دنیا کی اس معمولی دولت کے لالچ میں آکر خدا کے احکام میں ردوبدل اور منشائے الٰہی میں تحریف پیٹ ہی کی خاطر کرتے تھے۔ اس لیے یہی سزا ان کو ملے گی۔ ابن جریر نے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ یہودی رئیس اپنے علماء کو اس لئے رشوتیں دیتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جو اوصاف توراۃ میں ہیں وہ عام لوگوں کو نہ بتائیں لیکن قرآن پاک کے نظم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ احکام الٰہی میں عام طور سے ردوبدل کیا کرتے تھے اور اس کے ذریعہ سے دنیا کی دولت کماتے تھے چنانچہ سورۂ مائدہ میں ان کی اس حرام خوری کا ذکر دو دفعہ ہے۔ فرمایا:

وَتَرَىٰ كَثِيرًا مِنْهُمْ يُسَارِعُونَ	اور تو اُن میں سے بہتوں کو دیکھے کہ
فِي الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَأَكْلِهِمُ	وہ گناہ اور زیادتی، اور حرام کھانے

السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ○ (المائدة: ۶۲-۶۳)

پر دوڑتے ہیں، کیا برے کام ہیں جو وہ کرتے ہیں۔ ان کے درویش اور عالم ان کو گناہ کی بات کہنے اور حرام کھانے سے کیوں نہیں روکتے۔ کیا بُرے کام ہیں جو وہ کرتے ہیں۔

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ (المائدة: ۴۲)

جھوٹ کے بڑے سننے والے اور حرام کے بڑے کھانے والے۔

قرآن پاک کی ایک آیت جو پہلے گذر چکی ہے یہاں پر بھی استدلال کے قابل ہے:

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○ (البقرة: ۱۸۸)

اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق سے مت کھاؤ اور نہ مال کو حاکموں تک پہنچاؤ تاکہ لوگوں کے مال کا کچھ حصہ گناہ سے کھا جاؤ اور تم جان رہے ہو۔

یہ آیت اپنے اس ترجمہ کے لحاظ سے جس کو بعض مفسروں نے اختیار کیا ہے رشوت کی ممانعت میں صاف وصریح ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے[1]۔ رشوت دینے والے پر یوں کہ وہ جرم کی اعانت کرتا ہے اور جرم کی اعانت قانون

[1] ابو داؤد کتاب الاقضیہ۔

اور اخلاق دونوں میں منع ہے۔

خیبر کے یہودیوں سے زمین کی آدھے آدھ پیداوار پر مصالحت ہوئی تھی۔ جب پیداوار کی تقسیم کا وقت آتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عبداللہ بن رواحہؓ صحابی کو بھیجتے۔ وہ ایمانداری سے پیداوار کے دو حصے کر دیتے تھے اور کہہ دیتے تھے کہ ان دو میں سے جو چاہو لے لو۔ یہودیوں نے اپنے دستور کے مطابق ان کو بھی رشوت دینی چاہی۔ آپس میں چندہ کر کے اپنی عورتوں کے کچھ زیور اکٹھے کئے اور کہا کہ یہ قبول کرو اور اس کے بدلے تقسیم میں ہمارا حصہ بڑھا دو۔ یہ سُن کر حضرت ابن رواحہؓ نے فرمایا "اے یہودیو! خدا کی قسم تم خدا کی ساری مخلوق میں مجھے مبغوض ہو لیکن یہ مجھے تم پر ظلم کرنے پر آمادہ نہیں کر سکتا۔ اور جو تم نے رشوت پیش کی ہے وہ حرام ہے ہم مسلمان اس کو نہیں کھاتے" یہودیوں نے ان کی یہ تقریر سُن کر کہا کہ "یہی وہ (انصاف) ہے جس سے آسمان و زمین قائم ہیں"[1]

اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمّال کو رعایا سے ہدیہ اور تحفہ قبول کرنے کی ممانعت فرمائی[2] ایک دفعہ ایک عامل نے آکر کہا کہ یہ صدقہ کا مال ہے اور یہ مجھے ہدیہ ملا ہے۔ یہ سُن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر کھڑے ہو کر تقریر کی۔ حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

عامل کا کیا حال ہے کہ ہم اس کو بھیجتے ہیں تو آکر کہتا ہے کہ یہ تمہارا ہے اور یہ میرا ہے۔ تو اپنے باپ یا ماں کے گھر میں بیٹھ کر نہیں دیکھتا کہ اس کو تحفے ملتے ہیں یا نہیں قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے وہ اس میں سے جو لے جائے گا وہ قیامت میں اپنی گردن پر لاد کر لائے گا اونٹ، گائے بکری جو ہو" پھر آپؐ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر تین بار فرمایا "خدا وندا میں نے پہنچا دیا"[3]

اس تقریر میں آپؐ نے جو کچھ فرمایا وہ غلول والی آیت کی تفسیر ہے۔

---

[1] موطا امام مالک کتاب المساقاۃ۔ [2] ابوداؤد کتاب الاقضیۃ و کتاب الجہاد۔ [3] صحیح بخاری باب ھدایا العمال۔

سُود خواری

سُود خواری حرص وطمع، بخل اور ظلم کا مجموعہ ہے۔ حرص وطمع تو یوں کہ سُود خوار اس سُود کے ذریعہ چاہتا ہے کہ ساری دولت سمٹ کر اس کے پاس آجائے۔ بُخل یوں کہ وہ کسی غریب مقروض کے ساتھ کوئی رعایت کرنا نہیں چاہتا اور نہ کسی کارِ خیر میں دے کر اپنے سرمایہ میں کچھ کمی پسند کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سُود خواری کا ذکر زکوٰۃ اور خیرات کے مقابلہ میں کیا ہے۔ اور ظلم یوں کہ وہ سُود اور سُود در سُود کے ذریعہ لوگوں کو ان کی محنتوں کے پھل سے محروم کر دیتا ہے اور رحم نہیں کرتا۔ اسی لئے سُود کی ممانعت کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے خاص طور سے فرمایا:

لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ○ (البقرۃ: ۲۷۹)

نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔

یعنی تم نے جتنا دیا ہے اُس سے زیادہ لو تو یہ تمہارا ظلم ہے اور جتنا تم نے دیا ہے اتنا تم کو نہ ملے تو یہ تم پر ظلم ہے۔ اس حرام خوری کی عادت بھی عرب میں یہودیوں کی بدولت پھیلی تھی۔ وہی سرمایہ کے مالک تھے اور غریب عرب کسان اور مزدور اکثر ان ہی سے سُودی قرض لیتے تھے۔ یہودیوں پر نعمتوں کا دروازہ جو بند کیا گیا اس کے اسباب کے بیان کے سلسلہ میں ہے:

وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا اور ان کے سُود لینے کے سبب سے

عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ؕ (النسآء: ۱۶۱)	حالانکہ وہ اس سے روکے گئے تھے اور لوگوں کے مال کو ناروا طریق سے کھانے کے سبب سے ۔

اسلام آیا تو اس نے سرمایہ داری کی اس لعنت کو جس سے دنیا دبی جارہی تھی ہمیشہ کے لئے دور کر دیا:

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِىْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِى الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ○ (البقرۃ: ۲۷۵-۲۷۶)	جو سُود کھاتے ہیں وہ ایسے اٹھیں گے جیسے وہ اٹھتا ہے جس کے شیطان نے لپٹ کر حواس کھو دیئے ہوں۔ یہ اس لئے کہ انہوں نے کہا کہ خرید و فروخت کا معاملہ سُود ہی کی طرح ہے ۔ اور اللہ نے خرید و فروخت کے معاملہ کو حلال اور سُود کو حرام کیا ہے تو جس کے پاس اس کے پروردگار کی نصیحت پہنچی اور وہ باز رہا تو اس کا ہے جو پہلے دیا گیا۔ اور اس کا معاملہ خدا کے سپرد ہے اور جو پھر ایسا کرے تو وہ دوزخی ہیں، وہ دوزخ میں رہیں گے۔ خدا سود کو مٹاتا اور صدقہ و خیرات کو بڑھاتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے گنہگار کو پیار نہیں کرتا۔

قیامت میں سُود خور کا بدحواس ہو کر اُٹھنا اس کی دنیاوی بدحواسی کی پوری تمثیل ہو گی۔ دنیا میں سُود خواروں کا یہی حال ہوتا ہے کہ وہ دن رات دُوسروں کے مال و دولت کے چھیننے اور اپنی دولت کو ناجائز طریقوں سے بڑھانے میں ایسے مشغول رہتے ہیں کہ انھیں کسی کارِ خیر کا خیال نہیں آتا تو قیامت میں بھی وہ ایسے ہی اپنے حواس کھوئے ہُوئے اُٹھیں گے۔ آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے سُود خواروں کو ناشُکر گنہگار ٹھہرایا ہے کیونکہ خدا نے جو دولت ان کو دی تھی اس کا تقاضا یہ تھا کہ اس سے وہ کارِ خیر کرتے، غریبوں کو دیتے، مستحقوں کو بانٹتے مگر انھوں نے اس کے بجائے غریبوں کو اور لوٹا، اور ظلم سے ان کی تھوڑی بہت پونجی کو بھی چھین لیا۔ اور یہ نعمت کی ناشکری تھی۔

یہودیوں کی دیکھا دیکھی عربوں میں بھی کچھ ایسے سرمایہ دار پیدا ہو گئے تھے جو سُودی کاروبار کرنے لگے تھے جیسے حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ اور بنو عمرو بن عمیر وغیرہ۔ اب وہ اور ان کے مقروض جب مسلمان ہُوئے اور ان میں سے قرضداروں نے مقروضوں سے پہلے کا سود مانگا تو اس پر یہ آیتیں اتریں جو پہلی ہی آیتوں کے سلسلہ میں ہیں :

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ	اے ایمان لانے والو! خدا کا خیال
وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ	کرو اور سود جو رہ گیا ہو اس کو چھوڑ دو
كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا	اگر تم واقعی مومن ہو۔ تو اگر تم ایسا نہ کرو
فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ	تو اللہ اور اس کے رسُول سے لڑائی
وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ	کے لیے ہشیار ہو جاؤ۔ اور اگر تم باز
لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۝	آؤ تو تمہارے لئے تمہارا اصل سرمایہ ہے
وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ	نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ کوئی تم پر ظلم کرے۔
اِلٰى مَيْسَرَةٍ ۭ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا	اگر وہ مقروض تنگدست ہو تو اس کو کشادگی

خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○
وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ
اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ
مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○
(البقرۃ: ۲۸۰-۲۸۱)

تک مہلت دو اور معاف کردینا تمہارے لئے سب سے اچھا ہے اگر تم کو سمجھ ہو اور اس دن سے ڈرو جس میں تم خدا کی طرف لوٹائے جاؤ گے پھر ہر کسی کو وہ پورا پورا دیا جائے گا جو اس نے کمایا اور ان کا کچھ دبایا نہ جائے گا۔

ان آیتوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک دن آئے گا جب سب خدا کے سامنے کھڑے کئے جائیں گے اور جس نے کسی کا مال ناحق کھایا ہوگا اس کا حساب ہوگا تو اگر تم نے نیکی کی ہوگی اور مقروضوں کو معاف کیا ہوگا تو خدا کے یہاں پورا پورا اجر مل جائے گا۔

جاہلیت میں ربا کی یہ صورت تھی کہ غریب کسان اگلی پیداوار کے موقع پر ادا کردینے کے وعدے پر مہاجنوں سے قرض لیتے تھے۔ جب فصل کا وقت آتا اور کسان ادا نہ کرسکتے تو مہاجن کہتے کہ ہم مدت بڑھا دیتے ہیں تم جنس کی مقدار بڑھا دو، مثلاً ایک روپیہ میں دس سیر کا وعدہ ہوتا تو ایک سال کی اور مہلت بڑھا کر بیس کردیتے اور اسی طرح جب تک وہ قرض ادا نہ کردیتے یہ مدت بڑھاتے جاتے اور جنس کی مقدار بڑھتی چلی جاتی یہاں تک کہ اصل سے کئی گنا سود ہوجاتا۔ خدا نے فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا
الرِّبٰوۤا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً
وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○
وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْۤ اُعِدَّتْ
لِلْكٰفِرِيْنَ ○ (آل عمران: ۱۳۰-۱۳۱)

اے ایمان والو! (اصل سے) دوگنا چوگنا سود مت کھاؤ۔ اور خدا سے تقویٰ کرو شاید کہ تم فلاح پاؤ اور اس آگ سے بچو جو منکروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

اس آیت میں تصریح ہے کہ سُود خواری کی سزا جہنم ہے، وہ جہنم جو کافروں کے لیے تیار کی گئی

ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی ایک رویائے صادقہ میں سود خوروں کو جس حال میں دیکھا اس کی تصویر یہ ہے۔ فرمایا "میں نے دیکھا کہ خون کی ایک نہر ہے اس میں ایک آدمی تیر رہا ہے اور ایک دُوسرا آدمی ہاتھ میں پتھر لئے کھڑا ہے۔ پہلا آدمی تھک کر جب کنارہ آنا چاہتا ہے تو دوسرا آدمی ایسا تاک کر پتھر مارتا ہے کہ اس کا منہ کھُل جاتا ہے اور وہ پتھر لقمہ بن کر اس کے پیٹ میں چلا جاتا ہے۔ وہ پتھر کھا کر پھر پیچھے لوٹ جاتا ہے۔ جبرائیلؑ نے بتایا کہ یہ جو خون کی نہر میں تیر رہا ہے، سُود خوار ہے[1]۔ سزا کی مماثلت ظاہر ہے۔ لوگ اپنا خون پسینہ ایک کر کے محنت سے جو روزی پیدا کرتے ہیں سُود خوار آسانی سے اس پر قبضہ کر لیتا ہے تو وہ انسان کے خون میں تیرتا ہے۔ اور جو پتھر لقمہ بن کر اس کے منہ میں چلا جاتا ہے تو وہ وہ دولت ہے جس کو وہ سُود سے جمع کرتا ہے۔

گناہ کے شریک وہ بھی ہیں جو کسی گناہ کی اعانت میں شریک ہوں۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے سُود کھانے والے، سُود کھلانے والے (یعنی دینے والے)، سُود پر گواہ ہونے والے اور سُود کی دستاویز لکھنے والے سب پر لعنت فرمائی[2]۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجنائز باب اولاد المشرکین وکتاب التعبیر باب تعبیر الرویا بعد صلاۃ الصبح۔

[2] ابوداؤد کتاب البیوع۔

شرابِ خواری

شراب خواری ان عاداتِ ذمیمہ میں سے ہے جن کی بُرائی کھُلی ہوئی ہے پھر بھی یہ کتنی عجیب بات ہے کہ دنیا کی اکثر قومیں اس میں مبتلا نظر آتی ہیں۔ اسلام سے پہلے جو مذہب تھے ان میں بھی اس کی بُرائی کچھ نہ کچھ بیان کی گئی ہے اور اس کا پینا اچھا نہیں سمجھا گیا ہے[1] لیکن اس کو حرام قطعی ٹھہرانے کی عزت صرف اسلام کو حاصل ہے۔ شراب عرب کی گھٹی میں پڑی تھی۔ شراب پینا پلانا اچھے اچھے گھرانوں میں لُطف اور تفریح کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ بیبیاں شوہروں[2] کو اور چھوٹے[3] اپنے بزرگوں کو اپنے ہاتھوں سے پلاتے تھے۔

اسلام سے پہلے اگرچہ بعض نیک بخت لوگوں نے شراب چھوڑ دی تھی مگر سارا مُلک اسی مصیبت میں گرفتار تھا۔ لوگ شراب پیتے اور متوالے ہو کر آپس میں لڑتے جھگڑتے اور ایک دُوسرے کا سر پھوڑتے جس سے دلوں میں آپس کی دشمنی بیٹھ جاتی۔ کبھی ترنگ میں آتے تو جو اونٹ ملتا اس کو پچھاڑ ڈالتے اور یہ نہ دیکھتے کہ یہ کس کا ہے[4] اور ساتھیوں کو اس کے کباب لگا کر کھلا دیتے۔ ساتھ ہی ساتھ جوا ہوتا اور اس میں مویشیوں کی بازی لگاتے، ان کو ذبح کر کے ان کے گوشت کے حِصّے کیئے جاتے، ان کو

---

[1] لوقا ۱ - ۱۵۔ [2] سبعہ معلقہ میں قصیدہ الا ہبی بصحنک۔ [3] صحیح بخاری کتاب الاشربہ۔ [4] سبعہ معلقہ میں طرفہ کا قصیدہ اور صحیح بخاری میں حضرت حمزہؓ کا قصہ۔

سب مل کر آپ کھاتے اور بچ رہتا تو غریبوں کو بھی کھلاتے۔

اسلام آیا تو اس نے رفتہ رفتہ شراب کی چاٹ گھٹانی شروع کی۔ پہلے تو یہ کہا کہ نشہ کوئی اچھی چیز نہیں خدا نے تم کو کھجور اور انگور دیئے جو بہت بڑی نعمت ہیں۔ لیکن تم ان سے نشہ تیار کرتے ہو اور کھانے کے کام میں بھی لاتے ہو۔ فرمایا:

وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ	اور کھجور اور انگور کے میوے دیئے۔
تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا	تم ان سے نشہ بناتے ہو اور اچھی روزی
حَسَنًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً	اس میں ان لوگوں کے لئے خدا کی
لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ○ (النحل: ۶۷)	نشانی ہے جو سمجھتے ہیں۔

اس آیت میں نشہ کو "رزقِ حسن" کے مقابلہ میں رکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نشہ "رزقِ حسن"[1] نہیں۔ ان آیتوں میں میرے نزدیک درحقیقت خیر و باطل کے التباس کی تشبیہیں ہیں[2] اوپر دودھ اور گوبر اور خون اور نیچے شہد کا ذکر ہے کہ یہ بھی دودھ کی طرح آلائشوں کے اندر سے کیسا پاک و صاف نکلتا ہے۔ یہی حال کھجور اور انگور کا ہے کہ ان سے نشہ جیسی ناپاک اور غذا جیسی پاک چیز دونوں پیدا ہوتی ہیں۔

مدینہ میں آکر شراب کی حرمت کے مسئلہ نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ حکم ہوا:

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ	تم جب نشہ میں ہو تو نماز کے قریب نہ
سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ	جاؤ یہاں تک کہ تم جانو کہ تم کیا کہتے ہو۔

(النساء: ۴۳)

اس آیت نے ہشیاروں کو چونکا دیا۔ کچھ لوگوں نے بالکل چھوڑ دی اور دوسروں نے اپنے

---

[1] تفسیر کبیر امام رازی۔ [2] مفسرین کی مختلف رائیں ہیں۔

پینے کا وقت نماز کے اوقات کے علاوہ مقرر کیا۔ اب اتنی جانچ ہو چکی تو وقت آیا کہ کنایہ تصریح کی صورت اختیار کرے۔ لوگوں کے دلوں میں آپ سے آپ سوال پیدا ہو رہا تھا کہ شراب اور جوئے کے بارہ میں اسلام کا آخری فیصلہ کیا ہوگا:

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۭ	(اے پیغمبر!) تجھ سے شراب اور جوئے
قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ	کے بارہ میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دے کہ ان
لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ	دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے
نَّفْعِهِمَا ۭ	لیے کچھ فائدہ کی چیزیں بھی ہیں اور ان کا گناہ
(البقرۃ: ۲۱۹)	ان کے فائدہ سے بڑا ہے۔

فائدہ یہ ہے کہ لوگوں کا کچھ غم غلط ہوتا ہے، صحبت اور تفریح طبع کا لطف آتا ہے، لوگ کھاتے پیتے ہیں، دوسروں کو بھی ان کے بدولت کچھ کھانے پینے کو مل جاتا ہے لیکن اس کی خرابیاں اس تھوڑے سے فائدہ سے بہت زیادہ ہیں۔ اس آیت نے بہت سے لوگوں کو ہشیار کر دیا اور وہ شراب سے تائب ہو گئے۔ لیکن چونکہ ابھی قطعی فیصلہ کا وقت نہیں آیا تھا اس لیے اس کے فائدہ کے پہلو کو غنیمت سمجھ کر کچھ لوگ پیتے بھی تھے۔ آخر یہ آیت اتری:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا	اے ایمان والو! شراب اور جوا اور
الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ	چڑھاوے کے بت اور پانسے گندے
وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ	کام ہیں، شیطان کے سو ان سے
الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ	بچتے رہو شاید تمہارا بھلا ہو شیطان
تُفْلِحُوْنَ ۞ اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ	تو یہی چاہتا ہے کہ تمہارے آپس میں
اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ	شراب اور جوئے سے دشمنی اور بیر ڈال

فِی الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ وَیَصُدَّکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَعَنِ الصَّلٰوۃِ فَھَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَھُوْنَ ○

دے اور تم کو اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک دے پھر اب تم باز آتے ہو۔

(المائدۃ: ۹۰-۹۱)

جب یہ حکم آیا تو بعض صحابہ نے چلّا کر کہا خداوندا! ہم باز آ گئے[1] اس دن مدینہ کا یہ حال تھا کہ ہر طرف گلیوں میں خُم اُلٹے جا رہے تھے اور شراب زمین پر بہائی جا رہی تھی[2]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے شراب کی حرمت کے اسباب بھی بتا دیئے ہیں۔ اوّل یہ کہ یہ شیطان کا کام ہے دوسرا یہ کہ اس کو پی کر شرابی آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں اور تیسرا یہ کہ یہ انسان کو اس کے بہت سے ضروری کاموں سے غافل کر دیتی ہے۔ ان تینوں اسباب کی سچّائی روزِ روشن کی طرح آج بھی آشکارا ہے۔

اُوپر کی آیت میں شراب اور جُوئے کو جو شیطان کا کام بتایا گیا ہے اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک چیز تو کھلی ہوئی ہے یعنی شراب اور جوئے کو چڑھاوے کے بتوں اور بانٹ کے پانسوں کے ساتھ ملا کر شیطان کے ناپاک اور بُرے کاموں میں سے شمار کیا ہے۔ اس لیے ان سب کی باطنی گندگی اور نجاست میں کوئی شک ہی نہیں۔ اس کے علاوہ کسی کام کے شیطان کی طرف نسبت کرنے سے مقصود حد درجہ کی بُرائی کا اظہار بھی ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ہے کہ جب ان کے گھونسہ سے اتفاقاً ایک قبطی مر گیا تو فرمایا ھٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ (قصص ۱۵) (یہ ہوا شیطان کے کام سے۔ یعنی بہت ہی بُرا کام ہوا) اسی طرح اس آیت اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ (بنی اسرائیل: ۲۷) (بے شبہ فضول خرچ کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں) کی روشنی

---

[1] ابو داؤد، کتاب الاشربہ [2] صحیح بخاری کتاب الاشربہ۔

میں ادھر خیال جاتا ہے کہ شراب، جوئے، بتوں کے چڑھاوے، اور جیتے ہوئے جانوروں کو بے کار ذبح کرکے پانسوں سے ان کی بانٹ میں جن کو عرب جاہلیت میں فیاضی کا کام سمجھا جاتا تھا، مال و دولت کی بے فائدہ بربادی کی طرف بھی اشارہ نکل سکتا ہے۔ کون نہیں جانتا شراب خواری، قمار بازی اور دکھاوے کی جھوٹی فیاضیوں نے خاندان کے خاندان اور قوم کی قوم کو تباہ کر دیا ہے جس کی مثالیں زمانہ کے صفحوں پر لکھی آج بھی ملتی ہیں۔

اس کے بعد ان شیطانی کاموں کی دو برائیاں قرآن نے بتائی ہیں۔ ایک معاشرتی اور دوسری مذہبی۔ معاشرتی خرابی یہ کہ شراب سے بدمست ہو کر لوگ آپس میں لڑتے ہیں اور وہ کام کر گزرتے ہیں جن کو وہ ہوش کی حالت میں کبھی نہ کرتے۔ کتنے قتل کتنی خودکشیاں اور کتنے سخت حادثے اس کی بدولت روزانہ پیش آتے ہیں۔ مذہبی برائی یہ ہے کہ انسان شراب پینے اور جوا کھیلنے میں ایسا محو ہو جاتا ہے کہ خدا کی یاد اور نماز سے جو زندگی کا سب سے بڑا فرض ہے غافل ہو جاتا ہے۔ بلکہ خود اپنے مفید دنیاوی کاموں سے بھی ایسا کھویا جاتا ہے کہ وہ دین کے ساتھ دنیا کے کام کا بھی نہیں رہ جاتا اور اس کی ساری زندگی ناکام اور نامراد ہو جاتی ہے۔

شراب کے لفظ سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اس سے مراد کوئی خاص قسم کی شراب ہے۔ قرآن نے اس کے لئے خَمر کا لفظ استعمال کیا ہے۔ خمر کہتے ہیں چھپا جانے کو اس لئے ہر وہ شے جس کا کھانا یا پینا عقل اور ہوش کو چھپائے وہ خمر میں داخل ہے۔ حضرت عمرؓ نے منبر نبوی پر کھڑے ہو کر فرمایا "شراب (خمر) وہ ہے جو عقل کو ڈھانک لے"[1]۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "ہر وہ شے جو نشہ پیدا کرے حرام ہے"[2]۔ فرمایا "جس نے دنیا میں شراب پی اور اس سے توبہ نہ کی، وہ آخرت میں اس سے محروم رہے گا"[3]۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب معراج میں تشریف لے گئے تو آپؐ کے سامنے دستِ غیب نے دو پیالے رکھے۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الاشربہ و صحیح مسلم کتاب الاشربہ۔

ایک میں دودھ تھا اور دوسرے میں شراب۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ کا پیالہ اٹھالیا۔ ناموسِ وحی حضرت جبرائیل علیہ السلام نے کہا "اس خدا کی حمد جس نے آپؐ کو فطرت کی راہ دکھائی۔ اگر آپؐ شراب کا پیالہ اٹھاتے تو آپؐ کی اُمت گمراہ ہو جاتی"[1] گویا شراب مثال کی دنیا میں گمراہی کی تصویر ہے۔

حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "کوئی مومن جب شراب پینے لگتا ہے تو اس وقت اس کا ایمان اس سے رخصت ہو جاتا ہے"[2] یہ بھی فرمایا کہ "قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ شراب کا پینا بڑھ جائے گا"[3]

اسلام نے جب شراب کو حرام کیا تو اس کے سارے لوازم اور متعلقات بھی سدِّ ذرائع کے طور پر حرام کئے۔ یہاں تک کہ شروع شروع میں ان برتنوں کے استعمال کو بھی حرام کیا جن میں شراب عموماً بنائی جاتی تھی پھر جب لوگ شراب چھوڑنے کے عادی ہو گئے تو اس سختی کو اٹھا دیا[4]

اس اصول کا ذکر کئی دفعہ آچکا ہے کہ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (مائدہ ۱-۲) (گناہ اور تعدّی میں ایک دوسرے کی اعانت نہ کرو) کے اصول کی بنا پر نہ صرف شراب پینا بلکہ اس کا پلانا بنانا، بیچنا، خریدنا، لینا، لے جانا سب حرام ٹھہرایا گیا۔ فرمایا خدا نے شراب پر اس کے پینے والے، پلانے والے، بیچنے والے، خریدنے والے، دوسروں کے لئے نچوڑنے والے، اپنے لئے نچوڑنے والے، اس کے لے جانے والے اور جس کے پاس لے جائی جائے سب پر لعنت فرمائی ہے"[5] یہ بھی ارشاد ہوا کہ "ہر نشہ کی چیز حرام ہے اور جس کے زیادہ پینے سے نشہ ہو اس کا تھوڑا پینا بھی ویسا ہی حرام ہے"[6]

---

[1] و [2] و [3] صحیحین کتاب الاشربہ۔ [4] ابوداؤد کتاب الاشربہ۔ [5] صحیحین و ابوداؤد و ترمذی کتاب الاشربہ۔

غیظ و غضب

غیظ و غضب کی بے اعتدالی بھی بہت بڑی بُرائی ہے۔ بہت سے ظالمانہ اور بیدردانہ کام انسان صرف غیظ و غضب اور غصّہ میں کر بیٹھتا ہے اور بعد کو اکثر نادم اور پشیمان ہوتا ہے۔ اس لئے ایک مسلمان کو چاہیئے کہ اپنے غصّہ پر قابو رکھے اور بے سبب غیظ و غضب کا اظہار نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اچھے مسلمانوں کی یہ تعریف کی ہے کہ وہ اپنے غصّہ کو دبا لیتے ہیں وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ[1] اور دوسری جگہ فرمایا وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ[2] اور جب ان کو غصّہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں انسان کا سکون کی حالت میں معاف کر دینا آسان ہے لیکن غصّہ کی حالت میں جب وہ قابو سے باہر ہو جاتا ہے معاف کرنا آسان نہیں ہے۔ لیکن ایک مسلمان کی خصوصیت یہ ہونی چاہیئے کہ وہ اس وقت بھی اپنے کو قابو میں رکھے اور معاف کر دے۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "پہلوان وہ نہیں ہے جو دُوسرے کو پچھاڑ دے۔ پہلوان وہ ہے جو غصّہ میں اپنے کو قابو میں رکھے"[3]

حضرت ابو ہریرہؓ حضرت ابن عمرؓ حضرت جاریہ بن قدامہؓ حضرت ابو درداؓ وغیرہ کئی صحابیوں سے روایت ہے کہ ایک شخص نے آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم!

---

[1] آل عمران ۳:۱۳۴ [2] الشوریٰ ۴۲:۳۷ [3] صحیح مسلم باب فضل من یملک نفسہ عند الغضب و بخاری کتاب الادب باب الحذر من الغضب۔

مجھے کوئی نصیحت فرمائیے۔" ارشاد ہوا کہ "غصہ نہ کیا کرو۔" اس کو یہ معمولی بات معلوم ہوئی تو اس نے دوبارہ سہ بارہ عرض کی۔ آپؐ نے ہر دفعہ یہی فرمایا کہ "غصہ نہ کیا کرو۔"[1] مسند احمد میں ہے کہ اُن صاحب کا بیان ہے پھر میں نے دل میں غور کیا تو معلوم ہوا کہ غصہ حقیقت میں ساری بُرائیوں کی جڑ ہے۔

مشہور صحابی حضرت ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپؐ نے عصر کی نماز کے بعد صحابہ کو کھڑے ہو کر نصیحتیں فرمائیں جن میں سے ایک یہ تھی۔ فرمایا "آدم کے بیٹے کئی طبقوں میں پیدا کئے گئے ہیں۔ ان میں کوئی ایسا ہے جس کو غصہ دیر میں آتا ہے اور سکون جلد ہو جاتا ہے اور کسی کو غصہ بھی جلد آتا ہے اور دور بھی جلد ہو جاتا ہے تو ان دونوں میں ایک بات کی دوسری بات سے اصلاح ہو جاتی ہے۔ اور کوئی ایسا ہے کہ اس کو غصہ جلد آتا ہے اور دفع بہت دیر میں ہوتا ہے تو ہاں! ان میں سب سے اچھا وہ ہے جس کو غصہ دیر میں آئے اور دور جلد ہو جائے۔ اور ان میں سب سے بُرا وہ ہے جس کو غصہ جلد آجاتا ہو اور دور بہت دیر میں ہوتا ہو۔ ہاں! غصہ ابن آدم کے دل کی ایک چنگاری ہے دیکھتے نہیں کہ اس کی آنکھیں لال اور اس کی رگیں پھول جاتی ہیں۔ تو جس کو اپنے غصہ کا احساس ہو اس کو چاہئے کہ وہ زمین سے لگ جائے۔"[2]

ابو داؤد میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا "غصہ شیطان سے ہے اور شیطان آگ سے بنا ہے اور آگ کو پانی ٹھنڈا کرتی ہے تو جس کو غصہ آئے اس کو چاہیئے کہ وضو کرے۔"[3] حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس کو غصہ آئے وہ اگر کھڑا ہے تو چاہیئے کہ بیٹھ جائے اگر اس سے بھی کم نہ ہو تو چاہیئے کہ لیٹ جائے۔"[4]

صحیحین میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دو صاحبوں میں کچھ باتیں ہو گئیں

---

[1] صحیح بخاری و مسند احمد و ابن حبان و طبرانی (منذری باب الترہیب من الغضب)۔ [2] جامع ترمذی (منذری باب مذکور)۔
[3] و [4] سنن ابی داؤد کتاب الادب باب من کظم غیظا۔

ان میں سے ایک صاحب کو اتنا غصہ آیا کہ چہرہ غصہ سے لال ہوگیا اور رگیں پھول گئیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا پھر فرمایا "مجھے ایک ایسا کلمہ معلوم ہے کہ اگر وہ اس کو کہہ لے تو یہ غصہ جاتا رہے اور وہ یہ ہے کہ وہ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ کہے[1]۔"

اس اخیر حدیث کی تائید قرآن پاک کی اس آیت کریمہ سے ہوتی ہے:

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ	معاف کرنے کی عادت ڈال نیکی کی
اَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِیْنَ ۝ وَاِمَّا	بات کہہ اور ناداتوں سے درگذر کر اور
یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ	اگر شیطان کی چھیڑ تجھ کو ابھار دے
فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِیْعٌ	تو اللہ کی پناہ پکڑ۔ بے شک وہ سننے
عَلِیْمٌ ۝	والا اور جاننے والا ہے۔

(الاعراف: ۱۹۹-۲۰۰)

اسی قسم کی آیت سورۂ حٰم السجدہ میں بھی ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

"نیکی اور بدی برابر نہیں۔ برائی کا جواب نیکی سے دے پھر جس کے اور تیرے درمیان دشمنی ہو گی وہ ایسا ہو جائے گا جیسے دوست رشتہ والا۔ اور یہ بات ملتی ہے ان کو جو بڑے مستقل ہیں۔ اور یہ بات ملتی ہے اس کو جو بڑی قسمت والا ہے۔ اور اگر ابھار دے تجھ کو شیطان کی کوئی چھیڑ تو اللہ کی پناہ پکڑ۔ بے شک وہی سننے والا جاننے والا ہے[2]۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غصہ کے تین علاج بتائے ہیں۔ ایک روحانی اور دو ظاہری۔ روحانی تو وہی ہے جس کا ذکر قرآن پاک میں ہے یعنی یہ کہ چونکہ یہ غصہ شیطان کا کام ہے اس لیے جب غصہ آئے تو فوراً دعا کرنی چاہیے کہ خداوندا! میں شیطان سے بھاگ کر تیری پناہ چاہتا ہوں (اعوذ باللہ

---

[1] صحیح بخاری کتاب الادب باب الحذر من الغضب۔ مسلم باب فضل من یملک نفسہ عند الغضب۔ [2] حٰم السجدہ ۵: ۳۴-۳۶

کا یہی مطلب ہے خدا اس کی سنے گا اور شیطان کی اس چھیڑ سے اس کو محفوظ کرے گا۔ ظاہری طور سے بھی دیکھئے کہ جب کسی مسلمان کو دل سے یقین ہوگا کہ غصّہ شیطانی حرکت ہے تو خدا کا نام لینے کے ساتھ وہ اس سے دور ہو جائے گا۔

دو ظاہری علاجوں میں سے ایک تو یہ ہے کہ انسان کھڑا ہو تو بیٹھ جائے اور بیٹھا ہو تو لیٹ جائے۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ تبدیل ہیئت سے طبیعت بٹ جائے گی اور غصّہ کم ہو جائے گا۔ دوسرا علاج یہ ہے کہ وضو کرے۔ اس سے منشا یہ ہے کہ غصّہ کی حالت میں گرمی سے خون کا دوران بڑھ جاتا ہے آنکھیں لال ہو جاتی ہیں چہرہ سرخ ہو جاتا ہے تو پانی پڑنے سے مزاج میں ٹھنڈک آئے گی اور غصّہ کی گرمی دور ہو جائے گی۔

بغض وکینہ

دل میں کسی کی دشمنی اور عداوت کا دیرپا جذبہ رکھنا بغض اور کینہ کہلاتا ہے۔ یہ ایسی بری چیز ہے کہ جو اس سے پاک رہنے کی دعا مانگا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف فرمائی ہے:

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا	اے ہمارے پروردگار ہم کو اور ہمارے
الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ	بھائیوں کو جو ہم سے آگے ایمان میں
وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا	پہنچے معاف کر اور ہمارے دلوں میں
لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ	ایمان والوں کا کینہ مت رکھ اے
رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ○	ہمارے پروردگار تو نرمی والا مہربان ہے۔

(الحشر: ۱۰)

جنّت کی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں جو لوگ ہوں گے آپس میں بھائی بھائی ہوں گے وہاں بغض وکینہ کا گذر نہ ہوگا۔ فرمایا:

وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ	اور ہم نے ان کے سینوں سے جو کینہ
مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ	تھا نکال لیا۔ بھائی بھائی ہو کر تختوں
مُّتَقٰبِلِيْنَ ○ (الحجر: ۴۷)	پر آمنے سامنے بیٹھے۔

وَ نَزَعۡنَا مَا فِیۡ صُدُوۡرِهِمۡ	اور ہم نے ان کے سینوں سے جو کینہ تھا
مِّنۡ غِلٍّ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهِمُ	نکال لیا نہریں ان کے نیچے بہتی
الۡاَنۡهٰرُ ۚ (الاعراف: ۴۳)	ہوں گی۔

ان آیتوں کے اشارہ سے معلوم ہوا کہ جب تک بھائیوں میں کینہ رہے گا جنّت کا تخت ہاتھ نہ آئے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے ہم کو جو تعلیم دی ہے اس کا یہ منشا ہے کہ ہم کو دنیا ہی میں جنت کی سی زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ فرمایا:

"اے لوگو! آپس میں ایک دُوسرے پر حسد نہ کرو، ایک دُوسرے سے کینہ نہ رکھو اور ایک اللہ کے بندے بن کر آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔ کسی بھائی کے لیے حلال نہیں کہ اپنے بھائی کو تین دنوں سے زیادہ چھوڑ دے[1]"

مطلب یہ ہے کہ اگر کبھی کسی سبب سے دو بھائیوں میں کوئی ملال کی بات ہو جائے تو اس کو تین دنوں سے زیادہ کوئی اپنے دل میں نہ رکھے۔ ابو ایوبؓ صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ "کسی مسلمان کے لیے حلال نہیں کہ اپنے بھائی کو تین دنوں سے زیادہ چھوڑ دے۔ دونوں ملیں تو ایک دوسرے سے منہ پھیرے، اور ان دونوں میں بہتر وہ ہے جو سلام میں پہل کرے[2]" ایک اور روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "کسی مومن کے لیے جائز نہیں کہ کسی مومن کو تین دن سے زیادہ چھوڑے۔ تین دن جب ہو جائیں تو ان میں سے ہر ایک دوسرے سے آکر ملے پھر سلام کرے تو اگر دوسرے نے جواب دیا تو دونوں کو مزدوری ملی اور اگر اس نے جواب نہیں دیا تو وہ (جواب نہ دینے والا) گناہ لے کر لوٹا[3]" کئی حدیثوں میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "ہر دوشنبہ اور پنجشنبہ کو انسان کے اعمال پیش ہوتے ہیں تو جس نے خدا کے ساتھ شرک نہیں کیا خدا اس کو معاف فرماتا ہے لیکن جن

---

[1] صحیح بخاری و مسلم و مالک، ابو داؤد، ترمذی، نسائی۔ [2] مالک، بخاری، مسلم، ترمذی، ابو داؤد۔ [3] سنن ابو داؤد۔

دو آدمیوں میں آپس میں کینہ ہوتا ہے تو خدا فرماتا ہے کہ ان دونوں کو ابھی رہنے دو میل کرلیں[1] اس حدیث کی تشریح ایک روایت سے ہوتی ہے۔ فرمایا "دوشنبہ اور جمعرات کو اعمال پیش ہوتے ہیں تو جس نے مغفرت مانگی ہوگی اس کو مغفرت دی جاتی ہے اور جس نے توبہ کی ہوگی اس کی توبہ قبول ہوتی ہے لیکن کینہ والوں کے اعمال ان کے کینہ کے سبب سے لوٹا دیئے جاتے ہیں جب تک وہ اس سے باز نہ آئیں[2]" یہ بھی حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا تین شخصوں کی بخشایش نہیں۔ ان میں سے ایک وہ جو اپنے سے کینہ رکھتا ہے[3]۔

ان حدیثوں پر غور کیجیے۔ شرک اور کینہ دونوں کو ایک خاص پہلو سے برابر کا درجہ دیا گیا ہے۔ دین دو چیزوں سے عبارت ہے اللہ کا حق اور بندوں کا حق۔ جب تک شرک رہے گا اللہ کا کوئی حق ادا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح جن دو آدمیوں میں کینہ رہے گا ان میں سے کوئی ایک دوسرے کا کوئی حق ادا نہ کر سکے گا۔ غرض جس طرح شرک حق اللہ سے مانع ہے بغض و کینہ حق العباد سے باز رکھتا ہے اور ان ہی دونوں حقوق سے عہدہ برآ ہونا جنت کی کنجی ہے۔

---

[1] مالک و مسلم، ابوداؤد، ترمذی و ادب المفرد بخاری۔ [2] طبرانی فی الاوسط (منذری ۲ صفحہ ۴۹۱ مصر) [3] ادب المفرد بخاری باب الشحناء۔

ظُلم

ظلم کا لفظ قرآنِ پاک میں کئی معنوں میں آیا ہے یہاں تک کہ کفر و شرک اور عصیاں کے معنوں میں بھی کثرت سے آیا ہے مگر یہاں مراد اس ظلم سے ہے جو بندے بندوں پر کرتے ہیں۔ قرآن میں اس کے لئے دو اور لفظ بَغِیّ (سرکشی) اور عُدوان (تعدی) آئے ہیں۔ یہ ظلم اسلام کی شریعت میں حرام ہے:

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ	کہہ دے کہ میرے رب نے بے حیائی
مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَ	کے کاموں کو جو کھلے ہوں یا چھپے اور
الْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ	گناہ اور حق کے بغیر سرکشی کو حرام ٹھہرایا
(الاعراف: ۳۳)	ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

وَیَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ	اور خدا بے حیائی اور ناپسندیدہ کام اور
وَالْبَغْیِ ج (النحل: ۹۰)	اور سرکشی سے منع کرتا ہے۔

ان دونوں آیتوں میں سرکشی سے مراد حد سے آگے بڑھ کر دوسرے کے حقوق پر دست درازی اور ظلم ہے جس کی روک تھام اگر نہ کی جائے تو وہ پوری قوم اور ملک کے امن و امان کو برباد کر ڈالے۔ اس کی روک تھام کا پہلا قدم یہ ہے کہ جس پر ظلم کیا جائے اس کا یہ حق مانا جائے کہ وہ ظالم سے اپنا بدلہ

لے سکے تاکہ لوگ انجام کو سوچ کر ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے بچیں گو کسی کو تکلیف پہنچانا اچھا نہیں مگر ظالم کو اس کے ظلم کے بقدر تکلیف پہنچانے کی اجازت اس لئے دی گئی تاکہ یہ بُرائی آگے نہ بڑھنے پائے۔ فرمایا:

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ○ وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ	اور جن پر ظلم ہو تو وہ بدلہ لیتے ہیں اور بُرائی کا عوض اسی طرح کی بُرائی ہے۔

(الشوریٰ: ۳۹-۴۰)

یعنی جیسی برائی کوئی کرے ویسی ہی بُرائی اس کے ساتھ کی جائے۔

لیکن اگر کوئی مظلوم بدلہ لینے کی قدرت کے باوجود ظالم کو معاف کر دے تو مظلوم اپنا انصاف خدا کے ہاں پائے گا اور ظالم خدا کی محبت سے محروم رہے گا:

فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ○ (الشوریٰ: ۴۰)	پھر جو کوئی معاف کر دے اور سنوارے تو اس کی مزدوری اللہ کے ذمہ ہے بیشک اللہ ظالم لوگوں کو پیار نہیں کرتا۔

لیکن اگر کوئی معاف نہ کرے اور بدلہ ہی لے تو اس کو ملامت نہیں کی جاسکتی:

وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ○ (الشوریٰ: ۴۱)	اور جو کوئی اپنے ظلم کئے جانے کے بعد بدلہ لے تو اس پر کوئی ملامت کی راہ نہیں۔

ملامت اُس پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرنے میں پہل کرے اور ملک میں ناحق فساد برپا کرے:

اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ	راہ اُن پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں

يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۚ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝
(الشوریٰ: ۴۲)

اور زمین میں ناحق دھوم مچاتے ہیں ان کے لیے دکھ والی سزا ہے۔

اگر کوئی کسی کو ظلم سے مار ڈالے تو اس کے ولی کو طلبِ قصاص کی منصفانہ اجازت دی گئی:

وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُومًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهِ سُلْطَانًا فَلَا يُسْرِفْ فِي الْقَتْلِ ۖ إِنَّهُ كَانَ مَنْصُورًا ۝ (بنی اسرائیل: ۳۳)

اور جو ظلم سے مارا گیا تو اس کے وارث کو ہم نے زور دیا ہے۔ تو وہ خون کرنے میں زیادتی نہ کرے۔ بے شبہ اس کو مدد دی جائے۔

مقصود یہ ہے کہ ظالم قاتل کے خلاف مظلوم مقتول کی مدد کی جائے تاکہ دنیا میں عدل قائم ہو۔ لیکن مقتول کے وارثوں کو بھی چاہیئے کہ انتقام کے جوش میں حد سے آگے بڑھ کر قاتل کے ساتھ اس کے اور عزیزوں اور دوستوں کے خون سے اپنے ہاتھ نہ رنگیں ورنہ یہ سلسلہ جاہلیت کی طرح اسلام میں بھی کبھی ختم نہ ہوگا۔

مظلوم کو اس کی بھی اجازت ملی ہے کہ وہ ظالم کی ظالمانہ کارروائیوں کو علانیہ بیان کرے۔ اس کے دو فائدے ہیں۔ ایک تو اس سے اپنی بدنامی کے ڈر سے ظلم کرنے میں کچھ ہچکچائیں گے دوسرا یہ کہ اس طرح لوگوں کو مظلوم کے ساتھ ہمدردی پیدا ہو گی۔ فرمایا:

لَا يُحِبُّ اللَّهُ الْجَهْرَ بِالسُّوءِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَنْ ظُلِمَ ۚ وَكَانَ اللَّهُ سَمِيعًا عَلِيمًا ۝ (النساء: ۱۴۸)

اور اللہ کو بُری بات کا پکارنا پسند نہیں آتا مگر جس پر ظلم ہُوا ہو اور اللہ سنتا جانتا ہے۔

اگر ظالم اپنی حرکت سے باز نہ آئے تو مسلمانوں کو اجازت ملی ہے کہ سب مل کر اس سے لڑیں اور اس کو خدا کے قانون کے آگے سرنگوں کریں:

فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ (الحجرات: ۹)	تو اگر ان میں سے ایک دوسرے پر چڑھ آوے تو سب لڑو اس چڑھائی والے سے یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم پر پھر آئے۔

یہ تو مسلمانوں کے آپس کی بات تھی لیکن اگر فریق مخالف کافر ہو تو بھی اس پر زیادتی نہ کی جائے۔ اور اگر کوئی مسلمان اس حکم کے خلاف کرے تو دوسرے مسلمانوں کو اس کا ساتھ نہیں دینا چاہیئے فرمایا:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۪ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ○ (المائدۃ: ۲)	اور کسی قوم کی دشمنی اس لئے کہ وہ تم کو مسجد حرام سے روکتی تھی اس جرم پر تم کو آمادہ نہ کرے کہ تم زیادتی کر بیٹھو۔ اور نیکی اور تقویٰ کے کاموں پر ایک دوسرے کی مدد کرو اور گناہ اور تعدی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بیشک وہ سخت سزا والا ہے۔

اس سے معلوم ہوگا کہ دنیا میں مظالم کے انسداد کا وہ سب سے بڑا موثر حربہ جس کا نام آج کل عدم تعاون اور نان کوآپریشن ہے، اسلام نے اس کو بہت پہلے پیش کیا ہے اور صاف و صریح حکم دیا ہے کہ گناہ اور ظلم و تعدی کے کاموں میں ظالموں کا ساتھ نہ دیا جائے اور ان کے ظلم کے کاموں میں

شریک نہ ہوا جائے۔ البتہ اس عدم شرکت کی صورتیں زمانہ کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔

حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو فرمایا کہ "تم اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم"۔ صحابہ نے عرض کی کہ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد کی جاسکتی ہے مگر ظالم کی مدد کیونکر کی جائے" فرمایا "اس کی مدد یہ ہے کہ اس کو ظلم سے روکا جائے"[1]۔

اس طریقہ تعلیم کی جدت پر ایک نظر ڈالیئے۔ ظالم کی مدد کی ترغیب دلا کر سننے والوں کے دلوں میں توجہ کی خلش پیدا کر دی اور جب بظاہر اس عجیب تعلیم کی طرف وہ بدل و جان متوجہ ہو گئے تو اس کمال التفات سے فائدہ اٹھا کر آپ نے یہ تلقین فرمائی کہ ظالم کی مدد کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو ظلم کی برائی سے روکا جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ یہ حدیث قدسی بڑے موثر انداز میں سنائی فرمایا "اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ارشاد فرماتا ہے کہ اے میرے بندو! میں نے اپنے لیئے اور تمہارے لیئے آپس میں ظلم کو حرام کیا ہے تو تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کیا کرو"[2]۔

ایک اور روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا ظلم سے بچو کہ ظلم قیامت کے دن ظلمات بن جائے گا[3]۔ ظلمات عربی میں اندھیرے کو کہتے ہیں ظلم اور ظلمات کا مادہ عربی میں ایک ہی ہے۔ ہماری زبان میں اسی لفظی رعایت کے ساتھ اس کا ترجمہ یوں ہو سکتا ہے کہ اندھیر نہ کیا کرو کہ قیامت کے دن یہ اندھیرا ہو جائے گا۔ یہ ایک طرح کی مثالی سزا ہو گی۔ انسان اپنی غرض یا غصہ سے اندھا ہو کر دوسروں پر ظلم کر بیٹھتا ہے۔ یہ اندھا پن قیامت کے ہولناک دن میں اندھیرا بن کر نمودار ہو گا۔

---

[1] صحیح بخاری ابواب المظالم و صحیح مسلم باب نصر الاخ ظالما او مظلوما۔ [2] صحیح مسلم باب تحریم الظلم و ترمذی کتاب الزہد و مسند احمد جلد ۵ صفحہ ۱۵۴، صفحہ ۱۶۰ و صفحہ ۱۷۷ و ادب المفرد بخاری باب الظلم۔ [3] صحیح مسلم باب تحریم الظلم و صحیح بخاری ابواب المظالم۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ "مسلمان مسلمان کا بھائی ہے چاہیئے کہ وہ اس پر ظلم نہ کرے اور نہ اس کو بے مددگار چھوڑ دے[1]"۔ براء بن عازبؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے ہم کو سات باتوں کا حکم دیا اور سات باتوں سے روکا ہے۔ ان میں ایک یہ ہے کہ مظلوم کی مدد کی جائے[2]۔ حضرت معاذؓ کو امیر بنا کر جب آپ نے یمن بھیجا تو ان کو نصیحت فرمائی کہ "مظلوم کی بددعا سے بچتے رہنا کیونکہ اس کے اور خدا کے بیچ میں کوئی پردہ نہیں[3]"۔ حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ جس نے اپنے بھائی کی آبرو یا کسی چیز پر ظلم کیا ہو تو اس کو چاہیئے کہ آج ہی اس سے پاک ہو لے اس دن سے پہلے کہ اس کے پاس دینے کو نہ دینار ہو گا نہ درہم۔ ظلم کے بدلہ ظلم کے برابر مظلوم کو ظالم کی نیکیاں دلوائی جائیں گی اور نیکیاں نہ ہوں گی تو مظلوم کی بدیاں ظالم پر لاد دی جائیں گی[4]۔ فرمایا کہ "ظالم کو خدا مہلت دیتا ہے پھر جب اس کو پکڑتا ہے تو پھر چھوڑتا نہیں[5]"۔

فرمایا "اہلِ ایمان دوزخ سے پاک ہو چکیں گے تو جنت اور دوزخ کے درمیان ایک پُل کے پاس روکے جائیں گے۔ وہاں دنیا میں ایک نے دوسرے پر جو ظلم کئے تھے ان کا بدلہ ایک دوسرے کو دلایا جائے گا۔ جب اس سے بھی پاک ہو جائیں گے تب ان کو بہشت میں جانے کی اجازت ملے گی[6]"۔

---

[1] و [2] و [3] و [4] صحیح بخاری ابواب المظالم۔ [5] صحیح مسلم باب تحریم الظلم۔ [6] صحیح بخاری ابواب المظالم۔

فخر و غرور

انسان میں جب کوئی وصف یا کمال پایا جاتا ہے تو قدرتی طور پر اس کے دل میں اس کا خیال پیدا ہوتا ہے اور یہ کوئی اخلاقی عیب نہیں لیکن جب یہ خیال اس قدر ترقی کر جاتا ہے کہ وہ اور لوگوں کو جن میں یہ وصف نہیں پایا جاتا یا کم پایا جاتا ہے اپنے سے حقیر سمجھنے لگتا ہے تو اس کو کبر اور اس کے اظہار کو تکبّر کہتے ہیں۔ دُنیا میں سب سے پہلے اس بد اخلاقی کا ظہور شیطان سے ہوا۔ اس نے آدم کے مقابلہ میں اپنے کو بالاتر سمجھا اور پکارا اَنَا خَیْرٌ مِّنْہُ[1] میں اس سے بہتر ہوں۔ وہ مٹی سے بنا ہے اور میں آگ سے بنا ہوں۔ خدا تعالیٰ نے اس کی اس شیخی پر اس کو مردود قرار دیا اور فرمایا فَاھْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ۝[2] (یہاں سے اُتر جا۔ یہاں تجھے غرور کرنا زیبا نہیں۔ نکل جا تجھے بڑائی کے بدلہ یہاں ذلت کی چھوٹائی ملی)۔

کبر و غرور ایک اضافی اور نسبی چیز ہے جس کے لیے محض اپنی عظمت کا تخیّل کافی نہیں بلکہ اس تخیّل کے ساتھ دوسرے لوگوں کی تحقیر بھی ضروری ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ ایک خوش جمال شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میں ایک حسین شخص ہوں اور حُسن مجھے نہایت محبوب ہے۔ میں یہ نہیں پسند کرتا کہ کسی کو مجھ پر حُسن میں تفوّق حاصل ہو تو کیا یہ تکبّر ہے؟

---

[1] الاعراف: ۱۲۔ [2] الاعراف: ۱۳۔

فرمایا "نہیں تکبر یہ ہے کہ حق کو قبول نہ کیا جائے اور لوگوں کو حقیر سمجھا جائے"[۱]

تکبر کی اسی اضافی حیثیت نے اس کو مذہبی، اخلاقی، معاشرتی بداخلاقیوں کا سرچشمہ بنا دیا پیغمبر کی مزاحمت صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو اپنے آپ کو اور لوگوں سے بڑا سمجھتے ہیں۔ اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو غریب اور عام لوگ پیغمبروں کی ہدایت کو قبول کر لیتے:

وَبَرَزُوْا لِلّٰہِ جَمِیْعًا فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِیْنَ اسْتَکْبَرُوْٓا اِنَّا کُنَّا لَکُمْ تَبَعًا فَھَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ ؕ (ابراھیم: ۲۱)	اور قیامت کے دن سب لوگ خدا کے روبرو نکل کھڑے ہوں گے تو جو لوگ دنیا میں کمزور تھے اس وقت ان لوگوں سے جو بڑی عزت رکھتے تھے کہیں گے ہم تو تمہارے قدم بقدم چلنے والے تھے تو کیا آج تم عذاب خدا میں سے کچھ تھوڑا سا ہم پر سے ہٹا سکتے ہو۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو بڑی بڑی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے اعیان دولت کے پاس بھیجا لیکن انہوں نے خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت کے قبول کرنے سے اس لیے انکار کیا کہ وہ اپنے آپ کو سب سے بالاتر سمجھتے تھے:

فَاسْتَکْبَرُوْا وَکَانُوْا قَوْمًا عَالِیْنَ ۝ (المؤمنون: ۴۶)	تو وہ سب شیخی میں آگئے اور وہ تھے (بھی) سرکش لوگ۔

اسی تکبر کی بنا پر وہ اپنے ہی جیسے آدمی کی جو عام انسانوں کی طرح کھاتا پیتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہو اطاعت کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کو اس سے ننگ و عار تھا کہ جس حلقے میں عام لوگ شامل ہو گئے ہیں اس میں وہ بھی شامل ہو جائیں:

---

[۱] ابوداؤد کتاب اللباس باب ماجاء فی الکبر۔

فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا	اس پر اُن کی قوم کے سردار جو ان کو
مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا	نہیں مانتے تھے لگے کہنے کہ ہم کو تو تم ہمارے
مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا	ہی جیسے بشر دکھائی دیتے ہو۔ اور ہمارے
الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّاْیِ	نزدیک صرف وہی لوگ تمہارے پیرو
وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۢ	ہوگئے ہیں جو ہم میں رذیل ہیں (اور پیرو بھی
بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ○	گئے ہیں تو بے سوچے سمجھے) سرسری نظر سے اور
	ہم تو تم لوگوں میں اپنے سے کوئی برتری نہیں
(ھود: ۲۷)	پاتے بلکہ ہم تم کو جھوٹا سمجھتے ہیں۔

غرض پیغمبروں کی دعوت کے قبول کرنے سے صرف ان ہی لوگوں کو انکار تھا جو اپنے آپ کو مذہبی قومی، سیاسی یا اور کسی وجہ سے لوگوں سے یا خود پیغمبروں سے بڑا سمجھتے تھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں نہایت شدت سے ان لوگوں کی برائی بیان کی ہے اور مختلف الفاظ میں بیان کی ہے تاکہ کبر و غرور کے تمام مدارج پیش نظر ہو جائیں عام لفظ تو استکبار اور اس کے مشتقات ہیں بعض جگہ اس کو عزت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے:

بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِیْ عِزَّةٍ	لیکن جو لوگ منکر ہیں (ناحق کی) ہیکڑی
وَّشِقَاقٍ ○	اور مخالفت میں (پڑے ہیں)۔
(ص: ۲)	

بعض جگہ اس سے بھی زیادہ قوی لفظ جبّار اختیار کیا ہے:

كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ	جتنے مغرور اور سرکش ہیں اللہ ان کے
مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ○ (المؤمن: ۳۵)	دلوں پر اسی طرح مہر لگا دیتا ہے۔

دو موقعوں پر اس کے لیے مُختال کا لفظ آیا ہے۔ یہ اس شخص کو کہتے ہیں جس کو گھمنڈ ہو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسے مغرور اور فخار میری محبت کی عزت سے محروم ہیں:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ۝ (النساء: ۳۶)	اللہ اس کو پیار نہیں کرتا جو مغرور اور فخار ہو۔
اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ۝ (النحل: ۲۳)	اللہ غرور کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

ان کو جہنم کی خوشخبری بھی یہیں دے دی گئی ہے:

اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ۝ (الزمر: ۶۰)	کیا جہنم میں مغروروں کا ٹھکانا نہیں ہے۔
فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ۝ (النحل: ۲۹)	تو دوزخ مغروروں کا بُرا ٹھکانا ہے۔

مغروروں کے ساتھ یہ سختی اسی لئے ہے کہ ان کا یہ غرور ان کو حق کے قبول سے باز رکھتا ہے۔ اخلاقی اور معاشرتی حیثیت سے کبر و غرور کے جو ثمرات ظاہر ہوتے ہیں ان کا کوئی شمار ہی نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً ایک متکبر شخص عام لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، بات چیت کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتا ہے۔ اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ لوگ اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے رہیں۔ بلکہ بہت سے لوگوں کو اس قابل بھی نہیں سمجھتا کہ ان کو یہ شرف حاصل ہو جب لوگوں سے ملتا ہے تو چاہتا ہے کہ لوگ اس کو پہلے سلام کریں۔ راستے میں لوگوں سے آگے چلنا چاہتا ہے، مجلسوں میں صدر بننے کی کوشش کرتا ہے۔ غرض اس کے ثمرات و نتائج ہزاروں صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں اور اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کے

دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی غرور ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔[1] اور امام غزالیؒ نے اس حدیث کا یہ فلسفہ بیان کیا ہے کہ "مسلمانوں کے جو مخصوص اخلاق ہیں وہی جنت کا دروازہ ہیں اور غرور ان تمام دروازوں کو بند کر دیتا ہے۔ اس لیے جس شخص کے دل میں ذرہ بھر بھی غرور ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔" یعنی دنیا کی طرح آخرت میں بھی مسلمانوں سے الگ تھلگ رہے گا۔

یہ بداخلاقی چونکہ ہر طبقہ اور ہر درجہ کے لوگوں میں پائی جاتی ہے اور اس کے نتائج گوناگوں صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں اس لئے ان سب کا استقصار تو مشکل تھا البتہ شریعت نے اس کے بعض نتائج ظاہر کر دیئے ہیں۔ مثلاً کبر و غرور کے جو مظاہر امراء و سلاطین سے تعلق رکھتے ہیں ان کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جو شخص یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے سامنے لوگ کھڑے رہیں اس کو اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لینا چاہیئے۔" ایک بار آپ خود عصا ٹیکے ہوئے نکلے تو صحابۂ کرام تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔ فرمایا کہ عجمیوں کی طرح تعظیم کے لیے کھڑے نہ ہوا کرو۔[2]

بڑے آداب و القاب کا اپنے ناموں کے ساتھ اضافہ کرنا اگر وہ خلافِ واقعہ ہوں تو جھوٹ ہے اور اگر واقعہ کے مطابق ہوں تو فخر و غرور کا ذریعہ ہیں۔ عجمی بادشاہ اپنے کو فخریہ ملک الملوک اور شہنشاہ کہلاتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "سب سے بُرا نام خدا کے نزدیک یہ ہے کہ کوئی اپنے کو ملک الملوک اور شہنشاہ کہلائے۔"[3]

کبر و غرور کی چند عام اور بدنما صورتوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کیا ہے۔ مثلاً:

وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ	اور زمین میں اکڑ کر نہ چلا کر کیونکہ اس دھما کے
اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ	کے ساتھ چلنے سے، تو زمین کو تو پھاڑ نہیں سکے گا

---

[1] ابو داؤد کتاب اللباس باب ما جاء فی الکبر۔ [2] ابو داؤد کتاب الادب باب فی قیام الرجل للرجل [3] صحیح بخاری۔

تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ○ (بنی اسرائیل: ۳۷) | اور نہ تن کر چلنے سے پہاڑوں کی لمبائی کو پہنچ سکے گا۔

وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَ لَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ط اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ○ (لقمان: ۱۸) | اور لوگوں سے بے رخی نہ کر اور زمین میں اترا کر نہ چل، بیشک اللہ اس کو پیار نہیں کرتا جس کو گھمنڈ ہو، فخار ہو۔

گنہگار کی شان یہ بیان کی ہے:

ثَانِيَ عِطْفِهٖ (الحج: ۹) | اینٹھتا ہوا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

من جرّ ثوبه خيلاء لم ينظر الله اليه يوم القيمة (ابو داؤد، کتاب اللباس) | جو شخص غرور سے اپنے کپڑے گھسیٹے گا خدا اس کی طرف قیامت کے دن نہ دیکھے گا۔

ایک حدیث میں ہے کہ گذشتہ لوگوں میں ایک شخص ایک جوڑا پہن کر اتراتا ہوا نکلا تو خدا نے زمین کو حکم دیا جس نے اس کو پکڑ لیا اور اب وہ قیامت تک اس میں دھنسا چلا جا رہا ہے[1]۔ اس کے برعکس بہت سے افعال ہیں جو تواضع و خاکساری پر دلالت کرتے ہیں اور ان ہی کو خدا نے اپنی خاص عبودیت کی علامت قرار دیا ہے:

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ | اور خدائے رحمٰن کے خاص بندے تو وہ ہیں جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلیں اور جب جاہل

---

[1] ترمذی ابواب الزہد۔

الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا۝ (الفرقان: ۶۳)

ان سے جہالت کی باتیں کرنے لگیں تو ان کو سلام کریں (اور الگ ہو جائیں)۔

رسول اللہ صلی علیہ وسلم دوزانو بیٹھ کر کھانا کھا رہے تھے۔ ایک بدو بھی اس وقت موجود تھا۔ اس نے کہا بیٹھنے کا یہ کیا طریقہ ہے۔ فرمایا خدا نے مجھ کو شریف بندہ بنایا ہے متکبر اور سرکش نہیں بنایا۔[1]

ایک صحابی نے جن کو لوگ مغرور و متکبر سمجھتے تھے اسی قسم کے افعال سے اپنے کبر وغرور کی تردید کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کا خیال ہے کہ میں مغرور ہوں حالانکہ میں گدھے پر سوار ہوتا ہوں کمل اوڑھتا ہوں اور بکری کا دودھ دوہتا ہوں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا ہے کہ "جو شخص یہ سب کام کرتا ہے، اس میں غرور نہیں پایا جاتا"۔[2]

کبر وغرور کے اسباب بہت سے ہیں لیکن عام طور پر دنیا دار لوگ جن چیزوں پر غرور کرتے ہیں وہ یہ ہیں حسب ونسب، حسن وجمال، مال ودولت، قوت اور اعوان وانصار کی کثرت۔ اسلام نے ان میں سے ہر ایک سبب کی نسبت اپنی قطعی رائے ظاہر کر دی اور بتا دیا ہے کہ ان میں سے کوئی چیز فخر وغرور کا ذریعہ نہیں۔

عربوں کے فخر وغرور کا سب سے بڑا ذریعہ حسب ونسب کی برتری کا خیال تھا اس کو یہ کہہ کر مٹا دیا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا (الحجرات: ۱۳)

لوگو! ہم نے تم (سب) کو ایک مرد (آدم) اور ایک عورت (حوا) سے پیدا کیا اور پھر تمہاری ذاتیں اور برادریاں ٹھہرائیں تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔

---

[1] ابن ماجہ کتاب الاطعمہ باب الاکل متکئاً۔ [2] ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ماجاء فی الکبر۔

اس کے بعد بتایا کہ شرافت و عظمت کی بنیاد نسب و حسب پر نہیں بلکہ روحانی فضائل پر ہے:

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ — اللہ کے نزدیک تم میں بڑا شریف وہی

(الحجرات: ۱۳) — ہے جو تم میں بڑا پرہیز گار ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مزید تشریح کی اور فرمایا کہ "خداوند تعالیٰ نے تمہارے جاہلیت کے غرور اور باپ دادا کے اوپر فخر کرنے کے طریقہ کو مٹا دیا۔ اب صرف دو قسم کے آدمی ہیں مومن پرہیز گار اور بدکار بدبخت۔ تم لوگ آدم کے بچے ہو اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے تھے۔ لوگ ایسے لوگوں پر فخر کرنا چھوڑ دیں جو جہنم کا کوئلہ ہیں یا خدا کے نزدیک اس گبریلے سے بھی زیادہ ذلیل ہیں جو اپنے منہ سے نجاست کو گھسیٹتا چلتا ہے[1]۔"

جہاں تک زیب و زینت اور جسم کی ظاہری آرائش اور پاکیزگی کا تعلق ہے حسن و جمال کو ایک قابلِ قدر چیز قرار دیا۔ چنانچہ ایک خوبرو شخص نے جب آپ سے دریافت کیا کہ مجھ کو یہ پسند ہے کہ میرا کپڑا اور جوتہ عمدہ ہو تو فرمایا کہ "خدا حسن کو پسند کرتا ہے[2]" یعنی اس کا نام غرور نہیں۔ البتہ جن صورتوں میں حسن و جمال غرور و تکبر کے اظہار کا ذریعہ بن جاتا ہے شریعت نے ان کی ممانعت کی ہے چنانچہ ایک صحابی کو آپ نے چند اخلاقی نصیحتیں کیں جن میں ایک نصیحت یہ تھی کہ تہ بند کو بہت نیچے نہ لٹکاؤ کیونکہ یہ غرور کی ایک قسم ہے اور خدا غرور کو نہیں پسند کرتا[3]۔

تمدنی اور اجتماعی ضروریات کے لحاظ سے مال و دولت کی اہمیت کو قائم رکھا اور اسی لحاظ سے اس کی تعبیر قوام اور خیر کے لفظ سے کی۔ مال و دولت کے ضائع کرنے کی ممانعت فرمائی اور اس کے تحفظ کو اس قدر ضروری قرار دیا کہ جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں قتل کیا جائے اس کو

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی التفاخر بالاحساب۔ [2] ترمذی ابواب البر والصلہ باب ماجاء فی الکبر۔

[3] ابوداؤد کتاب اللباس باب ماجاء فی اسبال الازار۔

شہید کا لقب عنایت کیا لیکن اسی کے ساتھ اگر اس کو فخر و غرور کا ذریعہ بنالیا جائے تو اس کی حقیقت جلوۂ سراب سے زیادہ نہیں :

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا	(لوگو) جانے رہو کہ دنیا کی زندگی کھیل اور تماشا
لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ	اور ظاہری طمطراق اور آپس میں ایک دوسرے
بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِى الْاَمْوَالِ	پر فخر کرنا اور ایک دوسرے سے بڑھ کر مال اور
وَالْاَوْلَادِ ؕ	اولاد کا خواستگار ہونا بس یہی کچھ ہے)

(الحدید: ۲۰)

احادیث میں مال و دولت کی برائی جن اسباب کی بنا پر بیان کی گئی ہے ان میں ایک سبب یہ ہے کہ وہ فخر و غرور اور باہمی مسابقت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ حالانکہ اس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ اس سے اپنی اور دوسروں کی ضروریات پوری کی جائیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "تم کو مال و دولت کی طلب میں باہمی مسابقت نے غافل کر دیا۔ آدم کا بچہ کہتا ہے کہ میرا مال، میرا مال حالانکہ تیرا مال صرف وہی ہے جس کو تو نے صدقہ میں دے ڈالا، کھا پی ڈالا، اور پہن کر پھاڑ ڈالا[1]۔

قوّت ایک ایسی چیز ہے جس کے ذریعہ سے ہر قسم کے تمدّنی، مذہبی اور سیاسی کام انجام دیئے جا سکتے ہیں اس لئے اس قسم کے موقعوں پر وہ ایک قابل ستائش وصف ہے یہی وجہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے قرآن مجید میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو "قوی امین" کہا ہے اور حضرت لوط علیہ السلام نے ایک موقع پر یہ حسرت ظاہر کی ہے :

قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ	(لوط) بولے کہ اے کاش (آج) مجھ کو

---

[1] ترمذی کتاب الزہد باب ماجاء فی الزہادۃ فی الدنیا۔

اِلٰی رُکۡنٍ شَدِیۡدٍ ۝ — تمہارے مقابلہ کی طاقت ہوتی یا میں

(ھود: ۸۰) — کسی زبردست سہارے کا آسرا پکڑ پاتا۔

اللہ تعالیٰ نے ایک آیت میں تمام بنی نوع انسان پر اپنا یہ احسان جتایا ہے:

اَللّٰہُ الَّذِیۡ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ ضُعۡفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنۡۢ بَعۡدِ ضُعۡفٍ قُوَّۃً

(الروم: ۵۴)

اللہ ہی (وہ قادرِ مطلق) ہے جس نے تم لوگوں کو کمزور حالت سے (جو ماں کے پیٹ میں ہوتی ہے) بنا کھڑا کیا پھر (طفلی کی) کمزوری کے بعد (جوانی کی) توانائی دی۔

اور مسلمانوں کو طاقتور بننے اور سامانِ جنگ سے آراستہ رہنے کا حکم دیا ہے:

وَاَعِدُّوۡا لَہُمۡ مَّا اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ قُوَّۃٍ وَّمِنۡ رِّبَاطِ الۡخَیۡلِ تُرۡہِبُوۡنَ بِہٖ عَدُوَّ اللّٰہِ وَعَدُوَّکُمۡ وَاٰخَرِیۡنَ مِنۡ دُوۡنِہِمۡ ۚ لَا تَعۡلَمُوۡنَہُمۡ ۚ اَللّٰہُ یَعۡلَمُہُمۡ ؕ

(الانفال: ۶۰)

اور (مسلمانو!) سپاہیانہ قوت سے اور گھوڑوں کے باندھے رکھنے سے جہاں تک تم سے ہو سکے کافروں کے (مقابلہ کے) لئے سازوسامان مہیا کئے رہو کہ ایسا کرنے سے اللہ کے دشمنوں پر اور اپنے دشمنوں پر اپنی دھاک بٹھائے رکھو گے اور (نیز) ان کے سوا دوسروں پر بھی جن کو تم نہیں جانتے۔ (اور) اللہ ان (کے حال) سے (خوب) واقف ہے۔

قرآن مجید کے ساتھ احادیث سے بھی قوت کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ طاقتور مسلمان خدا کے نزدیک کمزور مسلمان سے زیادہ بہتر اور زیادہ محبوب ہے[1]۔ اگرچہ متعدد حدیثوں

---

[1] مسلم کتاب القدر باب فی الامر بالقوۃ وترک العجز۔

میں ضعف کی فضیلت بھی بیان کی گئی ہے تاہم غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت یہ ضعف کی فضیلت نہیں بلکہ تواضع وخاکساری کی فضیلت ہے جو ایک قابلِ ستایش وصف ہے۔ اسی بنا پر بعض حدیثوں میں ضعف کا مقابلہ کبر وغرور کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

الا اخبرکم باھل الجنۃ	کیا میں تم کو بتاؤں کہ جنتی کون ہے؟ ہر
کلّ ضعیف متضعف الا	وہ شخص جو کمزور ہو اور لوگ اس کو کمزور
اخبرکم باھل النار کلّ	سمجھیں کیا میں تم کو بتاؤں کہ دوزخی کون
عتلّ جواظ متکبّر[1]	ہے؟ ہر اکھڑ، بدخو اور مغرور شخص۔

دوسری حدیث میں ہے :

احتجت النّار والجنۃ فقالت	دوزخ اور جنّت نے باہم مباحثہ کیا دوزخ
ھذہ یدخلنی الجبّارون	نے کہا مجھ میں جبّار اور متکبّر لوگ داخل ہوں گے
والمتکبّرون وقالت ھذہ	اور جنّت نے کہا کہ مجھ میں کمزور اور
یدخلنی الضّعفاء والمساکین[2]	مسکین لوگ۔

ان حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں ضعف بجائے خود قابلِ مدح وصف نہیں ہے بلکہ اس کو صرف اس لئے فضیلت حاصل ہے کہ وہ تواضع وخاکساری اور اس قسم کے دوسرے اوصاف کا مظہر ہے۔

اعوان وانصار کی کثرت ہمیشہ سے انسان کے لئے مابہ الامتیاز چیز رہی ہے۔ بالخصوص غیر متمدّن قومیں ہمیشہ کثرتِ مال اور کثرتِ اولاد پر فخر وغرور کرتی ہیں اور اس فخر وغرور کے نشہ میں

---

[1] بخاری کتاب الادب باب الکبر۔ [2] مسلم کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمہا باب النار یدخلہا الجبارون۔

دوسروں کو حقیر سمجھتی ہیں بلکہ خدا کو بھی بھلا دیتی ہیں۔ زمانۂ سابق میں اسی قسم کا ایک شخص تھا جس کو اپنی دولت اور اعوان و انصار کی کثرت پر بڑا ناز تھا۔ اور اس کا خیال تھا کہ یہ تمام چیزیں ہمیشہ قائم رہیں گی اور قیامت کبھی نہ آئے گی اور اگر آئی بھی تو قیامت میں بھی اس کی یہی شان قائم رہے گی۔ وہ اس حیثیت سے ایک دوسرے شخص کو حقیر سمجھ کر کہتا ہے:

اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّ اَعَزُّ نَفَرًا ○	میں تجھ سے زیادہ مالدار ہوں اور میرا جتھا (بھی) بڑا زبردست جتھا ہے۔

(الکہف: ۳۴)

دوسرا شخص نصیحت آمیز الفاظ میں کہتا ہے کہ ایک حقیر انسان کے لیئے اس قدر کبر و غرور جائز نہیں:

اَكَفَرْتَ بِالَّذِیْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ○	کیا تو اس (پروردگار) کا منکر ہے جس نے تجھ کو (پہلے) مٹی سے پھر نطفے سے پیدا کیا پھر تجھ کو پورا آدمی بنایا؟

(الکہف: ۳۷)

نتیجہ یہ ہوا کہ عذاب الہی نے اس کی دولت کو ملیامیٹ کر دیا اور اس کا جتھا ٹوٹ گیا اور اس کو معلوم ہو گیا کہ ایسی ناپائدار چیز فخر و غرور کے قابل نہیں۔ اہلِ عرب کو بھی اس پر بڑا ناز تھا اور وہ قبیلہ کی کثرت پر ہمیشہ فخر کیا کرتے تھے اور زندوں سے گذر کر مُردوں کی ذات پر بھی فخر کرتے تھے۔ اس فخر و غرور میں باہم مقابلہ ہوتا تھا اور اس مقابلہ کے لئے ایک خاص لفظ "تَکَاثُر" ایجاد ہو گیا تھا جس نے ان کو دینی امور سے غافل و بے پروا کر دیا تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایک خاص سورہ میں انسانوں کو خطاب کر کے اس پر سرزنش کی:

أَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝

(التکاثر: ۱-۲)

تم کو مال اور اولاد کی کثرت میں ایک دوسرے پر بڑھ جانے کی کوشش نے غافل بنا دیا ہے، یہاں تک کہ تم قبروں سے جا ملتے ہو۔

لیکن اسی کے ساتھ اسلام میں یہ چیز بالکل نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں بلکہ اجتماعی و ملّی حیثیت سے نسلی ترقی ایک قابلِ فخر چیز ہے، بشرطیکہ فخر و غرور کے بجائے اس سے حق کی نصرت کا کام لیا جائے۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

تزوجوا الودود الولود فانّی مکاثر بکم الامم

(ابوداؤد، کتاب النکاح، باب النہی عن تزویج من لم یلد من النساء)

محبت کیش اور بچے جننے والی عورت سے نکاح کرو، کیونکہ کثرت تعداد میں میں تم پر دوسری قوموں کے مقابل میں فخر کروں گا۔

آج تعداد کی اسی اقلیت و اکثریت کے مسئلہ نے قوموں اور ملکوں کی سیاست کا رخ بدل دیا ہے اور اسلام کی نگاہ سے یہ نکتہ چھپا نہ تھا۔

ریاء

ریار کے لغوی معنی دکھاوا اور نمایش کے ہیں۔ انسانی اعمال کی اصل حقیقت ان کی نیت اور غرض پر مبنی ہے اس کے لئے اعمال کی راستی وناراستی اور اچھائی اور برائی کا بہت کچھ مدار غرض ونیت پر ہے۔ صحیح حدیثوں میں ہے کہ انما الاعمال بالنیات "عمل نیت سے ہے" اور ریا اسی نیت یعنی اعمال کی غرض وغایت ہی کی بنیاد کو کھوکھلی کردیتی ہے جس سے ساری عمارت ہی بودی اور کمزور ہوجاتی ہے۔ نمایش کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی اچھائی اور برائی کا اظہار کرکے لوگوں میں اپنی نسبت حسن ظن پیدا کرے اور اپنے کو بڑا کرکے دکھائے۔ غرور بھی اسی شوق کا جذبہ ہے کیونکہ اس کا منشا بھی اپنے نفس کی بڑائی اور دکھاوے کے سوا کچھ اور نہیں۔ اسی لئے قرآن نے ان دونوں کو ایک ساتھ جگہ دی ہے اور ان کی برائی بیان کی ہے جہاد میں مسلمانوں کو حکم ہوا کہ محض اپنی طاقت کا غرور اور اپنی قوت کی نمایش تمہاری لڑائی کا مقصد نہ ہو بلکہ حق کی حمایت اور اللہ کی بات کو اونچا کرنا تمہارا مقصد ہو۔ فرمایا:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِم بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ (الانفال: ۴۷)

اور ان کافروں جیسے نہ بنو جو ملے شیخی کے اور لوگوں کے دکھانے کے لئے اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے۔

یہ ریا اور نمائش انسان کے ہر اس عمل میں ظاہر ہوتی ہے جو خالصتاً لوجہ اللہ نہ کیا جائے بلکہ اس سے کوئی اور دنیوی غرض مطلوب ہو۔ اسی بنا پر اسلام نے ریا کا نام شرکِ خفی اور شرک اصغر رکھا ہے کیونکہ دنیوی غرض کی آمیزش سے ان اعمال میں خدا کے ساتھ ایک اور چیز کو شریک کر لیا جاتا ہے اسی لئے خدا فرماتا ہے۔

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ	کیا تو نے اس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی
هَوٰىهُ ط	خواہش کو اپنا خدا بنا لیا ہے۔

(الفرقان: ۴۳)

ایک حدیث میں ہے کہ " اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں شرک سے بے نیاز ہوں تو جو شخص میرے لیے کوئی ایسا عمل کرے جس میں کسی اور کو بھی شریک کرے تو مجھ کو اس سے کوئی تعلق نہیں وہ اسی کے لئے ہے جس کو اس میں شریک کر لیا گیا ہے۔"

ایک صحابی روایت کرتے ہیں کہ قیامت کے دن جب خدا اگلوں اور پچھلوں کو جمع کرے گا تو ایک منادی پکارے گا کہ جس شخص نے اپنے اس عمل میں جو خدا کے لئے کیا گیا ہے، کسی اور کو شریک کر لیا ہے وہ اس کا ثواب اسی سے طلب کرے کیونکہ اللہ شرک سے بے نیاز ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ کو اپنی امت کی نسبت شرک کا سب سے زیادہ خوف ہے۔ لیکن میں یہ نہیں کہتا کہ وہ چاند، سورج اور بتوں کی پرستش کرنے لگے گی بلکہ خدا کے علاوہ اور لوگوں کے لئے یا کسی مخفی خواہش سے عمل کرے گی۔[1]

اسلام کی لغت میں کفر کے بعد برائی میں نفاق کا درجہ ہے۔ نفاق کیا ہے؟ یہ ہے کہ دل میں کچھ ہو اور زبان سے کچھ کہا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نفاق والے کے ایمان اور عمل خیر کی حقیقت ریا اور نمائش کے سوا کچھ نہیں رہ جاتی ہے۔ وہ دل سے تو خدا کا منکر ہوتا ہے لیکن

[1] سنن ابن ماجہ باب الریاء والسمعہ۔

خوف وخطر یا دوسرے دنیوی فائدوں کے لئے ظاہری طور پر مذہبی اعمال بجالاتا ہے۔ اس لئے قدرتی طور پر ان اعمال میں ریاکاری پائی جاتی ہے۔ اس بنا پر قرآن مجید میں جا بجا اس حیثیت سے منافقین کی برائی بیان کی گئی ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا	مسلمانو! اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور
صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰى	دسائل کو طعن دے کر اس شخص کی طرح
كَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ	اکارت مت کرو جو اپنا مال لوگوں کے
النَّاسِ وَ لَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ	دکھاوے کے لئے خرچ کرتا ہے اور اللہ
الْیَوْمِ الْاٰخِرِؕ	اور روزِ آخرت کا یقین نہیں رکھتا۔

(البقرة : ۲۶۴)

منافقوں کے ریاکارانہ اعمال کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کا مقصد ایک جماعت میں شامل رہنے کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا دوسرے یہ کہ ان کے ذریعہ سے لوگوں پر اثر ڈالنا اور ان کو اپنی طرف مائل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ پہلا مقصد چونکہ اعمال کے سرسری طور پر ادا کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے اس لئے وہ نہایت بے پروائی غفلت اور کاہلی کے ساتھ ادا کئے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس دوسرے مقصد کے حاصل کرنے کے لئے مصنوعی خشوع وخضوع للّٰہیت اور محویت واستغراق کا اظہار کرنا پڑتا ہے۔

عہدِ رسالت میں منافقین کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہ تھا کہ وہ ظاہری طور پر مسلمانوں کی جماعت میں شامل رہیں۔ اس لئے وہ اسلام کی روزانہ عبادت یعنی نماز کو سرسری طور پر نہایت بے پروائی کے ساتھ ادا کرتے تھے تاکہ لوگ اس ظاہری نمائش سے ان کو مسلمان سمجھتے رہیں۔ اسی لئے ایسے شخص کے عمل میں للّٰہیت اور خلوص نہیں پیدا ہو سکتا:

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ	منافق مسلمانوں کو دھوکا دے کر گویا خدا کو دھوکا
اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَاِذَا	دیتے ہیں حالانکہ حقیقت میں خدا ان ہی کو دھوکے
قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا	میں رکھتے ہے۔ اور یہ لوگ جب نماز کے لیے کھڑے
كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَ	ہوتے ہیں تو الکساتے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں
لَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝	(ظاہرداری کرکے) لوگوں کو دکھاتے ہیں اور
(النساء: ۱۴۲)	(دل سے) اللہ کو یاد نہیں کرتے مگر کچھ یوں ہی سا
فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ	تو ان (منافق) نمازیوں کی بڑی تباہی
هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝ ۙ	ہے جو اپنی نماز کی طرف سے غفلت کرتے
الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝	ہیں اور وہ جو (کوئی نیک عمل کرتے بھی ہیں تو
(الماعون: ۴-۶)	ریا کرتے ہیں)۔

سنن ابن ماجہ میں ہے کہ ایک بار صحابہ مسیح دجال کا ذکر کر رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم آنکلے اور فرمایا "کیا میں تم کو وہ چیز بتاؤں جو میرے نزدیک تمہارے لئے مسیح دجال سے بھی زیادہ خطرناک ہے؟" صحابہ نے کہا "ہاں"۔ فرمایا "شرک خفی" اور یہ کہ آدمی نماز کے لئے کھڑا ہو اور اس کو زیب و زینت کے ساتھ ادا کرے اس لئے کہ وہ یہ دیکھ رہا ہے کہ اس کو دوسرا شخص دیکھتا ہے[1]۔

چونکہ ریا اور نمائش اعمال کی اصلی شکل وصورت ہی کو بگاڑنا چاہتی ہے اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس کے ایک ایک ریشہ کی بیخ کنی ضروری سمجھی اور اپنی امت کو اس کی ہر گھات سے آگاہ فرمایا۔ چنانچہ انسان کی عام فطرت اور عرب کی مخصوص اخلاقی حالت کے لحاظ سے ریاکاری کی جو صورتیں پیدا ہو سکتی تھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ان سب کی ممانعت فرمائی۔ مثلاً ان میں پہلی چیز تو

---

[1] ابن ماجہ باب الریاء والسمعۃ

داد و دہش ہے جو عام طور پر نیک نامی شہرت اور عزت کا ذریعہ سمجھی جاتی ہے۔ بالخصوص عرب کے فضائل اخلاق میں نہایت نمایاں حیثیت رکھتی تھی اور لوگ محض نام و نمود کے لئے اپنا کل سرمایہ لٹا دیتے تھے۔ اسلام نے صدقہ وخیرات کا حکم دیا تو اس بداخلاقی کے ظاہر ہونے کا بھی خطرہ پیدا ہوا۔ اس لیے قرآن وحدیث میں باقاعدہ زکوٰۃ کو چھوڑ کر عام صدقہ وخیرات مخفی طور پر کرنے کی فضیلت بیان کی گئی تاکہ اس میں ریاکاری کی آمیزش نہ ہونے پائے:

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۭ	لوگو! اگر خیرات ظاہر میں دو تو وہ بھی اچھا کہ اس سے خیرات کے علاوہ دوسروں کو بھی ترغیب ہوتی ہے) اور اگر اس کو چھپاؤ اور حاجتمندوں کو دو تو تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے۔ کہ اس میں نام و نمود کا دخل نہیں ہونے پاتا۔
(البقرۃ: ۲۷۱)	

ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن جب کہ خدا کے سایہ کے سوا کوئی اور سایہ نہ ہوگا۔ خدا سات آدمیوں کو اپنے سایہ میں لے گا جن میں ایک شخص وہ ہوگا جس نے صدقہ اس طرح چھپا کر دیا کہ اس کے بائیں ہاتھ کو یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اس نے داہنے ہاتھ سے کیا دیا۔[1]

عرب کے محاسن اخلاق میں سب سے زیادہ نام و نمود کی جو چیز تھی وہ شجاعت تھی۔ اور اسلام نے جہاد کو فرض کر کے مسلمانوں کے لئے اظہار شجاعت کا بہترین موقع دیا تھا اس کے علاوہ جہاد کے ذریعہ سے اور بھی بہت سے ذاتی اور دنیوی فوائد حاصل ہو سکتے تھے اس لئے وہ ریاکاری کی نمایش گاہ بن سکتا تھا لیکن اسلام نے جہاد کو ان تمام اغراض سے پاک کر کے مسلمانوں کو اس کی اصلی حقیقت بتائی چنانچہ ایک بدو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ایک شخص مال غنیمت کے لئے ایک شخص شہرت

---

[1] بخاری کتاب الزکوٰۃ باب الصدقۃ بالیمین۔

کے لئے اور ایک شخص اظہارِ شجاعت کے لئے لڑتا ہے تو ان میں کس کا جہاد خدا کی راہ میں ہے؟ فرمایا "اس شخص کا جو اس لئے لڑتا ہے کہ خدا کا کلمہ بلند ہو"[1]

آپ سے سوال کیا جاتا ہے کہ ایک شخص اظہارِ شجاعت کے لئے لڑتا ہے، ایک شخص قومی حمیت سے اور ایک شخص ریاء سے جہاد کرتا ہے تو کس کا جہاد خدا کی راہ میں ہے۔ وہی پہلا جواب ملا۔[1]

ریاکاری کا ایک بڑا مظہر علمی فضیلت ہے اور یہ فضیلت خاص طور پر اسلام نے پیدا کی تھی اس لئے اس میں ریاکاری کی جو آمیزش ہو سکتی تھی اس کے نتائج بد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت مؤثر طریقہ سے بتائے۔ ایک حدیث میں ہے کہ سب سے پہلے قیامت کے دن اس شخص کے خلاف فیصلہ کیا جائے گا جس نے شہادت حاصل کی۔ یہ شخص خدا کے سامنے لایا جائے گا اور خدا اس پر اپنے احسانات جتا کر پوچھے گا کہ تم نے اس سے کیا کام لیا؟ وہ کہے گا کہ میں تیری راہ میں لڑا اور شہید ہوا۔ خدا کہے گا کہ جھوٹ کہتے ہو۔ تم صرف اس لئے لڑے کہ تم کو بہادر کہا جائے۔ اس کے بعد اس کو گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ پھر وہ شخص لایا جائے گا جس نے علم حاصل کیا، لوگوں کو علم سکھایا اور قرآن پڑھا۔ اس سے بھی اسی طرح سوال کیا جائے گا اور وہ جواب میں کہے گا کہ میں نے علم سیکھا علم سکھایا اور تیرے لیے قرآن پڑھا ارشاد ہوگا کہ جھوٹ کہتے ہو۔ تم نے علم اس لئے حاصل کیا کہ عالم کہے جاؤ، قرآن اس لئے پڑھا کہ قاری کہے جاؤ۔ پھر اسی طرح گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ اس کے بعد ایک دولت مند شخص لایا جائے گا اور اس سے بھی اسی طرح سوال کیا جائے گا۔ وہ کہے گا کہ مال خرچ کرنے کے جو طریقے تجھ کو پسند تھے میں نے سب میں اپنا مال صرف کیا۔ ارشاد ہوگا۔ کہ جھوٹ بکتے ہو۔ تم نے یہ سب صرف اس لئے کیا کہ لوگ تم کو فیاض کہیں۔ پھر اسی طرح اس کو گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔[2]

---

[1] مسلم کتاب الامارہ باب من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا فھو فی سبیل اللہ۔

[2] مسلم کتاب الامارہ باب من قاتل للریاء والسمعۃ استحق النار۔

خود بینی اور خود نمائی

خود بینی خود نمائی اور خود رائی اپنے نفس سے غیر معمولی محبت کا نتیجہ ہے۔ اس میں اور کبر میں یہ فرق ہے کہ کبر ایک اضافی چیز ہے یعنی متکبر آدمی اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھتا ہے لیکن خود بینی کے لئے تنہا انسان کی ذات کافی ہے۔ یہاں تک کہ اگر ایک انسان تنہا پیدا ہو تب بھی وہ اپنے اوصاف کمالیہ پر غلط ناز کر سکتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان کو اپنے اندر جو کمالات اور خوبیاں نظر آتی ہیں وہ ان پر کبھی ایسا فریفتہ ہو جاتا ہے کہ اپنے سوا ہر چیز اس کو پست اور حقیر معلوم ہوتی ہے اور یہ تمام کمالات اور خوبیاں اس کو ایسی معلوم ہوتی ہیں گویا وہ اس کی اختیاری ہیں، اور اسی کی اپنی پیدا کی ہوئی ہیں۔ اسی کا نام عُجب اور خود بینی ہے۔ اسی سے نفس میں خود نمائی اور خود رائی پیدا ہوتی ہے اور اکثر حالتوں میں وہ کبر و غرور کا سبب بن جاتی ہے۔

حنین کی لڑائی میں مسلمانوں کی تعداد کافروں سے زیادہ تھی۔ یہ دیکھ کر مسلمانوں میں عُجب پیدا ہوا کہ اب کون ہمارا مقابلہ کر سکتا ہے۔ خدا کو ان کی یہ شان پسند نہ آئی فوراً شکست کا اثر دکھائی دینے لگا۔ اب مسلمانوں کا یہ عُجب دور ہوا تب نصرتِ الٰہی نے ان کے پاؤں تھام لئے۔ اور شکست فتح سے بدل گئی۔ خدا نے فرمایا:

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا (التوبۃ:۲۵)

اور حنین کے دن جب تمہاری کثرت تعداد نے تم میں خود بینی پیدا کر دی تو اس تعداد کی کثرت نے کچھ کام نہ دیا۔

اسی لئے مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی کہ جب وہ جہاد کو نکلیں تو ان میں جھوٹا غرور اور خود بینی اور نمائش نہ پیدا ہو بلکہ اُن میں سے ہر ایک اخلاص اور ایثار کا پیکر ہو:

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ (الانفال:۴۷)

اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جو اپنے گھروں سے اتراتے اور لوگوں کو دکھاتے نکلے۔

یہ قریش کا نقشہ ہے جو بدر کے موقع پر صرف اپنی طاقت کے اظہار اور قوّت کی نمائش کو نکلے تھے۔

جب کسی قوم میں تمدّن کی وسعت، دولت کی بہتات اور خوشحالی عام ہو جاتی ہے تو افراد میں خود غرضی اور خود بینی کا مرض عام ہو جاتا ہے۔ نہ اللّٰہ کا فرض یاد رہتا ہے اور نہ بندوں کا حق۔ ہر شخص اپنی ہی دولت کے گھمنڈ میں رہتا ہے اور یہی ان کی تباہی کا وقت ہوتا ہے۔ فرمایا:

وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا (القصص:۵۸)

اور کتنی بستیاں ہم نے برباد کر دیں جب وہ اپنے گذران میں اترا چلیں۔

یہ تو چند بستیوں کی تباہی کا حال تھا لیکن ایک وقت آئے گا جب ساری دنیا ایک ساتھ برباد ہو جائے گی یعنی قیامت آئے گی تو اس بربادی کے دن کی جو نشانیاں آنحضرت صلی اللّٰہ علیہ وسلم

نے بتائی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ جب ہر شخص کو اپنی ہی رائے بھلی معلوم ہو گی اور اسی پر ناز کرے گا اور اترائے گا۔ اور یہی وہ موقع ہے جس میں ہر شخص کو اپنی فکر کرنی چاہیے[1]

مذہبی حیثیت سے جن لوگوں کی ظاہر حالت اچھی ہوتی ہے ان کو اسی عجب و خود بینی کی بنا پر اپنی پرہیز گاری کا بڑا دعویٰ ہوتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی تعلّی کی ممانعت فرمائی ہے:

فَلَا تُزَكُّوا أَنفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ	تو مت اپنی پاکیزگی ظاہر جتایا کرو،
بِمَنِ اتَّقَىٰ ○	پرہیزگاروں کو وہی خوب جانتا ہے۔
(النجم: ۳۲)	

قدیم مذہبی اور علمی شرف نے یہود و نصاریٰ میں عجب و خود بینی کا اس قدر مادہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو خدا کا محبوب اور فرزند سمجھنے لگے تھے:

وَقَالَتِ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَىٰ	اور یہود و نصاریٰ دعویٰ کرتے ہیں
نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ	کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے
(المائدۃ: ۱۸)	چہیتے ہیں۔
قُلْ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ هَادُوا	(اے پیغمبر! ان یہودیوں سے) کہو کہ
إِن زَعَمْتُمْ أَنَّكُمْ أَوْلِيَاءُ	اے یہود اگر تم کو اس بات کا گھمنڈ
لِلَّهِ مِن دُونِ النَّاسِ	ہے کہ اور تمام آدمیوں کو چھوڑ کر تم ہی
(الجمعۃ: ۶)	خدا کے چہیتے ہو۔

ان تمام آیتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عجب و خود بینی ایک فریب کا نام ہے اور جب اس فریب کا پردہ چاک ہو جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حقیقت جلوۂ سراب ہے

---

[1] ابو داؤد کتاب الملاحم۔

زیادہ نہ تھی۔ لیکن معاشرتی اور سیاسی حیثیت سے تو یہ پردہ دنیا ہی میں چاک ہو جاتا ہے مگر مذہبی حیثیت سے آخرت میں چاک ہوگا۔

اس عیب کا مادہ جن ذرائع سے پیدا ہوتا ہے اسلام نے ان کا پورا انسداد کیا ہے۔ حدیث میں ہے کہ ایک شخص کسی کی مبالغہ آمیز طریقہ پر تعریف کر رہا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے سنا تو فرمایا کہ "تم نے اس کو ہلاک کر دیا"۔ ایک بار آپؐ کے سامنے کسی کا ذکر آیا تو ایک شخص نے اس کی تعریف کی۔ آپؐ نے فرمایا کہ "تم نے اس کی گردن کاٹ لی۔ اگر کسی کی تعریف ہی کرنا ہے تو یہ کہو کہ میں اس کو ایسا سمجھتا ہوں[1]"۔ مدح کی یہ ممانعت اس لئے کی گئی ہے کہ اس سے ممدوح میں عُجب و خود بینی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

لیکن اس بیماری کا سب سے بہتر علاج یہ ہے کہ کوئی اپنی کسی خوبی کو اپنی کوشش کا نتیجہ نہ سمجھے، بلکہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور عطیہ سمجھے۔ اسی لئے بار بار اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے ذکر میں بندوں کے سامنے اس پہلو کو نمایاں کیا ہے۔ فرمایا:

لَا تَفْرَحُوا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ؕ	خدا نے جو دیا ہے اس پر اتراؤ نہیں۔
(الحدید: ۲۳)	

---

[1] بخاری کتاب الادب باب مایکرہ من التمادح۔

فضول خرچی

فضول خرچی یہ ہے کہ انسان اپنی حیثیت اور موقع کی ضرورت سے زیادہ خرچ کرے چونکہ اسلام عرب میں آیا، اور عربوں کی فیاضی فضول خرچی کی حد تک تھی اس لئے تمام مذہبوں میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے فضول خرچی کو روکا ہے اور انسان کو اپنی حد میں رہ کر خرچ کرنے کا حکم دیا ہے۔ کیونکہ فضول خرچی کی عادت سے قومی سرمایہ بہت بری طرح برباد ہو کر فنا ہوجاتا ہے اور اس بے موقع خرچ سے جماعت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، نیز فضول خرچی عموماً فخر و غرور اور نمائش کے پردہ میں ظاہر ہوتی ہے اور ان بداخلاقیوں کی بُرائی چھپی نہیں۔

اہل عرب جب جلسوں میں شراب پیتے اور جوا کھیلتے تو جوسے میں جو کچھ جیتتے نشہ کے ترنگ میں اسی وقت لٹا دیتے، جانور ملتے تو اسی وقت بے وجہ ذبح کر ڈالتے جاہلیت کی شاعری میں اس قسم کے فخریہ اشعار بکثرت ہیں۔ شہرت طلبی کی ایک صورت یہ تھی کہ دو شخص فیاضی کے اظہار کے لئے اونٹ پر اونٹ ذبح کرتے جاتے تھے یہاں تک کہ دونوں میں سے ایک کے تمام اونٹ ختم ہوجاتے تھے تو وہ اپنے حریف کے مقابل میں مغلوب سمجھا جاتا تھا، اس کو معاقرہ کہتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس ریائی فیاضی کو روک دیا۔[1]

---

[1] ابو داؤد: باب ما جاء فی اکل معاقرۃ الاعراب۔

اہل عرب کی فیاضی کی بنیاد اکثر فخر و غرور اور نام و نمود پر قائم تھی اور اس نے ان کی فیاضی میں بے اعتدالی پیدا کر دی تھی۔ اس کا دینی نتیجہ یہ تھا کہ خلوص کے نہ ہونے سے وہ خدا کے نزدیک مقبول نہ تھی اور دنیوی حیثیت سے بعض اوقات وہ تمام مال و دولت اُڑا کر خود مفلس اور قلاّش ہو جاتے تھے۔ پھر اس قسم کی فیاّضی کے لئے جائز مال کافی نہیں ہوتا تھا وہ لوگ لُوٹ مار سے مال جمع کرتے تھے اور نمائش کے موقعوں پر اسی مال کو خرچ کرتے تھے۔ اس بے اعتدالی کے دور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے حقوق مقرر فرمائے اور فضول خرچ کو شیطان کے بھائی کا لقب دیا۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ	اور رشتہ دار اور غریب اور مسافر (ہر ایک)
وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ	کو اس کا حق پہنچاتے رہو اور (دولت کو)
تَبْذِيْرًا ۝ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ	بے جا مت اُڑاؤ (کیونکہ دولت کے)
كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَ	بیجا اڑانے والے شیطانوں کے بھائی
كَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ۝	ہیں، اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا
(بنی اسرائیل: ۲۶-۲۷)	ہی ناشکرا ہے۔

آیت کے اخیر ٹکڑے سے ثابت ہے کہ فضول خرچی خدا کی ناشکری ہے۔ امام رازیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"بعض علماء کا قول ہے کہ اس آیت کا مفہوم اہل عرب کی عادت کے موافق ہے کیونکہ وہ لوگ لُوٹ مار سے مال جمع کرتے تھے پھر اس کو فخر و غرور کے حاصل کرنے کے لئے صرف کرتے تھے۔"

آج بھی جو لوگ شادی بیاہ اور خوشی و غم کی تقریبوں میں اس قسم کی فضول خرچیوں کے مرتکب ہوتے ہیں وہ قرآن کی اصطلاح میں شیطان کے بھائی کہلائیں گے۔ یہ تعلیم فیاّضی کے خلاف

نہیں ہے کیونکہ فیاضی بخل و اسراف کے درمیان کا نام ہے۔ اور اسی کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے اور بتا دیا ہے کہ فضول خرچی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم مفلس اور تہی دست ہو کر کسی کام کے نہیں رہو گے بلکہ اُلٹے تمہیں کو لوگ قابلِ ملامت ٹھہرائیں گے:

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا ۝	اور اپنا ہاتھ نہ تو اتنا سیکڑو کہ (گویا) گردن میں بندھا ہے اور نہ بالکل اس کو پھیلا ہی دو (ایسا کرو گے) تو تم ایسے بیٹھے رہ جاؤ گے کہ لوگ تم کو ملامت بھی کریں گے
(بنی اسرائیل: ۲۹)	(اور) تم تہی دست بھی ہو گے۔

چونکہ یہ اعتدال کا وصفِ خاص اسلام کی اخلاقی تعلیم نے پیدا کیا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو مسلمانوں کا امتیازی وصف قرار دیا اور فرمایا:

وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا ۝	اور خرچ کرنے لگیں تو فضول خرچی نہ کریں اور نہ بہت تنگی کریں بلکہ اُن کا خرچ افراط اور تفریط کے درمیان بیچ
(الفرقان: ۶۷)	کا ہو۔

کوئی اس تعلیم کا یہ نتیجہ نہ سمجھے کہ اسلام بدحیثیتی کو پسند کرتا ہے اور کھانے پینے، پہننے اوڑھنے میں ہر قسم کی کفایت شعاری کا حوصلہ بڑھاتا ہے بلکہ یہ سمجھنا چاہیئے کہ ہر شخص کو اپنی چادر کے اندر رہنا چاہیئے اور اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ نہیں کرنا چاہیئے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کی فضول خرچی کا معیار خود اسی کی اپنی ذات ہے۔ سورہ اعراف میں خدا فرماتا ہے:

وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا ۚ	اور کھاؤ اور پیو اور فضول خرچی نہ کرو۔

إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ○ (الاعراف: ۳۱)

بے شک اللہ فضول خرچی کرنے والوں کو پیار نہیں کرتا۔

صدقات اور خیرات سے بڑھ کر تو کوئی نیکی کا کام نہیں مگر اس میں بھی بعض مفسّروں کے قول کے مطابق اپنی حیثیت سے بڑھ کر دینا پسندیدہ نہیں:

كُلُوا مِنْ ثَمَرِهٖٓ إِذَآ أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ ۖ وَلَا تُسْرِفُوا ۚ إِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ ○ (الانعام: ۱۴۱)

درخت کے پھل سے جب وہ پھلے تم کھاؤ اور اس کا حق ادا کرو جب فصل کٹے اور حد سے آگے نہ بڑھو، اللہ حد سے آگے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

حسد

اگر ایک شخص پر اللہ تعالیٰ اپنا کوئی احسان کرے مثلاً اس کو علم و فضل، مال و دولت عزت و شہرت یا اور کوئی دینی یا دنیوی نعمت عطا فرمائے تو ان چیزوں کو دیکھ کر اگر کسی دوسرے شخص کے دل میں ان کے حاصل کرنے کی خواہش ہو تو اس کو رشک و منافست کہتے ہیں اور یہ کوئی بداخلاقی نہیں بلکہ دینی امور میں پسندیدہ ہے۔ لیکن اگر وہ ان چیزوں کو دوسرے کے لئے پسند نہ کرے اور اس کی یہ خواہش ہو کہ خدا کی یہ نعمتیں اس سے چھین لی جائیں تو اسی کا نام حسد ہے۔ اور قرآن مجید سے بھی یہی تعریف مستنبط ہوتی ہے کیونکہ عہد رسالت میں خدا تعالیٰ نے مسلمانوں پر اپنا خاص احسان یہ کیا تھا کہ ان کو قرآن و ایمان کی دولت عطا فرمائی تھی جس کو دیکھ کر مسلمانوں کے حاسد یعنی یہود جلے مرتے تھے:

اَمْ یَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰی	یا خدا نے جو اپنے فضل سے لوگوں
مَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ ۚ	کو نعمت (قرآن) عطا فرمائی ہے
(النسآء: ۵۴)	اس پر جلے مرتے ہیں۔

اور ان کی خواہش تھی کہ یہ دولت مسلمانوں سے چھین لی جائے:

وَدَّ کَثِیْرٌ مِّنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ	(مسلمانو!) اکثر اہل کتاب اپنے دلی

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم (البقرة: ۱۰۹)

حسد کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ تمہارے ایمان لائے پیچھے پھر تم کو کافر بنا دیں۔

حسد کی تین قسمیں اور درجے ہیں:

(۱) یہ کہ ایک شخص کی صرف یہ خواہش ہو کہ دوسرے سے ایک نعمت سلب کر لی جائے گو وہ اُس کو نہ حاصل ہو سکے یا وہ اس کو خود حاصل نہ کرنا چاہے۔ حسد کی مذموم ترین قسم یہی ہے اور اسی بنا پر منافقین کی خواہش یہ تھی کہ مسلمان بھی ان ہی کی طرح کافر ہو جائیں۔

وَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ كَمَا كَفَرُوا فَتَكُونُونَ سَوَاءً (النسآء: ۸۹)

ان منافقوں کی خواہش یہ ہے کہ جس طرح خود کافر ہو گئے ہیں اسی طرح تم (سچے مسلمان) بھی کفر کرنے لگو (اور وہ) اور تم (سب) ایک ہی طرح کے ہو جاؤ۔

(۲) دوسرے یہ کہ اس کی خواہش یہ ہو کہ وہ نعمت اس کو حاصل ہو جائے۔ اس صورت میں اس کا مقصود بالذات تو صرف اس نعمت کا حاصل کرنا ہوتا ہے لیکن چونکہ بعض اوقات جب تک وہ نعمت دوسرے سے چھین نہ لی جائے اس کو مل نہیں سکتی اس لئے بالعرض اس کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ دوسرے سے سلب کر لی جائے۔

(۳) تیسرے یہ کہ ایک شخص خود اسی قسم کی نعمت حاصل کرنا چاہے لیکن اس کی یہ خواہش نہ ہو کہ وہ دوسرے سے سلب کر لی جائے۔

ان میں پہلی صورت حسد کی مذموم ترین قسم ہے۔ دوسری صورت میں چونکہ زوال نعمت بالذات مقصود نہیں ہوتا اس لئے اس کو حقیقی معنوں میں حسد تو نہیں کہہ سکتے تاہم قرآن مجید میں ہے:

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ (النساء: ۳۲)

اور خدا نے جو تم میں سے ایک کو دوسرے پر برتری دے رکھی ہے اس کا کچھ ارمان نہ کرو۔

اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو نعمت کسی کو حاصل ہو بعینہٖ اس کی خواہش کرنا پسندیدہ نہیں ہے اس لئے یہ بھی مذموم ہے۔ البتہ اس کے مثل دوسری نعمت کی خواہش کرنا مذموم نہیں۔ اسی لئے فرمایا:

وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ (النساء: ۳۲)

اور خدا سے اس کا فضل مانگو۔

تیسری صورت بالکل مذموم نہیں بلکہ دینی امور میں مستحسن ہے اور شریعت میں اسی کو منافست کہتے ہیں۔

حسد کے سات اسباب ہیں:

(۱) بغض و عداوت۔ کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص کے نزدیک دشمن کی برائی اور بھلائی دونوں یکساں ہوں اس لئے ایک دشمن کی طبعی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کے دشمن پر مصیبت آئے اور جب یہ مصیبت آتی ہے تو وہ خوش ہوتا ہے۔ اس کے بجائے جب خدا اس پر کوئی احسان کرتا ہے تو وہ اس کو پسند نہیں کرتا اور اسی کا نام حسد ہے۔

کفار اور منافقین کو مسلمانوں کے ساتھ جو عداوت تھی وہ اسی حسد آمیز طریقہ سے ظاہر ہوتی تھی:

وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۚۖ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ (آل عمران: ۱۱۸)

چاہتے ہیں کہ تم کو تکلیف پہنچے دشمنی تو ان کی باتوں سے ظاہر ہو ہی چکی ہے اور (غیظ و غضب) جو ان کے دلوں میں بھرے ہیں وہ اس سے بھی بڑھ کر ہیں۔

إِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا ط

(مسلمانو!) اگر تم کو کوئی فائدہ پہنچے تو ان کو برا لگتا ہے اور اگر تم کو کوئی گزند پہنچے تو اس سے خوش ہوتے ہیں۔

(آل عمران: ۱۲۰)

بغض و عداوت کی وجہ سے جو حسد پیدا ہوتا ہے اس کے لئے مساوات شرط نہیں بلکہ ایک ادنیٰ آدمی بھی بڑے سے بڑے شخص کا بدخواہ ہو سکتا ہے۔

(۲) حسد کا دوسرا سبب ذاتی فخر کا غلط خیال ہے کیونکہ امثال و اقران میں جب ایک شخص کسی بلند منصب پر پہنچ جاتا ہے تو یہ اس کے دوسرے ہم چشموں کو گراں گذرتا ہے اور وہ اس کے اس ترقع کو پسند نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ یہ منصب اس سے چھن جائے تاکہ وہ ان کے مساوی ہو جائے۔

(۳) حسد کا تیسرا سبب یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کو اپنا مطیع و منقاد بنانا چاہتا ہے۔ اس لئے جب وہ کسی شرف و امتیاز کی وجہ سے اس کے حلقۂ اطاعت سے نکل جاتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ اس کا یہ شرف جاتا رہے تاکہ وہ اس کا مطیع و منقاد ہو سکے۔ کفارِ قریش اسی بنا پر مسلمانوں کی حقیر جماعت کو دیکھ کر کہتے تھے:

أَهٰؤُلَاءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْ بَيْنِنَا ط

کیا یہی (ذلیل) لوگ ہیں جن پر اللہ نے ہم میں سے (اسلام کی توفیق دے کر) اپنا فضل کیا ہے؟

(الانعام: ۵۳)

حسد کا یہ سبب اکابر و اشراف سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے لئے کبر و غرور اور دوسروں کی تحقیر و تذلیل لازمی ہے۔

(۴) حسد کا چوتھا سبب یہ ہے کہ لوگ اپنے پندار میں جس کو معمولی آدمی سمجھتے ہیں اس کو کوئی

غیر معمولی شرف حاصل ہوجاتا ہے تو ان کو تعجب ہوتا ہے اور اسی تعجب کی بنا پر وہ اس کے اس شرف کا انکار کرتے ہیں۔ کفار اسی وجہ سے پیغمبروں کی رسالت کا انکار کرتے تھے اور تعجب سے کہتے تھے:

اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا (بنی اسرائیل: ۹۴)	کیا خدا نے آدمی (کو) پیغمبر (بنا کر) بھیجا ہے؟

(۵) حسد کا پانچواں سبب یہ ہے کہ جب دو شخصوں کا مقصد ایک ہوتا ہے تو دونوں باہم ایک دوسرے کو رشک و حسد کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان میں جب ایک کو اس مقصد میں کامیابی حاصل ہوجاتی ہے تو دوسرا قدرتی طور پر اس کا بدخواہ ہوجاتا ہے۔ ایک شوہر کی متعدد بیویوں اور ایک باپ کے متعدد بیٹوں میں جو رشک و حسد ہوتا ہے اس کی وجہ یہی ہوتی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اُن کے قتل کرنے کی جو سازش کی تھی اس کا سبب یہی تھا:

اِذْ قَالُوْا لَيُوْسُفُ وَ اَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا وَ نَحْنُ عُصْبَةٌ ؕ (یوسف: ۸)	جب یوسف کے علاتی بھائیوں نے (آپس میں) کہا کہ باوجودیکہ ہم (حقیقی بھائیوں) کی بڑی جماعت ہے تاہم یوسف اور اس کا (حقیقی) بھائی (دنیا میں) ہمارے والد کو ہم سے البتہ بہت ہی زیادہ عزیز ہیں۔

(۶) حسد کا چھٹا سبب جاہ پرستی اور ریاست طلبی ہے۔ اس لیے جو لوگ اس حیثیت سے یگانۂ روزگار ہونا چاہتے ہیں جب ان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اور شخص اس میں ان کا شریک و سہیم ہوگیا ہے تو یہ ان کو سخت گراں گذرتا ہے اور ان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ جس شرف و امتیاز سے دوسرا شخص جاہ و منزلت میں ان کا شریک ہوگیا ہے وہ اس سے چھن جائے۔

مسلمانوں کے ساتھ یہود اسی لیے حسد رکھتے تھے کہ اسلام سے پہلے ان کو علمی اور مذہبی حیثیت سے اہل عرب پر تفوّق حاصل تھا۔ لیکن اسلام کی وجہ سے ان کا یہ تفوّق جاتا رہا اس لیے وہ اسلام ہی کی بیخ کنی پر آمادہ ہوگئے۔ منافقین میں عبداللہ بن ابی کو اہلِ مدینہ اپنا بادشاہ بنانا چاہتے تھے لیکن اسلام نے اس کی اس شاہانہ ریاست کا خاتمہ کر دیا۔ اس لئے اس کو یہ سخت ناگوار ہُوا اور اسی ناگواری کی وجہ سے ایک مجمع میں وہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ گستاخانہ پیش آیا۔[1]

(۷) حسد کا ساتواں سبب خُبثِ نفس اور بدطینتی ہے کیونکہ بعض اشخاص کی فطرت ہی ایسی ہوتی ہے کہ جب کسی کو بہتر حالت میں دیکھتے ہیں تو ان کو ناگوار ہوتا ہے اور جب کسی پر مصیبت آتی ہے تو ان کو مسرت ہوتی ہے۔ اس صورت میں حسد کے پیدا ہونے کے لئے اشتراک، رابطہ یا کسی اور خواہش کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اس قسم کے خبیث النفس لوگ ہر شخص پر حسد کرتے ہیں۔

حسد کے یہ اسباب زیادہ تر اُن لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں جن میں کوئی چیز مابہ الاشتراک ہوتی ہے۔ اس لئے بیگانوں میں یہ جذبہ پیدا نہیں ہوتا بلکہ صرف ان لوگوں میں پیدا ہوتا ہے جن میں باہم ربط و اشتراک ہوتا ہے۔

ایک عالم دوسرے عالم پر، ایک عابد دوسرے عابد پر اس لیے حسد کرتا ہے کہ ان میں ایک چیز یعنی علم و عبادت مشترک ہے۔ اس کے بخلاف ایک عالم یا عابد کو کسی تاجر پر حسد نہیں ہوتا کیونکہ ان میں کوئی چیز مابہ الاشتراک نہیں۔

اسلام نے مسلمانوں میں باہم اخوّت کا رشتہ قائم کرکے نہایت وسیع اور عالمگیر اشتراک پیدا کر دیا تھا اس لئے اُن میں حسد کا جذبہ نہایت آسانی کے ساتھ پیدا ہو سکتا تھا اور حسد کے جس قدر اسباب و مراتب ہیں وہ سب کے سب اس وسیع برادری میں جمع ہو سکتے تھے۔ اس لئے اصولاً

---

[1] بخاری کتاب الاستیذان باب التسلیم فی مجلس فیہ اخلاط من المسلمین والمشرکین۔

جو بداخلاقیاں اس اخوت کا شیرازہ برہم کر سکتی تھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب سے مسلمانوں کو بچنے کی ہدایت کی اور فرمایا۔

ایاکم والظن فان الظن اکذب	بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی سب سے
الحدیث ولاتحسسوا ولاتجسسوا	زیادہ جھوٹی بات ہے۔ نہ لوگوں کے عیوب
ولاتحاسدوا ولاتدابروا و	کی ٹوہ لگاؤ نہ باہم حسد کرو نہ ایک دوسرے
لاتباغضوا وکونوا عباد اللہ اخوانا	بے تعلق رہو، نہ باہم بغض رکھو۔ بلکہ اے
بخاری، کتاب الادب باب ماینہی عن التحاسد والتدابر	خدا کے بندو بھائی بھائی ہو جاؤ۔

حافظ ابن حجرؒ نے اس حدیث کی شرح میں قرطبی کا یہ قول نقل کیا ہے۔

المعنی کونوا کاخوان النسب	اس کے معنی یہ ہیں کہ رحم و شفقت،
فی الشفقۃ والرحمۃ والمحبۃ	غمخواری محبت، اعانت اور خیرخواہی میں
والمواساۃ والمعاونۃ والنصیحۃ	نسبی بھائیوں کی طرح ہو جاؤ۔

لیکن یہ اخوت اسی وقت قائم رہ سکتی ہے جب ان تمام بداخلاقیوں سے احتراز کیا جائے ورنہ اس کے بجائے دشمنی پیدا ہو جائے گی اور یہ اور اس قسم کے تمام محاسنِ اخلاق جو اخوت کا لازمی نتیجہ ہیں یا ان سے اخوت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے فنا ہو جائیں گے۔

چنانچہ حافظ ابن حجرؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں۔

کانہ قال اذا ترکتم ھذہ	گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا
المنھیات کنتم اخوانا و	کہ جب تم لوگ ان منہیات کو چھوڑ دو گے تو
مفھومہ اذا لم تترکوھا	بھائی بھائی ہو جاؤ گے اور اس کا مفہوم یہ ہے
تصیروا اعداء ومعنی کونوا	کہ جب ان کو نہ چھوڑو گے تو دشمن ہو جاؤ گے

اخواناً اكتسبوا ما تصيرون	اور بھائی بھائی بننے کے معنی یہ ہیں کہ وہ
به اخواناً مما سبق ذكره	اخلاقی خوبیاں حاصل کرو جن کی وجہ سے
وغير ذلك من الامور	بھائی بھائی بن جاؤ۔ اور یہ اخلاقی خوبیاں
المقتضية لذلك نفياً و	وہ ہیں جن کا ذکر اوپر گذرا اور ان کے علاوہ
اثباتاً	اور بھی بہت سے امور ہیں جو اخوت کو نفیاً یا
(فتح الباری۔ ج۔ ۱۰۔ ص ۴۰۳)	اثباتاً پیدا کرتے ہیں۔

ان بداخلاقیوں میں سب سے زیادہ خطرناک چیز حسد ہے کیونکہ وہ ایک ایسا جذبہ ہے جس سے بمشکل کوئی دل خالی ہو سکتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ کوئی شخص شگون، بدگمانی اور حسد سے خالی نہیں ہو سکتا۔ کہا گیا کہ ان سے نکلنے کی کیا صورت ہے۔ فرمایا شگون کا خیال پیدا ہو تو جو کرنا چاہتے ہو اس کی وجہ سے اس کو مت چھوڑ دو اور جب بدگمانی پیدا ہو تو اس کو سچ مت سمجھو اور جب حسد پیدا ہو تو ظلم پر آمادہ نہ ہو جاؤ۔[1] لیکن اگر عملی طور پر اس حسد کا اظہار ہوا تو اسلام کے تمام محاسن اخلاق کا خاتمہ ہو جائے گا اور یہ شرارہ خرمن اسلام کو پھونک کر خاک سیاہ کر دے گا اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر حسد سے بچنے کی ہدایت کی اور فرمایا۔

اياكم والحسد فان الحسد	تم لوگ حسد سے بچو کیونکہ حسد نیکیوں کو اس
يأكل الحسنات كما تأكل	طرح کھا جاتی ہے جس طرح آگ لکڑی کو
النار الحطب[2]	کھا جاتی ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاقی حیثیت سے حسد نہایت خطرناک چیز ہے اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ہر مسلمان کو اس کے خطرہ سے پناہ مانگنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ ○ (الفلق: ۵)	اور برا چاہنے والے کی بدی سے جب وہ حسد کرے۔

---

[1] مصنف عبدالرزاق بحوالہ فتح الباری جلد ۱۰ ص ۴۰۲ بمصر [2] ابو داؤد کتاب الادب باب فی الحسد

فحش گوئی

فحش گوئی کی مختلف قسمیں ہیں، ایک قسم تو قوتِ شہوانیہ سے تعلق رکھتی ہے اور اس کے مرتکب زیادہ تر رِند، بیباک نوجوان اور بے تکلّف دوست واحباب ہوتے ہیں۔ مثلاً جب اس قسم کی بے تکلفانہ اور رِندانہ صحبتیں قائم ہوتی ہیں تو عورتوں کے حُسن وجمال کا ذکر ہوتا ہے، اور اس سلسلہ میں اس قسم کے حالات وواقعات بیان کیے جاتے ہیں جو بعض اوقات شرمناک حد تک پہنچ جاتے ہیں۔

عربی زبان میں اس قسم کی فحش گوئی کو رفث کہتے ہیں، اور قرآن مجید کی اس آیت میں:

فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ (البقرة: ۱۹۷)

حج کے دنوں میں نہ شہوت کی کوئی بات کرنی چاہیے نہ گناہ کی اور نہ لڑائی کی۔

اسی کی ممانعت کی گئی ہے۔ لیکن زمانۂ حج کی تخصیص اس لئے کی گئی ہے کہ اس زمانہ میں مردوں اور عورتوں کا عام اجتماع ہوتا ہے اور اس سفر میں پردے کی پوری پابندی مشکل ہوتی ہے[1] اس لئے اس قسم کے چرچے نہایت آزادی کے ساتھ کیے جاسکتے ہیں حالانکہ یہ زمانہ صرف ذکرِ الٰہی کا ہوتا ہے، ورنہ حج کی کوئی تخصیص نہیں بلکہ اسلام میں عام طور پر اس قسم کی فحش گوئی ممنوع ہے۔ چنانچہ سنن ابی داؤد میں ہے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں اور مردوں کے ایک[1] مجمع میں خطبہ دیا، اور

---

[1] دونوں کی نشستیں الگ تھیں۔

حمد و ثنا کے بعد مردوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ "کیا تم میں کوئی ایسا آدمی ہے جو اپنی بی بی کے پاس جاتا ہے تو دروازہ بند کر لیتا ہے اور اس پہ پردہ ڈال دیتا ہے اور اس طرح خدا کے پردہ میں چھپ جاتا ہے؟" لوگوں نے کہا "ہاں" پھر فرمایا کہ "اس کے بعد لوگوں کی صحبتوں میں بیٹھتا ہے تو کہتا ہے کہ میں نے یہ کیا، میں نے یہ کیا۔" اس پر سب لوگ خاموش ہو رہے۔ پھر عورتوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ "کیا تم سب اس قسم کے واقعات بیان کرتی ہو؟" اس پر ایک عورت نے دو زانو بیٹھ کر کہا کہ "ہاں مرد اور عورت دونوں اس قسم کے واقعات بیان کرتے ہیں۔" فرمایا "تم لوگ جانتے ہو کہ اس کی کیا مثال ہے؟ اس کی مثال اُس چڑیل کی ہے جو گلی میں ایک شیطان سے ملی اور اس نے اس سے مباشرت کی حالانکہ لوگ اس کو دیکھ رہے تھے۔"[1]

مقصود یہ ہے کہ علانیہ کرنا اور کھول کر بیان کرنا دونوں کی بے شرمی کی صورت یکساں ہے۔

اس فحش گوئی کی ممانعت کا فلسفہ یہ ہے کہ حدود الٰہی کی حرمت کا تخیل ہر حال میں برقرار رہے ورنہ جب باتیں زبانوں پر آئیں گی تو وہ اپنی اہمیت کھو دیں گی اور قول عمل کے لئے ایک دن راستہ صاف کر دے گا۔ یہی سبب ہے کہ اس قسم کی باتوں کے بیان کے لئے جب ناگزیر ضرورتیں پیش آتی ہیں تو مجاز و استعارہ کی زبان میں ان کو ادا کیا جاتا ہے تاکہ مدعا ظاہر ہو، اور شرم کا پردہ بھی ڈھکا رہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اس قسم کے واقعات مجاز و استعارہ ہی کے پردہ میں بیان کئے گئے ہیں مثلاً

وَقَدْ أَفْضَىٰ بَعْضُكُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ (النساء:۲۱)	حالانکہ تم ایک دوسرے تک پہنچ چکے (یعنی میاں بی بی ہم صحبت ہو چکے)۔
أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ (النساء:۴۳)	یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو (یعنی اُن سے صحبت کی ہو)۔

---

[1] ابوداؤد کتاب النکاح باب مایکرہ من ذکر الرجل مایکون من اصابتہ اہلہ۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا قول ہے کہ خدا شرمیلا اور شریف ہے اسی لئے اس نے جماع کو کنایۃً لمس (چھونے) کے لفظ سے بیان کیا ہے۔ اسلام نے اس کے لئے اور جو الفاظ پیدا کئے ہیں جو فقہی مسائل کی تشریح میں مجبوراً آتے ہیں گو وہ اب عام استعمال کی وجہ سے تصریح کے درجہ کو پہنچ چکے ہیں لیکن درحقیقت وہ سب کے سب کنائے اور استعارے ہیں۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق پائخانہ، پیشاب، اور دوسرے نفرت انگیز اور شرمناک امراض کا ذکر بھی کنایۃً کرنا چاہیے پائخانہ اور پیشاب کے لئے احادیث میں "قضائے حاجت" کا لفظ مستعمل ہے جو ایک کنایہ ہے۔ قرآن مجید میں اس کے لئے غائط کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو لغت میں نشیب زمین کو کہتے ہیں۔

أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِّنكُم مِّنَ الْغَائِطِ — یا تم میں سے کوئی پست زمین سے (ہوکر) آیا ہو۔

(النساء: ۴۳)

چونکہ عام طور پر لوگ اس مقصد کے لئے پست زمین کو پسند کرتے ہیں، اس لئے استعارۃً اس سے پائخانہ مراد لیا گیا۔

اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ پائخانہ بھی ایک استعارہ ہے جس کی اصل پائین خانہ ہے چونکہ پائخانے عموماً مکانوں کے کنارے بنائے جاتے ہیں اس لئے استعارۃً ان کو پائین خانہ کہا گیا پھر تخفیف کے اصول کے مطابق پائخانہ ہو گیا اور اب کثرت استعمال سے اس میں استعارہ کی شان باقی نہ رہی۔ قرآن مجید میں خداوند تعالیٰ نے "برص" کی تعبیر "سوء" کے لفظ سے کی ہے جس کے معنی برائی یا عیب کے ہیں۔

وَاضْمُمْ يَدَكَ إِلَىٰ جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاءَ مِنْ غَيْرِ سُوءٍ آيَةً أُخْرَىٰ ۝ — اور اپنے ہاتھ کو سکیڑ کر اپنی بغل میں رکھ لو (اور پھر نکالو) تو وہ بدون اس کے کہ کسی طرح کا روگ ہو سفید (براق) نکلے گا (اور یہ) دوسرا معجزہ ہے۔

(طٰہٰ: ۲۲)

فحش گوئی کی دوسری قسم کا تعلق قوتِ غضبیہ سے ہے جس کا نام سب وشتم یا گالی گلوچ ہے اور یہ صُورت عموماً جنگ وجدل کے موقع پر پیش آتی ہے۔ زمانہ حج میں چونکہ عام اجتماع ہوتا ہے اور اس حالت میں لڑائی جھگڑے کا زیادہ امکان ہوتا ہے اس لئے خداوند تعالیٰ نے ایک لفظ "فسق" سے اس کی ممانعت کی:

فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ (البقرۃ: ۱۹۷)	حج کے دنوں میں نہ شہوت کی کوئی بات کرنی چاہیئے، نہ فسق کی، نہ جھگڑے کی۔

گالی گلوچ کی مختلف صورتیں ہیں۔ بعض اوقات انسان ایک شخص کے ماں باپ کو بُرا بھلا کہتا ہے، اس کے نسب میں عیب نکالتا ہے، کبھی خود اس شخص کے عیوب ظاہر کرتا ہے یہاں تک کہ اگر وہ کسی نفرت انگیز مرض مثلاً برص یا جذام میں مبتلا ہو تو اس پر طنز کرتا ہے، بعض حالتوں میں اگر اس نے کوئی بُرا کام کیا ہے یا اس کے ساتھ کوئی بُرا برتاؤ کیا گیا ہے تو اس کا اظہار کرتا ہے۔

قرآن مجید نے اجمالی طور پر ان تمام صورتوں کی ممانعت صرف ایک لفظ سے کی ہے:

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ (النسآء: ۱۴۸)	اللہ کو بُری بات کا پکار کر کہنا پسند نہیں مگر جس پر ظلم ہوا ہو (وہ ظلم کو برملا بیان کر سکتا ہے)۔

اور قرآن وحدیث میں جابجا بدزبانی سے بچنے کے حکم ومصالح نہایت تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں (۱) ایک مصلحت یہ ہے کہ گالی گلوچ میں لوگ عموماً تعدی کرتے ہیں یعنی اگر ایک شخص ایک گالی دیتا ہے تو دوسرا دو دیتا ہے۔ اگر ایک شخص کسی کے باپ کو بُرا کہتا ہے تو دوسرا اس کے باپ ماں دونوں کو اس میں شامل کر لیتا ہے۔ اس لئے دوسرے کی تعدی سے محفوظ رہنے کا طریقہ یہ ہے کہ کسی کو گالی

نہ دی جائے۔ خداوند تعالیٰ نے قرآن مجید کی اس آیت میں یہی نکتہ بیان کیا ہے:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ	اور (مسلمانو) خدا کے سوا دوسرے جن معبودوں
مِنْ دُونِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ	کو یہ پکارتے ہیں اُن کو بُرا نہ کہو (یہ لوگ بھی)
عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ	نادانی سے بڑھ کر خدا کو بُرا کہہ بیٹھیں گے۔

(الانعام: ۱۰۸)

اسی نکتہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں اس طرح بیان فرمایا کہ سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ آدمی اپنے باپ ماں پر لعنت بھیجے۔ کہا گیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی اپنے باپ ماں پر کیونکر لعنت بھیج سکتا ہے؟ فرمایا "اس طرح کہ جب کوئی کسی کے باپ کو بُرا بھلا کہے گا تو وہ بھی اس کے ماں باپ دونوں کو بُرا بھلا کہے گا۔[1]

(۲) بدزبان آدمی اجتماعی اور معاشرتی زندگی کے فوائد سے محروم ہوجاتا ہے اور لوگ اس سے ملنا جُلنا چھوڑ دیتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے آیا۔ آپ نے اس کو دیکھا تو فرمایا کہ "اپنے قبیلہ میں یہ نہایت بُرا آدمی ہے" لیکن جب وہ آپ کے پاس بیٹھا تو آپ اس سے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ملے۔ جب وہ چلا گیا تو حضرت عائشہؓ نے کہا کہ جب آپ نے اس کو دیکھا تو بُرا کہا پھر اس سے نہایت لطف و محبت کے ساتھ ملے۔ فرمایا "عائشہؓ! تم نے مجھ کو بدزبان کب پایا؟ خدا کے نزدیک قیامت کے دن سب سے بُرا شخص وہ ہوگا جس کی بدزبانی کے خوف سے لوگ اس کو چھوڑ دیں۔"[2]

(۳) بدزبانی دورِ وحشت و جہالت کی یادگار اور تہذیب و شائستگی کے خلاف ہے۔ ایک بار حضرت ابوذرؓ نے ایک غلام کو ماں کی گالی دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا کہ تم میں جاہلیت کا اثر باقی ہے۔[3]

---

[1] بخاری کتاب الادب باب لا یسب الرجل والدیہ۔ [2] بخاری کتاب الادب باب لم یکن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاحشا ولا متفحشا۔

[3] بخاری کتاب الادب باب ما ینہیٰ من السباب واللعن ۱۲۰

امام بخاری نے ادب المفرد میں اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ غلاموں یا نوکروں کو برا بھلا کہنا جائز نہیں۔

(۴) رفق و ملاطفت اور شرم و حیا شریفانہ اخلاق ہیں اور اسلام نے خاص طور پر ان کی تعلیم دی ہے لیکن بدزبانی ان کے بالکل مخالف ہے۔ ایک بار کچھ یہود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام کے بجائے "السام علیکم" (تم کو موت آئے) کہا۔ حضرت عائشہؓ نے جواب میں کہا "علیکم ولعنکم اللہ وغضب اللہ علیکم" یعنی تم کو موت آئے، خدا تم پر لعنت بھیجے اور تم پر خدا کا غضب نازل ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا کہ "اے عائشہؓ! نرمی اختیار کرو اور سختی اور بدزبانی سے بچو۔"[1]

(۵) گالی گلوچ کی ممانعت کا ایک نہایت دقیق نکتہ یہ ہے کہ اس میں عموماً بے شرمی اور بے حیائی کی باتوں کو الفاظ کی صورت میں منہ سے نکالا جاتا ہے اور سنایا جاتا ہے۔ اس سے سوسائٹی میں ان کریہ باتوں کے سننے اور سنانے کی جرأت پیدا ہوتی ہے اور بے حیائی کے الفاظ بڑھ کر اعمال کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بدزبانی کو حیا کے بالمقابل ذکر فرمایا۔ ارشاد ہے کہ "بدزبانی جس چیز میں شامل ہوتی ہے اس کو بدنما بنا دیتی ہے اور حیا جس چیز میں ہوتی ہے اس کو زینت دے دیتی ہے۔"[2] اس سے معلوم ہوا کہ بدزبانی اور فحش گوئی حیا کے خلاف ہے۔

(۶) گالی گلوچ سے لوگوں کے دلوں کو اذیت پہنچتی ہے حالانکہ مسلمانوں کو ایذا رسانی سے احتراز کرنا چاہئے۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔[3] مُردوں کو برا بھلا کہنے کی ممانعت اسی لئے کی گئی ہے کہ اس سے زندوں یعنی مُردوں کے عزیز و اقارب اور دوست و احباب کے دلوں کو اذیت پہنچتی ہے۔[4]

---

[1] بخاری کتاب الادب باب لم یکن النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاحشا ولا متفحشا۔ [2] ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ما جاء فی الفحش۔
[3] مسلم کتاب الایمان باب بیان تفاضل الاسلام وای اموره افضل۔ [4] ترمذی ابواب البر والصلۃ باب ما جاء فی الشتم۔

(۷) گالی گلوچ لڑائی کا پیش خیمہ ہے اور مسلمانوں کے ساتھ لڑنا بھڑنا کفر ہے۔ اس لئے جو چیز اس کا ذریعہ بنتی ہے وہ اگر کفر نہیں تو کم از کم فسق تو ضرور ہے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

سباب المسلم فسوق وقتاله کفر (بخاری، کتاب الادب)

مسلمان کو برا بھلا کہنا گناہ ہے اور اس کے ساتھ لڑنا کفر۔

ان تمام مراتب کے پیش نظر رکھنے کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بدزبانی اور فحاشی اسلامی تعلیمات اور اسلامی خصوصیات کے منافی ہے۔ اس لئے جو شخص صحیح اسلامی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے وہ اس بداخلاقی میں مبتلا رہنا پسند نہ کرے گا۔ اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لیس المؤمن بالطعان ولا اللعان ولا الفاحش ولا البذی (ترمذی، ابواب البر والصلۃ)

جو مسلمان ہے وہ طنز و تشنیع نہیں کرتا، لعنت نہیں بھیجتا، بدزبانی اور فحش کلامی نہیں کرتا۔

ایک اور حدیث میں بدزبانی کو نفاق کی علامت قرار دیا گیا ہے[1]۔

یہ تمام وجوہ تو انسانوں کی باہمی گالی گلوچ اور لعن و طعن سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اس قسم کی بدزبانیاں صرف انسانوں تک محدود نہیں ہیں بلکہ بے جان اور عقل سے خالی چیزوں سے بھی جب نقصان پہنچتا ہے تو لوگ ان کو بھی برا بھلا کہہ بیٹھتے ہیں۔ مثلاً جب کوئی شخص حوادثِ زمانہ کا شکار ہوتا ہے تو وہ زمانہ کو برا بھلا کہنے لگتا ہے یہ نہیں سوچتا کہ اس میں زمانہ کا کیا قصور ہے یہ جو کچھ ہوا ہے مشیتِ الٰہی سے ہوا ہے۔ اس بنا پر اسلام نے ان چیزوں کے برا بھلا کہنے کی بھی ممانعت کی ہے اور اس مفہوم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اللہ تعالیٰ کی زبان سے اس طرح ادا کیا ہے کہ خدا کہتا ہے کہ انسان زمانہ کو برا بھلا کہتا ہے حالانکہ میں خود زمانہ ہوں اور رات دن میرے ہاتھ میں ہیں[2]۔ یعنی زمانہ کو برا بھلا

[1] بخاری کتاب الایمان باب علامات المنافق [2] بخاری کتاب الادب باب لا تسبوا الدھر۔

کہنا خود خدا کو بُرا بھلا کہنا ہے۔

ایک بار ہوا ایک شخص کی چادر کو ادھر اُدھر اُڑانے لگی۔ اس نے ہوا پر لعنت بھیجی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اس پر لعنت نہ بھیجو وہ تو صرف خدا کی فرمانبردار ہے"۔[۱]

ایک سفر میں ایک عورت نے اپنی اونٹنی پر لعنت بھیجی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اونٹنی کو الگ کر دیا[۲] اور یہ اس عورت کی سزا تھی تاکہ وہ دوبارہ اس قسم کا کلمہ نہ کہہ سکے۔

اسلام میں گالی گلوچ کے صرف یہی معنی نہیں کہ کسی کو مغلظات سنائی جائیں بلکہ ہر وہ بات جس سے کسی کی توہین یا دلآزاری ہو گالی ہے۔ کسی کو فاسق یا کافر کہنا اگرچہ عرفِ عام میں گالی نہیں ہے لیکن اسلام میں وہ ایک سخت گالی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کوئی شخص اپنے بھائی کو فاسق و کافر نہ کہے کیونکہ اگر وہ فاسق و کافر نہ ہو گا تو یہ تہمت خود تہمت لگانے والے پر لوٹ آئے گی[۳]۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر وہ شخص فاسق یا کافر ہو گا تو اس کا کہنے والا فاسق و کافر نہ ہو گا۔ تاہم اگر اس کا مقصود محض اس شخص کی تفضیح و تشہیر ہو تو وہ گنہگار ضرور ہو گا[۴]۔ بہرحال اسلام نے جان و مال کی طرح ہر مسلمان کی عزت و آبرو کو بھی محفوظ کر دیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مقدس دن ایک مقدس مہینہ اور ایک مقدس شہر میں (یعنی حجۃ الوداع میں) ایک خطبہ میں مسلمانوں کو یہ ہدایت کر دی ہے کہ خدا نے تمہارے خون، تمہارے مال اور تمہاری عزت کو اسی طرح حرام کر دیا ہے جس طرح تمہارا یہ دن، تمہارے اس مہینہ اور تمہارے اس شہر میں محترم ہے۔

---

[۱] ابو داؤد کتاب الادب باب فی اللعن۔ [۲] ابو داؤد کتاب الجہاد باب النہی عن لعن البہیمۃ۔ [۳] بخاری کتاب الادب باب ماینہی من السباب واللعن، و مسلم کتاب الایمان۔ [۴] فتح الباری کتاب الادب باب ماینہی من السباب واللعن۔

رذائل پر مختصر تبصرہ

گذشتہ صفحوں میں جن رذائل کی تشریح کی گئی ہے ان کے علاوہ اور بہت سی ایسی چھوٹی چھوٹی بد اخلاقیوں اور بری عادتوں کو گنایا جا سکتا ہے جن کی ممانعت اسلام میں کی گئی ہے مگر اصولی حیثیت سے وہ درحقیقت ان ہی مذکورہ بالا رذائل میں سے کسی کے تحت میں ہیں اس لئے ان کے پورے استقصا کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ اور چونکہ ان رذائل کے اخذ و ردّ میں خالص فلسفیانہ اصول کی پیروی نہیں کی گئی ہے۔ اس لئے صرف ان ہی کے بیان پر قناعت نہیں کی گئی جن کو فلسفۂ اخلاق کے مصنّفوں نے رذائل میں شمار کیا ہے بلکہ مذہبی تعلیمات کو سامنے رکھ کر اخلاق و عاداتِ ذمیمہ کی یہ فہرست مرتّب کی گئی ہے۔

اس فہرست پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بھید کھل جاتا ہے کہ اسلام نے تین اساسی برائیاں قرار دی ہیں اور جس قدر رذائل ہیں ان میں ان ہی تین میں سے کوئی برائی پائی جاتی ہے۔

سب سے پہلی اساسی بُرائی عدمِ صدق ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ دل اور زبان میں یکسانی نہ ہو۔ جھوٹ، غیبت، خلافِ وعدگی، اتہام، بدگمانی، خوشامد، چغلخوری، دو رخا پن، جھوٹی قسم وغیرہ اسی ایک جڑ کی مختلف شاخیں ہیں۔ دوسری اساسی بُرائی حُبِ مال ہے۔ حُبِ مال سے مقصود دنیا کے مال و دولت سے غیر معمولی محبّت ہے۔ بخالت، حرص و طمع، چوری، غصب، خیانت، غلول

ناپ تول میں کمی بیشی وغیرہ ایک ہی اصل کی مختلف فروع ہیں۔ تیسری اساسی بُرائی حبِّ ذات ہے۔ اس سے مقصود اپنی ذات سے غیر معمولی شغف ہے۔ حسد، تکبر، عُجب، فخاری، غیض و غضب، ظلم، کینہ وغیرہ ایک ہی حقیقت کے مختلف مظاہر ہیں۔ اس سے ظاہر ہوا کہ جو شخص ان تینوں اساسی بُرائیوں سے ہر طرح پاک رہنے کی کوشش کرے گا وہ ہر قسم کے رذائل سے اپنے کو محفوظ کرلے گا۔ یہ تینوں اساسی بُرائیاں ہوائے نفس یعنی نفس کی غلط اور بے جا خواہشیں ہیں۔ جو ان سے اپنا دامن بچائے گا وہ جنّت میں آرام پائے گا:

وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ ۝ فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ ۝

(النازعات: ۴۰-۴۱)

اور جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا۔ اور اپنے نفس کو غلط خواہش سے بچایا۔ تو جنّت اس کی آرام گاہ ہے۔

آداب

انسانی زندگی کے رات دن کے ضروری مشاغل رہنے سہنے، اُٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے، بولنے چالنے، کھانے پینے، سونے جاگنے، نہانے دھونے کے وہ تمام عمدہ قواعد جو ایک متمدّن زندگی کے ضروری جز ہیں، آداب کہلاتے ہیں۔ ان ہی آداب کی پابندی و عدم پابندی کے بدولت وحشی اور متمدّن لوگوں میں امتیاز ہوتا ہے۔ ان آداب میں خوبی اور لطافت ملحوظ رکھنا حُسنِ ادب ہے۔ اس پابندی سے اجتماعی اور معاشرتی امور میں خوشگواری پیدا ہوتی ہے اور انسان مہذّب، شائستہ اور باوقار بن جاتا ہے۔

یہ آداب درحقیقت اس اصول پر مبنی ہیں کہ ان روزانہ کے کاموں کے بجالانے میں ایسی خوبی ملحوظ رکھی جائے جس سے زیادہ سے زیادہ آدمیوں کو آرام مل سکے اور ایک کے کام کا طریقہ دوسرے کی تکلیف یا ناگواری کا باعث نہ ہو جائے اور یا یہ کہ وہ کام خوبی، خوبصورتی اور عمدگی کے ساتھ انجام پائے۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عملی و قولی ہدایات سے مسلمانوں کے لئے اس کا بہترین نمونہ قائم کر دیا ہے۔

دنیا کی دوسری قومیں مذہب ایک جگہ سے اور اپنے آداب و عوائد یعنی ایٹی کیٹ کسی دوسری جگہ سے لیتی رہی ہیں۔ عیسائی قوموں نے مذہب انجیل سے اور آداب و آئین یونان اور روم سے حاصل کئے، لیکن اسلام میں جو مذہب کا سرچشمہ ہے وہی اس کے آداب و عوائد کا ماخذ بھی ہے۔ اسی لئے اسلام وحشی سے وحشی قوموں میں صرف قرآن اور اپنے پیغمبر کی سیرت لے کر جاتا ہے اور ان کو چند روز

میں مہذّب اور شائستہ بنا دیتا ہے۔

ہمارے محدّثین کرام رحمہم اللہ تعالیٰ نے ان آداب کی نوعیت کو مکارِم اخلاق سے الگ کر دیا ہے اور ان کو کتاب الطّہارۃ، کتاب الاطعمہ، کتاب الاشربہ، کتاب اللباس کتاب الاستیذان، کتاب الآداب، اور کتاب السّلام میں درج کیا ہے۔ ہم صحاح و سنن کی عام کتابوں اور خصوصاً بخاری مسلم، ترمذی اور ابو داؤد کے ان ہی ابواب سے اس قسم کی تعلیمات کو الگ کر کے ذیل میں لکھتے ہیں۔

فطری آداب

اسلام دینِ فطرت ہے۔اس لئے اس کے آداب کا بڑا حصہ بھی فطری ہے یعنی فطرۃً وہ پسندیدہ ہیں اور تمام انبیا علیہم السلام نے ان کی پیروی کی ہے۔ یہ ایسے آداب ہیں جو انسانوں کو جانوروں سے ممتاز کرتے ہیں۔انسان کو اپنی برہنگی چھپانی پڑتی ہے، اس کے بال بڑھتے ہیں، ناخن بڑھتے ہیں بدن گندہ ہوتا ہے، کپڑے میلے ہوتے ہیں تو ان سب چیزوں کی اصلاح شایستہ اور ناشایستہ انسانوں میں فرق پیدا کرتی ہے۔چنانچہ حدیث میں ہے کہ چار چیزیں تمام پیغمبروں کی سنت ہیں حیا کرنا، عطر لگانا، مسواک کرنا اور نکاح[1] کرنا۔ایک روایت میں ختنہ کو بھی اس میں داخل کیا گیا ہے۔

حیا کرنے کا نتیجہ برہنگی کا چھپانا یعنی ستر عورت اور ضرورت کے وقت پردہ کرنا ہے۔عطر لگانا اور مسواک کرنا صفائی اور طہارت کے تمام اقسام کو بتاتا ہے اور ختنہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی مبارک نسل کی سنت ہے یہاں تک کہ تورات کے بیان کے مطابق یہ خدا اور حضرت ابراہیمؑ کے درمیان عہد کی جسمانی نشانی[2] ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام انسانیت کے سب سے پہلے معلم ہیں ان کے عہد میں دنیا اس عمر کو پہنچ چکی تھی جب کہ اس کو تہذیب و وقار کے آداب بتائے جائیں۔چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام

---

[1] ترمذی ابواب النکاح [2] توراۃ پیدایش۔

کو جسمانی طہارت و نظافت کے مختلف آداب سکھائے گئے جن کو خصالِ فطرت کہتے ہیں[1]۔ امام بخاریؒ کی ادب المفرد میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے سب سے پہلے ختنہ کرایا، مونچھیں ترشوائیں اور ناخن کٹائے[2]۔ ایک حدیث ہے ایک صحابی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خصالِ فطرت پانچ ہیں۔ ختنہ کرنا، موئے زیرناف اور بغل کے بال صاف کرنا اور ناخن اور مونچھ ترشوانا۔ ایک دوسری حدیث میں یہ آداب دس تک پہنچ گئے ہیں۔ مونچھ ترشوانا، داڑھی بڑھانا، مسواک کرنا، ناک میں پانی ڈالنا، ناخن ترشوانا، انگلیوں کے درمیان جو جگہ ہے اس کو دھونا، بغل کے بال بنوانا، موئے زیرناف کو صاف کرنا، پانی سے استنجا کرنا۔ راوی کہتا ہے کہ دسویں بات میں بھول گیا غالباً کلی کرنی ہوگی[3]۔

فطرت کے یہ آداب اسلامی طہارت کے اصول بن گئے ہیں۔ چنانچہ وضو میں مسواک کرنا مستحب اور انگلیوں کا دھونا، ناک میں پانی ڈالنا اور کلی کرنا واجب قرار دیا گیا ہے۔

ناخن ترشوانا، بال بنوانا، مونچھیں ترشوانا صفائی کے ضروری لوازم ہیں۔ جن کے ناخن بڑے اور مونچھیں بڑی ہوتی ہیں وہ کھانے پینے کی ہر چیز کو گندہ کر کے کھاتے پیتے ہیں جس سے نہ صرف دوسروں کو کراہت معلوم ہوتی ہے بلکہ خود ان کو بھی طبی طور پر نقصان پہنچتا ہے۔ یورپ میں ناخن بڑھانا اور ان کو ریت ریت کر صاف کرنا اور اسی طرح بعض لوگوں میں بڑی بڑی مونچھیں رکھنا حسن سمجھا گیا ہے مگر یہ دونوں باتیں صریحاً خلافِ فطرت ہیں اور کھانے پینے کی گندگی کا باعث ہیں۔

مونچھوں کے بڑھانے کا فیشن یورپ کا آئینہ بدل جانے سے اب کم ہو رہا ہے مگر داڑھی بڑھانے کے بجائے اس کے منڈانے کا فیشن ابھی اسی طرح قائم ہے بلکہ اب تو داڑھی اور مونچھ دونوں کے صاف کرنے کا فیشن ترقی پر ہے۔ یہ تمام باتیں اسلامی شعار کے خلاف ہیں اور اس شعار کے مخالف

---

[1] توراۃ پیدائش۔ [2] باب الختان الکبیر۔ [3] صحیح مسلم باب خصال الفطرہ۔

ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے لئے مقرر کیا تھا۔

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ نے فرمایا مجوسیوں کے برخلاف تم مونچھیں ترشواؤ اور داڑھی بڑھاؤ۔[1] حضرت ابن عمرؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مشرکوں کے برخلاف تم مونچھیں باریک ترشواؤ اور داڑھی بڑھاؤ۔[2] ان تعلیمات کے مطابق اسلامی صورت کو قائم رکھنا غیرتمند مسلمانوں کا مذہبی فرض ہے۔ اچھی اور بری معلوم ہونے کا تخیل زمانہ کے رسم و رواج کا واہمہ ہے۔ جس رنگ کی عینک لگایئے دنیا اسی رنگ کی نظر آئے گی۔

---

[1] و [2] صحیح مسلم باب خصال الفطرۃ۔

طہارت اور اس کے آداب

تہذیب و شائستگی کی باتوں میں سب سے اہم چیز طہارت اور پاکی ہے۔ گو کہ اسلام ایک ایسے ملک میں ظاہر ہوا جہاں پانی نسبتاً بہت کم تھا پھر بھی اس نے بعض خاص حالات میں غسل کرنا فرض قرار دیا۔ زن و شو کی ہمبستری کے بعد جب تک دونوں غسل نہ کر لیں نماز جو فرض ہے ادا نہیں ہو سکتی۔ فرمایا:

وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ؕ — اور اگر تم ناپاک ہو تو نہا کر پاک ہو۔

(المآئدۃ: ۶)

کپڑے شرعی طور سے پاک ہوں۔ فرمایا:

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ (المدثر: ۴) — اور اپنے کپڑے کو پاک کر۔

اگر پاکی کے لئے پانی نہ مل سکے یا بیماری کے سبب سے پانی استعمال کرنے سے نقصان کا اندیشہ ہو تو پاک مٹی سے تیمم کرنا چاہیے:

فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا — تو پاک مٹی کا قصد کرو۔

(المآئدۃ: ۶)

جب نماز پڑھنا چاہیں تو پہلے ہاتھ، منہ اور پاؤں دھو لیں اور بھیگے ہاتھوں کو سر پہ پھیر لیں۔ اس کا نام وضو ہے:

اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا	جب نماز کا ارادہ کرو تو اپنے منہ اور کہنیوں
وُجُوْهَكُمْ وَ اَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ	تک اپنے ہاتھ دھو لو اور اپنے
وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ	سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں
اِلَى الْكَعْبَيْنِ ؕ (المائدۃ: ۷)	دھوؤ۔

جمعہ کے دن نماز سے پہلے نہانے کا حکم دیا کہ لوگ پاک صاف اور نہا دھو کر جماعت میں شریک ہوں تاکہ کسی کی گندگی اور بدبوئی سے دوسرے نمازیوں کو تکلیف نہ ہو اور پورا مجمع پاکی اور صفائی کی تصویر ہو۔ قضائے حاجت اور پیشاب کے بعد استنجا اور عضو خاص و مقام خاص سے گندگی کو دور کرنا ضروری ٹھہرایا گیا۔

ان احکام سے معلوم ہوگا کہ اسلام میں طہارت اور صفائی کو خاص اہمیت حاصل ہے بلکہ وہ خدا کی محبت کے حصول کا ذریعہ ہے۔ فرمایا:

وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ○	اور (اللہ) طہارت کرنے والوں کو پیار
(البقرۃ: ۲۲۲)	کرتا ہے۔

اسی طہارت کی پابندی اور دلوں میں طہارت کا خیال پیدا کرنے کے لئے مختلف سنن اور طریقے سکھائے گئے مثلاً

۱۔ آپؐ نے فرمایا جب کوئی شخص سو کر اٹھے تو جب تک تین بار ہاتھ نہ دھولے اس کو پانی کے برتن میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہئے کیونکہ سوتے میں معلوم نہیں کہ اس کا ہاتھ کہاں کہاں پڑا ہے۔[۱]

اس حدیث سے معلوم ہوگا کہ ہم کو اپنے جسم کے ہر عضو کی طہارت کا سوتے جاگتے ہر حالت میں خیال رکھنا چاہئے۔ سونے میں کسی خواب کی وجہ سے بھی اگر انسان ناپاک ہو جائے تو نہانا ضروری قرار دیا گیا۔[۲]

---

[۱] مسلم کتاب الطہارۃ۔ [۲] ابو داؤد کتاب الطہارۃ۔

ہاتھ کی صفائی پر اس لئے زور دیا گیا کہ برتن سے پانی نکالنے میں ناپاک ہاتھ پانی میں بھیگ کر پانی کو ناپاک نہ کرے۔ اس لئے خیال رکھنا چاہئے کہ ہاتھ پانی کے برتن میں اس وقت تک نہ ڈبوئے جائیں جب تک ہاتھوں کی طہارت کا یقین نہ ہو۔

۲۔ دانتوں کی صفائی جو بہت سی گندگیوں اور بیماریوں کی جڑ ہے ضروری بتلائی۔ مسواک کرنا سنت ٹھہرایا۔ فرمایا "اگر میری امت پر شاق نہ ہوتا تو میں ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا"[۱]

ایک دفعہ کچھ مسلمان حاضر ہوئے جن کے دانت صاف نہ ہونے کی وجہ سے زرد تھے تو فرمایا "تمہارے دانت زرد کیوں دیکھ رہا ہوں۔ مسواک کیا کرو"[۲]

۳۔ عام راستوں اور درختوں کے سایہ میں قضائے حاجت نہیں کرنا چاہئے[۳]۔ یہ اس لئے کہ راستہ چلنے والوں اور درخت کے سایہ میں بیٹھنے والے مسافروں کو اس نجاست اور گندگی سے تکلیف نہ ہو۔

۴۔ ٹھہرے ہوئے پانی میں پیشاب کر کے پھر اس میں غسل کرنا جائز نہیں۔ ایسے ٹھہرے ہوئے پانی میں غسل جنابت بھی نہیں کرنا چاہئے بلکہ مجنب کو چاہئے کہ اس سے پانی لے کر غسل کرے کیونکہ ہماری تھوڑی سی سہل انگاری سے وہ پانی دوسروں کے لئے ناپاک یا قابل کراہت بلکہ عام حالت میں خود اس کی طبیعت کے لئے گھن پیدا کرے گا۔

۵۔ عام طور سے بے ضرورت کھڑے ہو کر پیشاب نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ اس حالت میں یہ خوف ہے کہ پیشاب کے چھینٹے جسم پر پڑ جائیں۔ نیز بے ستری کا بھی امکان ہے اور تہذیب و وقار کے بھی خلاف ہے۔ اگر یہ احتمالات نہ ہوں یا زمین بیٹھنے کے قابل نہ ہو تو جائز ہے۔

۶۔ پیشاب نرم زمین پر کرنا چاہئے کیونکہ سخت زمین سے پیشاب کے چھینٹے اڑ کر جسم پر پڑ سکتے ہیں۔

---

[۱] و [۲] ابوداؤد کتاب الطہارۃ۔ [۳] مسند احمد، جلد ۱ ص ۱۴۱۔

۷۔ غسل خانہ کی زمین میں پیشاب نہیں کرنا چاہیئے خصوصاً جب کہ کچی ہو۔ کیونکہ جگہ کی گندگی اور ناپاکی سے پانی کی چھینٹیں گندی اور ناپاک ہو کر اڑیں گی اور بدن کو ناپاک کریں گی یا ناپاک ہونے کا وسوسہ دل میں پیدا کریں گی۔

۸۔ بول و براز کے بعد استنجا کرنا چاہیئے ڈھیلے یا کسی اور پاک وجاذب چیز سے صفائی کے بعد پانی سے دھولینا اچھا ہے۔ استنجا بائیں ہاتھ سے کیا جائے اس میں داہنا ہاتھ نہ لگایا جائے۔

۹۔ طہارت کے بعد پانی کے علاوہ مٹی سے بھی ہاتھ دھونا چاہیئے[۱]

۱۰۔ ہفتہ میں ایک روز ہر مسلمان پر غسل کرنا، کپڑے بدلنا، عطر اور تیل لگانا مستحسن ہے۔ بلکہ بعض فقہا اور محدثین کے نزدیک حدیث کے الفاظ کی بنا پر غسل واجب ہے۔

اسلام نے اس کے لئے جمعہ کا دن مقرر کیا ہے جو مسلمانوں کے عام اجتماع کا دن ہوتا ہے۔ اور اس کی وجہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے یہ بیان کی ہے کہ عرب کے لوگ سخت تنگ دست اور پشمینہ پوش تھے اور محنت مزدوری کرتے تھے۔ ان کی مسجد نہایت تنگ اور اس کی چھت نہایت پست تھی جو چھپر کی تھی۔ ایک بار گرم دن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کی نماز پڑھنے کے لئے آئے تو لوگوں کو اس پشمینہ میں پسینہ آیا اور اس کی بو کے پھیلنے سے ہر شخص کو تکلیف ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بدبو محسوس کی تو فرمایا کہ لوگو! جب یہ دن آئے تو غسل کر لیا کرو اور ہر شخص کو جو بہترین تیل اور خوشبو میسر ہو سکے لگائے[۲] جمعہ کے علاوہ معمولاً کسی کو بودار چیز مثلاً لہسن یا پیاز کھا کر مسجد میں آنے کی ممانعت بھی فرمائی[۳]

۱۱۔ جمعہ کے علاوہ عام حالات میں بھی انسان کو صاف ستھرا رہنا چاہیئے چنانچہ ایک بار جب

---

[۱] یہ تمام مسائل کتب سنن کی کتاب الطہارۃ میں دیکھئے۔ [۲] ابوداؤد کتاب الطہارۃ۔
[۳] مسلم کتاب الصلوٰۃ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس کے بال بکھرے ہوئے ہیں تو فرمایا کہ اس کے پاس بال کے ہموار کرنے کا سامان نہ تھا؟ ایک دوسرے شخص کو میلے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ اس کو پانی نہیں ملتا تھا جس سے وہ اپنے کپڑے کو دھولیتا[1]۔"

اسی کے ساتھ اسلام نے طہارت و نظافت کی تعلیم میں سادگی اور بے تکلفی کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ اور ایسی تعلیم نہیں دی ہے جو تشدّد، غلو اور وہم و وسوسہ کی حد تک پہنچ جائے اس بنا پر اسلام نے بعض ان سختیوں کو دور کیا ہے جو اس معاملہ میں اور مذاہب میں پائی جاتی تھیں۔ مثلاً یہودیوں کے مذہب کی رو سے ناپاکوں کی پاکی کے لئے ضروری تھا کہ نہانے کے بعد بھی اس دن کا آفتاب ڈوب لے تب نہانے والا پاک ہو۔ لیکن اسلامی تعلیمات کی رو سے انسان کو اس معاملہ میں صرف اس قدر احتیاط کرنی چاہئے کہ پیشاب کے چھینٹے جسم یا کپڑے پر نہ پڑنے پائیں۔ اس سے زیادہ احتیاط تشدّد اور غلو کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت موسٰی اشعری رضؓ شدّتِ احتیاط کی وجہ سے شیشی میں پیشاب کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ بنواسرائیل کے جسم پر جب پیشاب لگ جاتا تھا تو اس کو قینچی سے کاٹ ڈالتے تھے۔ لیکن حضرت حذیفہؓ نے اس تشدّد کو ناپسند فرمایا اور کہا کہ کاش وہ اس قدر سختی نہ کرتے کیونکہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو معمولی طور پر استنجا کرتے ہوئے دیکھا ہے[2]۔

یہودیوں کے یہاں یہ بھی دستور تھا کہ جب کوئی عورت ایام سے ہوتی تھی تو اس کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیتے تھے اور اس کو گھر سے بالکل الگ کر دیتے تھے۔ صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے اس کے متعلق دریافت فرمایا تو یہ آیت نازل ہوئی:

وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ ۖ قُلْ — اور (اے پیغمبر) لوگ تم سے حیض کے

---

[1] ابوداؤد کتاب اللباس باب فی غسل الثوب فی الخلقان۔ [2] صحیح مسلم کتاب الطہارۃ باب المسح علی الخفین۔

هُوَ اَذًى فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ

(البقرۃ: ۲۲۲)

بارہ میں دریافت کرتے ہیں تو (ان کو) سمجھا دو کہ وہ گندگی ہے تو حیض کے دنوں میں عورتوں سے الگ رہو اور جب تک پاک نہ ہو لیں ان سے مقاربت نہ کرو۔ اور جب وہ پاک ہو جائیں تو ان کے پاس آؤ۔

اس کے مطابق آپ نے حکم دیا کہ دفاع کے علاوہ ان سے سب کام لے سکتے ہو اور خود اپنے طرزِ عمل سے اس کی مثالیں قائم کر دیں۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں اس حالت میں آپ کے بالوں میں کنگھی کرتی تھی اور آپ کے سر کو دھوتی تھی۔ ایک بار آپ نے مجھ سے کوئی چیز اٹھا کر دینے کو مانگی میں نے معذرت کی تو فرمایا یہ ناپاکی تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے۔[1]

ناپاکی کی حالت میں مقدس مقامات مثلاً مسجد میں نہیں جا سکتے، قرآن مجید کو نہیں چھو سکتے۔ اسی اصول کی بنا پر بعض صحابہ نے حالتِ جنابت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مصافحہ کرنے اور اٹھنے بیٹھنے سے اجتناب کیا، لیکن آپ نے فرمایا کہ "مسلمان نجس نہیں ہوتا"[2] یعنی مسلمان جنابت اور حاجتِ غسل سے ایسا نجس نہیں ہو جاتا کہ اس کے چھونے سے کوئی دوسرا آدمی یا چیز ناپاک ہو جائے۔

ایک عورت نے حضرت ام سلمہؓ سے دریافت کیا کہ میں عورت ہوں اور میرے دامن لمبے ہوتے ہیں اور میں گندے مقامات میں چلتی ہوں یعنی زمین میں گھسٹنے کی وجہ سے ممکن ہے کہ دامن میں نجاست لگ جاتی ہو۔ بولیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اس کے بعد کی زمین اس کو پاک کر دیتی ہے[3] یعنی اس کے بعد جو خشک اور پاک زمین آتی ہے وہ اس نجاست کو زائل کر دیتی ہے۔ ایک عورت نے آپ سے دریافت کیا کہ مسجد کی طرف ہمارا جو راستہ جاتا ہے وہ بدبو دار

---

[1] صحیح مسلم کتاب الطہارۃ باب جواز غسل الحائض راس زوجہا [2] و [3] ابوداود کتاب الطہارۃ۔

ہے۔ جب بارش ہو تو ہم کیا کریں۔ فرمایا کہ اس کے بعد اُس سے اچھا راستہ نہیں ہے؟ بولیں ہاں ہے۔" فرمایا تو وہ اس کی تلافی کر دیتا ہے۔"[1] غرض اسلام کا اصول یہ ہے کہ خشک زمین پاک ہے اور پانی کی طرح دوسری چیزوں کو بعض حالات میں پاک کر سکتی ہے۔ اسی لئے آپ نے فرمایا ہے کہ زمین میرے لئے پاک کر دی گئی ہے۔ اور اسی لئے وہ حالتِ تیمّم میں پانی کی قائم مقام ہو جاتی ہے۔ جو تا زمین پر رگڑ لینے سے پاک ہو جاتا ہے۔

اسلام نے اس باب میں سب سے زیادہ جو آسانی پیدا کی وہ یہ تھی کہ تیمّم کو غسل اور وضو کا قائم مقام کر دیا[2] اور اس کو تمام صحابہ نے ایک برکت سمجھا۔

غسل کا طریقہ یہ سکھایا کہ پہلے دونوں ہاتھ دھو لئے جائیں، پھر کمر سے نجاست دھو کر دور کر لی جائے پھر سارے بدن پر پانی بہایا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ضرورت سے غسل اس طرح فرماتے تھے۔ پہلے دونوں ہاتھ دھوتے، پھر داہنے ہاتھ سے پانی بہا کر بائیں ہاتھ سے کمر کے نیچے دونوں طرف دھوتے، پھر وضو کرتے، لیکن پاؤں نہیں دھوتے، پھر سر پر تین بار پانی بہا کر بال کی جڑوں کو ملتے پھر سارے جسم پر پانی بہاتے اور آخر میں پاؤں دھوتے۔[3]

اسلام میں ہر روز نہانے کا کوئی حکم نہیں ہے اور نہ عرب جیسے ملک میں یہ ہو سکتا تھا۔ لیکن اگر کوئی ایسے ملک میں جہاں پانی کی بہتات ہو اور وہ صفائی کے لئے ہر روز نہائے تو مباح ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پانچوں وقت کی نماز کی تمثیل میں فرماتے ہیں کہ اگر کسی کے دروازہ پر نہر بہ رہی ہو اور اس میں وہ دن میں پانچ دفعہ نہایا کرے تو کیا اس کے بدن پر میل رہ سکتا ہے۔[4]

---

[1] ابو داؤد کتاب الطہارۃ۔ [2] بیماری یا پانی نہ ملنے کی صورت میں۔ [3] مسلم باب صفۃ غسل الجنابۃ۔
[4] صحیح بخاری باب الصلوٰۃ الخمس کفارۃ۔

کھانے پینے کے آداب

(۱) کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھو لینا چاہیئے۔ کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کے متعلق اگرچہ کوئی صحیح حدیث مروی نہیں ہے لیکن اگر پیالہ میں ہاتھ ڈالنے کی ضرورت ہو تو سو کر اٹھنے کے بعد پانی کے برتن میں بے ہاتھ دھوئے ہاتھ ڈالنا جس طرح منع ہے اسی طرح بے ہاتھ دھوئے کھانے کے برتن میں ہاتھ ڈالنا اچھا نہیں۔[1] اور ابوداؤد میں بھی کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونے کی ایک ضعیف حدیث موجود ہے۔[2] ایک حدیث میں ہے کہ اگر کسی کے ہاتھ میں کھانے کی چکنائی لگی رہ جائے اور وہ سو جائے اور کوئی جانور اس کے ہاتھ کو کاٹ لے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایسا اسی کی غلطی سے ہوگا اور اس کو اس تساہل پر اپنے ہی کو ملامت کرنا چاہیئے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ ادب کی تعلیم اُس کے لئے ہے جس کی انگلیاں کھانے میں ملوث ہوتی ہوں۔

(۲) مسلمانوں کا ہر کام خدا کے نام سے شروع ہونا چاہیئے جیسا کہ حدیثوں میں مذکور ہے۔ اور دنیا کے سب کاموں میں کھانا جو زندگی کی بقا اور جسم کے قیام کا اصلی ذریعہ ہے کتنا بڑا کام ہے۔ یہ کام خدا کے نام کے بغیر شروع نہ ہونا چاہیئے۔ اس لئے کھانا کھانے سے پہلے بسم اللہ

---

[1] و [2] ابوداؤد کتاب الاطعمہ۔

کرلیتا چاہیے۔ صحابہ کہتے ہیں کہ جب ہم کو رسول اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھانا کھانے کا اتفاق ہوتا تھا تو جب تک آپؐ کھانا نہ شروع کرتے ہم لوگ کھانے میں ہاتھ نہیں ڈالتے تھے لیکن ایک بار ایک بدو دوڑا ہُوا آیا اور کھانے میں ہاتھ ڈالنا چاہا۔ آپؐ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر اسی طرح ایک لونڈی آئی اور کھانے میں ہاتھ ڈالنا چاہا آپؐ نے اس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا اور فرمایا کہ جس کھانے پر خدا نام نہیں لیا جاتا شیطان اس کو اپنے لئے جائز کر لیتا ہے[1]۔" اور اگر کوئی شروع میں بسم اللہ کہنا بھول جائے تو بسم اللہ اولہ وآخرہ کہہ لے[2]۔"

۲۔ انسان کو ضرورت کے منشا کے مطابق پاک و ناپاک ہر قسم کے کاموں اور چیزوں میں ہاتھ ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ صفائی کا اقتضا یہ تھا کہ انسان کے دونوں ہاتھ تقسیم کار کے اصول پر الگ الگ کاموں کے لئے خاص کر دیئے جائیں۔ چنانچہ سب اچھے کاموں کے لئے داہنے ہاتھ کو اور دفع نجاست وغیرہ کے لئے بائیں ہاتھ کو خاص کر دیا گیا ہے۔ اس تخصیص میں ایک طبّی اور فطری مصلحت بھی ہے۔ انسان کے زیادہ تر کام فطرۃً پاک اور مباح ہوتے ہیں اور دفع نجاست وغیرہ کے کام کبھی کبھی ہوتے ہیں۔ اس لئے زیادہ تر کاموں کے لئے اس پہلو کو خاص کیا گیا ہے جدھر قلب نہیں ہے یعنی دایاں پہلو تاکہ کام کے ہچکولوں اور جھٹکوں سے قلب کو صدمہ نہ پہنچے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر انسان فطرۃً سب کام داہنے ہاتھ سے کرتے ہیں اور بایاں ہاتھ صرف اس کی مدد کے لئے لگاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ داہنے میں زیادہ پھرتی چستی اور طاقت ہوتی ہے۔ اسی لئے کھانا پینا بھی داہنے ہاتھ سے چاہئے[3]۔ صرف کھانے ہی پینے ہی کی خصوصیت نہیں بلکہ شریعت نے اکثر باتوں میں اس کا لحاظ رکھا ہے۔ ایک بار آپؐ کے سامنے دودھ پیش کیا گیا۔ مجلس میں آپؐ کے داہنے جانب ایک بدو بیٹھا ہوا تھا اور بائیں جانب حضرت ابوبکرؓ تھے۔ آپؐ نے دودھ پی کر بدو کی طرف

---

[1] و [2] و [3] ابو داؤد کتاب الاطعمہ۔

پیالہ بڑھایا اور فرمایا کہ ترتیب میں داہنی جانب کا لحاظ ضروری ہے[1]۔

ایک بار آپؐ کے داہنی جانب ایک لڑکا اور بائیں جانب بڑے بوڑھے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ آپؐ نے کوئی چیز پی تو لڑکے سے کہا کہ اگر تم اجازت دو تو میں ان لوگوں کو دوں۔ اس نے کہا کہ میں آپؐ کا حصہ کسی کو نہیں دے سکتا۔ مجبوراً آپؐ نے پہلے اسی کو دیا[2]۔

۴۔ کھانا برتن کے کنارے سے کھانا چاہئے بیچ سے نہیں کھانا چاہئے کیونکہ اس سے ایک تو کھانے کی وہ مقدار جو کھانے سے بچ جائے گی گندی نہ ہوگی، دوسرے یہ کہ برتن گندہ نہ ہوگا اور تیسرے یہ کہ اگر کوئی اس طریق سے نہ کھائے تو اس سے اس کی حرص کا پتہ چلتا ہے اور حریص آدمی کبھی سیر نہیں ہوتا۔ اسی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برکت سے تعبیر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ برکت کھانے کے بیچ میں نازل ہوتی ہے[3]۔

۵۔ اپنے ساتھیوں کی اجازت کے بغیر کھجور یا انگور وغیرہ کو ایک ساتھ دو دو کر کے نہیں[4] کھانا چاہئے کیونکہ اخلاقی حیثیت سے اس سے حرص اور لالچ کا اظہار ہوتا ہے اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کھانے والے کا منشا یہ ہے کہ جلدی جلدی اس کو اپنے پیٹ میں پہنچا دے تاکہ کوئی دوسرا آکر شریک نہ ہو جائے۔ اور اگر وہ چند لوگوں کے ساتھ مل کر اس طرح سے کھا رہا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا منشا یہ ہے کہ وہ جلدی کر کے اپنے سب ساتھیوں سے زیادہ کھالے۔ یہ جذبہ ایثار کے سراسر منافی اور حرص وطمع پر دال ہے۔ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے اور اگر کسی ضرورت سے کسی شریک کو ایسا کرنا پڑے تو اس کو دوسرے شریکوں سے پوچھ لینا چاہئے۔

۶۔ کھانے میں عیب نہیں نکالنا چاہئے کیونکہ اس سے گھر والوں میں اور کام کرنے والوں

---

[1][2] صحیح بخاری کتاب الاشربہ۔ [3] ترمذی ابواب الاطعمہ باب ماجاء فی کراہیۃ الاکل فی وسط الطعام۔
[4] سنن ترمذی ابواب الطعام۔

میں بات بات میں نقص نکالنے والے کی طرف سے چڑ اور نفرت پیدا ہوتی ہے اور اس سے گھر کا کام سدھرنے کی جگہ اور بگڑتا ہے۔ اس لئے اگر اتفاق سے کھانا بدمزہ پکا ہو تو اگر خواہش ہو تو کھا لینا چاہیئے ورنہ چھوڑ دینا چاہیئے[1]۔

۷۔ سب کا مل کر ایک ساتھ کام کرنا تمدن کی بنیاد اور حسنِ معاشرت کا ذریعہ ہے اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پسند فرمایا ہے کہ دوست و احباب یا گھر کے لوگ کھانا ایک ساتھ مل کر کھائیں جیسا کہ قرآن پاک میں ہے الگ الگ کھانا بھی جائز ہے اور ایک ساتھ بھی[2]۔ لیکن ایک ساتھ مل کر کھانے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ برکت ہوتی ہے اس طرح کھانا زیادہ برباد نہیں ہوتا۔ کوئی تھوڑا کھاتا ہے، کوئی زیادہ کھاتا ہے، سب مل کر برابر ہو جاتے ہیں اور ہر شخص کو تھوڑی بہت ہر چیز پہنچ جاتی ہے۔ پھر اس سے گھر والوں کا ایثار ثابت ہوتا ہے اور گھر کے مالک کا تشخص اور امتیاز جو غرور کی نشانی ہے مٹتا ہے۔ اس سے گھر والوں اور عزیزوں اور دوستوں میں محبت ہوتی ہے۔ ایک بار صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم کھاتے ہیں لیکن آسودہ نہیں ہوتے۔ فرمایا غالباً تم لوگ الگ الگ کھاتے ہو؟ صحابہ نے کہا ہاں۔ فرمایا "ایک ساتھ کھاؤ اور بسم اللہ کرلو تو برکت ہوگی[3]"۔

۸۔ کھانا ٹیک لگا کے بیٹھ کر یا منہ کے بل ہو کر نہیں کھانا چاہیئے[4] کیونکہ روحانی کیفیت کے علاوہ طبی حیثیت سے اس لئے مضر ہے کہ اس طرح غذا معدہ میں اچھی طرح سے بآرام نہیں پہنچتی ہے۔ کھانے کے لئے بیٹھنے کی مسنون صورتیں یہ ہیں کہ یا تو ایک پاؤں کھڑا کر کے اور دوسرے پاؤں کو گرا کر اسی پہ بیٹھ کر کھایا جائے یا دو زانو بیٹھ کر اور اگر جگہ کم ہو اور لوگ زیادہ ہوں تو اکڑوں بیٹھ کر[5]۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ ٹیک لگا کر نہیں کھاتا میں بندہ ہوں غلاموں

---

[1] بخاری کتاب الاطعمہ [2] النور: ۶۱۔ [3] و [4] ابوداؤد کتاب الاطعمہ۔ [5] ابوداؤد کتاب الاطعمہ ابن ماجہ کتاب الاطعمہ و شرح سفر السعادۃ فیروز آبادی للشیخ عبدالحق محدث دہلوی۔

کی طرح کھاتا ہوں یعنی خاکساری سے[1]۔

۹۔ کھانا اپنے سامنے سے کھانا چاہئے اِدھر اُدھر ہاتھ نہیں بڑھانا چاہئے[2] خصوصاً جب کئی آدمی ایک برتن میں ساتھ ہوں۔ اسکی ایک وجہ تو یہ ہے کہ کھانا ہاتھ سے گندہ نہیں ہوتا، دوسرے ہر شخص کا اپنا حصہ الگ ہوجاتا ہے اور دوسرے کے کھانے میں کوئی اچھا ٹکڑا اتفاقاً پڑگیا ہے تو اس کے لئے لالچ سے بچتا ہے اور ایثار سیکھتا ہے۔

۱۰۔ کھانا کھانے کے بعد برتن کو انگلیوں سے اور انگلیوں کو منہ سے اچھی طرح صاف کر لینا چاہئے۔ اور اس کے بعد رومال سے ہاتھ پونچھنا چاہئے[3]۔

۱۱۔ پانی ٹھہر ٹھہر کر دو تین سانس میں پینا چاہئے[4]۔ اس طرح پانی پینے سے پوری سیری ہوتی ہے اور ضرورت کے مطابق انسان پانی پیتا ہے اور اندر سے نکلنے والی گندی سانس پانی میں نہیں لگنے پاتی۔

۱۲۔ پانی کے برتن میں سانس نہیں لینی چاہئے[5] کیونکہ ممکن ہے کہ منہ یا ناک سے تھوک وغیرہ نکل کر برتن میں پڑجائے اور وہ آدمی کو مکروہ معلوم ہو۔ پھر یہ بھی معلوم ہے کہ ہر سانس جو اندر سے باہر آتی ہے وہ بدن کی کثافتوں کو لے کر باہر نکلتی ہے اس لئے اس سانس کو یا اس سانس سے ملی ہوئی چیز کو پھر اندر نہیں کرنا چاہئے۔

۱۳۔ پانی بے ضرورت کھڑے ہو کر نہیں پینا چاہئے کیونکہ یہ وقار کے خلاف ہے اور طبی حیثیت سے بھی مضر ہے۔ البتہ کبھی کبھی اگر کوئی پی لے تو کچھ حرج نہیں کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کبھی کھڑے کھڑے پانی پی لیا ہے[6]۔ مگر اس کی عادت نہیں کرنی چاہئے کیونکہ پانی پینے میں

---

[1] و [2] ابوداؤد و ابن ماجہ مع زرقانی علی السیرۃ ج ۴ صفحہ ۳۹۸ [3] بخاری کتاب الاطعمہ [4] بخاری کتاب الاشربہ [5] ابوداؤد کتاب الاشربہ [6] ابوداؤد کتاب الاشربہ و موطا امام محمد۔

ضرورت ہے کہ اندر کے پٹھے ذرا ڈھیلے ہو جائیں اور یہ بات بیٹھ کر پانی پینے سے حاصل ہوتی ہے۔
البتہ زمزم کا پانی برکت، دعا، اور شاید تعظیم کی خاطر کھڑے ہو کر پینا مسنون ہے۔

۱۴۔ پانی مشکیزہ کے منہ یا پیالہ کے سوراخ سے نہیں پینا چاہیے کیونکہ اس سے اول تو پانی کی مقدار کا اندازہ نہیں ہوتا کہ کتنا پی لیا پھر یہ دیکھا نہیں جا سکتا کہ اس کے اندر کوئی مضر چیز تو نہیں

۱۵۔ کھانے اور پانی کے برتنوں کو ڈھانک کے رکھنا چاہیے تاکہ اس میں گرد و غبار یا کوئی نجس چیز یا کوئی کیڑا مکوڑا نہ پڑنے پائے یا کوئی جانور پانی نہ پینے پائے۔[1]

۱۶۔ کھانے کے بعد خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے کھلایا اور پلایا۔ اس موقع پر کئی مختلف دعائیں حدیثوں میں آتی ہیں جن میں سے ایک مختصر دعا یہ ہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ○

یعنی اس خدا کا شکر ہے جس نے کھلایا اور پلایا اور مسلمان بنایا۔[2]

---

[1] صحیح مسلم کتاب الاشربہ [2] عمل الیوم واللیلۃ ابن السنی باب ما یقول اذا اکل الطعام۔

آدابِ مجلس

آدابِ مجلس میں اصولی بات یہ ہے کہ مجلس میں تہذیب اور وقار کی شکل پیدا ہو اور شرکائے مجلس میں سے ہر ایک کا حق برابر ہو تاکہ یہ مجلس شرکاء کی باہمی محبت بڑھانے کا سبب ہو۔ ان ہی دو باتوں کو قائم رکھنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی شریعت نے نشست و برخاست کے کچھ آداب سکھائے ہیں۔

۱۔ مجلس میں انسان کو جہاں بے تکلف پہلے جگہ مل جائے یعنی جہاں تک نشست کا دائرہ اس کے آنے تک پہنچ چکا ہے وہیں بیٹھ جانا چاہئے۔ یہ نہیں کرنا چاہئے کہ مجمع کو چیر کر خواہ مخواہ آگے بیٹھنے کی کوشش کرے کیونکہ اس سے ایک تو پہلے سے آنے والوں اور بیٹھنے والوں کو تکلیف ہوتی ہے اور دوسرے ایسا کرنے والوں میں غرور و نخوت پیدا ہوتی ہے۔ اور اپنے تشخص کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ صحابہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسوں میں اسی طریقہ سے بیٹھتے تھے[1]۔ انتہا یہ ہے کہ مسجد میں بعد کے آنے والے نمازیوں کے لئے یہ سزاوار نہیں کہ وہ لوگوں کو روندتے ہوئے آگے کی صف میں بیٹھنے کی کوشش کریں۔ جمعہ کی نماز میں یہ خاص طور سے دیکھنے میں آتا ہے۔ اسی لئے "تخطی رقاب" یعنی دوسروں کی گردنوں کو روند کر اور زیرِ قدم لا کر آگے بڑھنے کو جمعہ میں خاص طور سے منع کیا گیا ہے۔

---

[1] ادب المفرد باب مجلس الرجل حیث انتہی۔

۲۔ مجلس میں کسی کو اٹھا کر اس کی جگہ نہیں بیٹھنا چاہئے[1] کیونکہ اس سے تفوق پسندی اور خود بینی کا اظہار ہوتا ہے اور دوسرے کے دل میں کدورت پیدا ہوتی ہے۔

۳۔ اگر کوئی شخص مجلس میں ایک جگہ بیٹھ کر کسی ضرورت سے خود اٹھ جائے تو پلٹنے کے بعد وہی اس جگہ کا مستحق ہے[2] دوسرا اس جگہ نہیں بیٹھ سکتا۔ کیونکہ وہ اس پر پہلے قابض ہو چکا تھا اور اس کا یہ حق عارضی طور سے اٹھ جانے سے چلا نہیں جاتا۔

۴۔ اگر مجلس میں دو شخص باہم مل کر بیٹھے ہوئے ہوں تو ان کی اجازت کے بغیر دونوں کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا ہے[3] کیونکہ اکثر دو شخص اس طرح باہم آپس میں بات چیت کرنے کے لئے یا کسی اور مصلحت باہمی سے بیٹھتے ہیں اور ان دونوں میں موانست اور بے تکلفی ہوتی ہے۔ اس لئے ان کا الگ کر دینا ان کے تکدر اور وحشت کا باعث ہوتا ہے۔

۵۔ اگر کچھ لوگ مجلس میں حلقہ باندھ کر بیٹھے ہوئے ہوں تو کسی کو اس حلقہ کے وسط میں نہیں بیٹھنا چاہئے۔ ایسے شخص پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت بھیجی ہے[4] کیونکہ اس حالت میں کچھ لوگوں کی طرف اس کا منہ ہو گا اور کچھ لوگوں کی طرف پیٹھ ہو گی جو ایک قسم کی بدتمیزی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مسخرے لوگ اس طرح بیٹھتے ہوں تاکہ سب کو ہنسا سکیں، اور یہ صورت تہذیب و وقار کے خلاف ہے۔

۶۔ مجلس میں کسی شخص کے گرد یا سامنے کسی کو کھڑا نہیں رہنا چاہئے[5] کیونکہ یہ عجمیوں کی عادت تھی کہ نوکر چاکر آقا کے اور رعایا بادشاہ کے گرد کھڑی رہتی تھی اور یہ ایک ایسی مبالغہ آمیز تعظیم تھی جس کا ڈانڈا شرک سے مل جاتا تھا۔ اس طرح ایک شخص گویا خدا بنتا تھا اور دوسرے اس کے آگے

---

[1] ترمذی ابواب الاستیذان باب ماجاء فی کراہیۃ ان یقام الرجل من مجلسہ ثم یجلس فیہ۔ [2] ترمذی ابواب الاستیذان باب اذا قام الرجل من مجلسہ ثم رجع ہو احق بہ۔ [3] ترمذی ابواب الاستیذان باب ماجاء فی کراہیۃ الجلوس بین الرجلین بغیر اذنہما۔ [4] ترمذی ابواب الاستیذان باب ماجاء فی کراہیۃ القعود وسط الحلقۃ۔ [5] ابوداؤد کتاب الادب باب فی قیام الرجل للرجل۔

اپنی شخصی خودداریوں اور عزتِ نفس کو فنا کر دیتے تھے جو اسلام جیسے مساوات پسند مذہب میں اچھا نہیں سمجھا جا سکتا۔

۷۔ راستہ میں نہیں بیٹھنا چاہئے کیونکہ یہ وقار کے خلاف ہے اور ہر آیند و روند کو تکنا بداخلاقی ہے۔ لیکن اگر ضرورت مجبور کرے تو ایسے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ چند اخلاقی باتوں کی پابندی کرنی چاہئے یعنی نگاہ نیچی رکھنا، ضرر رساں چیزوں کو راستہ سے دور کرنا، سلام کا جواب دینا، بری باتوں سے روکنا، راستہ بھولے ہوؤں کو راستہ دکھانا اور مصیبت میں مارے ہوؤں کی مدد کرنا[1]۔

۸۔ انسان پر سب سے زیادہ صحبت کا اثر پڑتا ہے اس لئے اپنے ہم نشینوں کے انتخاب میں اس کا ضرور لحاظ رہے کہ وہ ایسے لوگ ہوں جن کی صحبت سے اس کو فائدہ پہنچے۔ ہر انسان جس کی صحبت کو پسند کرتا ہے اس سے خود انسان کی فطری استعداد اور فطری مناسبت کا پتہ چلتا ہے۔ اسی نکتہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ روحیں ایک مخلوط فوج ہیں۔ جن میں باہم آشنائی ہوتی ہے ان میں الفت و موانست پیدا ہو جاتی ہے اور جن میں بیگانگی ہوتی ہے ان میں تفریق و اختلاف پیدا ہو جاتا ہے[2]۔ ایک مشہور مثل ہے، کہ "اگر کسی کے اخلاق کا پتہ لگانا چاہو تو اس کے دوستوں کے اخلاق کا پتہ لگاؤ"۔ اس نکتہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ان لفظوں میں ظاہر کیا ہے کہ "آدمی اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے اس لئے ہر شخص کو یہ دیکھ لینا چاہئے کہ وہ کس سے دوستی کرتا ہے"۔ پھر فرمایا کہ اچھے ہمنشین اور بُرے ہمنشین کی مثال مُشک بیچنے والے اور لوہار کی بھٹی کی ہے۔ مُشک بیچنے والے سے تم کو کچھ فائدہ ضرور پہنچے گا یا اس کو خریدو گے یا اس کی خوشبو پاؤ گے۔ لیکن لوہار کی بھٹی تمہارا گھر یا کپڑا جلائے گی یا تمہارے دماغ میں اس کی ناگوار بُو

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی الجلوس فی الطرقات۔ [2] ادب المفرد باب الارواح جنود مجندہ۔

پہنچے گی۔[1]

مجلس میں جو معزز جگہ ہو وہاں بیٹھنے کی از خود کوشش نہ کی جائے۔ کسی دوسرے کے یہاں جائے تو بھی اس کی اجازت کے بغیر اس کی معزز جگہ پر بیٹھنے کی کوشش نہ کرے فرمایا کہ "اپنے بھائی کی معزز جگہ پر اس کی اجازت کے بغیر کوئی نہ بیٹھے۔"[2]

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ مجلس میں یہ کوشش کرتے ہیں کہ اس معزز جگہ میں نہیں تو اس سے جس قدر قریب جگہ ہو اسی میں بیٹھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صدر نشین کے پاس جگہ بہت تنگ ہو جاتی ہے اور لوگوں کو وہاں سے ذرا سرکنے اور دوسروں کے لئے جگہ بنانے کیلئے کہا جائے تو وہ بُرا مانتے ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اس ادب کو سکھایا۔ فرمایا:

يَآيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قِيلَ	اے مسلمانو! جب تم سے کہا جائے کہ
لَكُمْ تَفَسَّحُوا فِي الْمَجَالِسِ	مجلسوں میں کشادگی کرو تو کشادگی کرو
فَافْسَحُوا يَفْسَحِ اللَّهُ لَكُمْ ۖ وَإِذَا	اللہ تمہارے لئے کشادگی کرے گا۔ اور
قِيلَ انْشُزُوا فَانْشُزُوا يَرْفَعِ	اگر کہا جائے کہ اٹھ جاؤ تو اٹھ جاؤ۔ اللہ ان کے رتبے
اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ ۙ وَ	اونچے کرے گا جو تم میں سے ایمان
الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ ۚ	لائے اور جن کو علم دیا گیا۔ اور اللہ تمہارے
وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝	کاموں کی خبر رکھتا ہے۔

(المجادلۃ: ۱۱)

اسی طرح مجلس میں بیٹھ کر اس طرح آپس میں کانا پھوسی نہیں کرنی چاہیئے کہ دوسرے حاضرین کو یہ معلوم ہو کہ آپ ان ہی کی نسبت کچھ کہہ رہے ہیں۔ منافقوں کے اس طرزِ عمل کی

---

[1] بخاری کتاب البیوع باب فی العطار و بیع المسک [2] ترمذی ابواب الاستیذان باب ماجاء فی الاتکاء۔

برائی قرآن پاک نے برملا کی ہے ۔

اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	یہ جو ہے کانا پھوسی سو شیطان کا کام ہے کہ دلگیر کرے ایمان والوں کو ۔

(المجادلة : ۱۰)

جہاں چند آدمی بیٹھے ہوں وہاں کوئی دو آدمی آپس میں ایسی سرگوشی کرنے لگتے ہیں تو دوسروں کو یہ بُرا معلوم ہوتا ہے۔ ایک تو یہ خیال ہوتا ہے کہ انہوں نے ہم کو اس راز کے قابل نہیں سمجھا دوسرے یہ بدگمانی ہوتی ہے کہ وہ شاید ہماری ہی نسبت کچھ کہہ رہے ہیں۔ اسی لئے ارشاد ہوا کہ تیسرے کو چھوڑ کر دو آدمی آپس میں سرگوشی نہ کریں کہ اس سے تیسرا غمگین ہوگا۔[1]

مجلس کی راز کی باتوں کو برملا نہیں بیان کرنا چاہئے کہ المجالس بالامانة قولِ نبوی[2] ہے۔

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب فی التناجی [2] ابوداؤد کتاب الادب باب فی نقل الحدیث۔

آدابِ ملاقات

اسلام میں معاشرتی حیثیت سے دوستوں کی ملاقات کے لئے جانا ایک ثواب کا کام ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ جس شخص نے کسی مریض کی عیادت کی یا اپنے بھائی کی (جس کی اخوت فی اللہ ہو) ملاقات کو گیا تو ایک پکارنے والا اس کو آواز دے گا کہ تم اچھے تمہارا آنا اچھا اور تم نے جنت میں اپنے لئے ایک مکان بنا لیا۔[1]

اسلام نے ملاقات کے جو آداب مقرر کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) دوستوں کی ملاقات کے وقت چہرہ سے خوش دلی اور مسرت ظاہر کرنی چاہئے اسی لئے فرمایا کہ "تمہارا اپنے بھائی کے سامنے مسکرانا یہ بھی صدقہ ہے[2]"۔ ملاقات کے وقت سب سے پہلے جو کلمہ منہ سے نکلے وہ محبت اور امن وسلامتی کا پیام ہو جس کو شریعت نے السلام علیکم (تم پر سلامتی ہو) کے لفظوں میں ترتیب دیا ہے۔ چھوٹے بڑے کو بڑے چھوٹے کو سب سے پہلے یہی پیام دیں۔

دنیا کی تمام قوموں میں ملاقات کے وقت خوشی اور محبت کے ظاہر کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی لفظ یا فقرہ کہنے کا رواج تھا اور ہے۔ عرب کے لوگ ملاقات کے وقت "انعم اللہ بک

---

[1] ترمذی کتاب البر والصلہ باب ماجاء فی زیارۃ الاخوان۔ [2] ترمذی کتاب البر والصلہ باب ماجاء فی صنائع المعروف۔

عیناً" وانعم اللّٰہ بك صباحًا" کہتے تھے یعنی "تمہاری آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔" "تمہاری صبح خوشگوار ہو" امراء وسلاطین کے لئے دوسرے الفاظ تھے۔ ایرانی "ہزار سال بزی" (ہزار برس جیو) کا فقرہ کہتے تھے۔ یورپ کے لوگوں میں صبح کو "گڈ مارننگ" (اچھی صبح) شام کو "گڈ ایوننگ" (اچھی شام)، رات کو "گڈ نائٹ" (اچھی رات) وغیرہ کہنے کا رواج ہے۔ مگر اسلام نے ان سب کے بجائے "السلام علیکم" کا لفظ ایجاد کیا اور اس میں حسب ذیل مصلحتیں ملحوظ رکھیں۔

(۱) یہ تمام انبیاء علیہم السلام کا متفقہ طریقہ ہے جیسا کہ قرآن پاک میں اس کے استعمالات سے جو انبیاء علیہم السلام کی زبان مبارک سے ادا ہوئے ہیں (وَالسَّلَامُ عَلَیَّ) یا ان کے لئے کہے گئے ہیں (وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ)[1] ظاہر ہوتا ہے۔

(۲) اس کی صورت ذکر و دعاء کی ہے۔ دنیوی تمتعات مثلاً طولِ عمر وغیرہ سے اس کا تعلق نہیں اور نہ محدود و معین اوقات سے مقید ہے۔ اس میں دائمی اور سرمدی سلامتی کا راز چھپا ہے۔

(۳) اس میں مذہبی شان زیادہ پائی جاتی ہے کیونکہ اس سلامتی سے مقصود جس کی طرف اسلام کا الف لام اشارہ کرتا ہے وہ سلامتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر نازل ہوتی ہے۔

(۴) اس میں مبالغہ آمیز تعظیم نہیں پائی جاتی جو بندگی کورنش، آداب عرض اور دوسرے قسم کے غیر مشروع طریقوں میں پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت قیس بن سعدؓ نے آپؐ سے کہا کہ میں نے حیرہ والوں کو دیکھا ہے کہ اپنے رئیسوں کو سجدہ کرتے ہیں تو آپؐ اس کے زیادہ مستحق ہیں کہ ہم لوگ آپؐ کو سجدہ کیا کریں۔ تو آپؐ نے ان کو اس کی اجازت نہیں دی[2]۔ ایک اور شخص نے کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! جب ہم میں سے کوئی اپنے بھائی یا دوست

---

[1] مریم ۱۲۳ [2] الصّٰفّٰت : ۱۸۱ [3] ابوداؤد کتاب النکاح باب فی حق الزوج علی المرأة۔

سے ملتا ہے تو کیا اس کے لیے جھک جائے؟ فرمایا "نہیں" اس نے کہا تو کیا اس سے لپٹ جائے اور اس کا بوسہ لے؟ فرمایا "نہیں"[1] اس نے کہا کہ اس کا ہاتھ پکڑے اور اس سے مصافحہ کرے؟ فرمایا "ہاں"[2]۔

(۵) دنیا میں انسان کو جو بہتر سے بہتر دعا دی جا سکتی ہے وہ اسی سلامتی کی ہے کہ یہ جان و مال آل و اولاد، دنیا اور آخرت ہر قسم کی سلامتی کو مشتمل ہے۔

(۶) جب دو انسان آپس میں ملتے تھے تو ایک دوسرے سے بے گانگی کے سبب سے متوحش اور چوکنے ہوتے تھے اور ڈرتے تھے کہ کہیں غفلت پا کر دشمنی نہ کرے۔ اب جب کہ اسلام کے قاعدہ کے مطابق دونوں اس لفظ کو اپنے اپنے منہ سے ادا کرتے ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کو اپنی طرف سے اطمینان دلاتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی سلامتی کی دعا کرتے ہیں۔

(۷) اسلام نے اپنے پیروں کے درمیان اس کو گویا آپس میں پہچان کی علامت اور "رواج ورد" مقرر کیا ہے۔ آمنے سامنے جب دو زبانوں سے یہ لفظ نکلتے ہیں تو دونوں اپنے سینوں میں ہزار بے گانگی کے باوجود آشنائی کی ایک لہر پاتے ہیں اور آپس میں محبت کی کشش محسوس کرتے ہیں۔ یہ بتاتا ہے کہ دونوں ایک ہی ملت محمدیہ کے ایمانی فرزند ہیں۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو سب سے پہلے جو تعلیم دی وہ یہ تھی:

یا ایھا الناس افشوا السلام	لوگو! باہم سلام کو پھیلاؤ، کھانا کھلاؤ
واطعموا الطعام وصلوا	اور جب تمام لوگ سو رہے ہوں

---

[1] یہ ممانعت اس موقع سے مخصوص ہے جہاں شرعی محذور ہو، مثلاً ملنے والا امرد ہو، یا کوئی اور شہوت انگیز صورت ہو
[2] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی المصافحہ۔

الناس نیام تدخلوا الجنة بسلام	تو نماز پڑھو، یہ سب کروگے تو جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ گے۔

(ترمذی ابواب الزھد)

ایک دوسری حدیث میں سلام کی غرض و غایت بھی بیان فرمادی اور فرمایا کہ "تم لوگ اس وقت تک جنت میں داخل نہ ہوگے جب تک ایمان نہ لے آؤ اور اس وقت تک ایمان نہ لاؤ گے جب تک آپس میں محبت نہ کرو۔ میں تم کو ایک ایسی بات بتاتا ہوں کہ جب تم اس پر عمل کروگے تو باہم محبت کرنے لگو گے اور وہ یہ ہے کہ باہم سلام کو پھیلاؤ[1]۔"

سلام کرنے کے لئے شناسا و غیر شناسا، جانے اور انجان کی تخصیص نہیں[2]، مرد اور عورت کی تفریق نہیں[3]، بڑے اور بچہ کی تمیز نہیں[4] البتہ اسلام نے سلام کی ابتدا کرنے کے لئے دو اصول کو ملحوظ رکھا ہے جو تمام متمدن قوموں میں رائج تھے۔ ایک یہ کہ چھوٹا ادب و احترام کا لحاظ کرے اور اس اصول کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ چھوٹا بڑے کو، گزرنے والا بیٹھنے والے کو، اور چھوٹی جماعت بڑی جماعت کو سلام کرے۔ دوسرا یہ کہ سلام کے ذریعہ سے تواضع و خاکساری کا اظہار ہو اس اصول کی بنا پر اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ سوار کو پیدل چلنے والے کو سلام کرنا چاہیئے[5]۔

ان مصالح کے لحاظ سے آپؐ نے اپنے اہل و عیال کو بھی گھر میں جانے کے وقت سلام کرنے کا حکم دیا اور اس کو موجب برکت قرار دیا[6]۔ مجلس سے اٹھ جاتے وقت بھی لوگوں کو سلام کرنا چاہیئے[7]۔

---

[1] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی افشاء السلام۔ [2] بخاری کتاب الاستیذان باب السلام للمعرفۃ وغیر المعرفۃ۔ [3] بخاری کتاب الاستیذان باب تسلیم الرجال علی النساء والنساء علی الرجال [4] بخاری کتاب الاستیذان باب التسلیم علی الصبیان۔ [5] کتاب الاستیذان باب فی تسلیم الراکب علی الماشی۔ [6] ترمذی کتاب الاستیذان باب فی التسلیم اذا دخل بیتہ۔ [7] ترمذی کتاب الاستیذان باب التسلیم عند القیام والقعود۔

سلام میں رحمۃ اللہ وبرکاتہ کے الفاظ کا اضافہ کرنا اور بھی موجب ثواب ہے۔ چنانچہ ایک بار ایک شخص آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا السلام علیکم۔ آپؐ نے فرمایا "اُس کو دس نیکیاں ملیں"۔ دوسرا آدمی آیا تو کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپؐ نے فرمایا "اُس کو بیس نیکیاں ملیں"۔ تیسرا آدمی آیا اور اس نے کہا کہا السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آپؐ نے فرمایا "اس کو تیس نیکیاں ملیں"[۱]۔

جس شخص کو سلام کیا جائے اس کا یہ فرض ہے کہ سلام کا جواب اسی طریق سے بلکہ اس سے بہتر طریقہ سے دے یعنی سلام کرنے والے نے جو الفاظ کہے ہیں ان پر دوسرے مناسب الفاظ کا اضافہ کرے ورنہ کم از کم وہی الفاظ دہرا دے۔ چنانچہ خود قرآن مجید نے یہ تعلیم دی ہے:

وَإِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا ۗ (النساء: ۸۶)	اور (مسلمانو!) جب تم کو کسی طرح پر سلام کیا جائے تو تم اس کے جواب میں اس سے بہتر (طور پر) سلام کرو، یا (کم سے کم) ویسا ہی جواب دو۔

اس سے کم الفاظ میں سلام کا جواب دینا اگرچہ فقہاء کے نزدیک جائز ہے لیکن آیت کا ظاہری مفہوم یہی ہے کہ استحساناً یہ ناکافی ہے۔

(۲) ملاقات کے وقت اظہارِ محبت اور اظہارِ مسرت کا دوسرا ذریعہ مصافحہ ہے اور اس سے سلام کے اغراض کی تکمیل ہوتی ہے اس لئے اسلام نے اس کو بھی سلام کا ایک جزء قرار دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سلام کا تکملہ ہاتھ کا پکڑنا یعنی مصافحہ کرنا ہے[۲]۔ مدینہ میں سب سے پہلے یہ تحفہ اہلِ یمن لائے[۳] اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قبول کر لیا اور مسلمانوں کے

---

[۱] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماذکر فی فضل السلام۔ [۲] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی المصافحہ [۳] ابوداؤد کتاب الادب باب فی المصافحہ

درمیان محبت اور اتحاد کا ایک ذریعہ قرار دیا۔ بعض حالات میں ملاقات کے وقت معانقہ کرنے یا بوسہ دینے کی جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے ممانعت آئی ہے لیکن اگر کوئی شرعی محذور نہ ہو تو اس کی اجازت بھی ہے۔ چنانچہ ایک بار حضرت زید بن حارثہؓ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے ان کو گلے لگا لیا اور ان کا بوسہ لیا۔[1]

کسی محبوب و محترم شخص کو آتے ہوئے دیکھ کر جوش محبت اور جوش عقیدت میں کھڑا ہو جانا بھی ممنوع نہیں حضرت فاطمہؓ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتی تھیں تو آپ کھڑے ہو جاتے تھے، ان کا ہاتھ چومتے تھے اور اپنی جگہ ان کو بٹھاتے تھے۔ اور جب آپ ان کے یہاں آتے تھے تو وہ بھی یہی برتاؤ کرتی تھیں۔ ایک موقع پر جب حضرت سعد بن معاذؓ جو بیمار اور زخمی تھے، آئے تو آپ نے تمام صحابہ کو حکم دیا کہ اٹھ کر جائیں اور ان کو لے آئیں۔[2]

دوسری قوموں میں ملاقات اور مجلس کے وقت بعض مشرکانہ قسم کے آداب جاری تھے اسلام نے ان کو یک قلم منسوخ کر دیا۔ ایک طریقہ یہ تھا کہ لوگ محبت کے بجائے غلامانہ اور بندگی کی ذہنیت سے اپنے امیروں اور بادشاہوں کے لئے کھڑے ہوتے تھے اور اسی طرح کھڑے رہ جاتے تھے۔ آپؐ نے اس سے منع کیا کہ تم آپس میں ایک دوسرے کے لئے ایسے نہ کھڑے ہوا کرو جیسے عجمی کھڑے ہوتے ہیں۔[3]

اس قسم کے موقعوں پر خوش آمدید کے الفاظ مثلاً مرحبا کہنے کی مثال بھی شریعت میں موجود ہے۔[4]

(۳) ملاقات یا کسی اور کام کے لئے کسی کے گھر میں جانے کے لئے صاحب خانہ سے اجازت لے لینا ضروری ہے اور اس کا حکم اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید میں دیا ہے:

---

[1] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی المعانقۃ والقبلۃ [2] یہ دونوں واقعے ابوداؤد کتاب الادب باب ماجاء فی القیام میں ہیں [3] ابوداؤد کتاب الادب باب قیام الرجل للرجل۔ [4] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء فی مرحبا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّىٰ تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَىٰ أَهْلِهَا ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ○ فَإِن لَّمْ تَجِدُوا فِيهَا أَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوهَا حَتَّىٰ يُؤْذَنَ لَكُمْ ۖ وَإِن قِيلَ لَكُمُ ارْجِعُوا فَارْجِعُوا ۖ هُوَ أَزْكَىٰ لَكُمْ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ○

(النور: ۲۷-۲۸)

مسلمانو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں گھر والوں سے پوچھے اور ان سے سلام علیک کئے بغیر نہ جایا کرو۔ یہ تمہارے حق میں بہتر ہے (یہ حکم تم کو اس غرض سے دیا گیا ہے) کہ (جب ایسا موقع ہو تو تم اس کا خیال رکھو۔ پھر اگر تم کو معلوم ہو کہ گھر میں کوئی آدمی موجود نہیں تو جب تک تمہیں (خاص) اجازت نہ ہو ان میں نہ جاؤ اور اگر (گھر میں کوئی ہو اور) تم سے کہا جائے کہ (اس وقت موقع نہیں) لوٹ جاؤ تو (بے تامل) لوٹ آؤ۔ یہ لوٹ آنا تمہارے لئے زیادہ صفائی کی بات ہے۔ اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے۔

غیر محرم عورتوں سے ملنے کے لئے ان کے شوہروں سے اجازت لینے کی ضرورت ہے۔[1] کسی کے گھر میں داخل ہونے کے لئے اجازت لینے کے اگرچہ اور بھی بہت سے فائدے ہو سکتے ہیں لیکن اس کا اصلی مقصد یہ ہے کہ انسان بعض اوقات ایسی حالت میں ہوتا ہے کہ وہ یہ پسند نہیں کرتا کہ دوسروں کی نگاہ اس پر پڑے۔ یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے مکان پر جاتے تھے تو چونکہ اس وقت دروازوں پر پردہ ڈالنے کا رواج نہ تھا[2] اس لئے اجازت لینے سے پہلے دروازہ کے

---

[1] ترمذی کتاب الاستیذان باب ما جاء فی النہی عن الدخول علی النساء الا باذن ازواجھن۔ [2] ابوداؤد کتاب الادب باب الاستیذان فی العورات الثلاث۔

دائیں یا بائیں کھڑے ہوتے تھے سامنے نہیں کھڑے ہوتے تھے[1] تاکہ اندر کی چیزوں پر نگاہ نہ پڑے۔ ایک بار ایک شخص آئے اور آپ کے دروازہ کے سامنے کھڑے ہوگئے تو آپ نے فرمایا کہ دروازہ کے دائیں یا بائیں کھڑے ہو کیونکہ اجازت لینے کا حکم اسی لئے دیا گیا ہے کہ گھر کے اندر کی چیزوں پر نگاہ نہ پڑنے پائے۔[2] ایک حدیث میں ہے کہ اگر بلا اجازت کوئی شخص کسی کے گھر میں تاک جھانک کرے اور کوئی اس کی آنکھ پھوڑ دے تو اس پر الزام نہیں۔[3] ایک بار کسی نے آپ کے حجرہ میں تاک جھانک کی۔ آپ اس وقت ایک لوہے کی کنگھی سے سر جھاڑ رہے تھے۔ فرمایا اگر میں یہ جانتا کہ تم دیکھ رہے ہو تو اس کو تمہاری آنکھوں میں کونچ دیتا۔ پھر فرمایا انما جعل الاذن من قبل البصر یا فرمایا انما جعل الاستیذان من اجل البصر یعنی اجازت کی ضرورت تو اسی لئے ہے کہ اس کو دیکھو نہیں۔[4]

اجازت لینے کا طریقہ یہ ہے کہ سلام کرکے یہ کہے کہ میں اندر آسکتا ہوں۔[5] تین بار سلام کرنے کے بعد اگر اجازت نہ ملے تو واپس جانا چاہیے۔[6] البتہ اگر کسی کو خود بلایا جائے تو اس کو اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔[7] اگر کوئی شخص گھر کے دالان میں بیٹھا ہوا ہو اور اس کے ساتھ کوئی دوسرا نہ ہو تو اس وقت بھی اجازت لینا غیر ضروری ہے۔[8] دکانوں میں جانے کے لئے اور اسی قسم کے دوسرے پبلک مقامات میں بھی اجازت لینا ضروری نہیں۔[9] خود اپنے گھر کے اندر بھی سلام کرکے جانا چاہیے اس سے برکت کے علاوہ یہ فائدہ ہوگا کہ اگر گھر میں عورتیں بے تکلفی کی حالت میں ہوں گی یا گھر میں غیر محرم عورتیں آگئی ہیں تو وہ ہوشیار ہوجائیں۔

---

[1] ادب المفرد باب کیف یقوم عند الباب۔ [2] ابوداؤد کتاب الادب فی الاستیذان۔ [3] ترمذی کتاب الاستیذان باب الاستیذان قبالۃ البیت و بخاری کتاب الدیات باب من اطلع فی بیت قوم ففقؤا عینیہ فلا دیۃ لہ۔ [4] اس کتاب کے صفحہ ۶۹ میں اس حدیث کے لفظ یہ لکھے گئے ہیں۔ انما الاذن لاجل الرویۃ، مگر صحیح لفظ یہ ہیں جو یہاں نقل کئے گئے ہیں۔ دیکھئے صحیح بخاری کتاب الاستیذان باب الاستیذان من اجل البصر و کتاب الدیات باب من اطلع فی بیت قوم۔ [5] ابوداؤد کتاب الادب باب فی الاستیذان۔ [6] ابوداؤد کتاب الادب باب کم مرۃ یسلم الرجل فی الاستیذان۔ [7] ادب المفرد باب دعاء الرجل اذنہ۔ [8] ادب المفرد باب مالا یستاذن فیہ۔ [9] ادب المفرد باب الاستیذان فی حوانیت السوق۔

یہ آداب تو اجنبی اور نا آشنا لوگوں کے لئے تھے۔ لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جن سے پردہ کرنا ضروری نہیں اور وہ ہر وقت گھر میں آتے جاتے رہتے ہیں مثلاً چھوٹے چھوٹے بچے یا لونڈی غلام۔ اس لئے اگر ان کے لئے بھی ہر وقت اجازت لینے کی ضرورت ہو تو اس سے بڑی تکلیف ہو گی۔ البتہ خاص خاص اوقات میں جن میں لوگ اکثر بے پردہ رہتے ہیں ان کے لئے بھی اذن طلب کرنا ضروری ہے۔ اور خود قرآن مجید نے ان اوقات کی تعیین کر دی ہے یعنی نمازِ عشاء کے بعد سے نمازِ صبح سے پہلے تک کہ کپڑے اتار کر سونے کا وقت ہے اور دوپہر کو جب قیلولہ کے لئے کوئی لیٹے کہ یہ بھی تخلیہ کا وقت ہے۔

فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ	مسلمانو! تمہارے ہاتھ کے مال (یعنی لونڈی
الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ	غلام) اور تم میں سے جو سن بلوغ کو نہیں
وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ	پہنچے تین وقتوں میں تمہارے پاس آنے
مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ مِنْ	کی تم سے اجازت لے لیا کریں۔ (ایک
قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ	تو) نماز صبح سے پہلے اور (دوسرے) جب
تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ	تم دوپہر کو (سونے کے لئے معمول کے
الظَّهِيْرَةِ وَمِنْۢ بَعْدِ	مطابق) کپڑے اتار دیا کرتے ہو اور (تیسرے)
صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ۗ ثَلٰثُ عَوْرٰتٍ	نماز عشاء کے بعد۔ (یہ) تین وقت تمہارے
لَّكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ	پردے کے وقت ہیں۔ ان (اوقات)
جُنَاحٌۢ بَعْدَهُنَّ ؕ طَوّٰفُوْنَ	کے سوا نہ (تو بے اذن آنے دینے میں) تم
عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ	پر کچھ گناہ اور نہ (بے اذن چلے آنے میں)
كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ ؕ	ان پر کچھ گناہ کیونکہ وہ اکثر تمہارے پاس

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○ وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ط

(النور: ۵۸-۵۹)

آتے جاتے رہتے ہیں (اور) تم میں سے بعض کو (یعنی لونڈی غلاموں کو) بعض (یعنی تمہارے) پاس آنے جانے کی ضرورت لگی ہی رہتی ہے (تو بار بار اذن مانگنے میں تم لوگوں کو بڑی تکلیف ہو گی) یوں اللہ (اپنے) احکام تم سے کھول کر بیان کرتا ہے۔ اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔ اور (مسلمانو!) جب تمہارے لڑکے حدِّ بلوغ کو پہنچیں تو جس طرح ان سے اگلے (یعنی ان سے بڑی عمر کے گھروں میں آنے کے لئے) اذن مانگا کرتے ہیں، اسی طرح ان کو بھی اذن مانگنا چاہیے۔

آدابِ گفتگو

آدابِ گفتگو میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم نرمی سے گفتگو کریں۔ حضرت موسٰی اور حضرت ہارون علیہما السلام کو ہدایت ہوتی ہے کہ تم فرعون کے پاس جاؤ تو اس سے نرمی کے ساتھ باتیں کرو:

فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا (طٰہٰ: ۴۴) تو تم ان سے نرم بات کہنا۔

پھر جو بات کہی جائے وہ بھی اچھی ہو اور فائدہ مند۔ اس کے کہنے میں اپنا یا دوسرے کا نفع ہو۔ اسی لئے فرمایا:

وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا (البقرۃ: ۸۳) اور لوگوں سے اچھی بات کہو۔

مجلس میں بیٹھیں تو ایسے فقرے نہ کہیں جن میں کسی پر کوئی طعن چھپا ہو یا کسی کی تحقیر نکلتی ہو۔ یہود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آتے تو اسی قسم کی باتیں کہتے۔ انظرنا (ہمارا خیال کیجیے) کی جگہ راعنا کہتے جس میں تخفیف کا چھپا پہلو نکلتا۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس سے باز رکھا۔ فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انظُرْنَا (البقرۃ: ۱۰۴) اے ایمان والو! راعنا نہ کہو انظرنا کہو۔

اس کی پوری تفصیل سورۂ نساء میں ہے۔

باتیں ایسی کرنی چاہئیں جو منصفانہ اور درست ہوں۔ اگر جماعت کے بیشتر افراد اس کا لحاظ رکھیں تو آپس میں لڑائی جھگڑا بہت کم ہو اور لوگوں کے درمیان دشمنی اور عداوت نہ پیدا ہو۔ فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا	اے ایمان والو! خدا سے تقویٰ کرو
اللَّهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۙ	اور بات سیدھی کہو۔ اللہ تمہارے کاموں
يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ	کو سنوارے گا اور تمہارے گناہ معاف
لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ (الاحزاب: ۷۰-۷۱)	کرے گا۔

عورتوں کو جب نامحرم مردوں سے گفتگو کا اتفاق ہو تو بات میں اور لہجہ میں ایسی نزاکت اور لوچ نہ ہو کہ سننے والے کے دل میں بدی کا خیال پیدا ہو۔ فرمایا:

فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ	تو (اے نبی کی بیبیو) دبی زبان سے بات
الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ وَقُلْنَ	نہ کیا کرو ایسا کرو گی تو جس کے دل میں
قَوْلًا مَعْرُوفًا ۝	کسی طرح کا کھوٹ ہے وہ خدا جانے
(الاحزاب: ۳۲)	تم سے کس طرح کی توقعات پیدا کرلے
	گا اور بات کرو تو معقول نبے لاگ۔

مردوں کو نرم، معقول اور دلجوئی کے ساتھ باتیں کرنے کی تاکید آئی اور اس کا ثواب صدقہ کے برابر بتایا ہے۔ فرمایا:

قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ	نیک بات کہنی اور درگذر کرنا اس خیرات
مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ أَذًى ۗ	سے بہتر ہے جس کے پیچھے دل آزاری ہو۔
(البقرۃ: ۲۶۳)	

بات کی جائے تو آہستگی کے ساتھ، بے موقع چیخ کر باتیں کرنا حماقت کی دلیل ہے فرمایا:

وَاغۡضُضۡ مِنۡ صَوۡتِكَ ؕ اِنَّ اَنۡكَرَ الۡاَصۡوَاتِ لَصَوۡتُ الۡحَمِيۡرِ ۝ (لقمان: ۱۹)

اور کچھ اپنی آواز پست کر کہ سب آوازوں میں بُری آواز گدھوں کی ہے۔

فضول باتوں سے پرہیز کرنا وقار کی نشانی ہے مسلمانوں کی صفت یہ ہو:

وَالَّذِيۡنَ هُمۡ عَنِ اللَّغۡوِ مُعۡرِضُوۡنَ ۝ (المؤمنون: ۳)

اور جو لغو باتوں سے اعراض کرتے ہیں۔

کیونکہ انسان جو بات بھی منہ سے نکالتا ہے اس پر خدا کا فرشتہ گواہ رہتا ہے۔ خدا فرماتا ہے:

مَا يَلۡفِظُ مِنۡ قَوۡلٍ اِلَّا لَدَيۡهِ رَقِيۡبٌ عَتِيۡدٌ ۝ (ق: ۱۸)

آدمی کوئی لفظ نہیں بولتا لیکن ایک نگران اُس پر حاضر رہتا ہے۔

اس لئے ہر شخص بات منہ سے نکالنے سے پہلے اس کے ہر پہلو کو سوچ لے۔

حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہئے کہ وہ نیک بات کہے یا چپ رہے"[1] اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے کی قید کے ساتھ حضورؐ کا یہ فرمانا ادھر اشارہ کرتا ہے کہ ہم اپنے عمل کی جزا سے غفلت نہ کریں کیونکہ جب ہم بُری بات بولیں گے تو اس کی جزا بھی پائیں گے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ "آدمی کے اسلام کی خوبیوں میں سے ایک یہ ہے کہ جس چیز سے اس کو مطلب نہ ہو اُدھر توجہ نہ دے"[2] یہ حدیث ان جوامع الکلم میں سے ہے جو دیکھنے میں تو بہت مختصر ہیں مگر درحقیقت کوزہ میں دریا بند ہے۔ مسلمان اگر اسی بات کا دھیان رکھیں تو مسلمانوں کے بہت سے کام بن جائیں۔

---

[1] مسلم کتاب الایمان باب الحث علی اکرام الجار و الضیف۔ [2] موطا و شرحہ للباجی باب ماجاء فی الصدق والکذب و ترمذی کتاب الزہد۔

زبان انسان کو اظہار مطلب کے لئے ملی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ پہلے مطلب یعنی گفتگو کا مقصود و معنیٰ درست اور صحیح ہوں پھر ان کے اظہار کا طریقہ مناسب ہو اور یہ دونوں باتیں اعراض عن اللغو میں داخل ہیں۔ اگر کوئی مخاطب ایسا ہو جو ان دو باتوں میں سے کسی ایک میں کمی کرے تو اسلام کی ہدایت ہے کہ ایسے جاہل کا جواب بھی تلخ نہ دیا جائے اور اپنی سلامت روی کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے:

وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ — اور جب ناسمجھ ان کو خطاب کریں تو وہ

قَالُوْا سَلٰمًا ○ (الفرقان: ۶۳) — جواب میں سلامتی کی بات کہیں۔

گفتگو بقدر ضرورت کرنی چاہئے۔ احادیث میں ایسے لوگوں کی بہت برائی آئی ہے جو فضول باتیں کرتے ہوں اور بکواس میں مبتلا رہتے ہوں۔ اور فرمایا ہے کہ ایسے لوگ امت کے بدترین افراد ہیں[1] یہ بھی فرمایا کہ اسی ایک بات سے یا تو اللہ تعالیٰ کی تاقیامت خوشنودی حاصل ہو جاتی ہے اور یا اس کی تاقیامت ناراضی ہاتھ آتی ہے[2] یہ حدیث ہم کو اپنی گفتگو کے ہر لفظ کی اہمیت کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ دین اور دنیا کے بہت سے کاموں کا رُخ صرف زبان کے سبب سے اِدھر یا اُدھر پھر جاتا ہے یہی زبان نیکی کا ذریعہ بھی ہے اور یہی برائی کا آلہ بھی ہے اس سے دین بھی سُدھرتا ہے اور دنیا بھی اور اسی سے دونوں کے کام بگڑ بھی جاتے ہیں۔ اسی لئے آیا ہے کہ جو دونوں جبڑوں کے بیچ یعنی زبان پر پورا قابو رکھے گا وہ جنت میں جائے گا[3]

مخاطب کو جو بات اچھی طرح سمجھانی ہو اس کو صفائی اور سہولت کے ساتھ کہا جائے بلکہ اس کو دہرا کر کہا جائے تاکہ وہ اچھی طرح سمجھ جائے۔ اسی غرض سے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بات کہتے تھے تو تین بار اس کا اعادہ فرماتے تھے[4] اور گفتگو اتنی جلدی جلدی نہیں کرتے تھے کہ مخاطب

---

[1] ادب المفرد باب فضول الکلام [2] موطا امام مالک باب ما یؤمر من التحفظ فی الکلام [3] موطا امام مالک باب ما جاء فی ما یخاف من اللسان [4] ابوداؤد کتاب العلم باب تکریر الحدیث۔

ہر لفظ کے مفہوم کو اپنی گرفت میں نہ لاسکے۔ ایک بار حضرت عائشہؓ کے حجرہ کے پہلو میں بیٹھ کر حضرت ابوہریرہؓ نے بڑی تیزی کے ساتھ حدیث بیان کرنی شروع کی حضرت عائشہؓ نے اس پر اعتراض کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی تیزی کے ساتھ گفتگو نہیں کرتے تھے بلکہ اس طرح ٹھہر ٹھہر کے گفتگو کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص آپ کے الفاظ کو گننا چاہتا تو گن سکتا تھا[1] حضرت جابر بن عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں ترتیل اور ترسیل پائی جاتی تھی یعنی ہر لفظ جدا جدا ہوتا تھا اور گفتگو میں عجلت نہیں فرماتے تھے۔ اسی مفہوم کو حضرت عائشہؓ اس طرح ادا فرماتی ہیں۔

کان کلام رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ایک
علیه وسلم کلاماً فصلا یفهمه	دوسرے سے الگ الگ ہوتا تھا اور
کل من سمعه	جو شخص اس کو سنتا تھا سمجھ لیتا تھا۔

(ابوداؤد کتاب الادب باب الہدی فی الکلام

گفتگو نہایت مختصر الفاظ میں کرنی چاہئے۔ ایک بار ایک شخص نے نہایت طویل گفتگو کی یا طویل خطبہ دیا۔ حضرت عمرو بن العاصؓ نے سنا تو فرمایا کہ اگر وہ میانہ روی اختیار کرتا تو اس کے لئے بہتر ہوتا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مجھ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں گفتگو میں اختصار کروں کیونکہ اختصار بہتر ہے[2]

گفتگو یا تقریر سے بعض اوقات فخر و مباہات اور شہرت مقصود ہوتی ہے بعض اوقات اس کے ذریعہ سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنایا جاتا ہے، کبھی اس سے صرف تفریح مقصود ہوتی ہے۔ ان اغراض کے حاصل کرنے کے لئے لوگ نہایت مسجع مقفیٰ، اور تکلف آمیز تقریر کرتے ہیں، گفتگو کو طول دیتے ہیں، چبا چبا کے باتیں کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام باتوں کی ممانعت کی

---

[1] ابوداؤد کتاب العلم باب فی سرد الحدیث۔ [2] ابوداؤد کتاب الادب باب ماجاء فی التشدق فی الکلام۔

اور فرمایا کہ "خدا اس بلیغ آدمی کو مبغوض رکھتا ہے جو اپنی زبان کو اس طرح توڑتا مروڑتا ہے جس طرح بیل اپنی زبان کو توڑ مروڑ کے گھاس کھاتا ہے"[1] نیز فرمایا کہ "جو شخص اسلوبِ کلام میں اس لئے ادل بدل کرتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنائے خدا قیامت کے دن اس کا فدیہ و توبہ نہ قبول کرے گا۔"[2]

جب چند لوگوں کے سامنے کوئی بات کہی جائے تو التفات ایک ہی طرف نہ رہے بلکہ ٹھہر ٹھہر کر ہر ایک کی طرف منہ کیا جائے تاکہ دوسروں کو عدمِ التفات کی شکایت نہ پیدا ہو جائے۔[3]

---

[1] یعنی حق کی تبلیغ نہیں بلکہ اپنی تعریف کرانی مقصود ہو۔ [2] ابوداؤد کتاب الادب ماجاء فی التشدق فی الکلام۔ [3] ادب المفرد باب اذا حدث الرجل لا یقبل علی واحد۔

باہر نکلنے

اور

چلنے پھرنے کے آداب

آدمی کو راستہ میں متانت، سنجیدگی اور خاکساری کے ساتھ قدم اٹھانا چاہیئے۔ خدا اچھے مسلمانوں کی تعریف میں فرماتا ہے:

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا (الفرقان: ۶۳)

اور رحمت والے خدا کے بندے وہ ہیں جو چلتے ہیں زمین پر دبے پاؤں۔

اکڑ کر نہیں چلنا چاہیئے یعنی چال میں غرور اور تبختر کے انداز نہ ہوں۔ فرمایا:

وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَ لَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ۝ (بنی اسرآءیل: ۳۷)

اور زمین میں اکڑ کر نہ چل (کہ اس طرح چل کر) نہ تو زمین کو پھاڑ سکتا ہے اور نہ پہاڑوں تک اونچائی میں پہنچ جا سکتا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ

اور زمین میں اکڑ کر نہ چل بے شک اللہ مغرور اور فخار کو پسند نہیں

فَخُوْرٍ ○ (لقمان: ۱۸) کرتا۔

عورت کو بجنے والے زیور مثلاً پازیب، چھڑے یا جھانجھ پہن کر چلنے میں زمین پر زور زور سے پاؤں نہیں رکھنا چاہیے کیونکہ اس کی آواز سے سننے والوں میں انتشارِ خیال پیدا ہوتا ہے۔ عرب کی عورتیں مردوں کے سامنے سے گذرتی تھیں تو اپنی پازیب کی آواز سنانے کے لیے زور زور سے زمین پر پاؤں رکھتی تھیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی ممانعت کی اور فرمایا:

وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ط (النور: ۳۱)	اور (چلنے میں) اپنے پاؤں ایسے زور سے نہ رکھیں کہ (لوگوں کو) ان کے اندرونی زیور کی خبر ہو۔

شریف عورت جب بضرورت گھر سے باہر نکلے تو کسی بڑی چادر یا برقع سے اپنا سارا جسم سر سے پاؤں تک چھپالے جس سے اس کی اصلی پوشاک اور زیب وزینت کی ساری چیزیں چھپ جائیں اور چادر یا نقاب کا کچھ حصہ منہ پر بھی آجائے تاکہ ہر مرد کو معلوم ہوجائے کہ یہ شریف خاتون ہے لونڈی نہیں۔ پھر نگاہیں شرم سے جھکی رہیں:

يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ط ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ط (الاحزاب: ۵۹)	اے پیغمبر اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں کو کہدے کہ نیچے لٹکالیں اپنے اوپر تھوڑی سی اپنی چادریں اس سے لگتا ہے کہ پہچانی پڑیں[1] تو کوئی نہ ستائے۔
وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ	اور اے پیغمبر! ایمان والیوں کو کہدے

[1] یعنی لوگ جان لیں کہ یہ شریف خاتونیں ہیں، ان کو کوئی راستہ میں چھیڑے نہیں۔

مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ	کہ اپنی آنکھیں ذرا نیچی رکھیں اور اپنا ستر
فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ	چھپائیں اور اپنا سنگار نہ دکھائیں مگر جو
اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ	(فطرۃً) کھلا رہتا ہے۔ اور اپنی اوڑھنیاں
بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ وَلَا	اپنے گریبانوں پر ڈالے رہیں اور اپنا
يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ الآية	سنگار نہ دکھائیں لیکن شوہر (وغیرہ محرم)
(النور: ۳۱)	کو (تا آخر آیۃ)

اسی اصول پر عورت کو کوئی تیز خوشبو لگا کر باہر نہیں نکلنا چاہئے[1] کیونکہ اس سے میلانِ طبع پیدا ہوتا ہے اور عورت کا یہ خیال پر ملا ظاہر ہوتا ہے کہ لوگ اس کی طرف توجہ کریں۔ اور کسی عورت کا ایسا خیال شرافتِ نسوانی کے خلاف ہے۔

راستہ میں مرد اور عورت کو مل جل کر نہیں چلنا چاہئے۔ اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرد کو دو عورتوں کے درمیان چلنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ عورتوں کو وسطِ راہ سے الگ ہو کر راستہ کے کنارے سے چلنا چاہئے۔ ایک بار راستہ میں مرد عورتیں باہم مل جُل گئے تو آپؐ نے یہ حکم دیا اور اس کے بعد یہ حالت ہو گئی کہ عورتیں راستہ کی اِدھر اُدھر کی دیوار سے لگ کر چلنے لگیں[2]۔

راستہ چلنے میں ادب اور وقار کا پورا خیال رہنا چاہئے یہاں تک کہ اگر مسجد میں جماعت ہو رہی ہو تو بھی جماعت میں ملنے کے لئے متانت کے خلاف دوڑنا نہیں چاہئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر مسجد میں تکبیر ہو رہی ہو یا نماز کھڑی ہو چکی ہو تو دوڑ کر اس میں شامل نہ ہو بلکہ تم متانت اور وقار کے ساتھ آ کر جماعت میں ملو[3]۔

---

[1] سنن ترمذی باب ماجاء فی خروج المرأۃ متعطرۃ۔ [2] ابوداؤد کتاب الادب باب فی مشی النساء فی الطریق۔ [3] صحیح مسلم باب استحباب اتیان الصلوٰۃ بوقار۔

مقدور ہو تو پاؤں کے بچاؤ اور طہارت اور پاکیزگی کے لئے جوتے پہنے جائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اکثر جوتے پہنا کرو یعنی جوتے پہن کر چلا کرو کہ جوتا پہننے والا بھی ایک طرح کا سوار ہوتا ہے[1]

جوتے دونوں پاؤں میں پہن کر چلنا چاہیے یا دونوں پاؤں ننگے رہیں یعنی یہ نہیں کرنا چاہیے کہ ایک پاؤں میں جوتا ہو اور دوسرا پاؤں ننگا ہو[2] کیونکہ یہ ادب وقار کے خلاف ہے۔ ایسے شخص کو لوگ احمق اور سفیہ سمجھیں گے لیکن اگر گھر میں کوئی اس طرح دو چار قدم چل لے تو کوئی حرج نہیں[3]

---

[1] ابوداؤد، باب الانتعال ۔ [3] ترمذی کتاب اللباس باب المشی فی نعل واحدۃ۔

آدابِ سفر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے جس زمانہ میں سفر فرمایا، اُس وقت زمانہ کے حالات اور سواریوں کے طریقے اور تھے اس لئے اس کے آداب عرب کی سرزمین، عرب کی آب و ہوا اور عرب کی عام اگلی حالت سے موزونیت و مطابقت رکھتے تھے۔ عرب کی زمین خشک، بنجر اور پتھریلی، پانی کی قلت، ہوا کی گرمی، دھوپ کی تمازت، قتل و غارتگری کی وجہ سے قدم قدم پر جان کا خطرہ۔ ان تمام حالات کو پیشِ نظر رکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے سفر کے متعلق چند مفید ہدایتیں کی ہیں جن میں سے بعض کی حالات کے بدل جانے سے اس زمانہ میں پابندی ضروری نہیں، تاہم جہاں اب بھی وہ حالات باقی ہیں ان سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ بالخصوص دیہات و قصبات کے لوگ ان سے زیادہ متمتع ہو سکتے ہیں جن کو زیادہ تر پیدل سفر کرنا پڑتا ہے اور صحرا و بیاباں کے راستوں میں ضروریاتِ زندگی کے وہ ساز و سامان میسر نہیں آتے جن کی اسٹیشنوں اور ہوٹلوں میں بہتات ہوتی ہے۔

(۱) سفر کے وقت مسافر کو رخصت کرنا چاہیے اور اس کو خیر و عافیت کی کوئی نیک دعا دینی چاہیے اور ہو سکے تو اس وقت وہ خاص دعا پڑھنا چاہیے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم فوج کے رخصت کرتے وقت پڑھا کرتے تھے اَسْتَوْدِعُ اللّٰہَ دِیْنَکُمْ وَ اَمَانَتَکُمْ وَخَوَاتِیْمَ اَعْمَالِکُمْ[1] یعنی تمہارے دین، امانت اور خاتمۂ عمل

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الدعا عند الوداع۔

کو خدا کے سپرد کرتا ہوتا ہوں۔

(۲) سفر صبح کے تڑکے کرنا چاہئے[1] اس سے انسان کا وقت ضائع نہیں ہوتا بلکہ پورا دن کام میں آجاتا ہے اور وہ دھوپ کی شدت اور ہوا کی گرمی سے محفوظ رہتا ہے اور ایک معتد بہ مسافت طے کر کے دوپہر کے وقت آرام کر سکتا ہے۔

(۳) سفر تنہا نہیں کرنا چاہئے بلکہ کم از کم تین آدمی ساتھ ہونے چاہئیں[2] اس سے انسان بہت سے خطرات سے محفوظ رہتا ہے اور اسباب سفر کی حفاظت و نگرانی میں سہولت پیدا ہوتی ہے۔

(۴) اگر تین آدمی ایک ساتھ سفر کریں تو ان میں ایک کو اپنا امیر بنا لینا چاہئے[3]۔ اسی شخص کو کاروان سالار کہتے ہیں۔

(۵) سفر سے آنے کے ساتھ ہی گھر میں داخل نہیں ہونا چاہئے بلکہ گھر والوں کو تیاری کا تھوڑا[4] موقع دینا چاہئے۔

(۶) اگر کوئی معزز یا محبوب شخص سفر سے واپس آئے تو اس کا استقبال کرنا چاہئے[5]۔

(۷) سفر رات کو کرنا چاہئے۔ حدیث میں اس کی مصلحت یہ بتائی گئی ہے کہ رات کو مسافت خوب طے ہوتی ہے[6]، اور درحقیقت لُو، گرمی اور دھوپ کے نہ ہونے سے اس وقت آدمی نہایت تیزی کے ساتھ چل سکتا ہے۔ بہرحال عرب کی سرزمین کے لحاظ سے اسلام نے سفر کے لئے دو مناسب وقتوں کا مشورہ دیا ہے، صبح کا وقت اور رات کا وقت۔

(۸) مسافر کو سفر میں سواری کے جانوروں کے آرام و آسایش کا خیال رکھنا چاہئے۔

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الابتکار فی السفر۔ [2] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الرجل یسافر وحدہ۔ [3] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی القوم یسافرون یؤمرون احدہم۔ [4] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الطروق۔ [5] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی التلقی۔

[6] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی سرعۃ السیر۔

(۹) رات کو مقام راستہ سے الگ ہو کر کرنا چاہیے۔ کیونکہ راستہ سے جانور گزرتے رہتے ہیں اور موذی جانوروں کا بھی خطرہ[1] رہتا ہے۔

(۱۰) جب سفر کی ضرورت پوری ہو جائے تو فوراً واپس آجانا چاہیے۔ کیونکہ سفر بہرحال تکلیف اور بے اطمینانی کی چیز ہے۔[2]

---

[1] مسلم کتاب الامارۃ باب مراعاۃ مصلحۃ الدواب فی السیر والنہی عن التعریس فی الطریق۔ [2] مسلم کتاب الامارۃ باب السفر قطعۃ من العذاب۔

آدابِ خواب

نیند کو اللہ تعالیٰ نے اپنے انعامات اور احسانات میں شمار کیا ہے اور فرمایا ہے:

وَمِنْ اٰیٰتِہٖ مَنَامُکُمْ بِالَّیْلِ (الروم: ۲۳) — اور خدا کی نشانیوں میں سے ایک تمہارا رات کو سونا ہے۔

سورۂ فرقان میں فرمایا:

وَھُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الَّیْلَ لِبَاسًا وَّ النَّوْمَ سُبَاتًا وَّ جَعَلَ النَّھَارَ نُشُوْرًا ○ (الفرقان: ۴۷) — اور اسی نے تمہارے لئے رات کو پردہ اور نیند کو آرام اور دن اٹھ کھڑے ہونے کو بنایا۔

سورہ نبا میں ہے:

وَّ جَعَلْنَا نَوْمَکُمْ سُبَاتًا ○ لا وَّ جَعَلْنَا الَّیْلَ لِبَاسًا ○ لا وَّ جَعَلْنَا النَّھَارَ مَعَاشًا ○ (النبا: ۹-۱۰) — اور ہم نے نیند کو تمہارے لئے آرام، اور رات کو پردہ اور دن کو کاروبار بنایا۔

ان آیتوں کا اشارہ یہ ہے کہ نیند کے لئے رات کا وقت ہے اور دن کا وقت کاروبار اور محنت کے لئے ہے یعنی دن کا بڑا حصہ محنت اور کام میں گزرے، البتہ دوپہر کو گرمی کے سبب

سے کچھ دیر اہل عرب آرام کرتے تھے جس کو قیلولہ کہتے تھے جس کا ذکر سورۂ نور میں ہے حِیْنَ تَضَعُوْنَ ثِیَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِیْرَةِ[1] اور رات آرام میں گزاری جائے اور ہو سکے تو اس کے کچھ حصوں میں خدا کی یاد کی جائے، جیساکہ دوسری آیتوں میں ہے۔ غرض یہ ہے کہ جو آرام طلب لوگ دن کو رات اور جو عیش پسند لوگ رات کو دن بناتے ہیں وہ دونوں قدرت کے حکموں کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ساری رات عبادتوں میں جاگ جاگ کر کاٹنا بھی پسندیدہ نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے[2]۔ یہ تو عام افراد کے لئے ہے لیکن خاصان خدا ایسے بھی ہیں جن کی تعریف اس آیت میں کی گئی ہے:

كَانُوْا قَلِیْلًا مِّنَ الَّیْلِ مَا یَهْجَعُوْنَ ○ (الذّٰریٰت: ۱۷) یعنی تھے وہ رات کو تھوڑا سوتے۔

(۱) سنّت نبوی نے سونے اور جاگنے کے طریقے اور اوقات بتادیئے ہیں۔ نمازِ عشا پڑھنے سے پہلے سونا نہیں چاہئے کیونکہ اس سے پہلے سو جانا غفلت کی نشانی ہے۔ اور نمازِ عشا پڑھ کر پھر فضول بات چیت نہیں کرنی چاہئے بلکہ ضروری کاموں سے اگر کوئی باقی رہ گیا ہو فارغ ہو کر فوراً سو جانا چاہئے[3]۔ یہ اس لئے تاکہ صبح تڑکے آنکھ کھل جائے اور اخیر رات میں خدا کی عبادت میں نیند کی کمی کے سبب سے غفلت نہ ہو۔

لیکن اگر کوئی ضروری یا مفید کام پیش ہو تو نمازِ عشاء کے بعد اس کے لئے بات چیت کرنا منع نہیں، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں نمازِ عشا کے بعد ضروری کاموں میں مشورہ کی غرض سے حاضر ہوتے ہیں اور آپ نے بات چیت فرمائی ہے[4]۔

(۲) احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ سونے سے پہلے بستر کو جھاڑ لینا چاہئے۔ پھر داہنی کروٹ

---

[1] النور: ۵۸ [2] بخاری کتاب النکاح [3] ابوداؤد کتاب الادب باب النہی عن السمر بعد العشاء [4] صحیح مسلم باب اکرام الضیف۔

لیٹنا چاہیئے۔[1]

(۳) ایسی چھت پر نہیں سونا چاہیے جس پر منڈیر یا جالی نہ لگی ہو[2] کیونکہ ایسی حالت میں زمین پر گر پڑنے کا اندیشہ ہے۔

(۴) پاکی کی حالت میں سونا چاہیئے بلکہ سونے سے پہلے وضو کر لینا اچھا ہے[3]۔

(۵) پیٹ کے بل نہیں سونا چاہیئے، ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو اسی طرح سوتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ سونے کا یہ طریقہ خدا کو پسند نہیں[4]۔

(۶) ایک پاؤں کو اٹھا کر اس پر دوسرے پاؤں کو رکھ کر لیٹنا نہیں چاہیئے[5]۔ کیونکہ عرب کے لوگ عموماً تہ بند باندھتے تھے اس لئے اس میں کشفِ عورت کا احتمال ہے۔ البتہ اگر یہ اندیشہ نہ ہو تو جائز ہے کیونکہ ایک حدیث میں ہے کہ ایک بار خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اس طریقہ سے لیٹے تھے[6]۔

(۷) سونے کے وقت گھر کا دروازہ بند کر لینا چاہیئے۔ کھانے پینے کے برتن کو ڈھانک دینا چاہیئے۔ چراغ کو بجھا دینا چاہیئے کیونکہ بعض اوقات تیل کی خاطر چوہے چراغ کی بتی کو اٹھائے جاتے ہیں جس سے گھر میں آگ لگنے کا اندیشہ ہے یہی حال آگ کا بھی ہے۔ ایک بار مدینہ میں رات کو کسی کے گھر میں آگ لگ گئی تو رسول صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ آگ تمہاری دشمن ہے۔ جب سوؤ تو اس کو بجھا دیا کرو[7]۔

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب ما یقال عند النوم۔ [2] ابوداؤد کتاب الادب باب فی النوم علی سطح غیر محجر۔ [3] ابوداؤد کتاب الادب باب ما یقال عند النوم و باب فی النوم علی طہارۃ۔ [4] ابوداؤد کتاب الادب باب فی الرجل ینبطح علی بطنہ۔ [5] ترمذی ابواب الاستیذان باب ماجاء فی کراہیۃ فی ذلک۔ [6] ترمذی ابواب الاستیذان باب ماجاء فی وضع احدی الرجلین علی الاخری مستلقیا۔ [7] بخاری کتاب الاستیذان باب لایترک النار فی البیت عند النوم و باب اغلاق الابواب باللیل مگر یہ اس حالت کے متعلق ہے جب گھر کی چھتیں پست ہوں اور بتی کا پرانا دیا جلایا جائے۔

(۷) سوتے اور سوکر اٹھتے وقت کوئی مسنون دعا پڑھنی چاہئے۔ سب سے مختصر دعا یہ ہے کہ سوتے وقت کہے اَللّٰھُمَّ بِاسْمِكَ اَحْیٰی وَاَمُوْتُ (اے اللہ! میں تیرے نام سے جیتا اور مرتا ہوں) اور جاگے تو کہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ[1]۔ (اس کی حمد ہو جس نے مرنے کے بعد مجھے پھر جلایا اور جس کی طرف اٹھ کر جانا ہے) حدیثوں میں اس موقع کے لئے اور بہت سی مؤثر دعائیں منقول ہیں۔

---

[1] ابوداؤد کتاب الادب باب ما یقال عند النوم۔

آدابِ لباس

لباس سے اصلی مقصد دو ہیں، ایک جسمانی اور دوسرا اخلاقی۔ جسمانی یہ ہے کہ جسم کو سردی اور گرمی کی تکلیفوں سے بچایا جائے اور اخلاقی یہ ہے کہ انسان کے بدن کے جن حصوں پر غیروں کی نظر نہیں پڑنی چاہیے وہ چھپے رہیں۔ اسلام کے علاوہ شاید کوئی اور مذہب نہیں جس نے برہنگی کو اعتراض کے قابل سمجھا ہو۔ اسلام پہلا مذہب ہے جس نے ستر پوشی کو مذہب کا ایک جز ٹھہرایا یہاں تک کہ بلا مجبوری اس کے بغیر نماز بھی ادا نہیں ہو سکتی۔

مردوں کے لئے ناف سے لے کر گھٹنوں تک کا حصہ اور شریف آزاد عورتوں کے لئے سر کے بالوں سے لے کر ٹخنوں اور گٹوں تک لونڈیوں کے لئے پیٹ اور پیٹھ سے لے کر گھٹنوں تک کا حصہ ستر قرار دیا گیا ہے[1] جس کا غیر کے سامنے کھولنا جائز نہیں یہاں تک کہ تنہائی میں بھی ان کا بے وجہ کھولنا پسندیدہ نہیں۔ ایک صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اگر ہم تنہائی میں ہوں یعنی کوئی دوسرا دیکھنے والا نہ ہو۔ فرمایا "خدا تو دیکھتا ہے اس سے اور زیادہ حیا کرنا چاہئے"[2]۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا کبھی ننگے نہ ہو کیونکہ تمہارے ساتھ فرشتے رہتے ہیں جو بضرورت

---

[1] عورت کا چہرہ قدم اور ہتھیلیاں ستر میں داخل نہیں۔ [2] سنن ترمذی ابواب الاستیذان والآداب باب ما جاء فی حفظ العورۃ۔

برہنگی کے وقت تم سے الگ ہو جاتے ہیں تو ان سے شرم کرو اور ان کا لحاظ رکھو[1]

حضرت آدم علیہ السلام اور حوا کو بہشت میں جو بہشتی جوڑے ملے تھے خدا کی نافرمانی کرنے سے وہ ان کے بدن سے اتر گئے تو وہ فوراً درخت کے پتوں سے اپنی برہنگی چھپانے لگے:

فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَ طَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ (الاعراف: ۲۲)

تو جب ان دونوں نے درخت کو چکھا ان کے ستر ان پر کھل گئے تو اپنے اوپر درخت کے پتوں کو جوڑنے لگے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ستر پوشی خدا تعالیٰ نے انسان کی فطرت بنائی ہے۔ مگر دنیا میں آکر یہ فطرت کبھی بگڑ جاتی ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وحشی، جنگلی اور صحرائی قومیں ستر کے حدود کو صرف شرمگاہوں تک محدود کر لیتی ہیں۔ عرب میں بھی یہی حال تھا، بلکہ حج میں انھوں نے یہ دستور بنایا تھا کہ قریش کے علاوہ دوسرے قبیلوں کے مرد اور عورت خانہ کعبہ کے طواف کے وقت اپنے کپڑے اتار دیتے تھے اور اگر قریش اپنے کپڑے دیتے تو وہ پہن لیتے تھے[2] ورنہ یونہی ننگے طواف کرتے تھے۔ وحی الٰہی نے انسانوں کو تہذیب و سلیقہ کا یہ سبق دیا:

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ۭ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ۭ (الاعراف: ۲۶)

اے آدم کے بیٹو! ہم نے اتاری تم پر پوشاک جو ڈھانکے تمہارے ستر اور زینت کا سامان اور پرہیزگاری کا لباس یہ بہتر ہے۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ

اے آدم کے بیٹو! ہر نماز کے وقت

---

[1] سنن ترمذی باب ماجاء فی الاستتار [2] صحیح مسلم و طبری تفسیر آیات ذیل۔

عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ (الاعراف: ۳۱) — اپنی زینت یعنی لباس اختیار کرو۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللّٰهِ الَّتِيْ أَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ (الاعراف: ۳۲) — کہدے کس نے اللہ کی اس زینت کو جس کو اس نے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے، منع کیا ہے۔

قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ (الاعراف: ۳۳) — کہدے کہ میرے رب نے تو بے حیائی کی باتوں کو خواہ وہ کھلی ہوں یا چھپی منع کیا ہے۔

ان آیتوں میں جس بے حیائی کی طرف اشارہ ہے وہ برہنگی ہے اور جس زینت کے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ ستر پوشی ہے۔ ان آیتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کپڑے سے مقصد ستر پوشی کے علاوہ زیب و زینت بھی ہے۔ پہلی آیت کے آخر میں لباس کے باب میں اصول کلیہ کی صورت میں ایک بلیغ فقرہ ہے جو بہت سی جزئیات کو حاوی ہے:

وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ (الاعراف: ۲۶) — اور پرہیزگاری کا لباس یہ بہتر ہے۔

پرہیزگاری کے لباس سے کیا مقصود ہے؟ بعضوں نے مجاز سمجھ کر اس سے ایمان، دوسروں نے اعمال صالحہ اور یا شرم و حیا مراد لی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجاز سے پہلے خود حقیقت پر غور کرنا چاہئے۔ اسی لئے کچھ مفسروں نے اس کو حقیقت ہی پر محمول کیا ہے۔ مشہور تابعی مفسر ابن زید نے اس سے مطلق پوشاک مراد لی ہے۔ کسی نے زرہ اور خود وغیرہ لڑائی کے سامان کو لباس تقوٰی قرار دیا ہے، کسی نے اس سے زہد و ورع کے صوفیانہ کپڑے سمجھے ہیں[1] لیکن یہ بھی حقیقت سے

---

[1] روح المعانی تفسیر آیت مذکور۔

دور ہونا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ لباس التقویٰ سے تقویٰ اور پرہیزگاری ہی کا لباس مراد ہے یعنی وہ لباس پہننا چاہیے جو تقویٰ اور پرہیزگاری کا منشا ہو اور جو لباس تقویٰ اور پرہیزگاری کا منشا ہے اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی قولی اور عملی تفسیر سے ظاہر فرما دیا ہے۔ شاہ عبدالقادر محدث دہلوی اس آیت پر ترجمۂ قرآن کے حواشی میں لکھتے ہیں:

"اب وہی لباس پہنو جس میں پرہیزگاری ہو۔ مرد لباس ریشمی نہ پہنے۔ اور دامن دراز نہ رکھے۔ اور جو منع ہوا ہے سو نہ کرے اور عورت بہت باریک نہ پہنے کہ لوگوں کو نظر آوے اور اپنی زینت نہ دکھاوے" (تفسیر اعراف آیت مذکورا)۔

اسلام میں لباس و پوشاک کی حد بندی اس کے سوا کچھ اور نہیں کی گئی ہے۔ اس حد بندی کی تشریح احادیث کے مطابق حسب ذیل ہے:

۱۔ مردوں کو کسی ضرورت اور مجبوری کے بغیر خالص ریشم کا بنا ہوا کپڑا نہیں پہننا چاہیے کیونکہ اس سے زنانہ پن کا اظہار ہوتا ہے اور وہ اس عیش و تنعم کی زندگی کی یاد دلاتا ہے جو مردوں کی جد و جہد اور محنت کی زندگی کے خلاف ہے۔ ضرورت اور مجبوری کی تشریح یہ ہے کہ جیسے لڑائی میں زرہ کے نیچے ریشمی کپڑے پہنتے ہیں تاکہ اس کی لوہے کی کڑیاں بدن میں نہ چبھیں یا کسی کے بدن میں کھجلی ہو تو سوتی کپڑے کے کھردرا پن سے بدن کے چھل جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اس لیے ان دونوں موقعوں پر مرد ریشمی کپڑے پہن سکتے ہیں اگر کوئی دو چار انگل کی ریشمی دھجی کپڑے میں لگالے تو اس کی بھی اجازت ہے۔

۲۔ مردوں کے لیے عورتوں کی سی پوشاک اور عورتوں کے لیے مردوں کی سی پوشاک پہننا جائز نہیں کیونکہ اس سے دونوں کی اخلاقی تنگ دامانی کی کھلی شہادت ملتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے اُن عورتوں پر جو مردوں کے لباس اور طور و طریق کی مشابہت کریں اور اُن مردوں

پر جو عورتوں کے لباس اور طور و طریق کی نقالی کریں لعنت فرمائی ہے۔

۳۔ عربوں میں لباس کا دامن اتنا لمبا یا تہبند اتنا نیچے رکھنا کہ وہ زمین پر گھسٹتا ہوا چلے بڑائی کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ ان کے بڑے بڑے امراء اور رئیس اتنے ہی لمبے دامن رکھتے تھے اور اتنا ہی نیچے تہبند باندھتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کوئی اپنا ازار فخر و غرور اور بڑائی کے اظہار کے لئے گھسیٹ کر چلے گا اللہ تعالیٰ اس کی طرف قیامت کے دن نظر نہیں اٹھائے گا۔ اسی لئے مرد کو پائجامہ کی مہریوں اور تہبند کو اتنا نیچا نہیں کرنا چاہئے کہ ٹخنے چھپ جائیں۔ بلکہ آپ نے پسند فرمایا ہے کہ پائجامہ اور تہبند نصف ساق تک ورنہ کم از کم ٹخنوں سے اونچا ہے۔ فرمایا ازار نیچے لٹکانا غرور کی نشانی ہے اور خدا غرور کو پسند نہیں فرماتا البتہ عورتوں کو دامن یا گھیر نیچے تک لٹکانا بلکہ ایک آدھ بالشت نیچے رکھنا درست ہے۔

۴۔ ایسا لباس جس کی طرف بے اختیار لوگوں کی انگلیاں اٹھیں پہننا ٹھیک نہیں خواہ وہ امیروں کی زرق برق پوشاکیں ہوں، یا مولویوں کا نمائشی عبا، جبہ یا صوفیوں کا گیروا رنگ کیونکہ ایسے کپڑوں کے پہننے والوں کا اصل منشا اپنے کو دوسروں سے ممتاز بنانے کی چھپی خواہش ہوتی ہے اور یہ تفوق و امتیاز کی ہوس نفس کا کھلا غرور ہے۔

۵۔ مرد ہو یا عورت کوئی ایسے باریک کپڑے نہ پہنے جن سے ستر دکھائی دے۔ عورتوں کے لئے خصوصیت کے ساتھ آپؐ نے یہ فرمایا ہے کہ "کتنی کپڑے پہننے والیاں ہیں جو حقیقت میں ننگی رہتی ہیں"۔

۶۔ ایسا کپڑا پہننا جس سے پوری ستر پوشی نہ ہو یعنی اس سے ستر کی پوری حدود نہ چھپیں جائز نہیں۔ ایک دفعہ حضرت عائشہؓ کی بڑی بہن حضرت اسماءؓ کوئی ایسا ہی[1] کپڑا پہن کر حضورؐ کے

---

[1] باریک کپڑا۔

سامنے آئیں تو آپؐ نے فرمایا "اے اسمأ جب عورت جوان ہو جائے تو اس کو چہرہ اور ہتھیلیوں کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ ان کے سوا کھولنا حلال نہیں"۔

۷۔ مرد شوخ رنگ خصوصاً سُرخ رنگ کے کپڑے نہ پہنیں۔ سُرخ دھاری کے کپڑے جائز ہیں۔ ایسی سُرخ دھاریوں کی چادر آپ نے اوڑھی ہے۔ زرد رنگ کے کپڑے پہنے جا سکتے ہیں۔ آپ کبھی زرد رنگ کا پورا لباس پہن لیتے تھے البتہ زعفرانی کپڑے درست نہیں۔ اور خوشبو کے لئے بدن پر زعفران کے دھبے ڈالنا جس کا عرب میں رواج تھا مردوں کے لئے منع ہے۔ سبز رنگ کی چادر بھی آپؐ نے اوڑھی ہے اور اس رنگ کا تہبند بھی آپؐ نے باندھا ہے اسیاہ رنگ کا عمامہ زیب سر فرمایا ہے۔

۸۔ مردوں کے لئے عام طور سے سپید رنگ کے کپڑے آپؐ نے پسند فرمائے ہیں۔

۹۔ آستین والی پوشاک پہنتے وقت پہلے داہنے ہاتھ میں آستین ڈالنی چاہیئے۔

۱۰۔ نیا لباس پہنتے وقت آپ دعا پڑھا کرتے تھے جس میں اللہ تعالیٰ کی اس نعمت پر اس کا شکر ادا فرماتے تھے۔ یہ دعا پڑھتے تھے۔

الحمد لله الذی کسانی هذه	اس خدا کی حمد جس نے مجھ کو یہ پہنایا
و رزقنیه من غیر حول منّی	اور روزی کیا میری قوت کے بغیر
و قوّة	(یعنی محض اپنے فضل سے)

لہ اس باب کی یہ ساری حدیثیں صحاح اور سنن کی کتاب اللباس میں ہیں۔ میرے پیش نظر اس وقت ابوداؤد اور ترمذی ہیں۔ ان مسائل کی تفصیلات فقہ کی کتابوں میں ملیں گی۔

آدابِ مسرّت

انسان کو جن چیزوں پہ مسرت حاصل ہوتی ہے ان کی کوئی انتہا نہیں۔ مال و دولت علم و فضل عہدہ و منصب، شادی بیاہ، عید اور تہوار، غرض انسان کو اپنی زندگی میں اظہارِ مسرت کے سینکڑوں مواقع پیش آتے ہیں۔ لیکن یہ مسرت جب حدِ اعتدال سے بڑھ جاتی ہے تو اس کی سرحد فخر و غرور سے مل جاتی ہے۔ قارون نے اپنے مال و دولت کی کثرت پر جب اسی قسم کی فخر آمیز مسرت کا اظہار کیا تو اس کی قوم نے ناگواری سے کہا:

اِذْ قَالَ لَهٗ قَوْمُهٗ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِيْنَ ○	جب کہا اس کو اس کی قوم نے اترا مت اللہ کو نہیں بھاتے اترانے والے۔

(القصص:۷۶)

اسلام نے چونکہ تمام جذبات میں اعتدال پیدا کرنا چاہا ہے اس لئے اس نے اس قسم کی مسرتوں کو انسان کی ایک اخلاقی کمزوری قرار دیا ہے:

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ ○ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ	اور اگر ہم چکھا دیں آدمی کو اپنی طرف سے مہر پھر وہ چھین لیں اس سے تو وہ ناامید ناشکر ہو، اور اگر ہم چکھا دیں اس کو آرام بعد

نَعۡمَآءَ بَعۡدَ ضَرَّآءَ مَسَّتۡهُ	تکلیف کے جو پہنچے اس کو تو کہنے لگے
لَيَقُولَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيۡ	گئیں بُرائیاں مجھ سے تو وہ خوشیاں
اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُورٌ ۝	کرتا بڑائیاں کرتا۔

(ھود: ۹-۱۰)

اور اس کی ممانعت کی ہے :

وَلَا تَفۡرَحُوا بِمَآ اٰتٰكُمۡ وَاللّٰهُ	اور نہ اتراؤ اس پر جو تم کو اس نے دیا۔
لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخۡتَالٍ فَخُورٍ ۝	اور اللہ نہیں چاہتا ہے کسی اترا تے
(الحدید: ۲۳)	بڑائی مارتے کو۔

ساتھ ہی اس کے مسلمانوں میں مردہ دلی نہیں پیدا کی ہے بلکہ معتدل طریقہ پر اظہار مسرت کی اجازت دی ہے اور اس کے معتدل طریقے بتائے ہیں۔

جب مسلمان کو کوئی مسرت حاصل ہو تو اس کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اسی کے فضل وکرم سے اس کو یہ خوشی حاصل ہوئی۔ اگر کوئی بڑی خوشی حاصل ہو تو سجدۂ شکر بجا لانا چاہئے تاکہ غایت مسرت کی حالت میں دنیوی فخر و غرور کے بجائے انسان کی نیازمندی کا اظہار ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی ایسا مسرت آمیز واقعہ پیش آتا تو سجدۂ شکر بجا لاتے۔

ایک بار مکہ سے مدینہ کو جا رہے تھے جب غوراء کے قریب پہنچے تو سواری سے اتر پڑے اور تھوڑی دیر تک دعا کی، پھر سجدہ میں گر پڑے اس کے بعد دیر تک ٹھہرے رہے۔ پھر ہاتھ اٹھایا اور تھوڑی دیر تک دعا کی۔ پھر سجدہ میں گر پڑے۔ اسی طرح تیسری بار بھی دعا کی اور سجدہ میں گر پڑے اور فرمایا کہ میں نے خدا سے اپنی امت کے لئے شفاعت کی دعا کی تو اس نے میری ثلث امت کے لئے شفاعت قبول کر لی۔ اس لئے میں اپنے خدا کا شکر ادا کرنے کے لئے سجدہ میں گر پڑا۔ پھر میں نے

سر اٹھا کر اپنی امّت کے لیے یہی درخواست کی تو اس نے میری ثلث امّت کے لئے اور میری درخواست قبول کی۔ اس لئے میں اپنے خدا کا شکر ادا کرنے کیلئے سجدہ میں گر پڑا۔ پھر میں نے یہی التجا کی تو اس نے میری ثلث امّت کے لئے اور میری التجا کو قبول کیا تو میں اپنے خدا کے لئے سجدہ میں گر پڑا۔[1]

صحابۂ کرام کا بھی یہی دستور تھا۔ چنانچہ حضرت کعب بن مالکؓ کی توبہ جب قبول ہوئی اور ان کو اس کا مژدہ سنایا گیا تو وہ سجدہ میں گر پڑے۔ اس قسم کے مسرت آمیز موقعوں پہ دوسرے مسلمانوں کا اخلاقی فرض بھی یہ ہے کہ وہ اپنے بھائی کو مبارکباد دے کر اس کی مسرت میں شریک ہوں۔ چنانچہ اس موقع پر صحابۂ کرام بھی ان کے پاس جوق در جوق آئے اور ان کو مبارکباد دی۔[2]

سفر سے واپس ہونے کے بعد بھی انسان کو وطن میں پہنچنے کی مسرت ہوتی ہے۔ اس موقع پہ اعزہ واحباب کی دعوت کی جا سکتی ہے کہ وہ بھی اس مسرت میں شریک ہوں چنانچہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے مدینہ میں آئے تو اونٹ یا گائے ذبح کر کے لوگوں کو کھلایا۔[3] اس موقع پہ دوسروں کا فرض بھی یہ ہے کہ سفر سے واپس آنے والے کا استقبال کریں تاکہ اس طریقہ سے ان کی مسرت کا اظہار ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوہ تبوک سے واپس تشریف لائے تو لوگوں نے ثنیۃ الوداع تک جا کر آپ کا استقبال کیا جس میں بچے بھی شامل تھے۔[4]

اجتماعی طور پر اظہارِ مسرت کا عام موقع شادی بیاہ میں پیش آتا ہے اور اس موقع پر اسلام نے اظہارِ مسرت کے لئے گانے اور ڈھول بجانے کی اجازت دی ہے تاکہ خوب اعلان ہو اور

---

[1] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی سجود الشکر۔ [2] بخاری کتاب المغازی حدیث کعب بن مالکؓ۔ [3] ابوداؤد کتاب الاطعمہ باب الاطعام عند القدوم من السفر۔ [4] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی التلقی۔

سب کو اس نکاح کی خبر ہو جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔

فصل ما بین الحلال والحرام الدفّ والصوت[1] — حلال اور حرام میں دف بجانے اور گانے سے فرق پیدا ہوتا ہے۔

یعنی زنا اور نکاح میں فرق یہ ہے کہ دف بجا کر اور راگ گا کر نکاح کا اعلان کیا جاتا ہے تاکہ عام طور سے سب کو معلوم ہو جائے کہ فلاں مرد اور فلاں عورت نے باہم مل کر ازدواجی زندگی بسر کرنے کا معاہدہ کیا ہے اور زنا چھپ کر چپکے سے کیا جاتا ہے کہ کسی کو خبر نہ ہونے پائے۔

حضرت ربیع بنت معوذؓ بن عفراء کا نکاح ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لا کر ان کے پاس بیٹھے۔ چند لڑکیاں دف بجا بجا کر حضرت ربیع بنت معوذؓ کے ان بزرگوں کی تعریف میں اشعار گانے لگیں جو غزوۂ بدر میں شہید ہوئے تھے۔ اسی حالت میں ایک نے یہ مصرع گایا۔

وفینا نبیّ یعلم ما فی غد — ہم میں ایک ایسا پیغمبر ہے جو کل کی بات جانتا ہے۔

تو آپ نے فرمایا کہ اس کو چھوڑ دو جو گا رہی تھیں اسی کو گاؤ[2]

ایک بار حضرت عائشہؓ نے ایک انصاری سے اپنی ایک رشتہ دار عورت کا نکاح کر کے اس کو رخصت کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عائشہ تم لوگوں کے ساتھ گیت نہ تھا کیونکہ انصار کو گیت پسند ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا تم لوگوں نے اس کے ساتھ ایک لونڈی کیوں نہیں بھیجی جو دف بجاتی اور گاتی جاتی[3]

ایک دفعہ شادی کا موقع تھا۔ قرظہ بن کعبؓ اور ابو مسعود انصاریؓ بیٹھے لڑکیوں کا گانا سن رہے

---

[1] ترمذی کتاب النکاح باب ماجاء فی اعلان النکاح۔ [2] بخاری کتاب النکاح باب ضرب الدف فی النکاح والولیمۃ۔
[3] بخاری کتاب النکاح باب النسوۃ التی یہدین المرأۃ الی زوجہا ودعائہن بالبرکۃ مع فتح الباری۔

تھے۔ اتنے میں عامر بن سعد ایک تابعی آ گئے انہوں نے یہ دیکھا تو اعتراض کیا اور کہا آپ دو صاحب بدری صحابی ہیں اور آپ کے سامنے یہ ہو رہا ہے۔ انہوں نے کہا تمہارا جی چاہے تو تم بھی بیٹھ کر سنو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شادی بیاہ کے موقع پر ہم کو اس کی اجازت دی ہے[1]۔

عربوں میں رسم تھی کہ دولھا کو بالرفاء والبنین کہ کر عیش و آرام اور اولاد نرینہ کی دعا دیتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی جگہ یہ دعا سکھائی:

بارك الله لك وبارك عليك	تمہارے لئے اللہ مبارک کرے۔ تم پر
وجمع بينكما في خير	برکت اتارے اور تم دونوں میں بھلائی
(ابوداؤد: کتاب النکاح باب ما یقال للمتزوج)	میں میل ملاپ رکھے۔

شادی بیاہ میں دوستوں اور عزیزوں کی دعوت مسنون ہے۔ اس کو ولیمہ کہتے ہیں جس سے جو کچھ ہو سکے اور جتنا ہو سکے عزیزوں اور دوستوں کو اس موقع پر کھلائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اور کچھ نہیں تو ایک بکری ذبح کر کے کھلا دو[2]" اور خود کبھی پنیر، گھی اور چھوہارے بھی کھلائے ہیں[3]، اسی طرح دوست اور عزیز کو اس کی شادی میں تحفہ کے طور پر بھی کچھ بھیج سکتے ہیں[4]۔

مسلمانوں کے لئے اس سے بھی زیادہ وسیع پیمانہ پر اجتماعی اظہار مسرت کا موقع عید الفطر اور عید اضحیٰ کے دن پیش آتا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں اہل عرب نے سال میں دو دن مقرر کئے تھے جن میں وہ خوشیاں مناتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو فرمایا کہ تم لوگ دو دنوں میں خوشیاں مناتے تھے اب خدا نے ان کو تمہارے لیے ان سے دو بہتر دنوں سے بدل دیا یعنی عید الفطر اور عید اضحیٰ کے دن[5] خوشی کے ان دونوں کی تعیین میں دوسری مشرک قوموں کی طرح

---

[1] نسائی باب اللہو والغناء عند العرس۔ [2] بخاری کتاب النکاح باب الولیمۃ ولو بشاۃ۔ [3] نسائی کتاب النکاح باب البناء فی السفر۔ [4] نسائی باب الہدیۃ لمن عرس۔ [5] نسائی کتاب الصلوۃ العیدین۔

فصل و موسم اور دوسرے غیر موحدانہ مشاہد کو یادگار کا ذریعہ نہیں بنایا گیا بلکہ دینِ حنیف کے دو عظیم الشان واقعوں کو اظہارِ مسرت کے لئے پسند کیا گیا۔ عید اضحیٰ حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی قربانیوں اور خانہ کعبہ کی بِنا اور فتح کی اور عید الفطر اسلام کی آمد اور قرآن پاک کے نزول کی یادگار ہے۔

ان دونوں دنوں میں اظہارِ مسرت کے لئے عمدہ لباس پہننا اور خوشبو لگانا مسنون فرمایا۔ اس کے علاوہ خوشی و مسرت کا گانا اور دوسری قسم کے جائز کھیلوں کو پسند فرمایا۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ عید کے دن میرے پاس انصار کی دو لونڈیاں جو پیشہ ور گانے والیاں نہ تھیں وہ اشعار گا رہی تھیں جو انصار نے بعاث کی لڑائی کے متعلق کہے تھے۔ اسی حالت میں حضرت ابوبکرؓ آئے اور کہا کہ "شیطان کے مزامیر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے گھر میں"۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا "اے ابوبکر! ہر قوم کے لئے عید کا دن ہوتا ہے اور یہ ہماری عید کا دن ہے[1]"۔ یعنی اس دن گانا مباح ہے[2]۔

حبشی لوگ عید کے دن فوجی کرتب دکھاتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو پسند فرماتے تھے۔ ایک بار عید کے دن یہ لوگ اسی قسم کا کرتب دکھا رہے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے خود حضرت عائشہؓ کو یہ تماشا دکھایا اور حبشیوں سے کہا کہ "ہاں بنو ارفدہ!" اس سے آپ کا مقصد ان میں مستعدی اور نشاط پیدا کرنا تھا۔ یہاں تک کہ جب حضرت عائشہؓ تھک گئیں تو آپؐ نے کہا کہ "بس"۔ انہوں نے کہا "ہاں" ارشاد ہوا تو جاؤ[3]۔

مسرت کے اس طریقہ اظہار کا نام "تقلیس" تھا جس کے معنی دف بجانے، گانے اور دلچسپی کے لئے شمشیر بازی، نیزہ بازی وغیرہ کے کھیل تماشے دکھانے کے ہیں بعض لوگوں کے نزدیک اس کے

---

[1] بخاری باب سنۃ العیدین لاہل الاسلام۔ [2] بشرطیکہ اس کے مضامین اخلاقی اور مذہبی حیثیت سے برے نہ ہوں۔ [3] بخاری باب الحراب والدرق یوم العید۔

معنی یہ ہیں کہ لڑکے اور لڑکیاں راستوں پہ کھڑے ہوکر ڈھول بجا کر اچھلیں کودیں، تماشے دکھائیں۔ عہدِ رسالت میں عید کے دن اس کا اس قدر رواج تھا کہ جب صحابہ کو کسی جگہ عید کے دن اظہار مسرت کا یہ طریقہ نظر نہیں آتا تھا تو ان کو تعجب ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک بار حضرت عیاض اشعریؓ نے انبار میں عید کی تو فرمایا کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لوگ "تقلیس" کیا کرتے تھے، اس طرح تم لوگ کیوں نہیں کرتے۔

حضرت قیس بن سعدؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو چیزیں تھیں وہ سب میں نے دیکھ لیں بجز ایک چیز کے کہ عید کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے "تقلیس" ہوتی تھی۔[۱]

عیدین کے دن خوشی و مسرت کے اس طریقہ اظہار کی اجازت کا فلسفہ یہ ہے کہ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ قوم کی زندگی میں سال میں ایک دو مواقع ایسے مذہبی وقومی جشن کے آئیں جن میں لوگ کھل کر خوشی کرسکیں اور تین سے تین آدمی کچھ دیر انبساطِ خاطر کا اظہار کرلے۔ اسی لئے ان دونوں میں روزے رکھنے کی ممانعت آئی ہے اور آپؐ نے فرمایا ہے کہ یہ دن کھانے پینے، اہل وعیال سے لطف اٹھانے اور یادِ الٰہی کے ہیں۔[۲]

اسلام نے خوشی میں بھی اس کو یاد رکھا ہے کہ قلب کو خدا کی یاد سے غفلت نہ ہو۔ اسی لئے عید کے دونوں موقعوں پر دوگانہ ادا کرنا سنت ٹھہرایا، تکبیر کہتے ہوئے ایک راستہ سے عیدگاہ کو جائیں اور دوسرے راستے سے لوٹیں، تاکہ ہر طرف اسلام کی شان وشوکت کا اظہار ہو، اور وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ[۳] کی تعمیل ہو۔

---

[۱] ابن ماجہ کتاب الصلوٰۃ باب ما جاء فی التقلیس یوم العید۔ [۲] شرح معانی الآثار طحاوی صفحہ ۴۲۹، یہاں بعال کا ترجمہ اہل وعیال سے لطف اٹھانا کر دیا گیا ہے۔ [۳] البقرہ: ۱۸۵۔

آدابِ ماتم

خوشی اور غم توام ہیں جس طرح انسان خوشی میں بے اعتدالی کرتا ہے غم کی حالت میں بھی وہ اعتدال سے گزر جاتا ہے۔ عربوں میں فخر و غرور، اور جہالت و وحشت کی وجہ سے تعزیت و ماتم کی عجیب عجیب رسمیں قائم ہو گئی تھیں فخر کا خیال موت کے بعد بھی نہیں جاتا تھا اس لئے اظہارِ فخر کے بہت سے طریقے جاری ہو گئے تھے۔ سب سے مقدم یہ کہ مرنے والا جس درجہ کا ہو اسی شان سے اس کا ماتم ہونا چاہیئے۔ چنانچہ بڑے بڑے سردار جب مرتے تھے تو وصیت کر جاتے تھے کہ ان کا ماتم ان کی شان کے موافق کیا جائے۔

ایک شاعر اپنی بیوی سے کہتا ہے:

اذا مِتُّ فابکینی بما انا اھلہ — وشقی علیّ الجیب یا ابنۃ معبد

جب میں مر جاؤں تو میرے لئے میرے درجے کے موافق رونا — اور میرے لئے گریبان کو چاک کر ڈالنا۔

منہ پر تھپڑ مارنا، چھاتی کوٹنا، سر کے بال کھول دینا عام رسم تھی اور شعراء اس کا فخریہ اظہار کرتے تھے:

من کان مسرورا بمقتل مالک — فلیات نسوتنا بوجہ نہار

جو شخص مالک کے قتل سے خوش تھا — تو ہماری مستورات کو دن دھاڑے آکر دیکھے

یجد النساء حواسرا یندبنہ — یلطمن اوجھھن بالاسحار

وہ دیکھے گا کہ عورتیں سر کھول کر نوحہ کر رہی ہیں اور صبح کے وقت اپنے گالوں پر طمانچے مار رہی ہیں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان رسوم سے نہایت سختی سے منع کیا۔ آپ نے فرمایا کہ "جو شخص گریبان پھاڑتا اور گالوں پر طمانچے مارتا اور جاہلیت کی طرح چیختا اور چلاّتا اور بین کرتا ہے، وہ میری امت میں سے نہیں[1]" یعنی یہ میری امت کے کام نہیں۔

حضرت جعفر طیارؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہایت محبت تھی۔ ان کی شہادت کی جب خبر آئی تو اُن کے خاندان کی عورتوں نے نوحہ شروع کیا آپ نے منع کرا بھیجا۔ وہ باز نہ آئیں۔ دوبارہ منع فرمایا۔ جب پھر نہ مانیں تو آپ نے حکم دیا کہ "ان کے منہ میں خاک بھر دو[2]"۔

یہ بھی فخر میں داخل تھا کہ میت پر کثرت سے رونے والے ہوں۔ اس بنا پر دُور دُور سے عورتیں بلائی جاتی تھیں۔ رفتہ رفتہ یہ رسم مبادلہ کے طور پر داخل مراسم ہو گئی تھی یعنی کسی میت کے لئے کسی خاندان کی عورتوں نے نوحہ کیا ہے تو اس میت کے خاندان پر گویا یہ ایک فرض ہوتا تھا جس کا ادا کرنا ضروری تھا۔ ایک دفعہ ایک خاتون نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ "وہ کونسی بات ہے جس میں ہم کو آپ کی نافرمانی نہیں کرنی چاہیے؟" آپ نے فرمایا یہ کہ "نوحہ نہ کرو" وہ بولیں کہ میرے چچا نے جب انتقال کیا تو فلاں خاندان کی عورتیں آ کر روئی تھیں۔ ان کا یہ فرض مجھ کو ادا کرنا ہے۔ آپ نے منع فرمایا لیکن وہ کسی طرح نہ مانیں۔ بالآخر ان کے بار بار اصرار پر اجازت دی لیکن وہ خاتون آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی منشا سمجھ گئی تھیں اس لئے پھر کبھی کسی کے نوحہ میں شریک نہیں ہوئیں[3]۔

دستور تھا کہ جب کوئی مر جاتا تھا تو عام منادی کراتے کہ لوگ کثرت سے آئیں اس کو عربی میں

---

[1] ترمذی کتاب الجنائز باب ماجاء فی النھی عن ضرب الخدود۔ [2] بخاری کتاب الجنائز باب من جلس عند المصیبۃ یعرف فیہ الحزن۔ [3] ترمذی تفسیر سورۃ ممتحنہ۔

"نعی" کہتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے اس سے بھی منع فرمایا۔ حضرت حذیفہؓ جب مرنے لگے تو فرمانِ نبوی کی اس قدر احتیاط مدِنظر تھی کہ وصیت کی "میرے مرنے کی کسی کو خبر نہ کرنا۔ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کو اعلانِ مرگ سے منع کرتے دیکھا ہے اور شاید خبر کرنا بھی اعلان میں داخل ہو"[1]

جنازہ کے ساتھ نوحہ اور ماتم کرنے والے چلتے اور بخور دان جلا کر لے جاتے[2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے حکم دیا کہ جنازہ کے پیچھے کوئی آگ اور راگ نہ لے جائے۔ راگ سے مقصود کفارِ ہند کی طرح گانا بجانا بھی ہو سکتا ہے۔ تب یہ مطلب ہوگا کہ "جنازہ کے پیچھے کوئی آگ اور باجا نہ لے جائے"[3]

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم ایک جنازہ میں شریک تھے۔ ایک عورت انگیٹھی لے کر آئی۔ آپؐ نے اس کو اس زور سے زجر کیا[4] کہ وہ بھاگ گئی۔

جنازہ کے پیچھے چلتے تھے تو چادر پھینک دیتے تھے صرف کرتہ بدن پر رہ جاتا تھا۔ ایک دفعہ آپؐ نے لوگوں کو اس صورت میں دیکھا تو فرمایا کہ "جاہلیت کی رسم پر چلتے ہو؟ میرا یہ ارادہ ہوا کہ میں تمہارے حق میں ایسی بد دعا کروں کہ تمہاری صورتیں بدل جائیں" لوگوں نے فوراً چادریں اوڑھ لیں اور پھر کبھی کسی نے ایسا نہیں کیا[5]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے سوگ کی مدت بھی مقرر کر دی اور فرمایا کہ کسی مومن کے لئے یہ جائز نہیں کہ تین دنوں سے زیادہ کسی کا سوگ کرے البتہ بیوہ کو چار مہینے دس دن سوگ کرنے کا حکم دیا۔ جس میں وہ کوئی رنگین کپڑا نہ پہنے خوشبو نہ لگائے اور نہ کوئی اور آرایش و زیبایش کرے[6]

کسی عزیز کی موت پر آنکھوں سے آنسو نکلنا جو فطرت کا اقتضا ہے برا نہیں لیکن زور زور

---

[1] ترمذی کتاب الجنائز باب کراہیۃ النعی۔ [2] ترمذی باب الاسلام یہدم ما قبلہ صہ ۱۹۹۔ [3] ابو داؤد جلد ۲ کتاب الجنائز باب فی النار یتبع بہا المیت مع بذل المجہود فی شرح ابی داؤد۔ [4] اسد الغابۃ جلد ۴ صفحہ ۳۹۵ [5] ابن ماجہ کتاب الجنائز باب ما جاء فی النہی عن التسلب مع الجنازۃ [6] ترمذی کتاب الطلاق باب ما جاء فی عدۃ المتوفی عنہا زوجہا۔

سے چیخنا چلانا بین کرنا منع ہے اور اس پر سخت تہدید فرمائی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادہ حضرت ابراہیمؑ نے جب وفات پائی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو کے چند قطرے نکل آئے اور فرمایا کہ "اے ابراہیم ہم تیری جدائی سے مغموم ہیں لیکن زبان سے وہی نکلے گا جو رب کی مرضی ہے[1]۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "مردہ پر اس کے اعزہ کے رونے سے عذاب ہوتا ہے صحابہ اور محدثین کے درمیان اس حدیث کے مطلب میں اختلافات ہیں جس بات پر سب کا اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ عرب میں جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا کہ لوگ فخر و غرور کے لئے حسب حیثیت ماتم کرنے کی وصیت کر جاتے تھے اسی وصیت کے مطابق اس پر رونے سے اس کو عذاب ہوتا ہے[2]۔

ہمدردی کا تقاضا ہے کہ جب کسی مسلمان کے گھر میں کوئی موت ہو تو مناسب ہے کہ عزیز، دوست یا محلہ کے لوگ اس کے ہاں کھانا بھیجیں کیونکہ غم کے سبب سے اس کے گھر میں کھانا پکانے کا سامان مشکل ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جعفرؓ کی شہادت کے موقع پر ان کے گھر کھانا بھجوانے کا حکم دیا تھا اور فرمایا تھا کہ ان کے گھر کے لوگوں کو آج کھانا پکانے کا موقع نہ ملے گا[3]۔

ایک مسلمان کا فرض مشکلات میں صبر اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہے۔ صبر اور دعا، دفع غم کا وہ نسخہ ہے جس کو قرآن نے مسلمانوں کے لئے تجویز کیا ہے۔ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ[4] صبر کا موقع حادثہ کے شروع ہی میں ہے یہ نہیں کہ شروع میں خوب رو پیٹ لیا جائے اور پھر آخر میں مجبوری کا صبر کیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت کو جو اپنے بچہ کی موت پر رو رہی تھی سمجھایا۔ مگر وہ نہیں مانی۔ بعد کو جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] مسلم کتاب الفضائل باب رحمۃ صلی اللہ علیہ وسلم الصبیان والعیال۔ [2] فتح الباری جلد ۳ صفحہ ۱۲۲۔ [3] ابوداؤد کتاب الجنائز باب صنعۃ الطعام لاہل المیت [4] البقرہ ۱۵۴۔

تھے تو معذرت کرنے آئی اور صبر کا کلمہ ادا کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ صبر صدمہ کے شروع ہی میں کرنا چاہیئے۔[1]

خدا فرماتا ہے کہ اچھے مسلمان وہ ہیں کہ جب ان کو کوئی مصیبت پیش آئے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے لیے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ جائیں گے قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ[2] اسی لئے مسلمانوں میں دستور ہے کہ جب غم کی کوئی خبر سنتے ہیں تو اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ پڑھتے ہیں اور یہ دستور مستحسن ہے۔

تقدیر کا عقیدہ غم کا چارہ کار ہے۔ جو کچھ ہوا خدا کے حکم اور مصلحت سے ہوا۔ یہ اسلام کی حکیمانہ تعلیم ہے اور اس تعلیم کا فائدہ بھی قرآن نے بتا دیا ہے:

لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ (الحدید: ۲۳) — تاکہ تمہارے ہاتھ سے جو جاتا رہے اس پر غم نہ کرو۔

---

[1] ابوداؤد کتاب الجنائز باب الصبر عند الصدمۃ۔ [2] البقرہ: ۱۵۶۔

متفرق آداب

انسان کی بعض جسمانی حالتیں ادب، تہذیب اور وقار کے خلاف ہوتی ہیں، ان کو دیکھ کر ناگواری پیدا ہوتی ہے مثلاً جمائی لینے میں انسان کا منہ کھل جاتا ہے۔ آہ آہ یا ہاہ ہاہ کی ناگوار آواز منہ سے نکلتی ہے اور چہرے کی قدرتی ہیئت بدل کر ایک مضحکہ انگیز شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی مفہوم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے "جمائی شیطان کی جانب سے ہے اور جب کوئی اس حالت میں آہ آہ کہتا ہے تو شیطان اس کے پیٹ کے اندر سے اس پر ہنستا ہے"[1]

بعض حدیثوں میں ہے کہ جب تم میں کوئی جمائی لے تو اپنے منہ کو بند کرے کیونکہ شیطان اس کے منہ کے اندر گھس جاتا ہے[2]۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اس میں حقیقت و مجاز کی اس طرح تطبیق دیتے ہیں کہ شیطان مکھی یا مچھر کو اڑا کر اس کے منہ کے اندر داخل کر دیتا ہے[3]۔ اس لئے اسلام نے مختلف طریقوں سے اس بدنمائی کو دور کیا ہے۔

(۱) پہلا حکم تو یہ ہے کہ جمائی روکنے کی چیز ہے۔ اس لئے جہاں تک ممکن ہو اس کو روکنا چاہیے اور ہاہ ہاہ نہیں کہنا چاہیے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو منہ پر ہاتھ رکھ لینا چاہیے[4]۔

---

[1] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء ان اللہ یحب العطاس ویکرہ التثاؤب۔ [2] ابوداؤد کتاب الادب باب ما جاء فی التثاؤب۔ [3] حجۃ اللہ البالغہ آداب الصحبۃ۔ [4] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء ان اللہ یحب العطاس ویکرہ التثاؤب۔

(۲) جمائی کے برخلاف آپ نے چھینک کے روکنے کی کوئی ہدایت نہیں کی ہے۔ بلکہ اس کو خدا کی جانب سے بتلایا ہے[۱]۔ ہمارے شراح حدیث اس کی وجہ یہ لکھتے ہیں کہ چھینک بدن کے ہلکے پھلکے ہونے، مسامات کے کھلنے اور بہت زیادہ نہ کھانے سے آتی ہے لیکن جمائی بدن کے ثقل اور کسل و سستی کا نتیجہ ہے۔ اس لئے چھینک عمل کے لئے نشاط اور جمائی اس کے لئے کسل پیدا کرتی ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ چھینک سے دماغی انجرے نکلتے ہیں اور اس طریقہ سے وہ شفا کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس بنا پر شریعت نے چھینکنے والے کو حکم دیا ہے کہ وہ اس پر خدا کا شکر کرے اور "الحمد للہ" کہے۔ دوسرے لوگ اس کے جواب میں "یَرْحَمُكَ اللّٰه" کہیں[۲]۔

(۳) تاہم وہ ایک بدنما چیز ہے۔ بعض اوقات اس حالت میں ناک سے بلغم نکل آتا ہے اس لئے چھینکتے وقت منہ کو ہاتھ یا کپڑے سے ڈھانک لینا چاہئے۔ اور اس طریقہ سے چھینک کی آواز کو پست کرنا چاہئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی طریقہ تھا[۳]۔

(۴) انگڑائی اور ڈکار کے متعلق اگرچہ آپ نے کوئی خاص حکم نہیں دیا ہے تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ عام مجمع میں انگڑائی اور ڈکار لینا تہذیب کے خلاف ہے۔ خصائص کی بعض کتابوں میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جمائی اور انگڑائی نہیں لیتے تھے۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں ان حدیثوں کو نقل کیا ہے اور ان کی تضعیف و تردید نہیں کی ہے بلکہ بعض کی تائید کی ہے[۴]۔ بہرحال یہ حدیثیں صحیح ہوں یا نہ ہوں لیکن ان سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ انگڑائی لینے میں جسم کی جو حالت ہوتی ہے وہ بدنمائی پیدا کرتی ہے۔ اس لئے مجمع عام میں اس سے احتراز کرنا چاہئے۔

ڈکار کے متعلق صحیح ترمذی میں ہے کہ ایک شخص نے آپ کے سامنے ڈکار لی تو آپ نے فرمایا

---

[۱] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء ان اللہ یحب العطاس ویکرہ التثاؤب۔

[۲] ترمذی کتاب الاستیذان باب ماجاء کیف یشمت العاطس [۳] ابوداؤد کتاب الادب باب فی العطاس [۴] فتح الباری جلد ۱۰ صفحہ ۵۰۷۔

کر اپنی ڈکار کو روکو کیونکہ جو لوگ دنیا میں بہت زیادہ پیٹ بھر لیتے ہیں وہ آخرت میں سب سے زیادہ بھوکے رہیں گے۔ اس حدیث سے پُرخوری کی ممانعت کے ساتھ ضمناً ڈکار کی کراہت بھی ثابت ہوتی ہے۔

آداب کا فلسفہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں ان آداب کی خصوصیات پر ایک نہایت عمدہ تبصرہ کیا ہے جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

تمام متمدن ملکوں کے باشندوں نے خورد و نوش نشست و برخاست اور وضع و لباس وغیرہ کے متعلق اجتماعی و معاشرتی حالات میں فطرۃً چند آداب کی پابندی کا لحاظ رکھا ہے اور اس میں مختلف طریقے اختیار کئے ہیں۔

(۱) بعض لوگوں نے ان کی بنیاد حکمتِ طبعی کے قواعد پر رکھی ہے اور ان آداب کو اختیار کیا ہے جو طب اور تجربہ کی رو سے مفید ہیں۔

(۲) بعض لوگوں نے ان کو مذہبی اصول پر قائم کیا ہے اور اس میں اپنے مذہب کی پابندی کی ہے۔

(۳) بعض لوگوں نے اس معاملہ میں اپنے بادشاہوں حکیموں اور راہبوں کی تقلید کی ہے۔ ان کے علاوہ اور اصول و قواعد بھی ہیں جن میں بعض مفید اور بعض مضر ہیں اور بعض میں نفع و نقصان کچھ بھی نہیں ہے۔ اس لئے جو مفید تھے وہ اس بات کے مستحق تھے کہ ان کی پابندی کا حکم دیا جائے اور جو مضر تھے ان کی ممانعت کی جائے اور جن میں نفع و نقصان کچھ بھی نہ تھا وہ اپنی اباحت کی حالت میں قائم رکھے جائیں۔ ان مصلحتوں کی بنا پر شریعت نے ان سے بحث کی اور اس میں امورِ ذیل کا لحاظ رکھا۔

ا۔ ایک تو یہ کہ ان آداب کی پابندی سے بعض اوقات خدا بھول جاتا ہے اور دل کی صفائی باقی نہیں رہتی۔ اس لئے شریعت نے ان سے پہلے، ان کے بعد اور ان کے ساتھ چند دعائیں مسنون کر دیں جو خدا کو یاد دلاتی ہیں۔

ل ترمذی ابواب الزہد صفحہ ۴۰۹۔

۲۔ بعض افعال و اشکال شیطان کے مزاج سے مناسبت رکھتے ہیں مثلاً ایک جوتہ پہن کے چلنا اور بائیں ہاتھ سے کھانا اس لئے شریعت نے ان کی ممانعت کی ہے۔ اس کے بخلاف بعض باتیں ایسی ہیں جو فرشتوں سے قریب کر دیتی ہیں مثلاً گھر میں داخل ہونے اور نکلنے کے وقت دعا پڑھنا اس لئے شریعت نے ان کی ترغیب دی ہے۔

۳۔ بعض چیزیں ایسی ہیں جن سے تجربۃً تکلیف پہنچتی ہے مثلاً ایسی چھت پر سونا جس پر کوئی آڑ یا جالی نہ ہو یا سوتے وقت چراغ کو جلائے رکھنا۔ اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ چوہے چراغ کی بتی سے گھر میں آگ لگا دیتے ہیں۔

۴۔ بعض آداب ایسے ہیں جن سے عجمیوں کے مسرفانہ اور عیاشانہ تمدن کی مخالفت مقصود ہے مثلاً حریر، تصویر دار کپڑوں اور چاندی سونے کے برتنوں میں کھانے پینے کی ممانعت۔

۵۔ بعض چیزیں وقار و تمدن کے منافی ہیں اور انسان کو بالکل وحشیوں اور بدوؤں میں شامل کر دیتی ہیں اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی ممانعت فرمائی تاکہ افراط اور تفریط کے درمیان توسط و اعتدال کی راہ نکل آئے[1]۔

اس تفصیل کے پیشِ نظر رکھنے کے بعد یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ دنیا کی تمام مہذب قوموں کے اجتماعی و معاشرتی آداب کی بنیاد جن اصولوں پر قائم تھی اسلام کے احکام میں اور رسولِ انام علیہ السلام کے آداب میں وہ سب ملحوظ ہیں اور مذہبی، اخلاقی، تمدنی اور طبی غرض ہر قسم کے فوائد و منافع پر مشتمل ہیں۔ یعنی ان آداب کی پیروی سے خدا کی رضا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع، روح اور جسم کی پاکیزگی، گھر کی صفائی، اخلاق کی طہارت اور بلندی، معاشرت کی اچھائی، صحت کی حفاظت اور ترقی، بزرگوں کے آزمودہ اصولِ کار اور طریقِ زندگی کی ہدایت نصیب ہوتی ہے اور ان ہی کے مجموعہ کا نام

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۳۶۳۔

خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے لئے کی گئی تھی یُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيهِمْ ۔ یعنی ایسا نبی جو ان اُمیوں کو اللہ کے احکام اور اخلاق و حکمت سکھائے اور ان کو اپنی تعلیم و تربیت سے پاک وصاف کرکے نکھار دے ۔ یہ نکھارنے والا آیا اور نکھار کر دنیا کو پُر بہار بنا گیا صلی اللہ علیہ وسلم ۔

اُمیدوارِ رحمت

سید سلیمان ندوی

۲۹ ذیقعدہ ۱۳۵۷ھ